وزیرِ اعظم
اشرف شاد
Dost

وزیرِ اعظم

(ناول)

اشرف شاد

دوست پبلی کیشنز ۔ اسلام آباد

ضابطہ

ISBN : 969-496-095-9

نام کتاب	:	وزیراعظم
مصنف	:	اشرف شاد
موسم اشاعت	:	۱۹۹۹ء
سرورق	:	خالد رشید
مطبع	:	الساجد پرنٹرز
قیمت	:	320.00 روپے
مصنف کا پتہ	:	2-Brown Road, Broadmeadow NSW 2292 AUSTRALIA

دوست پبلی کیشنز 8اے خیابان سہروردی' پوسٹ بکس نمبر 2958' اسلام آباد

اپنے بھائی، اپنے دوست

احمد شمسی

کے نام

ع مرنے پہ جس کے موت کی آنکھوں میں درد تھا

ہمراہ لے گئے ہیں محافظ سمیٹ کر
بھوکے کسی کسان کا جتنا اناج تھا

پاکستان میں بہت کچھ اسی طرح ہو رہا ہے جس طرح
"وزیراعظم" میں بیان کیا گیا ہے۔ اس لئے ممکن ہے
اس ناول کی کہانیاں سچے واقعات کا عکس نظر آئیں
اور کردار جیتے جاگتے حقیقی وجود لگنے لگیں۔
لیکن
ایسی کوئی بھی مطابقت محض اتفاقیہ ہو گی!

مصنف

حوالہ جات

- وزیراعظم میں آکسفورڈ یونیورسٹی سے متعلق واقعات اور بیورو کریسی کے بارے میں جو بحث شامل ہے اس کے لئے تحقیقی کتابوں سے مدد لی گئی ہے۔
- بڈاپسٹ' ہنگری کا باب مصنف کے ذاتی مشاہدات اور تجربات کا نتیجہ ہے تاہم تاریخی حوالوں کیلئے تحقیقی کتب اور مقامات کے درست حوالوں کیلئے ہنگری کے صحافی دوست Peter Ipper کی خدمات مستعار لی گئی ہیں۔
- ترکی کے متعلق بیان کیلئے بھی ذاتی مشاہدات کے علاوہ تحقیقی کتب کا سہارا لیا گیا ہے۔
- ناول میں جو نظمیں شامل ہیں اور جو اشعار درج ہیں وہ مصنف کی اپنی تخلیق ہیں اور ان میں سے بیشتر ان کے شعری مجموعے "نصاب" میں شامل ہیں۔

فہرست

سب ہی اندھے ہیں میرے اس شہر میں
کون ہو گا راہبر —— سوچو بھئی!

پیش لفظ

پاکستان میں سیاسی منظر نامہ اس تیزی سے بدلتا ہے کہ آج کی کہانی آج لکھنا ایک مشکل کام ہے۔ "وزیراعظم" لکھنے کے دوران دو وزیراعظم بدل چکے ہیں اور کوئی نئی تبدیلی آئی تو آج کی یہ کہانی گزرے ہوئے کل کی کہانی بن جائے گی۔ لیکن آج کے پاکستان کی یہ کہانی سیاسی تاریخ لکھنے کی کوشش نہیں ہے اس لئے اسے پڑھتے ہوئے تاریخ کی غلطیاں نہ نکالی جائیں۔ دراصل یہ سیاسی ناول ہے بھی نہیں۔ اس کی کہانی نے انسانی رشتوں کی نزاکتوں کو ساتھ لے کر روایتی ناول کے اتار چڑھاؤ طے کئے اور بہت سے جذباتی موڑ کاٹے ہیں۔ اس کے کردار عشق و محبت کا کھیل بھی کھیلتے ہیں لیکن یہ کردار کیونکہ سیاست کے کاروبار سے بھی وابستہ ہیں اس لئے دوستیاں اور رشتے نباہنے اور عشق و محبت کا کھیل کھیلنے کا ان کا اپنا ایک الگ انداز ہے۔ یہ انداز آپ کو پسند آئے یا نہ آئے قدم قدم پر آپ کو حیران ضرور کر دے گا۔

میرا پہلا ناول "بے وطن" شائع ہوا تو کہا گیا تھا کہ بقول میرا جی ایک ناول ہر شخص کے اندر ہوتا ہے' وہ باہر آگیا ہے۔ گزشتہ سال جب "وزیراعظم" طباعت کیلئے تیار ہو کر پاکستان پہنچا تو دوستوں نے آسٹریلیا کی اس پر سکون فضا کو سراہا جہاں بیٹھ کر فی برس ایک ضخیم ناول لکھنا آسان ہے۔ یہ بات اس حد تک صحیح ہے کہ آسٹریلیا کی نیلی اور برفانی پہاڑیوں اور جھیلوں سے مزین سرسبز وادیوں میں گہرا سکون اور اطمینان ہے۔ بہت سے جنت نشان مقام ایسے ہیں جو مجھ جیسے عام انسان کی بھی پہنچ اور دسترس میں

ہیں لیکن میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں لفظوں کی نقاشی اور ان کی مرمت کا کام خاموش فضاؤں میں بیٹھ کر نہیں کر سکتا۔ گزشتہ چھ برسوں سے میری تخلیقی سرگرمیوں کا مسکن یونیورسٹی آف نیو ساؤتھ ویلز کا وہ کیفے ہے جو نو عمر طالبان علم سے بھرا ہوتا ہے اور جہاں باتوں، نعروں، قہقہوں اور سسکاریوں کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ "بے وطن" میں کیفے ا-سمیس کا بار بار تذکرہ آیا ہے جہاں بیٹھ کر میں نے ایک تحقیقی مقالہ اور اپنے دونوں ناول تحریر کئے ہیں۔ یہ کیفے یونیورسٹی کی چودہ منزلہ لائبریری کے بالکل سامنے واقع ہے جس کی وجہ سے تحقیقی کتب تک رسائی آسان رہتی ہے۔ ناول میں دیئے گئے ایک ایک حوالے کی صحت جانچنے کیلئے کئی کئی کتابیں نچوڑی ہیں، وہیں بیٹھ کر نوکر شاہی کی پوری تاریخ کھنگالی ہے اور مقامات کا جغرافیہ درست رکھنے کیلئے بھی اکثر اسی کتب خانے کی مدد لی ہے لیکن یہ خیال رکھا ہے کہ تحقیق کا بہاؤ ناول کی سمت تبدیل کر کے اسے گراں نہ کر دے۔

"وزیر اعظم" کا مرکزی کردار ایک صحافی ہے اس لئے اکثر دوست اس میں میرا چہرہ دیکھنے کی کوشش کریں گے۔ "بے وطن" کو بھی صرف اس کے نام کی وجہ سے پڑھے بغیر میرا سوانحی ناول کہہ دیا گیا تھا۔ ایک زمانہ تھا جب میں نے بے وطنی کے عذاب جھیلے تھے لیکن "بے وطن" میری کہانی نہیں تھی۔ اسی طرح "وزیر اعظم" کا ذہین جلالی بھی میں نہیں ہوں۔ میں نے کہانیوں کو ان کے اندر اور کبھی باہر بیٹھ کر دیکھا سنا اور بیان کیا ہے لیکن خود کو کہانی نہیں بنایا۔ لہٰذا "وزیر اعظم" کو آپ بیتی یا بقول یوسفی صاحب "پاپ بیتی" سمجھنے کے بجائے ایک ناول اور ایک افسانوی تخلیق سمجھ کر پڑھئے اور جیسا کہ میں نے کتاب کے آغاز میں لکھ دیا ہے، کوئی واقعہ یا کردار سچا لگنے لگے تو اسے اتفاق یا مصنف کی تخلیقی کوششوں کا کمال سمجھئے گا۔

میرے پہلے ناول "بے وطن" کو جب اکادمی ادبیات پاکستان نے ۱۹۹۷ء کے بہترین ناول کا وزیر اعظم ادبی ایوارڈ دیا تو مجھے خوشی سے زیادہ حیرت ہوئی تھی۔ میرے لئے زیادہ بڑا اعزاز "بے وطن" کی تحسین میں کہے گئے ان بزرگوں اور دوستوں کے الفاظ تھے جنہیں میں ادب کے حوالے سے بہت محترم اور قابل تعظیم جانتا ہوں۔

"وزیراعظم" رابطے کا ذریعہ بن رہا ہے تو میں دیس بدیس رہنے والے اپنے ان دوستوں کا بھی شکریہ ادا کروں جنہوں نے مجھے مبارکباد کے پیغامات بھیجے' خاص طور پر اردو سوسائٹی آف آسٹریلیا کا جس نے سڈنی میں ایک یادگار جلسہ کیا۔ میں نے "بے وطن" کو ملنے والا ایوارڈ بھی آسٹریلیا کے انہی شاعر و ادیب دوستوں کی نذر کیا ہے۔

میری شریک حیات یاسمین اپنی تخلیقی اور تدریسی مصروفیات کے باوجود میری ہر نثری اور شعری تخلیق کی پہلی سامع اور ناقد ہوتی ہیں اور تخلیق کے اس سفر میں مجھے تازہ دم رکھتی ہیں۔ روزگار کی مشقت سے بچنے والا جو وقت یاسمین' میری بیٹی سمن اور بیٹوں ارسلان اور سلمان کی امانت تھا وہ اب ان تخلیقی سرگرمیوں کی نذر ہو رہا ہے۔ میری صحافیانہ زندگی اور پہلی دو کتابوں کی طرح "وزیراعظم" بھی میرے اہل و عیال کی مقروض ہے۔ میرے چھوٹے بھائی شفقت نے "وزیراعظم" کے مسودے کے ساتھ بھی بہت بھاگ دوڑ کی ہے یہ ان کی' میرے دوسرے بھائیوں ارشاد راؤ' ثروت' ارشد' مظفر' فرخ' بہنوں طلعت' شاہینہ' فرحت' رانی' عائشہ اور سعدیہ اور بھائیوں جیسے دوستوں جی این قریشی اور نقاش کاظمی کی محبتیں ہیں جن کی وجہ سے میں پاکستان میں نہ رہتے ہوئے بھی وہیں رہتا ہوں اور میرا رشتہ پاکستان اور اس کے ادب سے بدستور قائم ہے۔ اس فہرست میں پاکستان سے باہر رہنے والے میرے دوسرے بھائی بہنوں تحسین' قیصر' عشرت' عارف' راجی' ایلبین' شاہین' عائشہ اور جبین' یاسمین کی امی اور میرے بزرگ مظاہر علی کا شمار بھی ضروری ہے جن کی نیک تمنائیں اور دعائیں ہمیشہ میرے ساتھ رہتی ہیں۔

میں اس کتاب کے پبلشر اور دوست پبلیکیشنز کے آصف محمود کو داد دوں گا جنہوں نے پاکستان میں کتابوں کی ناقدری کا شکوہ کئے بغیر ایک دور دراز ملک میں رہنے والے ایک غیر معروف ناول نگار کی کتاب شائع کرنے کی ذمہ داری قبول کی۔ انہوں نے ہزاروں میل کی دوری کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے کتاب کی اشاعت کے ہر مرحلے میں مجھے شامل رکھا ہے۔ میں واقعتاً ان کا اور ان کے ساتھیوں کا شکر گزار ہوں جو کتاب کی پروسیسنگ' پروف ریڈنگ' طباعت اور تقسیم کے کاموں میں شریک رہے

ہیں۔ کراچی میں حیات نے بہت محنت اور توجہ سے کتاب کی ابتدائی پروسیسنگ کی
تھی ان کا اور اپنے دوست مجاہد بریلوی کا بھی شکر گزار ہوں جن کا دفتر پاکستان میں
میرے رابطے کا مرکز رہتا ہے۔ سڈنی میں مقیم میرے بزرگ دوست اور شاعر و ادیب
اوم کرشن راحت نے زبان کی صحت جانچنے کا کام کیا جبکہ شمیم زیدی' ڈاکٹر کوثر جمال
اور کنیز فاطمہ نے "وزیراعظم" کے ابتدائی ابواب پڑھ کر گرانقدر مشورے دیئے۔ مجھ
پر ان دوستوں کا شکریہ بھی واجب ہے۔

اس وقت مجھے احمد شمسی کی بہت یاد آئی ہے۔ "وزیراعظم" کی اشاعت میری
زندگی کا وہ پہلا اہم کام ہے جس میں وہ شامل نہیں ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ جن
آسمانوں پر ان کا قیام ہے وہ وہیں سے بیٹھے مجھے دیکھ کر مسکرا رہے ہوں گے۔

اشرف شاد

حصہ اول

ٹیلی فون آنے تک...

وزیر اعظم ایمان علی

ذہین جلالی نے سگریٹ کا گہرا کش لے کر دھواں کھڑکی سے باہر پھیلے ہوئے اندھیرے میں اڑا دیا۔ باہر کا بلب فیوز تھا اور پھاٹک کے دونوں ستونوں پر لگے ہوئے قمقموں کی کمزور پیلی روشنی اس کھڑکی تک پہنچنے میں ناکام تھی جس کے دوسری طرف جلالی کھڑا تھا۔ کھڑکی سے باہر کا چھوٹا سا برآمدہ' پھولوں کی کیاریاں اور ہرا بھرا لان بھی اندھیرے میں تھا لیکن بند پھاٹک کے دوسری طرف سے آنے والی غصے بھری آوازیں جلالی تک پہنچ رہی تھیں۔ کچھ لوگ شاید چوکیدار سے بحث کر رہے تھے۔ کوئی زور زور سے پھاٹک ہلانے لگا۔ لیکن پھر اچانک سب کچھ تھم گیا۔ ایک ایک کر کے موٹر سائیکلیں اسٹارٹ ہوئیں اور ان کی آوازیں دور ہوتی گئیں۔ صحافیوں کی ٹولی کا یہ حملہ بھی ناکام ہو گیا تھا۔ دن بھر میں آج انہوں نے چھٹی یا ساتویں بار دھاوا بولا تھا۔ لیکن چوکیدار نے کسی کو اندر جھانکنے تک نہیں دیا تھا۔ شروع شروع میں چند مہم جو رپورٹروں نے پھاٹک کے باہر ڈیرہ ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ انہیں سن گن تھی کہ اس پھاٹک کے پیچھے کوئی بڑی خبر پروان چڑھ رہی ہے۔ لیکن ان کے پاس انتظار کے

لئے زیادہ وقت نہیں تھا۔ انہیں آج کئی دروازے کھٹکھٹانے اور کئی بڑے پھاٹک ہلانے تھے۔

ذہین جلالی کو معلوم تھا کہ صحافیوں کی کوئی ٹولی اب نہیں آئے گی۔ شام کے سات بج چکے تھے۔ اسلام آباد میں سرد موسم کی راتیں جس تیزی سے آتیں اتنی ہی جلدی گہری بھی ہو جاتیں۔ ایف۔۱۰ کا یہ علاقہ شہر سے دور تھا اور جس خبر کی تلاش میں صحافی یہاں آئے تھے وہ ایوان صدر میں جوان ہو رہی تھی اور کسی وقت بھی ساری ناکہ بندیاں توڑ کر اپنی چال دکھانے باہر نکلنے والی تھی۔ جلالی شرمندہ ہونے لگا۔ بند پھاٹک سے سر ٹکرا کر جانے والے صحافیوں میں کئی اس کے دوست بھی ہوں گے۔ شاید وہ بھی ہوں جن کے ساتھ وہ کام کر چکا تھا۔ وہ پھاٹک کے اندر نہ ہوتا تو ممکن ہے باہر سے پھاٹک ہلانے والے صحافیوں کی ٹولی میں شامل ہوتا۔ واپس جاتے ہوئے شاید پھاٹک پر ایک پتھر بھی مار جاتا' لیکن وہ اب صحافی کہاں رہا تھا۔ جلالی نے ایک گہرا سانس لے کر سوچا۔ وہ تو خود اس کہانی کا کردار بن گیا تھا اور کردار اپنی کہانی خود نہیں لکھتے۔

سگریٹ کا آخری کش لے کر اس نے جلتا ہوا ٹوٹا باہر لان میں پھینک دیا۔ دھویں کا غبار اندھیرے میں چھپے ہوئے سبز پودوں اور رنگین پھولوں کے چہروں پر سیاہی ملنے لگا۔ جلالی نے گہری سانس لے کر باہر کی تازہ ہوا سونگھنے کی کوشش کی لیکن رات کی رانی بھی سگریٹ ہی کی مہک دے رہی تھی۔ پچھلے تین دن پھول پتیوں پر بھاری گزرے تھے۔ مگر اس باغیچے اور عالیشان بنگلے کی مالکہ کو پرواہ نہیں تھی۔ سگریٹ کا زیادہ دھواں خود مسز چنائے کے ہونٹوں کے سرخ گلابوں سے نکلا تھا۔ باغیچے کے رخ پر واقع جھروکے کی کھڑکی سگریٹ کا دھواں پھینکنے والی واحد چمنی تھی۔ کھڑکی کے چاروں طرف بوگن ولا کی بیل لٹکی اور پھیلی ہوئی تھی جس کے پھولوں کے رنگ دیکھ کر مسز چنائے بہت فخر کرتی تھی۔ وہ کہتی تھی کوئی اس رنگ کو نام دے کر بتائے۔ سرخ' گلابی' نارنجی تینوں رنگ مل کر آگ کی طرح دہکتے لیکن کسی ایک رنگ کی پہچان مشکل تھی۔

جلالی نے مڑ کر انگریزی حرف ایل کی شکل کے کشادہ ڈرائنگ روم کے اس حصے کی طرف دیکھا جہاں کھانے کی میز کو کانفرنس ٹیبل بنا کر اس کے گرد نئے پاکستان کی کابینہ بیٹھی تھی۔ ایک سرے پر ایمان علی کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے بغیر آگے کی طرف جھکا بیٹھا تھا۔ کسی اہم نکتے کی وضاحت کرتے ہوئے اس کا چہرہ لال پیلا ہو رہا تھا۔ اس کے بولنے میں جو گرمجوشی تھی اس نے آنکھوں کی چمک اور بڑھا دی تھی۔

"وزیراعظم ایمان علی!" جلالی نے ہونٹوں ہی ہونٹوں میں وہ نعرہ دہرایا جو ایمان علی کے جلسوں میں لگتا تھا۔ اسے لگا جیسے ایمان علی کا ادھورا نام مکمل ہو گیا ہو۔ اس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ سوئیاں تیزی سے دوڑتی ہوئی اپنا چکر پورا کر رہی تھیں۔ جلالی نے سوچا نعروں کے حقیقت بننے کا وقت نزدیک آ گیا ہے۔ آج تک وزیراعظم کہلائے جانے والے عامر نذیر کو شاید اب تک صدر کا محبت نامہ مل گیا ہو گا۔ جنرل منصف خان صدر کو ایمان علی کی کابینہ کے ناموں کی فہرست دے چکا ہو گا۔ یہ فہرست جلالی نے خود اپنے ہاتھوں سے فوجی ہیڈ کوارٹر کے خصوصی ایلچی کے حوالے کی تھی۔

جلالی نے ڈرائنگ روم کے کشادہ حصے کے نیم تاریک گوشے میں لگے ہوئے آرام دہ صوفے اور اس کے سامنے رکھی ہوئی گہرے رنگ کی چمکدار کافی ٹیبل کی طرف دیکھا جس پر اس کا لیپ ٹاپ کمپیوٹر، ٹیبل لیمپ اور کاغذوں کا ایک انبار لگا ہوا تھا۔ گزشتہ تین دن سے یہ جلالی کا دفتر بھی تھا اور بستر بھی۔ ایمان علی نے موٹی موٹی ضخیم رپورٹیں اس کے حوالے کی تھیں۔ حکومت کرنے کے یہ منصوبے ان نعروں کی تفسیر تھے جو "نیا پاکستان" کے نام سے ایمان علی نے لگائے تھے۔ ایمان علی کے پاس اپنے ہر نعرے کو سچ کرنے کا بلیو پرنٹ موجود تھا۔ جلالی تین دن سے بیٹھا ان منصوبوں کے خلاصے ٹائپ کر رہا تھا۔ ان خلاصوں کی کاپیاں کانفرنس میز پر بیٹھے ہوئے دس افراد کے سامنے رکھی تھیں۔ یہ دس کے دس وہ لوگ تھے جن کے ناموں کے پیچھے برسوں کی کمائی ہوئی عزت تھی۔ تجربہ تھا۔ وہ اپنے اردگرد پھیلے ہوئے دکھوں کو دیکھ کر کڑھنے والے، اپنے اپنے دائروں میں رہ کر ان کا مداوا ڈھونڈنے والے، خواب دیکھنے والے

لوگ تھے۔ ایمان علی اور اس کے منصوبوں میں انہیں اپنے خوابوں کی تعبیر نظر آئی تو نئے پاکستان کے سفر کا آغاز بننے پر تیار ہو گئے تھے۔ بس چند گھنٹوں کی دیر تھی، سفر شروع ہونے والا تھا۔

جلالی نے واپس اپنے کونے کی طرف جانے سے پہلے ایک بار پھر کانفرنس ٹیبل کی طرف دیکھا۔ اسے حیرت ہو رہی تھی کہ مسز چناۓ، شمسہ جہانزیب یا وائی اے سبحان میں سے کوئی بھی سگریٹ نوشی میں اس کے ساتھ شامل ہونے کھڑکی تک نہیں آیا تھا۔ جلالی کی طرح تینوں سگریٹ نوشی کے پرانے مریض تھے۔ لیکن کانفرنس ٹیبل پر سگریٹ نوشی منع تھی۔ سگریٹ نوشی پر پابندی عائد کرانے میں ڈاکٹر محمد شفا کا ہاتھ تھا۔ وطن کی محبت میں وہ امریکہ سے اپنی بہت کامیاب پریکٹس چھوڑ کر ایمان علی کی تحریک سے آ جڑا تھا۔ اسے جب بھی موقع ملتا سگریٹ نوشی کے قہر سے ڈرانے لگتا۔ وائی اے سبحان پرانا صحافی تھا، اس نے قلم سے روشنائی اور سگریٹ سے دھواں چھوڑنا ایک ساتھ شروع کیا تھا۔ شمسہ جہانزیب دن رات انسانی حقوق کی ستائی ہوئی عورتوں کے مقدمے لڑتی اور جب بھی موقع ملتا سگریٹ لگا کر اپنے اعصاب کا تناؤ دور کرنے کی کوشش کرتی۔ اور مسز چناۓ، وہ تو شاید سگریٹ منہ میں لے کر پیدا ہوئی تھی۔

سگریٹ نہ پینے کی وجہ جنرل عالم گل کا احترام بھی تھا۔ بوڑھا اور اپنے زمانے میں فوج کا مرد آہن دل پر بائی پاس کی مہر لگوا چکا تھا۔ سگریٹ کا دھواں اس کے لئے آہستہ اثر کرنے والے زہر کی طرح تھا۔ باقی لوگوں کے لئے سگریٹ پینا یا نہ پینا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ ڈاکٹر حبیب الحق جو معیشت کی رگ رگ سے واقف تھا پائپ پیتا تھا، بڑے اہتمام کے ساتھ، لیکن کبھی کبھی۔ ریٹائرڈ جسٹس صدیق واحد جو اپنے زمانے میں اعلیٰ عدالتوں کے وقار کی علامت رہا تھا سگار پیتا تھا وہ بھی صرف رات کے کھانے کے بعد۔ اعجاز محمد خان جس کی طالب علمی کے دور کی شعلہ بیانی اور انقلابی روح آج بھی زندہ تھی، دو تین سال پہلے سگریٹ پینا چھوڑ چکا تھا۔ سردار قاہر کا قہر سگریٹ پر کبھی نہ ٹوٹ سکا تھا۔ اسے چٹانوں کی گود میں پھیلی ہوئی بڑی سی حویلی میں اپنی مسند پر بیٹھ کر حقہ گڑگڑانا اچھا لگتا تھا لیکن پچھلے چند سالوں سے اس نے وہ بھی چھوڑ دیا تھا۔ کہتا

تھا پاکستان کی سیاست میں حقہ منافقت کی علامت بن گیا ہے۔ آغا شاہ رخ نوکر شاہی کا پرانا بازیگر تھا۔ اس نے بہت سی حکومتوں کا عروج و زوال دیکھا تھا لیکن اب ریٹائر ہو کر خاموش بیٹھا حالات پر کڑھا کرتا تھا۔ ایمان علی کے بلاوے کو فرض کی پکار سمجھ کر آیا تھا۔ سگریٹ نوشی اس کا بھی مسئلہ نہیں تھی۔ اس کی زندگی اس چھوٹے سے تھرماس میں بند تھی جو وہ اپنے ساتھ لے کر آتا اور ہر ایک گھنٹے بعد چھوٹا سا گھونٹ لے کر اس کا ڈھکنا بند کر دیتا۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ اس تھرماس میں کون سا آتش سیال بند رہتا ہے۔ مسز چنائے نے ایک دفعہ پیشکش کی تھی' اس کے گھر میں دنیا کا ہر مشروب موجود تھا۔ لیکن شرمیلے آغا نے "شکریہ" کہہ کر اپنے تھرماس کو تھپکی دی تھی اور مسکرا کر سر جھکا لیا تھا۔

جلالی نے صوفے اور کافی ٹیبل پر مشتمل اپنے عارضی دفتر کی طرف جانے کے لئے قدم اٹھایا ہی تھا کہ اسے مسز چنائے کی نظریں اس جھروکے کی طرف اٹھتی ہوئی محسوس ہوئیں جہاں وہ کھڑا تھا۔ تاریکی میں ہونے کے باوجود اسے ایسا لگا جیسے وہ اسے رکنے کے لئے کہہ رہی ہو۔ اسے شاید سگریٹ نوشی کے لئے کسی ساتھی کی ضرورت تھی۔ اس نے اپنا قدم واپس لیا اور کھڑکی سے کمر ٹکا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ کانفرنس کی میز کے گرد بیٹھے ہوئے ان چہروں کو غور سے دیکھ رہا تھا جو آنے والے دنوں کے منصوبوں میں غرق تھے۔ صرف مسز چنائے کی نظریں ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں۔ وہ ایمان علی کے بائیں ہاتھ پر اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھی تھی۔ اس نے یہ کرسی خاص طور پر چنی تھی۔ ایک شام اس نے ہنس ہنس کر اس کی وجہ بتائی تھی۔ اسے ڈر تھا ایمان علی کی پرانی عادت واپس نہ آ جائے۔

ایمان علی کرسی یا صوفے کی پشت سے ٹیک لگاتے ہی پاؤں سامنے رکھی میز پر پھیلا لیتا تھا۔ اس کے سارے دوست اس کی نوجوانی کے زمانے سے پختہ ہونے والی عادت سے واقف تھے اس لئے برا نہیں مانتے تھے۔ مسز چنائے ایمان علی کو آکسفورڈ یونیورسٹی کے زمانے سے جانتی تھی اس لئے وہ بھی بخوبی واقف تھی۔ لیکن دو سال پہلے جب ایمان علی اس سے ملنے بحرین آیا اور صوفے پر پشت ٹکاتے ہی پیر سامنے کی

میز پر رکھے تو وہ برداشت نہیں کر سکی تھی۔

"تمہارے جوتے کاؤ بوائے بوٹوں کی بہت بھونڈی نقل ہیں۔ ان کا چمڑہ بھی اصلی نہیں ہے۔ ٹیکساس کے اصیل نسل والے کسی امریکی نے یہ سستی نقل دیکھی تو تمہارے بارے میں اچھی رائے قائم نہیں کرے گا۔" ایمان علی نے اپنے پاؤں فوراً واپس کھینچ لئے تھے۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ بوٹوں کی توہین اسے اپنی توہین لگی تھی۔ شاہی خاندان کی شخصیتوں سے کندھے رگڑنے والا ایمان علی شہزادوں کا سا مزاج رکھتا تھا۔ اس کے لئے نقلی اور ملاوٹی چیزیں استعمال کرنا سخت ہتک کی بات تھی۔ اس شام رات کے کھانے میں شیخ علی بھی موجود تھا۔ کھانے سے پہلے ڈرائنگ روم میں باتیں کرتے ہوئے ایمان علی کی ٹانگ کئی بار کسمسائی اور ہر دفعہ مسز چنائے کی سانس رک کر رہ گئی تھی۔ شیخ علی کے سامنے وہ پاؤں اٹھا کر میز پر رکھ لیتا تو شیخ علی شاید مہمانداری کی عرب روایت اور یہ بھول جاتا کہ وہ اس کی بیوی کا کتنا عزیز دوست تھا۔ لیکن یہ دو سال پرانی بات تھی۔ مسز چنائے کو حیرت تھی کہ ان دو سالوں میں ایمان علی کتنا بدل گیا تھا۔

جلالی نے سوچا مسز چنائے کی احتیاط غلط نہیں تھی۔ اس میز کے گرد بیٹھنے والوں میں فوجی جنرل' بلوچی سردار' بیوروکریٹ' سابق جسٹس' سینئر صحافی اور خواتین شامل تھیں۔ ایمان علی میز پر اگر اپنے پیر جوتوں سمیت رکھ دیتا تو اس کی کابینہ بننے سے پہلے ٹوٹ جاتی۔ ادھر ادھر سے ٹکڑے لا کر کابینہ کا مربع مکمل کرنا آسان نہیں تھا۔ ایمان علی کو کئی ہفتے لگے تھے۔ ملک سے وہ لوگ عنقا ہو چکے تھے جن کے دامن بے داغ تھے' جن پر جانبداری کی کوئی تہمت نہیں تھی اور جن کی اہلیت پر انہیں ناپسند کرنے والوں کو بھی شبہ نہیں تھا۔ ایسے کچھ لوگ اگر تھے تو وہ حکومتی کاروبار کے گورکھ دھندے میں پھنسنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ ایمان علی نے جلالی اور قریشی کی مدد سے اور بہت سوچ بچار کے بعد بیس افراد کی فہرست مرتب کر کے جنرل منصف کو دی تھی۔ فہرست واپس آئی تو پانچ نام کاٹ دیئے گئے تھے۔ جو پندرہ بچے تھے ان میں سے دو نے ایمان علی کے اجلاس میں آنے سے معذرت کر لی تھی۔ جو تیرہ لوگ آئے تھے

انہیں ایمان علی دن بھر حکومت کرنے کے اپنے منصوبے سمجھاتا رہا۔ ایمان علی کی بات ختم ہونے کے بعد بحث شروع ہو گئی تھی۔ ۷۵ سالہ سہراب جی نے اس ساری بحث میں ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ حکومت کی بدعنوانیوں کا پردہ چاک کرنے والے سہراب جی کی شہرت ملک گیر تھی۔ جلالی جانتا تھا کہ اگر وہ کابینہ میں شامل ہو گیا تو نئی حکومت کی عزت دو گنی ہو جائے گی۔ رات کو کھانے کے وقفے سے قبل سہراب جی نے اپنی خاموشی توڑتے ہوئے کہا:

"میں رات کی فلائٹ سے کراچی جا رہا ہوں' اس اجلاس میں اب واپس نہیں آؤں گا۔ مجھے خواب دیکھنے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ خاص طور پر ایسے خوابوں سے جن کی کوئی تعبیر نہ ہو۔ تم سب جب اپنے خوابوں سے جاگ جاؤ تو مجھے بلا لینا۔ شاید اس وقت میں تم لوگوں کے کسی کام آ سکوں۔" بوڑھا سہراب جی یہ کہہ کر اور اپنی بات کا ردعمل دیکھے بغیر چلا گیا تھا۔ دوسرے دن مزید دو لوگوں نے وہ بات جو سہراب جی نے بہت مبہم طور پر کہی تھی صاف صاف کہنا شروع کی۔ ایمان علی کے منصوبوں سے سب متفق تھے۔ لیکن انہیں یقین نہیں تھا کہ ایمان علی کے اتنے انقلابی پروگرام کو فوج اور طاقت کے دوسرے ستونوں کی حمایت حاصل ہے۔ ایمان علی نے دلائل' شواہد اور واقعات سے انہیں یقین دلانے کی کوشش کی تھی لیکن ان کی عقل ماننے پر تیار نہیں تھی۔ دوسرے دن شام تک وہ دونوں چلے گئے تھے۔ جو دس افراد بچے تھے انہوں نے شک کی جگہ یقین کو دی تھی۔ جو کچھ وہ کرنا چاہتے تھے اس کے سچ ہونے کی ہلکی سی امید بھی ان کے یقین کے لئے کافی تھی۔ جلالی نے سوچا پندرہ میں سے دس' یہ کوئی ایسا برا اسکور نہیں تھا۔

جلالی نے پیلے رنگ کی سلک کٹ کی ڈبیا سے دو ملی گرام والا سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبایا لیکن سلگایا نہیں۔ اس نے سوچا مسز چنائے کے سنہرے ڈنہل لائٹر سے جلائے گا۔ اچھے لائٹر کا شعلہ پا کر سگریٹ کچھ اور نشیلا ہو جاتا ہے۔ اسی وقت اس نے مسز چنائے کو اپنی کرسی سے اٹھتے دیکھا۔ جلالی کو یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ کوئی اور اس کے ساتھ نہیں اٹھا تھا۔ سب کسی اہم نکتے میں الجھے ہوئے تھے۔ جلالی مسز چنائے

سے علیحدگی میں بات کرنا چاہتا تھا لیکن موقع نہیں مل رہا تھا۔ علیحدگی میں بات کرنے کی کوئی خاص وجہ نہیں تھی۔ بس جلالی کو اپنے ایک "کیوں" کا جواب چاہیے تھا۔ جلالی کو قریشی نے مسز چنائے کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا اس کے بعد جلالی کے "کیوں" کا سوالیہ نشان اور بڑا ہو گیا تھا۔ قریشی کے ذریعے ایمان علی کی غیر جانبدار حکومت کی بیل پروان چڑھ رہی تھی۔ کون تھا جسے وہ نہیں جانتا تھا۔ قریشی نے جلالی کو بتایا تھا کہ مسز چنائے کا مسٹر چنائے سے اب کوئی تعلق نہیں رہا تھا۔ اس کا سابقہ شوہر اختر چنائے علیحدگی اختیار کر کے اپنا بڑھاپا گزارنے اسپین چلا گیا تھا۔ شاید اب تک مر کھپ بھی گیا ہو۔ مسز چنائے نے بحرین کے شاہی خاندان کے ایک بہت امیر شیخ علی سے شادی کر لی تھی لیکن پاکستان میں وہ آج بھی مسز چنائے کے نام سے پہچانی اور پکاری جاتی تھی۔ صرف ایمان علی اسے رفی پکارتا تھا جو قریشی کے مطابق رفیقہ کا چھوٹا کیا ہوا نام تھا۔

شیخ علی سے شادی ہونے سے پہلے بھی رفی کا شمار دولت مندوں میں ہوتا تھا۔ وہ چنائے کے کاروبار کی شریک تھی۔ اس زمانے میں اس نے کروڑوں کمائے تھے۔ لندن میں اس کی ایک بڑی فیشن بوتیک تھی جسے اس کی انگریز ماں چلاتی تھی۔ شیخ علی سے شادی کے بعد تو وہ دولتمندوں کی بین الاقوامی فہرست میں شامل ہو گئی تھی۔ جلالی کو یاد تھا دو دن پہلے رات کے کھانے کے بعد اس نے کہا تھا وہ شیخ علی سے ملنے بحرین جا رہی ہے۔ بحرین جانے کا ذکر اس نے اس طرح کیا تھا جیسے اسلام آباد سے راولپنڈی جا رہی ہو۔ شاید ایسا ہی تھا۔ شیخ علی کا ذاتی جیٹ طیارہ رات میں اسے لے کر گیا تھا اور دوسرے دن دوپہر کے بارہ بجے وہ واپس اسلام آباد پہنچ گئی تھی۔ جلالی کو پوچھنا تھا کہ اس جیٹ سیٹ زندگی کو چھوڑ کر وہ پاکستانی سیاست کے خار زار میں "کیوں" الجھ رہی ہے۔

سگریٹ کے لئے مسز چنائے کی بے تابی کا یہ عالم تھا کہ سگریٹ نوشوں کے کونے تک پہنچنے سے پہلے ہی اس نے سگریٹ نکال کر ہونٹوں سے لگا لی تھی اور لائٹر ہاتھ میں تیار رکھا تھا۔ جلالی نے لائٹر اس کے ہاتھ سے لے کر پہلے اس کا اور پھر اپنے

ہونٹوں میں دبا ہوا سگریٹ سلگایا اور لائٹر واپس کرنے لگا۔

"نہیں نہیں اسے اپنے پاس رکھو' یہ لائٹر اب تمہارا ہے۔" مسز چنائے نے لائٹر واپس لئے بغیر کہا۔ جلالی کو یوں لگا جیسے کسی نے سر عام چپت مار دی ہو۔

"بہت بہت شکریہ۔ لیکن میں کسی سے اتنی قیمتی چیز بلاوجہ نہیں لیتا"

"تحفہ سمجھ کر لے لو۔"

"میں بلاوجہ تحفہ بھی نہیں لیتا۔" جلالی کی انا ضد پر اتر آئی تھی۔

"وجہ تو ہے۔ تم ہمارے دوست ہو۔ ہمارا ساتھ دے رہے ہو۔"

"میں ساتھ دینے کی قیمت نہیں لیتا۔"

"میں تم جیسے دیانتداروں سے بہت تنگ ہوں۔" مسز چنائے نے جلالی کی طرف رخ کر کے بیزاری سے کہا۔ "میں تمہیں اپنا انٹرویو شائع کرانے کی رشوت نہیں دے رہی ہوں۔ اور پھر یہ لائٹر میرے لئے قیمتی ہے بھی نہیں۔"

"مجھے معلوم ہے۔ آپ کے لئے اس کی قیمت ماچس کی ڈبیا کے برابر بھی نہیں ہے۔" جلالی کے لہجے میں اب طنز بھی آ گیا تھا۔

"میرے خدا!" مسز چنائے نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ پرسوں شیخ علی نے مجھے نیا لائٹر دیا ہے۔ نیا لائٹر استعمال نہیں کروں گی تو شیخ علی اسے اپنی توہین سمجھیں گے۔ تم ان عرب شیخوں کی نفسیات کو نہیں سمجھتے۔ یہ لائٹر میرے لئے اب بیکار ہو گیا ہے۔ سمجھو تمہیں سڑک پر پڑا ہوا مل گیا ہے۔"

"میں سڑک پر پڑی ہوئی چیز بھی نہیں اٹھاتا۔" جلالی نے کہا لیکن پھر اپنے اعصاب ڈھیلے چھوڑ کر ہنس پڑا۔ اسے خود پر غصہ آ رہا تھا کہ وقت دیکھے بغیر ایک فضول بحث میں الجھ گیا تھا۔ لائٹر اس نے جیب میں رکھ لیا۔ مسز چنائے بھی مسکراتی ہوئی دوبارہ کھڑکی کی طرف مڑ گئی اور اپنی دل پسند بیل پر سگریٹ کے دھویں سے گلکاری کرنے لگی۔

"آپ کی کابینہ کا اجلاس کیسا جا رہا ہے؟" جلالی نے پوچھا۔ مسز چنائے تھوڑی دیر کچھ بولے بغیر اندھیرے میں گھورتی رہی۔

"کیا تمہیں یقین ہے جو کچھ ہونے والا ہے سچ مچ ہو جائے گا؟" اس نے پلٹ کر جلالی کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کیوں۔ کیا آپ کو کچھ شبہ ہے؟"

"نہیں۔ شبہ تو نہیں ہے۔ لیکن یقین بھی نہیں ہے۔ مجھے بوڑھے سہراب جی کا جملہ یاد آنے لگتا ہے۔ ہم شاید کوئی خواب دیکھ رہے ہیں۔"

"شاید آپ صحیح کہہ رہی ہوں۔ لیکن یہ خواب ہے بھی تو ایسا کہ جاگا نہ جا سکے۔" جلالی نے شاعری کی۔

"جاگنا تو پڑے گا۔ یہ خواب سچا نہ بھی ہوا تب بھی جاگنا پڑے گا۔ ایک خواب کی غلط تعبیر نے خوابوں کا سلسلہ توڑ دیا تو تمہاری قوم کے مقدر میں صرف اندھیرے لکھ جائیں گے۔" جلالی کو خوشی ہوئی کہ مسز چنائے نے تاریک پہلو پر نظر رکھی تھی۔ اسے امید تھی کہ ایمان علی بھی اسی طرح سوچتا ہو گا۔ امید کی شمع کسی نے تو تھام کر رکھنی تھی۔ لیکن ایک بار پھر اسے کیوں کا سوال یاد آ گیا۔ مسز چنائے نے اپنی نہیں، تمہاری قوم کہا تھا۔

"یہ لڑائی آپ کی نہیں تو آپ کیوں لڑ رہی ہیں؟"

"تمہیں کیسے معلوم یہ لڑائی میری نہیں ہے۔" مسز چنائے نے جلالی کو تیکھی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ نے خود بتایا تھا کہ آپ کا باپ پاکستانی ضرور تھا لیکن جب آپ چھوٹی سی تھیں چھوڑ کر لاپتہ ہو گیا تھا۔ آپ کی مٹی انگلستان سے اٹھی اور وہیں آپ بڑی ہوئیں۔ آج کل آپ بحرین کے ایک بڑے شیخ کی بیوی ہیں۔ پاکستان آپ کے ایجنڈے میں کیسے آ گیا۔" جلالی اچانک دو ٹوک سوال کرنے والا اخباری رپورٹر بن گیا۔ مسز چنائے نے کوئی جواب دیئے بغیر آخری کش لے کر سگریٹ کھڑکی سے باہر پھینک دیا اور دوسرا سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبا لیا۔ اس سے پہلے کہ جلالی اس کا دیا ہوا لائٹر جیب سے نکالتا مسز چنائے نئے لائٹر سے اپنا سگریٹ جلانے لگی۔ لائٹر کا شعلہ نکلتے ہی ہلکی سی خوشگوار موسیقی فضا میں بکھر گئی۔ جلالی کو اس نئے لائٹر کے

سامنے مسز چنائے کا دیا ہوا سنہری لائٹر واقعی ماچس کی ڈبیا لگنے لگا۔

مسز چنائے کی آنکھوں میں یونیورسٹی کا برسوں پرانا زمانہ سما گیا وہ خاموشی سے کھڑکی کے باہر اندھیروں میں گھور رہی تھی۔

"کیا ایمان علی کی وجہ سے.....؟" جلالی نے سوال آگے بڑھایا۔

"نہیں نہیں یہ بات نہیں ہے۔" مسز چنائے نے تیزی سے جواب دیا۔ "ایمان علی کو میری بیساکھی کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا جانتا ہے۔" مسز چنائے نے تھوڑی دیر رک کر دوبارہ بولنا شروع کیا تو نظریں کھڑکی سے باہر اندھیرے خلاؤں میں تک رہی تھیں۔

"آکسفورڈ میں ایمان اور میں نے بہت یادگار زمانہ ایک ساتھ گزارا ہے۔ پت جھڑ کی کئی پہریں، بہاروں کی رنگین شامیں، برفانی راتیں، ایک دور تھا جو میرے لئے آج بھی کل جیسا ہے۔ میں اور ایمان......"۔

"کیا آپ دونوں......؟" جلالی نے مسز چنائے کو بیچ میں ٹوک کر اپنا سوال جان بوجھ کر ادھورا چھوڑ دیا۔

"نہیں ہم عاشق معشوق نہیں تھے۔" مسز چنائے نے ہنستے ہوئے کہا۔ "میں اپنے ایک ہم جماعت کے عشق میں مبتلا تھی۔ ایمان اپنی شرمیلی طبیعت کے باوجود لڑکیوں میں بہت مقبول تھا۔ اس زمانے میں کسی لارڈ کی بیٹی اس کی دوست تھی۔ ہم چاروں ساتھ ملا کرتے۔ دوپہر کو کھانے پر، شام کو پب میں اور یخ بستہ راتوں میں ہوسٹل کے اس آرام دہ گرم کمرے میں جس میں ایمان رہا کرتا تھا۔ میں ایمان کے ساتھ پاکستان کی باتوں میں کھو جاتی۔ پاکستان کی باتیں مجھے میرے بچھڑے ہوئے باپ کی یاد دلاتی تھیں۔ مجھ سے گفتگو کرتے ہوئے ایمان کی کم گوئی بھی ختم ہو جاتی۔ ہمیں ایک دوسرے میں گم دیکھ کر ہم دونوں کے انگریز دوستوں نے ایک دوسرے میں دلچسپیاں تلاش کر لیں۔ مجھے ہوش اس وقت آیا جب وہ دونوں ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈالے ہمیں بائی بائی کر کے چلے گئے۔ ایمان علی نے تو اطمینان کی سانس لی تھی۔ میں ٹوٹ کر بکھر گئی۔ دل ٹوٹ گیا تو میں نے ڈگری مکمل کئے بغیر

یونیورسٹی چھوڑ دی اور گلف ایئر میں ایئر ہوسٹس بھرتی ہو کر بحرین چلی گئی۔"

مسز چنائے کی انگلیوں میں دبے ہوئے سگریٹ کی راکھ سانپ کی طرح بل کھاتی اور بڑھتی ہوئی دم توڑنے لگی۔ آنکھوں میں یونیورسٹی کا برسوں پرانا زمانہ سما گیا تھا۔ ایمان علی آکسفورڈ میں رفی کے ابتدائی زمانے کی دریافت تھا۔ وہ دن سہانے خواب کی طرح اسے آج بھی یاد تھے۔ خاص طور پر ایمان علی سے ملاقات کا پہلا دن۔ لندن کی ایک خزاں رسیدہ صبح وہ برفانی ہوا کے تھپیڑے کھاتی ہوئی آکسفورڈ یونیورسٹی میں بیلیل کالج کی طرف رواں دواں تھی جہاں اسے اپنے تاریخ کے ٹیوٹر سے ملنا تھا۔ اس نے بہت سے گرم کپڑوں اور بھورے رنگ کی گھٹنوں سے نیچے ڈھیلی اسکرٹ کے اوپر آکسفورڈ کا سیاہ گاؤن پہنا ہوا تھا جو ہوا کے زور سے بار بار غبارہ سا بن کر اڑنے لگتا اور اس کے ساتھ اس کی اسکرٹ بھی دائرہ بنا کر چھتری کی طرح اوپر اٹھ جاتی۔ وہ کندھوں پر کتابوں کا بھاری تھیلا اٹھائے' دونوں ہاتھوں سے اپنے گاؤن کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے تیز تیز چل رہی تھی۔ اسے کالج جانے کا راستہ چند روز میں ازبر ہو گیا تھا۔ سینٹ جائلز اسٹریٹ کے بعد شہیدوں کی یادگار سے گزر کر میکڈالن اسٹریٹ' پھر براڈ اسٹریٹ پر پتھریلی صلیب کے سامنے "بیلیل" کالج میں داخلے کا محراب نما دروازہ' جس کے اندر چوکور عمارت کے کونے پر سب سے اوپر کی منزل پر آخری کمرہ ڈاکٹر بیری کا تھا۔

ایمان علی کریم کلر کی گرم پتلون اور چمڑے کی جیکٹ پہنے جیبوں میں ہاتھ ڈالے اسے پتھریلی صلیب کے پاس کھڑا ہوا نظر آیا تھا۔ مسز چنائے نے جو اس وقت صرف رفی تھی اسے دو روز پہلے ڈاکٹر بیری کے کمرے سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ بھی شاید تاریخ کا طالب علم تھا لیکن یونیورسٹی میں نووارد نہیں لگتا تھا۔ اسے دیکھ کر رفی کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ اس کی قومیت کیا ہو گی۔ نقوش ترکی یا ایرانی تھے۔ رنگ یونانی اور قد افغانی تھا۔ رفی اس کے پاس سے گزری تو اسے ہیلو کہے بغیر نہ رہ سکی۔

"ہیلو!" ایمان نے کچھ چونکتے کچھ جھجکتے ہوئے اسے جواب دیا۔ "میں نے

تمہیں ڈاکٹر بیری کے کمرے میں دیکھا تھا۔ تم بھی شاید تاریخ پڑھ رہی ہو۔"

"قرون وسطیٰ کے دور کی تاریخ۔ میرا نام رفی ہے۔ میں نئی نئی یونیورسٹی میں آئی ہوں۔ یہ میرا پہلا ٹرم ہے۔" رفی نے تعارف کرایا۔

"وہ تو مجھے تمہارے گاؤن سے پتہ چل گیا۔ یہ تمہارا شاید دوسرا یا تیسرا روز ہے۔" ایمان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تیسرا۔ لیکن میرے گاؤن کو کیا ہوا۔ کیا میں نے غلط پہنا ہوا ہے۔" رفی نے اپنے گاؤن کو بدن پر کستے ہوئے اور مضبوطی سے تھام لیا۔ آکسفورڈ کا یہ گاؤن اس کے لئے تمغے کی طرح تھا۔ آکسفورڈ میں داخلہ آسان نہیں تھا۔ داخلہ ملا تھا تو اس کی ماں بھی خوشی سے ناچ اٹھی تھی۔

"میں جب نیا نیا آیا تھا تو میں بھی ہر وقت بڑے فخر سے اپنا گاؤن پہنے گھومتا تھا۔ لیکن اب اسی جگہ پہنتا ہوں جہاں پہننا ضروری ہوتا ہے۔" ایمان علی نے مسکراتے ہوئے بتایا۔ گاؤن پر رفی کی گرفت ایک دم کمزور ہو گئی۔ ہوا کے زور سے گاؤن اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر پہلے بادبان بنا اور پھر پھڑپھڑاتا ہوا اڑنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی اسکرٹ ایک بار پھر چھتری کی طرح اوپر اٹھ گئی۔ رفی گاؤن اور اسکرٹ سنبھالتی ہوئی گلنار ہو گئی۔ لیکن ایمان علی نے پلٹ کر اپنی نظریں پتھریلی صلیب پر جما دی تھیں۔ جیسے اس نے کچھ دیکھا ہی نہ ہو۔ رفی کا رنگ واپس آ گیا۔

"اس صلیب کی کہانی تو تمہیں ضرور معلوم ہو گی۔" ایمان علی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ رفی چپ رہی' وہ ابھی تک اپنے گاؤن اور اسکرٹ میں الجھی ہوئی تھی۔ ایمان انتظار کئے بغیر اس کی طرف سے خود ہی جواب دینے لگا۔

"چار سو سال پہلے کیتھولک ملکہ میری نے اس مقام پر دو روشن خیال پادریوں کو زندہ جلوا دیا تھا۔ شعلوں کی لپیٹ میں آئے ہوئے پادری نے اپنے ساتھی سے کہا تھا۔ "ماسٹر رڈلی! خوش ہو جاؤ' ہمارے جسموں نے اس مقام پر جو قندیل جلائی ہے وہ تاابد نہ بجھ سکے گی۔" دوسرے پادری نے جو کچھ کہا وہ تاریخ میں لکھا نہ جا سکا۔ کیونکہ بشپ رڈلی اس وقت تک پوری طرح شعلوں کی لپیٹ میں آ کر جل چکا تھا۔ میں

اس مقام سے جب بھی گزرتا ہوں یہ سوچنے کی کوشش کرتا ہوں کہ جلتے ہوئے پادری نے کیا جواب دیا ہو گا۔ شاید کچھ نہ کہا ہو اور خاموشی سے جل گیا ہو یا شاید مسکرا کر رہ گیا ہو۔" ایمان علی سوچوں میں کھو گیا تھا۔

"کیا تم بہت مذہبی ہو؟" رفی نے پوچھا۔ رفی نے مذہبی معاملات پر کبھی سنجیدگی سے غور نہیں کیا تھا۔ اس کا باپ مسلمان اور ماں عیسائی تھی۔ ماں شادی کرتے وقت مسلمان ہو تو گئی تھی لیکن برائے نام۔ شادی ختم ہوئی تو اپنا مسلمان ہونا بھی بھول گئی۔ رفی کو خود اپنے بارے میں یہ فیصلہ کرنے کا موقع نہیں مل سکا تھا کہ وہ مسلمان ہے یا عیسائی۔ اس نے کسی ایک عقیدے سے وابستہ ہونے کی ضرورت محسوس ہی نہیں کی تھی۔

"نہیں نہیں۔" ایمان علی نے ہنستے ہوئے کہا۔ "میں عیسائی نہیں ہوں۔ مسلمان ہوں۔ میرا نام ایمان علی ہے۔" رفی سوچنے لگی شکر ہے اس نے نام تو بتایا ورنہ اس کا خیال تھا اپنا تعارف کرائے بغیر ہی رخصت ہو جائے گا۔

"تم شاید کالج جا رہی تھیں۔ چلو مجھے بھی اسی طرف جانا ہے۔" کالج کا دروازہ چند قدموں کے فاصلے پر تھا۔ دروازے کی محراب سے گزرتے ہوئے ایمان علی پھر اسی صلیب کا قصہ دہرانے لگا۔

"میں اس واقعہ کو یاد کر کے صرف یہ سوچتا ہوں کہ یقین کی وہ منزل کب آتی ہو گی جب انسان موت کو حقیر جان کر ٹھوکروں میں رکھ لیتا ہو گا۔"

"یہ صدیوں پرانی اور بادشاہوں کے زمانے کی باتیں ہیں۔ آج تحریک چلانے والوں کو نہ کوئی جلا سکتا ہے نہ دار پر چڑھاتا ہے۔ سب کو اپنے عقیدوں کے پرچار کی پوری آزادی ہے۔" رفی نے کہا۔ وہ اس گفتگو سے بور ہونے لگی تھی۔ اسے تو ایمان علی کو جاننے کا اشتیاق تھا۔

"ہاں، لیکن صرف تمہاری دنیا کی حد تک۔ میری دنیا میں یہ صلیبیں جگہ جگہ گڑی ہیں۔"

"تمہاری دنیا کا نام کیا ہے؟"

"پاکستان!"

"سچ!" ایمان جو اپنے خیالوں میں ڈوبا ہوا تھا رفی کی خوشی سے بھری چیخ سن کر ایک دم چونک پڑا۔ رفی جوش میں اس کا بازو تھام کر کہہ رہی تھی:

"میں بھی پاکستانی ہوں۔ میرا باپ پاکستانی تھا۔ بہت پکا اور خالص پاکستانی۔ میرے اندر اسی کی روح ہے۔"

ایمان علی کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایک انگریز لڑکی سچ مچ پاکستانی بھی ہو سکتی ہے۔ یقین آیا تو اس کا چہرہ بھی کھل اٹھا۔ دونوں اندر کالج کی چوکور عمارت میں اس مقام تک پہنچ گئے تھے جہاں کالج کے داخلے کا چار سو سالہ پرانا دروازہ لٹکا ہوا تھا۔ جب پادریوں کو آگ میں جلایا گیا تھا تو آگ کے شعلے "بلیل کالج" کے دروازے تک پہنچ کر اپنے نشان چھوڑ گئے تھے۔ بعد میں اس دروازے کو یادگار کے طور پر اندر لے جا کر لٹکا دیا گیا تھا۔

"اس دروازے کو دیکھ رہی ہو۔" ایمان علی نے رکتے ہوئے کہا۔ "اس دروازے پر شعلوں نے جو نشان چھوڑے ہیں وہ کبھی کبھی مجھے اپنے بدن پر رقص کرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔" یہ کہہ کر اور پھر ملنے کا وعدہ کر کے ایمان علی چلا گیا۔ رفی تھوڑی دیر اسے جاتا دیکھتی رہی اور پھر وہ بھی ان سیڑھیوں کی طرف چل دی جن پر چڑھ کر اسے تاریخ کا سفر طے کرنا تھا۔

ایمان علی سے اس کی اگلی ملاقات کئی ہفتوں بعد ہوئی۔ اس وقت تک وہ پرانی ہو چکی تھی' اس کا گاؤن اتر گیا تھا اور ساتھ ہی اس کی زندگی میں ایڈورڈ اس طرح آن بسا تھا جیسے اب واپس نہیں جائے گا۔ ایمان اسے ونسنٹ کلب میں ملا تھا۔ وہ ایک لڑکی کے ساتھ تھا اور رفی کے ساتھ اس وقت بھی اس کا ایڈورڈ تھا۔ ایڈورڈ کو یقین نہیں آیا کہ رفی ایمان علی کو جانتی ہے۔ ایمان علی ایتھلیٹ کلب کی جان اور آکسفورڈ کا ہیرو تھا۔ کیمبرج یونیورسٹی جیسے روایتی دشمن کو کھیلوں کے مقابلے میں زیر کرنے میں ایمان علی کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ رفی نے خود دیکھا تھا۔ مقابلوں میں حصہ لیتے وقت لگتا جیسے زندگی کی بازی کھیل رہا ہو۔ پہلی ٹرم ختم ہونے کے بعد نواں "ناٹ

ویک'' کھیلوں اور مباحثوں کا زمانہ ہوتا تھا۔ رفی نے ایمان کو کبھی مباحثوں میں جاتے نہیں دیکھا تھا۔ لیکن کھیلوں میں شریک ہوتا تو ایسا لگتا جیسے محاذ پر جانے کی تیاری کر رہا ہو۔ مخالفوں کو دیکھتا تو آنکھوں میں دشمنی کی چنگاریاں ناچنے لگتیں۔ رفی کبھی کبھی سوچتی اس کی جیت میں ہنر سے زیادہ اپنا سب کچھ داؤ پر لگانے کے جذبے کو دخل تھا۔

گم صم اور محدود رہنے کی عادت نے ایمان کو پراسرار بنا دیا تھا۔ ایک ایسا مشرقی شہزادہ جو دشمنوں کے ڈر سے بھیس بدل کر جلا وطنی کے دن گزار رہا ہو۔ اس زمانے میں رفی بھی اس کے بارے میں ایسی ہی کہانیاں سوچتی تھی۔ وہ ایمان کے دوستوں کے چھوٹے سے حلقے کا لازمی حصہ بن گئی تھی۔ لیکن اس نے ایمان کو خود اپنے بارے میں باتیں کرتے ہوئے کبھی نہیں سنا۔ اپنے بارے میں باتیں کرنا ایمان کو پسند نہیں تھا۔ رفی سوچتی کہ اچھا ہوا ایمان سے دوستی سے پہلے وہ ایڈورڈ کے عشق میں مبتلا ہو گئی تھی۔ ورنہ ایمان کے سحر سے نہ بچ پاتی اور پھر ٹھکرائی جاتی تو برداشت نہ کر پاتی۔ ایڈورڈ سے عشق ناکام ہوا تو وہ بیچ ٹرم میں آکسفورڈ چھوڑ گئی تھی اور ایمان سے نہیں مل سکی تھی لیکن دو سال پہلے جب ایمان بحرین میں ملا تو بالکل نہیں لگا کہ ان کے درمیان اتنے برسوں کی دوری کا فاصلہ تھا۔ اب وہ اپنے آپ میں گم رہنے والا پراسرار شہزادہ نہیں رہا تھا۔ اب وہ بہت جوشیلے انداز میں باتیں کرتا تھا۔ اپنے بارے میں اس نے اب بھی کچھ نہیں کہا۔ بس دنیا کو بدلنے کی باتیں کرتا رہا۔ رفی کو لگا آکسفورڈ میں لٹکے ہوئے چار صدی پرانے دروازے پر جن شعلوں نے اپنے نشان چھوڑے تھے وہ شعلے ایمان علی کی آنکھوں میں رقص کرنے لگے ہیں۔

مسز چینائے نے نیا سگریٹ سلگانے کے لئے لائٹر جلایا تو اس کی موسیقی اسے حال میں واپس لے آئی۔ جیسے سکتے میں آیا ہوا مفعول چٹکی کی آواز سن کر سکتے سے باہر نکل آیا ہو۔ جلالی اسے خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔ اسے معلوم تھا وہ اس وقت اپنے آپ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ خیالوں کی رو میں بہتی ہوئی خود ہی سب کچھ بتائے گی۔ نیا سوال کر کے چونکانے کی کوشش کی تو دوبارہ اپنے خول میں واپس چلی جائے گی۔ اس کا

خیال غلط نہیں تھا۔
"اپنا گمشدہ باپ مجھے کوئی چالیس سال بعد آسٹریلیا میں ملا اور وہ بھی مرا ہوا۔" مسز چنائے بولتے ہوئے اب بھی خیالوں میں گم تھی۔ "وہ خود سے ایک تہائی عمر کی ایک غریب لڑکی کو شادی کر کے انڈیا سے آسٹریلیا لے گیا تھا۔ وہ بہت ظالم شخص تھا اور ظلم کرتے کرتے خود بھی اس ظلم کا شکار ہو کر مرگیا تھا۔ میں اس کی میت لینے گئی تو باپ کا رشتہ بھول گئی اور اپنی سوتیلی ماں کو بیٹی بنا کر رشتوں کی ایک نئی بستی آباد کر آئی۔ میرے لئے یہ عجیب اور نئی طرح کی دنیا تھی جس میں رہنے والے اپنے لئے نہیں دوسروں کے لئے جیتے تھے۔"

مسز چنائے تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو گئی، لیکن آنکھیں اسی طرح سوچوں میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ جلالی کمرے میں جا کر سائڈ بورڈ پر رکھی ہوئی گرم کیتلی سے کافی کے دو کپ بنا کر لے آیا۔ کافی کی پیالی جلالی سے لیتے ہوئے شکریہ ہونٹوں سے نہیں نکلا بس آنکھوں میں گونج کر رہ گیا۔ کافی کا گھونٹ لے کر بولی تو اس طرح جیسے خود اپنے آپ سے مخاطب ہو۔

"میں نے جسے اپنی بیٹی بنایا تھا اس نے مجھ سے کبھی کچھ نہیں مانگا۔ میں نے دینا چاہا تب بھی نہیں لیا۔اس کی ایک چھوٹی بہن حیدر آباد دکن میں اپنی ماں کے پاس رہتی تھی۔ اس کی اور اس کی ماں کی خواہش اسے ڈاکٹر بنانے کی تھی۔ میں ان کی خواہش پوری کرنے اسے اسکالر شپ کے بہانے لندن لے گئی۔ وہ میری اور میری ماں دونوں کی زندگیوں کا مرکز بن گئی۔ میری ماں نے اسے قانونی طور پر بھی اپنی بیٹی بنایا اور لندن کی بوتیک اس کے نام لکھنا چاہی۔ میں نے اپنی وصیت میں بہت کچھ دونوں بہنوں کے نام کرنا چاہا۔ لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ اس کی بہن ڈاکٹر بن گئی تو لندن کی خوبصورت زندگی چھوڑ کر حیدر آباد کی گندی بستیوں میں پلنے والی بیماریوں کا علاج کرنے واپس چلی گئی۔ کہتی تھی کہ وہ اپنے باپ کا قرض اتار رہی ہے جو علاج نہ ہونے سے جوانی ہی میں مر گیا تھا۔"

مسز چنائے نے کافی ختم کر کے خالی کپ وہیں منڈیر پر رکھ دیا اور سگریٹ نکال

کر منہ سے لگا لیا۔ لیکن اس بار جلانے کے لئے اس نے اپنا لائٹر استعمال نہیں کیا۔ ماحول پر جو ہلکی سی اداسی چھا گئی تھی' لائٹر کی موسیقی اس کا تاثر ختم کر دیتی۔ جلالی اس کا سگریٹ جلا کر خاموشی سے اسے دیکھنے لگا۔ وہ اس کہانی سے اپنے سوال کا تعلق جاننا چاہتا تھا۔

"مجھے اپنی ساری دولت بے مصرف اور زندگی بے مقصد نظر آنے لگی تھی۔ خلاؤں میں ہاتھ پاؤں مارنے والا ایک بیکار وجود۔ سب کچھ حاصل کر کے بھی کتنی غریب اور کتنی کھوکھلی تھی۔ کتنے امیر تھے وہ جو کوئی خواب اپنے سینے سے لگائے کسی نہ کسی منزل کی جستجو میں دوڑ رہے تھے۔ ایک عجیب سی بے اطمینانی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے دل و دماغ میں بہت سی تتلیاں پھڑپھڑا رہی ہوں اور اپنے ساتھ مجھے بھی اڑا لئے جانا چاہتی ہوں۔ چندے اور عطیئے مجھے دولت سے نیکی خریدنے کا کاروبار لگنے لگے۔ خیراتی اداروں کو پیسے دیتے رہنا اندھے کنویں کو پاٹنے کی کوشش تھا۔ ہزاروں خزانے مل کر بھی اس کنویں کا پیٹ نہیں بھر سکتے تھے۔ ایک وقت کی روٹی' کپڑوں کا ایک جوڑا' ایک رات کی چھت' ایک دن کی دوا۔ یہ کوئی علاج تو نہیں ہے۔ کتنے خالی پیٹ' کتنے ننگے تن' کھلے آسمان کے نیچے کتنے بیمار وجود---- قافلہ در قافلہ غربت کے کتنے کارواں زمانوں سے زمانوں کا سفر کر رہے ہیں اور جانے کب تک کرتے رہیں گے۔ قیام کی کوئی مستقل منزل ڈھونڈنی تھی۔ کسی طرح بھوک اگانے والے نظام کو بدلنا تھا۔"

جلالی دل ہی دل میں مسکرایا۔ اسے لگا اب مسز چینائے "انقلاب زندہ باد" کا نعرہ لگائے گی اور اپنے سرخ دوپٹے کو پرچم بنا کر خواہشات کا جلوس لئے باہر نکل پڑے گی۔ زندگی کا سب سے اچھا زمانہ جلالی نے بھی ایسی ہی تقریریں کرنے اور نعرے لگانے میں گزارا تھا۔ کیسے کیسے حسین خواب تھے اور کس بیدردی سے ٹوٹے تھے۔ لیکن جلالی نے سوچا اس میں اور مسز چینائے میں فرق تھا۔ وہ خواب دیکھنے والی کچی عمر کی انقلابی نہیں' ایک عملی عورت تھی۔ وہ تو خوابوں کو بھی سوچ سمجھ کر دیکھنے والی تھی۔ وہ کوئی کمزور عورت نہیں تھی۔ کچھ کر گزرنے کے لئے اس کے پاس دولت کی'

اپنی شخصیت کی، یقین کی اور ان سب کے ساتھ ساتھ ایمان علی کی طاقت تھی۔

"ایمان کو اپنے ملک کے حالات ٹھیک کرنے کا جنون ہو گیا تھا۔" مسز چینائے نے چھوٹا سا وقفہ لے کر پھر بولنا شروع کیا۔ "وہ دنیا بھر میں ایسے پاکستانیوں کا نیٹ ورک بنا رہا تھا جو مختلف پیشوں کے ماہر تھے اور ایمان ہی کی طرح پاکستان کے حالات پر کڑھتے تھے۔ ان سب نے مل کر پاکستان کو سدھارنے کے منصوبوں کو کاغذی شکل دینا شروع کر دی تھی۔ پاکستان میں خاموشی سے ایک سیاسی تحریک کا ڈھانچہ بھی بننے لگا تھا۔ اس نے مجھے بھی شامل ہونے کے لئے کہا تھا لیکن میرے لئے وہ ابھی تک کاؤ بوائے بوٹ پہننے والا وہی شرمیلا اور کھلنڈرا نوجوان تھا۔ یہ بدن پر شعلوں کا رقص دیکھنے کا کھیل نہیں تھا۔ مگر ایک سال میں میں نے اس میں بہت تبدیلیاں دیکھیں۔ جو شخص خود کو بدل سکتا ہے وہ بہت کچھ بدل سکتا ہے۔ وہ ایک نیا ایمان علی تھا۔ بالکل دیسی۔ بالکل پاکستانی۔"

"آپ کو یقین ہے کہ آپ کا بالکل دیسی، سچا اور مخلص پاکستانی کل بھی ایسا ہی رہے گا جیسا آج ہے؟" جلالی شاید اپنے شک کو دور کرنے کے لئے مسز چینائے کی تائید چاہتا تھا۔

"مجھے نہیں معلوم۔" مسز چینائے نے سوچتے ہوئے کہا۔ "لیکن کسی پر تو یقین کرنا ہو گا۔ شک کرتے رہنا صرف بے عملی کا بہانہ ہے۔ ایمان سے غلطیاں ہو سکتی ہیں لیکن وہ ابھی تازہ دم ہے، اس میں لڑنے کی قوت اور توانائی ہے، اس لئے تھک کر نہیں بیٹھے گا۔ ضدی ہے اس لئے ہار بھی نہیں مانے گا۔ یہ بھی نہیں لگتا کہ وہ اچانک قہر برسانے والا جاگیردار یا چوری کرنے والا صنعتکار بن جائے گا۔ اس میز کے گرد بیٹھے ہوئے لوگوں کو دیکھو۔ ہر شخص اپنی اپنی جگہ بھاری پتھر ہے۔ ایمان نے ان کے دلوں میں اپنے لئے ان تین دنوں میں اتنا احترام پیدا کر لیا ہے کہ وہ اسے اپنا وزیراعظم مان کر اس کے ساتھ چپکے ہوئے بیٹھے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ وزیراعظم نہ بنا تب بھی اس کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے۔"

"اور آپ؟" جلالی کو جواب معلوم تھا، پھر بھی خواہ مخواہ پوچھ بیٹھا۔

"تم سچ پوچھو تو مجھے ایمان علی کا وزیراعظم بننا پسند نہیں ہے۔ یہ اس کے لئے قبل از وقت ہے۔ اس کے پاؤں زمین سے اٹھ کر ایک دم آسمان پر چلے جائیں گے۔ اسے اپنے قدم کچھ دن اور زمین پر رکھنے تھے۔" جلالی کو لگا جیسے یہ فرد جرم خود اس پر عائد کی جا رہی ہو۔

"اس ملک کے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔ آپریشن آج ہونا ہے' زیادہ دیر کی گئی تو مریض بچے گا نہیں۔"

"شاید تم صحیح کہتے ہو۔" مسز چنائے نے کہا۔ اس کی سگریٹ ختم ہو گئی تھی۔ تھوڑی دیر وہ خاموش رہی پھر وہ واپس کانفرنس ٹیبل کی طرف چل دی جہاں بحث اپنے زور و شور سے جاری تھی۔ جلالی بھی اپنے کونے کی طرف بڑھ گیا۔ جو کام باقی رہ گیا تھا اسے کرتے ہوئے مسز چنائے کی باتیں اس کے ذہن میں گونج رہی تھیں۔ رپورٹوں کا جو خلاصہ اس نے اپنے لئے بنایا تھا وہ تیار ہو کر پرنٹر پر چھپنے لگا تھا۔ جلالی نے سوچا اب شاید کوئی انہونی ہی ایمان علی کو وزیراعظم بننے سے روک سکے۔ پھر بھی جانے کیوں مسز چنائے کی طرح اس کے ذہن میں شک جنم لینے لگا۔ شاید میراج طیاروں کی خریداری کا معاملہ رکاوٹ بن جائے۔ جلالی نے سوچا ایمان علی کو پانچ ارب روپے کے جہازوں کی خریداری کے معاہدے کو ختم کرنے پر اصرار نہیں کرنا چاہیے تھا۔ قریشی نے ایمان علی کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ جلالی نے جنرل منصف کو بھی پہلو بدلتے دیکھا تھا۔ جلالی جانتا تھا اس سودے میں کون کون ملوث تھا اور کون ملوث ہونے کے لئے کود سکتا تھا۔ ایک ارب روپے کے کمیشن کا معاملہ تھا۔ یہ رقم کم نہیں تھی۔ لیکن ایمان علی نے کہا تھا اسے سمجھوتے کر کے حکومت نہیں چاہیے۔ اسے حکومت چاہیے ہی نہیں تھی۔ وہ اقتدار کے لئے نہیں ملک کے حالات کو سدھارنے کے لئے حکومت لینے پر تیار ہوا تھا۔ اسے طیارے نہیں اسکول' کالج' اسپتال اور دواخانے درکار تھے۔

جلالی پرنٹر سے نکلے ہوئے صفحوں کو یکجا کر رہا تھا کہ فون کی گھنٹی کی تیز آواز سے چونک کر کھڑا ہو گیا۔ سب کو کب سے فون کی اس گھنٹی کا انتظار تھا۔ جلالی کاغذ

ہاتھوں میں لئے بے اختیار کانفرنس ٹیبل کی طرف بڑھ گیا۔ ایمان علی کے دائیں ہاتھ پر رکھی ہوئی تپائی پر سرخ رنگ کا فون بج رہا تھا۔ اس کا نمبر صرف جنرل منصف خان کے پاس تھا۔ جنرل منصف اس وقت شاید ایوان صدر میں تھا۔ فون وہیں سے آ سکتا تھا۔ کانفرنس ٹیبل کے گرد بیٹھے ہوئے سب لوگ خاموش ہو گئے۔ چہروں سے تناؤ ظاہر تھا۔ وائی اے سبحان، شمسہ جہانزیب اور مسز چنائے نے بڑے خودکار طریقے سے اپنے سگریٹ نکال کر جلا لئے تھے۔ ڈاکٹر حق اپنا پائپ سلگانے اور آغا شاہ رخ تھرماس کا ڈھکنا کھولنے لگا تھا۔ ڈاکٹر شفا سگریٹ نوشی کے خلاف اپنا لیکچر بھول کر ایمان علی کو دیکھ رہا تھا اور جنرل عالم گل سگریٹ کے دھوئیں کو نظرانداز کر کے گھنٹی بجاتے ہوئے فون پر نظریں گاڑے ہوئے تھا۔ سردار قاہر اپنی مونچھوں، جسٹس صدیق اپنی داڑھی اور اعجاز محمد خان اپنے سر کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگے تھے۔ ایمان علی نے کمر کرسی کی پشت سے ٹیک دی، فون اٹھا کر کانوں سے لگایا اور پیر اٹھا کر مسز چنائے کے سامنے میز پر رکھ دیئے۔

وزیر اعظم رضا سروہی

وحیدہ شمشاد نے بہت کینہ بھری نظروں سے رضا سروہی کے پیچھے کھڑی ہوئی رئیسہ بشیر کو دیکھا جو انگلیوں سے رضا کی کنپٹیوں پر مالش کے چاند بنا رہی تھی۔ "بے شرم کتیا!" وحیدہ نے دل ہی دل میں گالی دی۔ شادی شدہ ہو کر بھی کس ڈھٹائی سے اپنے تعلقات کے اشتہار بانٹ رہی تھی۔ لیکن اب کچھ چھپانے کا فائدہ بھی کیا تھا۔ کس کو نہیں معلوم تھا۔ یہ سال دو سال کی بات بھی نہیں تھی۔ وحیدہ کو یقین تھا کہ رضا کی بیوی نادیہ رئیسہ ہی کی وجہ سے اپنے شوہر کو عین رضا کے سیاسی عروج کے زمانے میں چھوڑ کر بھاگی تھی۔ وحیدہ کو آج بھی رضا سروہی کی بیس سال پرانی وہ پارٹی یاد تھی جو اس نے رئیسہ بشیر کی گلوکارہ بیٹی کا پہلا گانا ہٹ ہونے پر دی تھی۔ نادیہ اس وقت تک اسے چھوڑ کر لندن جا چکی تھی۔ رضا اس طرح مبارک باد وصول کر کے خوش ہو رہا تھا جیسے وہ رئیسہ بشیر کی نہیں اس کی اپنی بیٹی ہو۔ وحیدہ کو حیرت تھی کہ رئیسہ نے اپنے شوہر سے طلاق لے کر رضا سے شادی کیوں نہیں کی تھی۔ بیس برس سے زیادہ ہو گئے تھے اپنے شوہر اور رضا دونوں سے چمٹی ہوئی تھی۔ رضا کو بھی

شادی نہیں کرنے دی تھی۔ رضا نے پارٹی دی تھی تو کتنا اترائی تھی۔ لیکن اس زمانے میں وحیدہ کو کسی کے اترانے کی پرواہ نہیں تھی۔ اقتدار کی راہداریوں میں رئیسہ جیسی کتنی تتلیاں اپنے رنگین پروں کو پھڑپھڑاتی گھوما کرتی تھیں۔ رال ٹپکاتے مردوں کے علاوہ انہیں کون گھاس ڈالتا تھا۔ بیس برس پہلے کا وہ زمانہ وحیدہ کے عروج کا زمانہ تھا۔ اس وقت اس کا سوہنا منڈا اس کے ساتھ تھا۔ "حرام زادہ!" انیس شمشاد کی یاد آئی تو بے ساختہ گالی زبان پر آ گئی۔ اس وقت تک مرینہ شاہ انیس شمشاد کی زندگی میں نہیں آئی تھی۔ وزیراعظم کی بیوی کے بعد وحیدہ دوسرے نمبر کی وی آئی پی تھی۔ نمبر ایک بھی ہو جاتی اگر مرینہ شاہ درمیان میں نہ آ جاتی۔ "رنڈی کہیں کی!" ایک گالی مرینہ کے نام کی بھی زبان پر آ گئی۔

وحیدہ نے شمشاد کو وزیراعظم بنوانے کی کتنی کوشش کی تھی۔ نجومی نے بشارت دی تھی۔ پیر صاحب سے تعویذ بھی لے آئی تھی۔ بس ایبٹ آباد جا کر بابا جی کی چھڑیاں کھانا باقی تھیں۔ لیکن اسی دن شمشاد نے مرینہ شاہ کو مرینہ شمشاد بنا کر اپنے سیاسی مستقبل کو داؤ پر لگا دیا۔ بعد میں آصفہ کو بابا جی کا پتہ وحیدہ نے ہی بتایا تھا۔ کیسے مزے سے اس کا میاں ڈنڈے کھا کر آیا تھا اور وہ ابھی تک وزیراعظم بنا بیٹھا تھا۔ "کمینی احسان فراموش!" اس کی سوچوں نے آصفہ کے نام کی بھی ایک گالی گنگنا دی۔ وزیراعظم ہاؤس پہنچتے ہی بھول گئی تھی۔ شکریہ تک نہیں ادا کیا۔ کتنی بار فون کر کے پیغام چھوڑے لیکن پلٹ کر جواب تک نہ دیا۔ کل دھکے دے کر نکالی جائے گی تو دماغ زمین پر آ جائے گا۔

وحیدہ کی سوچیں ایک بار پھر اپنے سوہنے منڈے انیس شمشاد کی طرف مڑ گئیں۔ کتنے سالوں کی کوشش کے بعد وہ اسے مرینہ سے آزاد کرا کے دوبارہ جیت سکی تھی۔ جنرل سے رشتے داری نکال کر احسان فراموش کو مارشل لاء کے عتاب سے بھی بچا لیا تھا۔ وہ دوبارہ اس کے حصار میں واپس آ گیا تھا۔ ادھر ادھر منہ مارتا لیکن وحیدہ کو کب پرواہ تھی۔ اسے تو مرینہ شاہ پر بھی اعتراض نہیں تھا۔ جب پہلی بار مرینہ اس کی زندگی میں آئی تھی تو اس نے شمشاد کو سمجھایا تھا کہ شادی کر کے گلے کا ہار بنانے

کی کیا ضرورت ہے۔ ممتاز کھوسو نے بھی یہی بات سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ وحیدہ وہ رات کبھی نہیں بھول سکی تھی جب شمشاد سے لڑ کر وہ اپنا گھر چھوڑ کر ممتاز کے گھر رہنے چلی گئی تھی۔ غصے نے اس کا دماغ الٹ دیا تھا۔ ممتاز نے اسے اور اس کے پیچھے آنے والے شمشاد کو رات بھر سمجھایا تھا۔ لیکن شمشاد کے ہوش و حواس پر تو پٹھان زادی سوار تھی۔ بالکل دیوانہ ہو گیا تھا۔ "کبھی کبھی" کے گانے گا کر خود کو امیتابھ بچن سمجھنے لگا تھا۔ شاید مرینہ شاہ نے شادی کے بغیر تصرف میں آنے سے انکار کر دیا تھا۔ وحیدہ ان پاک زادیوں کے حربوں سے اچھی طرح واقف تھی۔

وحیدہ نے پھر بھی ہمت نہیں ہاری تھی اور شمشاد کو مرینہ سے چھڑا کر ہی دم لیا تھا۔ مرینہ شاہ نے بھی علیحدگی حاصل کر کے جلالی سے شادی کی اور اپنا گھر دوبارہ بسا لیا۔ وحیدہ کو اطمینان ہو گیا تھا کہ شمشاد کی زندگی میں مرینہ کا جو جھونکا آیا تھا وہ ہمیشہ کے لئے گزر گیا ہے۔ کتنا غلط تھا اس کا خیال۔ شمشاد کے دل میں مرینہ شاہ کی چنگاری بجھی نہیں تھی۔ اسے یقین تھا مرینہ بھی ایک صحافی اور وہ بھی جلالی جیسے ایماندار صحافی کے ساتھ مطمئن نہ رہ سکے گی۔ بیچارہ جلالی۔ لیکن کتنا اکھڑ اور بددماغ تھا۔ شمشاد نے اسے ایک بار پھر چھوڑا تو وحیدہ نے جلالی کو فون کیا تھا۔ سوچا تھا اسے بتائے گی کہ ہوشیار رہے۔ ایک معمولی سے صحافی کو کتنا بڑا اعزاز دے رہی تھی۔ لیکن کتنی رکھائی سے ملنے تک سے انکار کر دیا تھا۔ "کیا میں واقعی بوڑھی ہو گئی ہوں۔" وحیدہ نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سوچا۔ ابھی دو مہینے پہلے ہی لندن سے چہرہ ٹھیک کروا کر آئی تھی۔ چہرے پر ایک شکن بھی باقی نہیں رہی تھی۔ لیکن گردن کی جھریاں چغلی کھا رہی تھیں۔ ایک دعوت میں گردن کو چھپانے والا "ہائی نیک" بلاؤز پہن کر گئی تھی۔ کتنا اسکینڈل بنا تھا۔ سب کو حیرت تھی کہ کھلے گلے سے اپنے سینے کی نمائش کرنے والی اچانک آؤٹ آف فیشن کیوں ہو گئی تھی۔ مسز علی نے چوتھی ڈرنک کے بعد نشے میں آ کر کہہ بھی دیا تھا:

"کس کے بوسوں کے داغ چھپا رہی ہو جانی!"

اگر شمشاد اسے چھوڑ کر نہ گیا ہوتا تو وہ دیکھتی کہ کس حرام زادی کو اس طرح

منہ پر بکواس کرنے کی ہمت ہوتی۔ قلعے کی فصیل ہی ٹوٹ گئی ہو تو حملہ کرنے والوں کو کون روک سکتا ہے۔ وحیدہ نے گہری سانس لے کر ایک بار پھر رئیسہ بشیر کو دیکھا۔ عمر میں اس سے دو تین برس زیادہ ہو گی' لیکن گردن کی کھال اتنی ہموار تھی جیسے ابھی ابھی استری کرا کر آئی ہو۔ وحیدہ کو یقین تھا وہ بیٹے کی گریجویشن کے بہانے امریکہ جا کر چہرے اور گردن کی کھال کھنچوا کر آئی تھی۔ وحیدہ سوچنے لگی وہ رئیسہ سے کس طرح اس کے امریکی بیوٹیشن کا پتہ حاصل کرے۔ وحیدہ کو معلوم تھا رئیسہ آسانی سے نہیں بتائے گی۔ "نہ بتائے!" وحیدہ نے سوچا۔ کل جب وہ وزیر بنے گی تو خود پتہ کرا لے گی۔ امریکہ میں پاکستانی سفارتخانہ کس دن کام آئے گا۔ "مفت کی روٹیاں توڑتے ہیں حرام خور۔"

وزیر بننے کا خیال آتے ہی وحیدہ کے چہرے پر بے ساختہ مسکراہٹ کھل اٹھی۔ رضا سروہی کے پاس جو سرمایہ کاری کی تھی وہ کام آئی تھی۔ اس نے ممتاز کھوسو کی بات پہلے مان لی ہوتی تو اب تک کئی بار وزیر بن چکی ہوتی۔ انیس شمشاد جب پہلی بار اسے چھوڑ کر گیا تھا تو ممتاز نے وحیدہ کو سمجھایا تھا کہ کسی اور کے بجائے خود اپنے لئے کام کرے۔ لیکن جب موقع آیا تو وہ اپنے بجائے شمشاد کے لئے جنرل کے پاس دوڑی گئی۔ کوشش کرتی تو اس وقت خود مجلس شوریٰ میں شامل ہو سکتی تھی۔ غیر جماعتی حکومت میں وزیر ہو سکتی تھی۔ جنرل نے اشارے بھی دیئے تھے۔ سر پر ایک دوپٹہ ہی تو اوڑھنا تھا۔ اچھا تھا گردن بھی چھپ جاتی۔ لیکن اس کے سر پر اس وقت سوہنے منڈے کو واپس جیتنے کا بھوت سوار تھا۔ اس کے بعد ایک بار پھر موقع ملا تو اس نے اپنے بھانجے کو آگے بڑھا دیا۔ "دوغلا کہیں کا' بے غیرت!" وحیدہ کی زبان پر ایک بار پھر گالی آ گئی۔ وزیر بنتے ہی آصفہ کے پیچھے کتے کی طرح دم ہلاتا ہوا گھومنے لگا تھا۔ اسے بھول گیا جس نے اسے آگے بڑھا کر وہاں تک پہنچایا تھا۔ اس کے بعد ہی وحیدہ نے طے کر لیا تھا کہ اب موقع آیا تو صرف اپنے لئے کام کرے گی۔

اور وہ موقع جلد ہی آ گیا تھا۔ وحیدہ کو رضا سروہی سے بھی پہلے معلوم ہو گیا تھا کہ رضا کی لاٹری نکلنے والی ہے۔ کسی اہم فوجی جنرل کی بیوی نیویارک سے غلط سائز

کے کپڑے اور غلط رنگ کی لپ اسٹک خرید لائی تھی۔ اب انہیں بدلنے سی۔۱۳۰ لے کر دوبارہ نیویارک جا رہی تھی۔ شاید کوئی ساتھی نہیں مل رہا تھا اس لئے وحیدہ کو ساتھ چلنے کی دعوت دی تھی۔ وحیدہ اس سے چند بار دعوتوں میں ملی تھی۔ "نک چڑھی چڑیل!" گہرے میک اپ اور ماتھے پر موٹے موٹے بل والا سراپا نظروں میں آتے ہی وحیدہ کی سوچیں بڑبڑائیں۔ سخت بور کمپنی تھی۔ اچھا زمانہ ہوتا تو وحیدہ کبھی نہیں جاتی۔ نیویارک جانے کے لئے اسے کسی سہارے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ لیکن وقت بدل گیا تھا۔ اب تو نیویارک گئے ہوئے ایک زمانہ ہو گیا تھا۔ وہ دعوت ملتے ہی تیار ہو گئی۔ اکیلے جہاز میں سفر کرنے کا مزا ہی کچھ اور تھا۔ اس کے ٹائلٹ پیپرز کا اسٹاک بھی ختم ہو چکا تھا۔ چھ مہینے پہلے نیویارک گئی تھی تو ایک سوٹ کیس بھر کر لائی تھی۔ آخر کتنا ساتھ دیتے۔ کلفٹن کی سپر مارکیٹ سے جو ٹائلٹ رول خریدا تھا وہ کھردرا تھا۔ اس کی نازک کھال چھل کر رہ گئی تھی۔ صوفے پر پہلو بدل کر اس نے سسکاری لی۔ چھلی ہوئی کھال سچ مچ تکلیف دے رہی تھی۔ اسٹاک پھر ختم ہو رہا تھا۔ وزیر بن جائے تو پھر سفارت خانے کے ذریعے ڈبل پلائی والے روئی جیسے نرم ٹائلٹ پیپرز کی مستقل فراہمی کا بندوبست کرے گی۔

نیویارک تک کی پرواز میں راستے بھر لپ اسٹک اور ناخنوں کی پالش کے رنگوں پر دماغ چاٹتے چاٹتے نک چڑھی خانم نے اپنے باخبر ہونے کا ثبوت دینے کے لئے بتایا تھا کہ تبدیلی آنے والی ہے اور اس دفعہ سہرا رضا سروہی کے سر بندھے گا۔ اس نے وحیدہ کو تاکید کر دی تھی کہ کسی کو نہ بتائے۔ وحیدہ کو اس کی دی ہوئی خبر پر یقین آ گیا تھا۔ اسے بہت پہلے شمشاد نے بتایا تھا کہ خفیہ ادارے کی پسندیدہ لوگوں کی فہرست میں رضا سروہی کا نام سب سے پہلا ہے۔ وحیدہ کو کسی کی تاکید کی پرواہ نہیں تھی۔ لیکن اس خبر کا ابھی عام ہونا خود وحیدہ کے حق میں ٹھیک نہیں تھا۔ خبر بازار میں آ گئی تو رضا سروہی کا بھاؤ ایک دم بڑھ جائے گا۔ وحیدہ نے موقع ملتے ہی رضا سروہی کے قریب ہونے کی کوشش شروع کر دی تھی۔ اس کی قسمت اچھی تھی۔ رئیسہ بشیر اس زمانے میں تین مہینے کے لئے اپنی بیٹی کے پاس لندن گئی ہوئی تھی۔ وحیدہ کو لگا

اسے دیکھ کر رضا کے بازو پھڑپھڑانے لگے ہیں۔ تنہائی کا شکار تھا اس لئے یا شاید پرانی چوٹ یاد آگئی تھی۔ وحیدہ کو یاد تھا کہ ایسے ہی ایک زمانے میں جب رئیسہ ملک سے باہر گئی ہوئی تھی اور وحیدہ شمشاد سے نئی نئی الگ ہوئی تھی رضا اسے معنی خیز نظروں سے دیکھنے لگا تھا۔ ایک دفعہ تو اپنے پیر کو لے کر آیا تھا۔ کہتا تھا پیر اشرف کا چلہ کبھی رائیگاں نہیں جاتا۔ کیا کمال کا پیر تھا۔ قمیض شلوار کی جگہ سوٹ پہنے ہوئے ہوتا تو کوئی ڈپلومیٹ لگتا۔ داڑھی مونچھوں سے بے نیاز چہرہ۔ مجلسی آداب سے واقف۔ شائستہ گفتگو کرنے والا بے حد مہذب۔ وہ حکومت کے خرچ پر ہالی ڈے ان کے سب سے مہنگے سوئٹ میں ٹھہرا ہوا ایک مہینے سے رضا سروہی کو وزیر سے وزیراعظم بنانے کا چلہ کھینچ رہا تھا۔ رضا نے پیش کش کی تھی اس کا چلہ ختم ہوتے ہی پیر اشرف شمشاد کو واپس وحیدہ کے قدموں میں لا پھینکنے والا چلہ کھینچنے کے لئے تیار ہے۔ لیکن وحیدہ تعویذ کے نہیں اپنے زور پر شمشاد کو واپس جیتنا چاہتی تھی۔ اسے رضا سروہی کی اچانک بڑھتی ہوئی مہربانیوں کی وجہ معلوم تھی۔ لیکن کہاں چمکیلے بالوں، نیلی آنکھوں اور گلابی رنگت والا یونانی دیوتاؤں جیسا انیس شمشاد اور کہاں موٹا پلپلا اونگھتا ہوا کاہل رضا سروہی۔

وقت بدلا تو پسند کے معیار اور پیمانے بھی بدل گئے۔ رضا سروہی کے ساتھ تین مہینے برے نہیں گزرے تھے۔ وہ اتنا مجہول بھی نہیں تھا جتنا نظر آتا تھا۔ عمر نے صرف سر کے بالوں کو سفید کیا تھا۔ رضا کو بھی وحیدہ کا ساتھ پسند آیا تھا۔ وحیدہ مستقبل کی خاتون اول بننے کے خواب دیکھنے لگی تھی۔ لیکن رئیسہ بشیر کے واپس آتے ہی اس کے خواب ٹوٹ گئے۔ وحیدہ نے آنکھیں اٹھا کر ایک بار پھر رئیسہ کو دیکھا جس کی انگلیاں ابھی تک رضا کی کنپٹیوں پر آہستہ آہستہ گردش کر رہی تھیں۔ وہ سوچنے لگی رئیسہ کے پاس وہ کون سا جادو ہے جو اس کے پاس نہیں ہے۔ ان تین مہینوں میں اس نے سارے جادو آزما لئے تھے لیکن رئیسہ کے آتے ہی رضا ایسا بن گیا تھا جیسے وحیدہ سے کبھی کوئی تعلق ہی نہیں تھا۔ رضا نے ان تین مہینوں میں بھی مکمل احتیاط برتی تھی۔ اندھیرے میں آؤ اور اندھیرے میں نکل جاؤ۔ جیسے وہ کوئی

چوری کر رہی تھی۔ کمرے میں رہو تو بند ہو کر، نہ تازہ ہوا کا کوئی جھونکا اندر آ سکے نہ ہانپتی ہوئی سانسیں باہر نکلنے کا رستہ ڈھونڈ سکیں۔ مڈل کلاس گھرانوں کی سترہ سالہ کنواریوں والی احتیاط وحیدہ کے لئے چڑ بن گئی تھی۔ شروع شروع میں اسے رضا کا واٹر بیڈ بھی بہت بے ڈھب لگا تھا۔ لیکن پھر آہستہ آہستہ عادت ہو گئی تھی۔ عجیب بستر تھا جو ہر کروٹ اور ہر جنبش کی چغلی کھاتا تھا۔ چمڑے کے بستر میں بند پانی ادھر سے ادھر ہو کر غڑ غڑ کی ایسی آوازیں نکالتا جیسے سمندر کی موجیں ڈکار لے رہی ہوں۔ وہ پانی کی تہہ میں بیٹھی ہوئی مچھلی کی طرح ساکت ہو کر ہر جذبے سے عاری ہو جاتی۔ راتوں کو وہیل مچھلیوں کے خواب آنے لگے تھے۔ رضا کو اپنے پانی کے بستر پر بڑا فخر تھا۔ جس زمانے میں وہ مواصلات کا وزیر تھا حکومت کی شپنگ کمپنی کا ایک جہاز یہ بستر اس کے لئے خاص طور پر اٹلی سے لے کر آیا تھا۔ یونان کی کسی جہاز راں کمپنی نے تحفے کے طور پر بھجوایا تھا۔

وحیدہ کو ایک دن پہلی بار پانی کے بستر پر صحیح مزا آیا تھا۔ چادریں اور تکئے اٹھا کر قالین پر پھینک دیئے تھے اور دیر تک اچھل کود کر کے خوش ہوتی رہی تھی۔ اس طرح جیسے تیراکی کے چھوٹے سے تالاب میں بچے پانی کو چھپ چھپ کرنے کا کھیل کھیل رہے ہوں۔ کالے رنگ کے چمڑے کے بستر پر اس کا موتیوں جیسا سفید بدن کھل اٹھا تھا۔ بے ترتیبی سے پھیلے ہوئے سرخ بال ایسے لگ رہے تھے جیسے رات کے اندھیروں میں آگ کے شعلے لپک رہے ہوں۔ لیکن رضا سرہانے بستر کے قریب رکھی ہوئی جھولنے والی کرسی پر ساکت بیٹھا سگار نوشی کے مزے لے رہا تھا۔ اس نے شور مچاتے ہوئے بستر اور خوش ہوتی ہوئی وحیدہ کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا تک نہیں تھا۔ چہرہ سگار کے گہرے دھوئیں کی زد میں تھا پھر بھی چوڑی پیشانی پر پڑے ہوئے موٹے موٹے بل صاف دکھائی دے رہے تھے۔ نظریں کھڑکی پر تنے ہوئے بڑے بڑے پھولوں والے پردے پر گڑی تھیں۔ وحیدہ تھکی نہیں تھی لیکن رضا کی عدم توجہی کی وجہ سے اپنا اچھلنا کودنا مضحکہ خیز لگنے لگا تھا۔ رضا محفل میں بہت برد باری دکھاتا تھا۔ لیکن اکیلے میں کی جانے والی بچکانہ حرکتیں اسے پسند تھیں۔ وحیدہ کو بھی لگتا جیسے عمر واپسی

کا سفر کر کے تیس سال پہلے کے کسی مقام پر رک گئی ہو۔ لیکن اس وقت وہ گم تھا۔
وحیدہ بستر سے اتر کر رضا کے قدموں کے پاس آ کر بیٹھ گئی تھی۔ رضا کے گھٹنوں پر سر رکھ کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔ سفید قالین بہت نرم اور دبیز تھا لیکن اس پر بچھی ہوئی چھوٹی سی ہاتھ کی بنی ہوئی رنگین دری چبھ رہی تھی۔ وحیدہ نے چبھن بھول کر رضا کے زانوؤں پر اپنے ہاتھ پھیلا دیئے تھے۔ رضا نے اچانک ہی جھولنے والی کرسی پر ہلنا شروع کر دیا، گھٹنوں کی جنبش نے وحیدہ کے کان رگڑ دیئے اور وہ جھنجھلا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسے آج کیا ہو گیا تھا۔ کیوں اتنا بے چین تھا!

"رئیسہ کل واپس آ رہی ہے۔" رضا نے سوالیہ نظروں سے دیکھتی ہوئی وحیدہ کی طرف نظریں کرتے ہوئے کہا۔

"تو پھر-----؟"

"آج کے بعد ہم اس طرح نہیں مل سکیں گے۔"

"اتنا ڈرتے ہو اس سے۔"

"ڈرتا نہیں ہوں۔ مجھے اس کی عادت ہو گئی ہے۔ میرا اس کا بہت پرانا ساتھ ہے، میں اسے دکھ نہیں دے سکتا۔"

"اور مجھے؟ میرا کیا ہو گا؟"

چند مہینوں بعد وہ کچھ عرصے کے لئے امریکہ جائے گی۔ اس وقت یہ بستر پھر تمہارا ہو گا۔ ہم پھر اچھلنے کودنے اور تیرنے والے کھیل کھیلیں گے۔" رضا کے چہرے پر بہت دیر بعد ہلکی سی مسکراہٹ ابھری تھی۔ لیکن وحیدہ غصے سے سرخ ہو گئی تھی۔

"میں تمہاری گاڑی کا فالتو ٹائر نہیں ہوں۔ جب چاہا بدل لیا۔ جب چاہا پنکچر کی دکان پر دے آئے۔ رئیسہ کی میرے سامنے حثیت کیا ہے۔ دو ٹکے کی چھنال۔" وحیدہ غصے سے بری طرح کھول رہی تھی۔ رضا کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔ غصہ روکنے کی کوشش میں سگار کا گہرا کش لے کر کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ کھڑکی کے پاس جا کر پردے کا ایک کونا اٹھا کر باہر دیکھنے لگا لیکن پھر فوراً ہی پردہ دوبارہ برابر کر دیا۔ شاید باہر کوئی نوکر گزر رہا تھا۔

''نوکر ابھی سوئے نہیں ہیں۔'' رضا نے واپس وحیدہ کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔ ''تھوڑی دیر بعد میں خود تمہیں گھر چھوڑ آؤں گا۔'' رضا کا سگار راکھ ہو چکا تھا۔ اسے ایش ٹرے میں ڈال کر دوبارہ جھولنے والی کرسی پر بیٹھ گیا اور المونیم کے ٹیوب سے نیا سگار نکال کر آہستہ آہستہ اس کا پلاسٹک اتارنے لگا تھا۔ سگار کاٹنے والے خصوصی کٹر سے جلنے والے سرے کو بڑی نفاست سے کاٹ کر اس نے ماچس کی تیلی سے سگار کے دوسرے حصے میں چھید کر کے تیلی کو پھریری کی طرح گھمانا شروع کیا تو وحیدہ کو عجیب سا لگا۔ غصے کی جگہ اس کے اندر سنسنی دوڑ گئی تھی۔ لیکن رضا وحیدہ کی طرف دیکھے بغیر بہت انہماک سے اپنا سگار تیار کرنے میں مصروف تھا۔ سگار جلا کر دھوئیں کا گہرا غبار چھوڑتے ہوئے اس نے وحیدہ کو دیکھا تو وحیدہ کے سارے جذبے برف ہو گئے۔ دماغ بھی ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ رئیسہ کے موضوع پر خون جلانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ یہ لڑائی وہ نہیں جیت سکے گی۔ اس نے صاف صاف بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

''تم حلف کب اٹھا رہے ہو؟'' وحیدہ نے کرسی میں دھنستے ہوئے پوچھا۔

''کیا؟'' رضا کا چہرہ حیرت سے کھلا رہ گیا تھا۔ ''تمہیں کیسے معلوم؟''

''میں رئیسہ نہیں ہوں جس کی کہانی تم سے شروع ہو کر تم پر ہی ختم ہو جاتی ہے۔ تم جانتے ہو میری پہنچ کہاں تک ہے۔ مجھے اس وقت سے معلوم ہے جب شاید تمہیں بھی معلوم نہیں تھا۔''

''سی ۔ ۱۳۰؟'' رضا نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا لیکن وحیدہ نے جواب نہیں دیا۔ خاموش بیٹھی رہی تھی۔

''چلو پھر خوش ہو جاؤ' تمہارا سائیں وزیراعظم بنا تو تمہارے کھیت بھی ہرے بھرے ہو جائیں گے۔'' رضا نے تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد کرسی پر جھولتے ہوئے کہا۔

''ہاں' تمہارے وزیراعظم اور اپنے وزیر بننے پر میں واقعی بہت خوش ہوں۔''

''کیا؟'' رضا جھولتی ہوئی کرسی پر ساکت ہو کر سیدھا بیٹھ گیا۔ ''تمہیں کون

وزیر بنا رہا ہے؟ کس نے تم سے وعدہ کیا ہے؟"
"تم بناؤ گے اور تمہیں وعدہ بھی کرو گے۔"
"تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ تم کیسے وزیر بن سکتی ہو۔"
"کیوں، کیا کمی ہے مجھ میں۔ وزیراعظم کی بیوی آصفہ وزیر بن سکتی ہے تو میں کیوں نہیں بن سکتی؟ اسے اردو آتی ہے نہ سندھی۔ انگریزی بھی کوکنی لہجے میں بولتی ہے۔ میں روانی سے پنجابی بولتی ہوں۔ شمشاد نے کام چلانے والی سندھی بھی سکھا دی تھی۔ میرے انگریزی لہجے کی تعریف برطانیہ کا قونصل جنرل کر رہا تھا۔ آصفہ کی طرح دیہاتی رنگ کے کپڑے بھی نہیں پہنتی۔"
"زبان دانی کا مقابلہ یا فیشن پریڈ نہیں ہو رہی۔ یہ سیاسی معاملے ہیں تم نہیں سمجھو گی۔" رضا نے اس طرح ہاتھ ہلا کر کہا جیسے مکھی اڑا رہا ہو۔
"مجھ سے زیادہ کون سمجھے گا۔ سیاست تیس سال سے میری دہلیز چوم رہی ہے۔ تم بھول گئے جب میرے گھر آ کر شمشاد کے ساتھ گھنٹوں سیاسی گتھیاں سلجھاتے تھے۔ مجھ سے بھی رائے مانگتے تھے۔"
"وہ اور بات تھی۔ وہ کچھ اور زمانہ تھا۔" رضا نے کہا لیکن وحیدہ نے جیسے سنا ہی نہیں تھا۔
"تمہاری کابینہ ایک عورت کو لئے بغیر مکمل نہیں ہو گی۔ کس کو لو گے۔ زاہدہ کو جو سفارت چھن جانے پر چوٹ کھائے ہوئے بچھو کی طرح بیٹھی ہے۔ تم سے بہت پینگیں بڑھا رہی ہے۔ ایک نمبر کی سازشی ہے۔ ایسا ڈنک مارے گی کہ پتہ بھی نہیں چلے گا۔ وہ اپنے میاں کو وزیراعظم بنوانے کے خواب دیکھ رہی ہے۔"
"مجھے سیاست مت پڑھاؤ۔ میں سب سمجھتا ہوں۔"
"تم کچھ نہیں سمجھتے۔" وحیدہ نے پھر ان سنی کرتے ہوئے کہا۔ "تم ڈالی ڈالی کودنے والی اس بندریا کو وزیر بنا دو گے جو افسر خان کی چھت سے کود کر ناصر بھٹی کے چھجے پر ٹنگی ہوئی تھی اور اب ریاض توصیف کے زینے سے اتر کر تمہارے گھر میں آ کودی ہے۔ وقت آیا تو بے پیندے کی لٹیا تمہیں بھی چھوڑ کر چلی جائے گی۔ مجھے

معلوم ہے اسے تمہارے پاس رئیسہ لے کر آئی تھی۔"
"رئیسہ کو بیچ میں مت لاؤ۔ اس کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ سیاست میں ٹانگ نہیں اڑاتی۔ اپنے کام سے کام رکھتی ہے۔ لیکن میں نے تمہیں وزیر بنا دیا تو شک میں مبتلا ہو جائے گی۔" وحیدہ نے سوچا بلی تھیلے سے باہر آ گئی تھی۔ رضا کو کسی اور کی پرواہ نہیں تھی۔ رئیسہ کا ڈر تھا۔
"وہ کچھ نہیں سمجھے گی۔ اس میں اتنی سمجھ نہیں ہے۔ پوچھے تو کہہ دینا میرا نام ہیڈ کوارٹر سے آیا تھا۔ وہ میرے اس تعلق کو جانتی ہے۔"
"ٹھیک ہے ٹھیک ہے، وقت آیا تو دیکھیں گے۔" رضا نے ذرا بیزاری سے کہا اور سگار کا کش لے کر دھواں اڑانے لگا۔
"دیکھو گے نہیں دیکھنا پڑے گا۔" وحیدہ کو معلوم تھا آج کے بعد موقع نہیں ملے گا۔ اسے آج وعدہ لے کر جانا تھا۔ "تم نہیں دیکھو گے تو پھر میں تمہیں دیکھوں گی۔ ہر دعوت میں تمہارے واٹر بیڈ کے قصے چٹخارے لے لے کر سناؤں گی۔ میں شوہر کی چھوڑی ہوئی اکیلی عورت ہوں۔ مجھے کوئی شرم نہیں ہے۔ لیکن تم مذاق بن جاؤ گے۔" رضا غصے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ سگار کی راکھ جھڑ کر بے داغ سفید قالین پر گر گئی تھی لیکن اسے پرواہ نہیں تھی۔
"تم مجھے دھمکی دے رہی ہو۔ رضا سروہی کو جو اپنے ہاتھوں سے مزارعوں کی کھال ادھیڑ دیتا ہے۔ تم نے مجھے بھی کیا انیس شمشاد سمجھ رکھا ہے۔ جاؤ اور اسی وقت چلی جاؤ۔ میں نے تم سے کہا ہے کہ وقت آئے گا تو دیکھوں گا۔ اور بس۔ اس سے زیادہ میرے منہ میں زبان ڈالنے کی کوشش مت کرو۔" وحیدہ کو معلوم تھا اس نے صحیح جگہ چوٹ لگائی ہے۔ رضا سروہی اب بھولے گا نہیں۔
"مجھے چھوڑنے نہیں جاؤ گے۔" اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔
"نہیں۔ تم نے میرا موڈ خراب کر دیا ہے۔ جاؤ گیٹ پر چوکیدار کے پاس ڈرائیور بیٹھا ہے وہ تمہیں چھوڑ آئے گا۔"
"نوکر دیکھیں گے تو کیا کہیں گے۔ تم بدنام ہو جاؤ گے۔" وحیدہ اٹھلائی۔

"مجھے پرواہ نہیں ہے۔ وہ میرے نوکر ہیں۔ کسی نے منہ کھولا تو زبان کھینچ لوں گا۔ تم بھی اپنی زبان کو لگام دے کر رکھنا۔ جاؤ بس چلی جاؤ۔ گیٹ آؤٹ۔" رضا مڑ کر کمرے سے منسلک باتھ روم کی طرف چلا گیا۔ پلٹ کر دیکھا بھی نہیں کہ وحیدہ کھڑی ہے یا چلی گئی۔

وحیدہ کا خیال غلط نہیں تھا۔ رضا کو یاد رہا تھا۔ کل رات اسے رضا نے فون کیا تھا کہ آ جاؤ وقت آ گیا ہے۔ صبح کی پہلی پرواز سے اسلام آباد آ کر اس نے رضا سروہی کے گھر ڈیرا ڈال دیا تھا۔ حلف اٹھاتے ہوئے جو لباس پہننا تھا وہ ساتھ لے کر آئی تھی۔ تنویر نے اس کے لئے خاص طور پر ڈیزائن تیار کیا تھا۔ نہ بہت جدید نہ دقیانوسی۔ نہ بہت شوخ اور نہ بھڑکیلا' نہ بالکل سادہ اور صوفیانہ۔ نہ بالکل کھلا ہوا' نہ پوری طرح بند۔ سر پر آئے ہوئے دوپٹے نے چہرے پر پاکیزگی پھیلا دی تھی' ساتھ ہی گردن بھی ڈھک دی تھی۔ ایوان صدر سے کسی وقت بھی فون آ سکتا تھا اس لئے تیار ہو کر بیٹھی تھی۔ رئیسہ جل کر بولی تھی "پی آئی اے کی ایئر ہوسٹس لگ رہی ہو۔" وحیدہ تلملا کر رہ گئی تھی۔ گنوار کہیں کی۔ اس کی سوچوں نے تنک کر کہا تھا۔ موقع کی مناسبت سے لباس پہننے کا فن رئیسہ کیا جانے۔ کل ٹیلی ویژن پر حلف اٹھاتے ہوئے پورا پاکستان اسے دیکھے گا۔ جو وہ پہنے گی پاکستان میں اب وہی فیشن بنے گا۔ اب وہ کسی سابق وزیر کی چھوڑی ہوئی بیوی نہیں خود وزیر بننے والی تھی۔ پیٹرولیم اور معدنی وسائل کی وزیر۔ وہ یہ سوچ کر مسکرانے لگی کہ وزیر ہو کر کس کس کا تیل نکالے گی۔

رئیسہ رضا سروہی کی مالش ختم کر کے اب شیر پنجاب کے ساتھ بیٹھی اس سے شکایت کر رہی تھی کہ وہ اپنی نئی منگیتر کو ساتھ لے کر کیوں نہیں آیا۔ رئیسہ اس وقت رضا سروہی کے اسلام آباد والے اس گھر کی پوری مالکہ تھی۔ رضا کے خاندان والے کراچی یا اپنے گاؤں کی حویلی میں تھے۔ صرف رضا کا بھائی اپنی امریکی بیوی کے ساتھ اسلام آباد آیا ہوا تھا لیکن وہ بھی اوپر بیڈ رومز کے ساتھ بنے ہوئے لاؤنج میں بیٹھا بی بی سی پر اپنے بھائی کے وزیراعظم اور اپنے وزیر بننے کی خبر کا انتظار کر رہا تھا۔

رضا سروہی پر رئیسہ کی مالش کا نشہ ابھی تک طاری تھا۔ آنکھیں بھی بند تھیں۔ کبھی کبھی ہلکا سا جھروکہ کھول کر سامنے کی تپائی پر رکھے ہوئے کالے رنگ کے ٹیلی فون کو دیکھنے لگتا جس کا نمبر صرف ایک شخص کے پاس تھا۔ اس فون کی گھنٹی رضا کی قسمت کی گھنٹی بجانے والی تھی۔ پچھلی دفعہ اس کے ساتھ دھوکہ ہوا تھا۔ تین مہینے کی حکومت ملی تھی ساتھ میں اگلے پانچ سال کا وعدہ بھی تھا۔ لیکن الیکشن کے بعد درمیان میں ریاض توصیف آ کودا۔ رضا کے دوستوں نے ریاض توصیف کے مقابلے پر ڈٹ جانے کو کہا تھا۔ وہ ایک اچھی لڑائی لڑ سکتا تھا۔ لیکن اسے پتہ تھا یہ بیکار کی لڑائی ہو گی۔ فیصلہ کرنے والے ریاض توصیف کو وزیراعظم بنانے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ اس لئے وہ خاموشی سے پیچھے ہٹ گیا۔ لیکن اب پھر اس کا وقت آ گیا تھا۔ اب وہ دیکھے گا اسے کون روکتا ہے۔ عامر نذیر کی حکومت الٹنے والی ایجنسی نے اسکا نام طے کر دیا تھا۔ اس کی کابینہ کے نام بھی منظور ہو گئے تھے۔ اسے معلوم تھا اس کی کابینہ کے چند ناموں کو دیکھ کر صدر بھی خوش ہوئے ہوں گے۔ حکومت اب بھی تین مہینے کے لئے مل رہی تھی لیکن اب وہ مروت نہیں کرے گا۔ وہ بھی جام حاکم علی بننا جانتا تھا۔ اس دفعہ دیکھے گا کہ اس کی حکومت کے ہوتے ہوئے کوئی اور انتخاب کیسے جیتتا ہے۔ کرسی کے پیر اس مضبوطی سے زمین میں گاڑے گا کہ پانچ سال کیا دس سال تک کوئی ہلا نہ سکے۔

رضا نے فون سے نظریں ہٹا کر ایک بار کنکھیوں سے پیر حقہ' مولانا ٹوپی اور شیر پنجاب کو دیکھا۔ شیر پنجاب تہمینہ درانی کی انگریزی میں چھپ کر آئی ہوئی نئی کتاب کا مزا لے رہا تھا۔ شاید کوئی جملہ سمجھ میں آ گیا تھا اس لئے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ مولانا ٹوپی کی ساری توجہ ٹی وی پر آنے والی ریسلنگ پر تھی۔ اس وقت اس کا پسندیدہ پہلوان ہوگن اپنے مخالف کو اٹھا اٹھا کر پٹخ رہا تھا۔ مولانا کا منہ کھلا ہوا تھا اور چہرہ اندرونی جوش سے سرخ ہو رہا تھا۔ وہ ریٹائر ہونے والا ایسا پہلوان لگ رہا تھا جو اکھاڑے میں اپنے پٹھے کو زور کرتے ہوئے دیکھ کر خوش ہو رہا ہو۔ پیر حقہ آنکھیں میچ کر حقے کے کش لے رہا تھا۔ شیروانی کے بٹن نیچے تک کھلے ہوئے تھے۔ آگے کی طرف آیا ہوا ترکی ٹوپی کا پھندنا ہوا کی زد میں آئی ہوئی شاخ کی طرح ہل رہا

تھا۔ چہرہ دیگ سے اتری ہوئی تازہ نہاری پر آئے ہوئے گھی کے تار کی طرح سرخ تھا۔ رضا یہ سوچ کر مسکرایا کہ اگر دونوں کو معلوم ہو جائے وہ اپنے دل میں انہیں ان کے اصلی ناموں کی جگہ مولانا ٹوپی اور پیر حقہ کے نام سے یاد کرتا ہے تو اس کی کابینہ بننے سے پہلے بحران کا شکار ہو جائے گی۔ اس نے یہ سوچ کر اطمینان کی سانس لی کہ پیر حقہ امور کشمیر کی وزارت لینے پر مان گیا تھا۔ پیر کے بیٹے اسے وزارت داخلہ لینے پر اکسا رہے تھے۔ پیر اڑ جاتا تو مشکل ہو جاتی۔ رضا شیر پنجاب سے وعدہ کر چکا تھا۔ رضا جانتا تھا کہ شیر پنجاب آخری بار وزیر بن رہا ہے۔ وہ وزیراعظم بننے کے خواب ادھورے چھوڑ کر سیاست سے ریٹائر ہونے والا تھا لیکن اپنے بیٹوں کے قدم مضبوطی سے جمانے کے لئے اسے وزارت داخلہ کا قلمدان چاہئے تھا۔

پیر حقہ نے امور کشمیر کا قلمدان لینے کی وجہ بتائی تھی۔ وہ آزادیٔ کشمیر کی جدوجہد کی تاریخ میں اپنا اور اپنے حقے کا نام زندہ کر کے جانا چاہتا تھا۔ رضا نے پوچھا تھا۔ ”وہ کیسے؟“ تو اس نے بتایا تھا کہ وہ جب کشمیر کو آزاد کرانے کی جدوجہد میں ملک ملک گھومے گا تو بدن پر ادھ کھلی پیلی شیروانی، سر پر لال ٹوپی اور ہاتھوں میں میٹھا میٹھا دھواں اڑاتا ہوا حقہ دنیا بھر کے اخبار اور ٹی وی کو اپنی طرف متوجہ کر لے گا۔ بات حقے سے چلے گی اور مسئلۂ کشمیر تک پہنچے گی۔ دنیا بھر میں کشمیر کا چرچا ہو گا تو بھارت پر بھی دباؤ بڑھے گا۔ ”تاریخ میرے حقے کو بھلا نہیں سکے گی۔“ اس نے بڑے پیار سے حقے کی نے کو سہلاتے ہوئے کہا تھا۔ رضا سروہی نے سوچا کاش وہ بھی امریکہ کے دورے پر جاتے ہوئے ایک بندر اور ڈگڈگی ساتھ لے کر جا سکتا۔ پچھلی بار جب سرکاری وفد کا قائد بن کر اقوام متحدہ گیا تھا تو کسی امریکی اخبار نے اس کی ایک سطر کی خبر بھی نہیں چھاپی تھی۔

ٹی وی پر ریسلنگ ختم ہو گئی تھی۔ مولانا ٹوپی نے صوفے پر اپنی نشست ٹھیک کر کے میز پر رکھی ہوئی کالے رنگ کی اونچی ٹوپی دوبارہ اپنے سر پر جما لی۔ شیر پنجاب کتاب کو میز پر رکھ کر جماہی لینے لگا۔ حقہ ٹھنڈا ہو گیا تھا اس لئے پیر حقہ کی آنکھیں بھی کھل گئی تھیں۔ وحیدہ خاموش اور ساکت بیٹھی تھی۔ ڈر رہی تھی کہ کوئی جنبش

لباس پر شکن نہ ڈال دے۔ رئیسہ میز پر رکھے ہوئے ایک میگزین کے ورق الٹ رہی تھی۔ رضا کی آنکھیں ابھی تک بند تھیں۔

"حکومت تو بننے سے پہلے ہی سو گئی۔ اس ملک کا کیا بنے گا۔" شیر پنجاب نے رضا سروہی کی طرف دیکھ کر ہنستے ہوئے کہا۔

"سائیں ہم پر سیدوں کا سایہ ہے۔ ہماری آنکھیں بند ہو کر بھی دور تک دیکھتی ہیں۔" رضا نے آنکھیں کھول کر مسکراتے ہوئے کہا۔ پیر حقہ شعر پڑھنے لگا۔

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
جس کے بازو پر تری زلفیں پریشاں ہو گئیں

"پیر صاحب کس کا شعر ہے، فیض کا یا فراز کا۔" شیر پنجاب نے پوچھا۔

"لا حول ولا قوۃ۔ کن سرخوں کے نام لے رہے ہو۔" نام سنتے ہی مولانا ٹوپی کا ایمان خطرے میں پڑ گیا۔

"یہ اپنے زمانے کے سب سے بڑے سرخے چچا غالب کا شعر ہے۔" پیر حقہ نے بتایا۔

"غالب سرخا نہیں شرابی تھا۔" رئیسہ نے اپنی علمیت ظاہر کی۔

"ایک ہی بات ہے۔" مولانا نے اصرار کیا۔

"نہیں مولانا تھوڑا سا فرق ہے۔" شیر پنجاب نے کہا۔ "سب شرابی سرخے نہیں ہوتے، لیکن ہر سرخا شرابی ضرور ہوتا ہے۔" سب ہنس پڑے۔

"کابینہ کے باقی لوگ کب آئیں گے۔" وحیدہ جو حلف اٹھانے کے انتظار میں سخت تناؤ کا شکار تھی بولی۔

"کسی کی شیروانی تنگ ہو گئی ہے، کسی سے ٹائی کی گرہ نہیں بندھ رہی، لیکن فکر مت کیجئے، سب تیار بیٹھے ہیں وقت پر پہنچ جائیں گے۔" پیر حقہ نے خوش مزاجی سے جواب دیا۔

"سب سے کہیں شیروانیاں اور ٹائیاں لے کر یہیں آ جائیں۔ وحیدہ سب کی شیروانیاں ڈھیلی کر کے ٹائیاں کس دے گی۔" شیر پنجاب نے کہا اور ایک بار پھر سب

ہنس پڑے۔

"نہیں ایسا نہیں ہے۔ سب فون کے انتظار میں ہیں۔ میں نے خود آنے سے منع کیا تھا۔ اخبار والے سونگھتے پھر رہے ہیں۔ مجمع بڑھتا دیکھیں گے تو الٹی سیدھی کہانی بنا کر چھاپ دیں گے۔ میں نے رپورٹروں کو کھانا کھلوا کر بڑی مشکل سے واپس بھیجا ہے۔" رضا نے سنجیدہ ہو کر کہا۔

"اگر کہیں تو کھانا منگوا لوں۔" کھانے کا ذکر سنتے ہی رئیسہ کو میزبانی کا فریضہ یاد آگیا۔

"پوچھتی کیا ہو ضرور منگواؤ۔ راجپوت کو فون کر دو۔ فون آنے میں ابھی دیر ہے۔" رضا نے جلدی سے کہا۔

"راجپوت کا کھانا شادی والا ہوتا ہے۔ بہت بھاری ہو جائے گا۔ ابھی شام کو پیر صاحب کے مرید کا لایا ہوا حلیم کھایا ہے وہی ہضم نہیں ہوا۔ میرے لئے کوئی ہلکا سا سینڈوچ منگوا دیں۔" وحیدہ نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

"وحیدہ صحیح کہہ رہی ہیں۔ سینڈوچ منگوا لیں' مولانا کو بھی بہت پسند ہیں۔" شیر پنجاب نے شرارتی نظروں سے مولانا کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"لا حول ولا قوۃ۔ خواتین کی موجودگی کا خیال کیجئے۔" مولانا نے شیر پنجاب کو کڑی نظروں سے دیکھتے ہوئے ذرا آہستہ سے کہا۔

"کیوں مولانا سینڈوچ کھانا کوئی شیطانی کام ہے۔" وحیدہ نے معصومیت سے پوچھا۔ رضا اور شیر پنجاب زور سے ہنس پڑے۔ پیر حقہ نے مسکرانے پر اکتفا کیا۔ رئیسہ مسکراہٹ روکنے کی کوشش کرنے لگی۔ مولانا بری طرح جھینپ گئے تھے۔ وحیدہ سب کو حیرانی سے دیکھ رہی تھی۔ وہ اردو اخبار نہیں پڑھتی تھی اس لئے اسے مولانا اور سینڈوچ کا تعلق نہیں معلوم تھا۔ پوچھنے کے لئے اس نے منہ کھولا ہی تھا کہ سیاہ فون تیزی سے چیخ پڑا۔ تھوڑی دیر کے لئے سب ساکت ہو گئے۔ لیکن تین گھنٹیوں کے بعد رضا نے آگے بڑھ کر ریسیور اٹھا کر کانوں سے لگایا' کرسی سے پشت ٹیکی اور آنکھیں موند کر دوسری طرف سے بولنے والے کی آواز سننے لگا۔

وزیراعظم ناصر بھٹی

ناصر بھٹی تین نشستی صوفے پر ذرا پھیل کر بیٹھا ہوا تھا۔ دائیں اور بائیں رکھی ہوئی آرام دہ نشستوں میں سے ایک پر ریٹائرڈ جنرل اسلم برلاس اور دوسری پر بوڑھا بیورو کریٹ اختیار حیدر رضوی بیٹھا تھا۔ دونوں کسی مسئلے پر زور شور سے بحث کرتے ہوئے ناصر کی توجہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ناصر ان کی باتیں سن رہا تھا لیکن سمجھ نہیں رہا تھا۔ ذہنی طور پر وہ اس وقت بالکل غیر حاضر تھا۔ اس کی آنکھیں بار بار سامنے کی طرف اٹھ جاتیں جہاں قالین پر پڑی ہوئی رنگ برنگی گدیلی نشستوں پر دیوار سے ٹیک لگائے اس کا بھانجا رحمت بھٹی ساتھ بیٹھی ہوئی فیروزہ اسلم سے بہت انہماک کے ساتھ باتوں میں مصروف تھا۔ ناصر بھٹی کی آنکھوں سے تشویش جھانک رہی تھی۔ جنرل کانی کا پہاڑ جیسا وجود ایک کوچ پر پھیلا ہوا تھا۔ جنرل کانی کی آنکھیں----- بلکہ ایک آنکھ بند تھی۔ وہ آنکھ کھلی ہوئی تھی جو پتھر کی تھی۔ یہ آنکھ سوتے جاگتے ہر وقت کھلی رہتی تھی۔ شاید سائز سے کچھ بڑی بن گئی تھی اس لئے پپوٹے اسے پوری طرح ڈھک نہیں سکتے تھے۔ ناصر کا خیال تھا جنرل کانی نے جان بوجھ

کر بڑے سائز کی آنکھ لگوائی تھی جو سوتے جاگتے ہر وقت نگرانی کرتی رہے اور دیکھنے والوں کو ڈراتی ہوئی محسوس ہو۔ کسی کو پتہ ہی نہیں چلتا کہ وہ سو رہی ہے یا جاگ رہی ہے۔ وہ اکثر جاگتے میں بھی اپنی ایک آنکھ بند رکھتی تھی۔ جنرل کانی کا کہنا تھا اسے اپنی پتھر کی آنکھ سے زیادہ صاف نظر آتا ہے۔

ناصر بھٹی کو اس وقت پہلی بار اپنے کمرے کی وسعت بری لگی۔ کمرے کی ایک دیوار سے دوسری دیوار تک کا فاصلہ اتنا تھا کہ ناصر بھٹی کے لئے رحمت اور فیروزہ کی گفتگو سننا ناممکن تھا۔ اس سے پہلے اسے یہ بڑا کمرہ بھی تنگ اور سیاسی ضروریات کے لئے کم لگتا تھا۔ کمرے میں چاروں طرف صوفے اور کرسیاں رکھی تھیں اور نرم قالین پر جا بجا بیٹھنے والے نرم تکیئے پڑے تھے۔ ایک لیٹنے والی نشست تھی جو اس وقت جنرل کانی کے قبضے میں تھی۔ جب سیاسی اجلاس ہوتے یا اس سے ملنے کے لئے وفود آیا کرتے تو نشستیں کم پڑ جاتیں۔ باہر سے مزید کرسیاں منگا کر لگانا پڑتیں یا دوسرے کمرے کی ایک اور بیٹھک کھولنا پڑتی۔ کمرے کی دیواریں تقریباً" ننگی تھیں۔ صرف ایک طرف کسی مصور کا بنایا ہوا ناصر بھٹی کا بڑا سا پورٹریٹ تھا اور اسی کے سامنے کی دیوار پر پورٹریٹ سے نصف سائز کی قائداعظم کی تصویر لگی تھی۔ یہ تصویر کسی اردو اخبار سے پھاڑ کر فریم کرائی گئی تھی۔

ناصر بھٹی سے بالآخر برداشت نہیں ہوا اور جنرل برلاس اور رضوی کی گفتگو میں وقفہ آتے ہی اس نے رحمت کو آواز لگائی۔ رحمت چونک کر اٹھ کھڑا ہوا اور ناصر بھٹی کے قریب آ کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

"سب تیاریاں مکمل ہیں؟" ناصر نے تیز نظروں سے اپنے بھانجے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں!" رحمت نے بہت سعادتمندی سے جواب دیا۔ "چار مختلف مقامات پر سب کو جمع کر دیا ہے۔ ایک گروپ کے ساتھ سینیٹر صاحب' دوسرے کے ساتھ خان صاحب' تیسرے کے ساتھ چوہدری صاحب اور چوتھے کے ساتھ شاہ صاحب ہیں۔ آپ کا اشارہ ملتے ہی سب کو اس جگہ لے جایا جائے گا جہاں نہ پرندہ پر مار سکتا ہے نہ

کوئی پہنچ سکتا ہے۔"
"کیسی بیوقوفی کی باتیں کرتے ہو۔ چالیس ایم این اے غائب ہیں' یہ کوئی مذاق نہیں ہے۔ تمہارے کسی نہ کسی اڈے پر اب تک نگرانی کرنے والے پہنچ گئے ہوں گے۔" ناصر بھٹی نے ذرا غصے سے کہا۔
"میں نے کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں ماما۔" رحمت نے بڑے اطمینان سے کہا۔
"میں نے بہت پکا انتظام کیا ہے۔ چاروں جگہ سے گاڑیاں دس دس آدمیوں کو لے کر نکلیں گی تو نگرانی کرنے والے ان کے پیچھے دوڑیں گے اور چکراتے رہیں گے۔ ان گاڑیوں میں ہمارے اصلی آدمی نہیں ان جیسے دوسرے لوگ ہوں گے۔ میدان صاف ہوتے ہی ہم دوسری گاڑیوں میں اپنے آدمیوں کو لے کر وہاں پہنچا دیں گے جہاں ہمیں جانا ہے۔" رحمت نے داد طلب نظروں سے سب کی طرف دیکھا۔
"واہ رحمت میاں واہ۔" جنرل برلاس نے تعریف کی۔ "تم تو خفیہ ایجنسیوں کا میٹریل ہو۔ میرے زمانے میں آئے ہوتے تو کہاں سے کہاں پہنچا دیتا۔"
"آپ کے زمانے میں یہ نیویارک میں جھک مار رہا تھا۔" ناصر نے منہ بنا کر کہا۔ بھانجے کے خلاف اس کی ناراضی چھپی نہ رہ سکی تھی۔ لیکن وہ اس وقت ناصر کی مجبوری تھا۔ سیاست کے اس کھیل میں ناصر کسی اور پر بھروسہ نہیں کر سکتا تھا۔ رحمت نے اسے ایسے کسی موقع پر مایوس بھی نہیں کیا تھا۔ بس نوجوانی کے زور میں توازن کھو کر احتیاط کرنا بھول جاتا تھا۔ پچھلے انتخابات میں ناصر کے مخالف چوہدریوں سے لڑائی میں اپنے ہاتھ خون میں رنگ بیٹھا تھا۔ ناصر کے جانی دشمن ریاض توصیف کی حکومت تھی۔ ناصر نے رحمت کو فوراً" نیویارک بھگا دیا تھا۔ ورنہ رحمت بچ نہیں سکتا تھا۔ اسے امریکہ گئے ہوئے تین سال ہی ہوئے تھے کہ ریاض توصیف کی جگہ ناصر بھٹی کی مدد سے عامر نذیر وزیراعظم بن گیا۔ ناصر بھٹی چاہتا تھا رحمت ابھی ایک دو سال اور امریکہ میں رہے۔ اسے سیاسی گرما گرمی ختم ہونے کا انتظار تھا۔ یہ بھی چاہتا تھا کہ وہ امریکہ میں رہ کر اپنے مزاج کو ٹھنڈا رکھنا سیکھ لے۔ رحمت پر اس نے بہت سرمایہ کاری کی تھی۔ ناصر بھٹی کے لئے وہ ایک قیمتی اثاثہ تھا۔ سیاست کے اندرون

خانہ کھیل میں بھروسے کا ایک آدمی ضروری تھا۔ بھروسے کا آدمی خود اپنا خون ہو سکتا تھا۔ ناصر بھٹی کو معلوم تھا کہ ریاض توصیف کی کامیابی میں اس کے بھائی ایاز توصیف کا کتنا بڑا ہاتھ تھا۔ ریاض ایک چہرہ تھا' بساط پر بیٹھا ہوا ایک وجود۔ چالیں ایاز چلتا تھا۔ اپنے مہروں کو پٹنے سے بچانے اور مخالف کے مہروں کو پیٹنے والی چالیں۔ ناصر بھٹی رحمت کو اپنا ایاز توصیف بنانا چاہتا تھا۔

لیکن رحمت کو پاکستان واپس آنے کی بہت بے تابی تھی۔ اس نے کاروبار کے بہانے ناصر بھٹی سے جو ہزاروں ڈالر منگوائے تھے وہ اٹلانٹک سٹی کے تاج محل میں جوئے کی ممتاز محل پر نچھاور ہو گئے تھے۔ سنہرے پروں اور شہد جیسے رنگ کی ایک چڑیا بھی مل گئی تھی۔ وہ جوئے خانے میں سیاہ غلام کی میز پر پتے بانٹتی تھی۔ رحمت اسے پا کر خود کو بادشاہ سمجھنے لگا تھا۔ لیکن دگیوں اور چھکوں نے مقدر بن کر جب بادشاہ کے سر سے ڈالروں کا تاج اتار لیا تو چڑیا پھر سے اڑ گئی اور رحمت معزول شاہجہاں کی طرح اٹلانٹک سٹی کے اندھے تہہ خانوں میں سر ٹکرانے لگا۔ اوسان بحال ہوئے تو بینائی حاصل کرنے ایک بار پھر نیویارک پہنچ گیا۔

ناصر بھٹی سے پیسہ منگوانے کے سب بہانے ختم ہو چکے تھے اور نوکری کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ پٹرول پمپ پر رات بھر کی نوکری نے جوئے کی عادت تو ختم کرا دی لیکن دوسری لت نہ چھوٹ سکی۔ "وادکا" کا ایک پوا چڑھا کر اور ایک جیب میں رکھ کر کام پر پہنچتا تو آنکھوں میں نیند اور نشہ خون کی طرح جھلکتا نظر آتا۔ اس کی موٹی موٹی سرخ آنکھوں کو دیکھ کر خوفناک شکلوں والے سیاہ فام بھی اس کے پٹرول پمپ کو لوٹنے کا ارادہ ترک کر کے آگے بڑھ جاتے۔ کچھ جی دار تھے جنھوں نے شروع شروع میں اس کے پٹرول پمپ کو لوٹنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ جیب سے پستول نکالتے رحمت بیس بال کا بلا لے کر پنجابی میں گالیاں بکتا ہوا تیزی سے ان پر لپکتا۔ وہ نہ سمجھ میں آنے والی جناتی زبان' رحمت کی بے خوفی اور اس کے جارحانہ انداز کو دیکھ کر اپنا سر ٹوٹنے سے بچاتے ہوئے کار میں سوار ہو کر بھاگ لیتے۔ بھاگتی ہوئی گاڑی کو بیس بال بیٹ کا وار سہنا پڑتا۔ کم از کم دو گاڑیاں اپنی پیچھے کی

اسکرین ریزہ ریزہ کرا چکی تھیں۔

یہ پیٹرول پمپ ڈیوٹی کے دوران رحمت کی اپنی جاگیر تھا۔ اسے لوٹنے کا حق کسی دوسرے کو نہیں صرف اسے تھا۔ قرب و جوار کے لٹیرے یہ بات جان کر اس کے دوست بن گئے تھے۔ وہ اکثر رات میں واردات کرنے سے پہلے رحمت بھٹی سے مل کر جاتے۔ رحمت اپنی بوتل سے سب کو ایک ایک گھونٹ پلاتا' سگریٹوں کے پیکٹ مفت نذر کرتا اور وہ ہوا میں لہراتی ہوئی ہتھیلیوں کو اس کی ہتھیلی پر مار کر پٹاخوں کی آوازیں نکالتے ہوئے رخصت ہو جاتے۔ مہینے میں صرف ایک بار رحمت والے پیٹرول پمپ کو لوٹنے کی اجازت تھی۔ کب اور کس وقت؟ اس کا فیصلہ رحمت بھٹی خود کرتا۔ لوٹنے کا ڈرامہ اسٹیج کرنے والوں کو سو سو ڈالر دیتا اور باقی سارا کیش نکال کر جیب میں ڈالتا' لوٹنے والے جب اپنا حصہ لے کر چلے جاتے تو وہ سیکورٹی کا الارم بجاتا' پولیس کو رپورٹ لکھواتا اور گھر میں آرام کی نیند سوتے ہوئے مالک کو فون کر کے ڈکیتی کی اطلاع دیتا۔ بعد میں مالک نے اسے تاکید کر دی تھی کہ وہ اسے رات میں اٹھانے کے بجائے صبح فون کر کے خبر دیا کرے۔ مالک جو ڈیڑھ ہزار ڈالر کے نقصان کو دس پندرہ ہزار ڈالر بنا کر انشورنس سے وصول کرنے کے کاروبار کا ماہر تھا' رحمت سے بہت خوش تھا۔

سب فائدے میں تھے۔ رحمت' اس کے لٹیرے دوست' اس کا مالک۔ سب خوش تھے سوائے رحمت کے۔ اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر جو پیسے کما رہا تھا وہ اس کے لئے باجرے کے دانے تھے۔ ایک ایک کر کے دانے چگنا چھوٹی چھوٹی معصوم چڑیوں کا کھیل تھا۔ رحمت پاکستان جا کر بڑے کھیل میں شریک ہونا چاہتا تھا۔ بہت منصوبہ بندی سے کی جانے والی لوٹ مار سے جو پیسے ملتے تھے اس سے دگنے اس کے دوست لاہور میں مجرے کے دوران ایک رات میں ناچنے گانے والی کے سر پر وار دیتے تھے۔ لوٹ میں اس کے حصے دار صرف اس سے ڈر کر اسکا ساتھ دیتے تھے۔ آس پاس والے اسے کوئی اسپینی غنڈہ سمجھ کر منہ نہیں لگاتے تھے۔ اس کی انا ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئی تھی۔ اسے پاکستان جا کر اپنا وقار بحال کرنا تھا۔ اسے معلوم تھا پاکستان کی زمین اس

کے لئے پھر زرخیز ہو گئی ہے۔ وہ ایک ہی جھٹکے میں کروڑوں کا ہاتھ مار سکتا تھا۔ پاکستان میں یہ لوٹ عزت کم کرنے کا نہیں بڑھانے کا ذریعہ تھی۔ زیادہ لوٹنے والا زیادہ عزت دار تھا۔ رحمت بھٹی نے ریاض توصیف کے خاندان کو چند سالوں میں ارب پتی بنتے دیکھا ہے۔ عامر نذیر نے یورپ میں محل بنا لئے تھے۔ اب اس کے ماموں کا زمانہ آیا تھا تو واپس جا کر اسے بھی اپنے حوصلے نکالنے تھے۔ اسے معلوم تھا عامر نذیر کی حکومت اس کے ماما کے چالیس ووٹوں کی بنیادوں پر کھڑی تھی۔ اس کا ماما کسی وقت خود بھی وزیراعظم بن سکتا تھا۔ رحمت کو اس وقت اپنے ماما کا دایاں ہاتھ بننا تھا۔ لینے والا ہاتھ۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ وہ اپنے ماما کو پاکستان واپس آنے کے لئے تیار کیسے کرے۔

رحمت کی ماں اپنے اکلوتے بیٹے کی شکل دیکھنے کو ترس گئی تھی۔ اس نے اپنے بھائی کے پاؤں میں دوپٹہ ڈال دیا۔ ناصر بھٹی کو اپنی بہن کی یہ عادت سخت ناپسند تھی۔ پاؤں میں پڑا ہوا دوپٹہ زنجیر بن جاتا۔ یہ ایک ایسی قسم تھی جو اس سے فیصلہ کرنے کی قوت چھین لیتی۔ اس کی ایک ہی بہن تھی اور وہ بھی جوانی میں بیوہ ہو گئی تھی۔ جب بیوہ ہوئی تو ناصر نے عہد کیا تھا کہ اپنی بہن کے آنسو زمین پر گرنے سے پہلے سمیٹ لے گا۔ ناصر کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔ اسے وہی کرنا تھا جو اس کی بہن چاہتی تھی۔ رحمت کو واپس بلوانا آسان نہیں تھا۔ ایف آئی آر تبدیل کرانی پڑی تھی۔ وزیراعظم کے دباؤ کے بغیر ایف آئی آر میں تبدیلی ممکن نہیں تھی۔ عامر نذیر ناصر بھٹی کو منع نہیں کر سکا تھا۔ وہ منع کر ہی نہیں سکتا تھا۔ لیکن ناصر بھٹی کو رحمت کی یہ واپسی کروڑوں کی پڑی۔ اس زمانے میں ہاؤسنگ کے ایک منصوبے کے لئے زمین کی بات چل رہی تھی۔ اس پروجیکٹ کی منظوری حکومت کو دینی تھی۔ ناصر بھٹی کو کچھ عرصے کے لئے ہاؤسنگ کا منصوبہ بھولنا پڑا۔ وہ دو چیزیں ایک ساتھ نہیں مانگ سکتا تھا۔ یہ مہلت وزیراعظم عامر نذیر کی بیوی آصفہ کے لئے کافی تھی۔ ہاؤسنگ کا منصوبہ وہ لے اڑی تھی۔

رحمت کے پاکستان واپس آنے سے پہلے اس کی نوکری کی آخری رات پیٹرول

پمپ پر سب سے بڑا ڈاکہ پڑا تھا۔ دوسری صبح اس کے مالک نے اسے دو ہفتے کی تنخواہ دے کر نوکری سے نکال دیا تھا۔ مسلسل ڈاکوں نے انشورنس کا پریمیم دوگنا کر دیا تھا۔ رحمت ہرجانے کا دعویٰ کرنے کی دھمکیاں دیتا ہوا نکل آیا تھا اور اسی رات پاکستان پرواز کر گیا تھا۔ اپنا بیس بال کا بلا وہیں چھوڑ آیا تھا۔ پاکستان میں ایسے بے ضرر کھلونوں کا کام نہیں تھا۔

ناصر بھٹی کو کروڑوں کے اس نقصان کی پرواہ نہیں رہی تھی جو رحمت کو امریکہ سے واپس بلانے کی وجہ سے ہوا تھا۔ وزیراعظم بن کر وہ پچھلا حساب کتاب برابر کر سکتا تھا۔ اسے غصہ اس پر تھا کہ رحمت سب کچھ جانتے ہوئے بھی فیروزہ اسلم پر ڈورے ڈال رہا تھا۔ رحمت کی طرح فیروزہ اسلم بھی ناصر بھٹی کو سستی نہیں پڑی تھی۔ اسے اس کے شوہر اسلم سے نجات دلانے کے لئے بھی ناصر کو وزیراعظم کے پاس جانا پڑا تھا۔ ایک بار پھر وہ شوگر مل آصفہ لے اڑی تھی جو ناصر بھٹی منظور کرانا چاہتا تھا لیکن پھر فیروزہ کے کام کی وجہ سے ٹھہر گیا تھا۔ ایک بار غصے میں اس نے سوچا کہ وہ اپنے ان وعدوں کو بھول جائے جو اس نے رحمت اور فیروزہ سے کئے تھے۔ لیکن وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ ایسا کرنا اس کے بس میں نہیں تھا۔ اس نے حکومت ملنے کی صورت میں رحمت کو مالیات کا مشیر بنانے کا وعدہ کر لیا تھا۔ ایک بار پھر اس کی بہن نے اس کے پاؤں میں اپنا دوپٹہ ڈال دیا تھا۔ رحمت کو معلوم تھا کہ اس کا ماموں آسانی سے نہیں مانے گا۔ اسے اپنی ماں کو دھمکی دینی پڑی تھی کہ وہ پھر نیویارک چلا جائے گا اور اس دفعہ واپس نہیں آئے گا۔ ناصر بھٹی چاہتا تھا رحمت اس کے وہ سیاسی معاملات نمٹائے جن کے سلسلے میں وہ کسی اور پر بھروسہ نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن بہن کا دوپٹہ ایک بار پھر زنجیر بن گیا تھا۔ اس نے رحمت کو سمجھانا چاہا لیکن وہ بضد تھا۔ وہ کہتا تھا جب نیویارک میں تھا تو اس نے مالیاتی نظام چلانے کی تربیت لی تھی اور عملی تجربہ بھی حاصل کیا تھا۔ وہ غلط نہیں کہتا تھا۔ پیٹرول پمپ پر کام کرتے ہوئے اس نے کیش رجسٹر چلانا، پیسے گننا اور روز کے کیش سے چالیس پچاس ڈالر اڑانا سیکھا تھا۔ ڈاکے الگ تھے۔ پاکستان میں اگر اسے سال بھر بھی مالیات کا مشیر بن کر

اپنی امریکی مہارت استعمال کرنے کا موقع مل سکا تو ہر معاملے میں اپنے ماما کا منہ دیکھنے کی ضرورت نہ رہے گی۔ وہ اپنا سیاسی کیریئر خود بنا سکتا تھا۔ اسے بس ایک بار الیکشن جیتنے کے لئے پیسے چاہئے تھے' اس کے بعد سب کچھ آسان تھا۔ وہ اپنے ماما کے ساتھ رہ کر وزیر بننے کے گر جان گیا تھا۔ ناصر بھٹی بھی یہ سوچ کر مطمئن ہو گیا تھا کہ ملک کا خزانہ اس کے اپنے بھروسے کے آدمی کی نگرانی میں رہے گا۔ کسی کو اعتراض بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کا بھانجا نیویارک پلٹ تھا۔ پاکستان کے مالی مسائل کو حل کرنے کا ہنر امریکہ سے آنے والوں کے علاوہ اور کسے آ سکتا تھا۔

فیروزہ اسلم کو اس نے ٹی وی کا نیا ایم ڈی بنانے کا وعدہ کر لیا تھا۔ فیروزہ نے جب یہ عہدہ مانگا تھا تو وہ ہنسا تھا۔ سمجھا تھا وہ مذاق کر رہی ہے۔ لیکن فیروزہ سنجیدہ تھی۔ اس نے مثال دی تھی کہ ایک معمولی پروڈیوسر ایم ڈی بن سکتی ہے تو وہ کیوں نہیں بن سکتی۔ وہ تو ایک بڑے انگریزی اخبار کی رپورٹر بھی ہے۔ اور رپورٹر بھی وہ جو وزیراعظم سے کم سطح کی تقریبات میں شرکت نہیں کرتی۔ فیروزہ کی بات غلط نہیں تھی۔ ناصر بھٹی کی وجہ سے فیروزہ وزیراعظم کے ہر غیر ملکی دورے میں شامل ہوتی تھی۔ ایک دفعہ نیپال کے دورے سے واپس آتے ہوئے جہاز میں وزیراعظم کی بیوی آصفہ اپنے تحفوں میں سے فیروزہ کا حصہ الگ کر کے اسے دے رہی تھی۔ دورے میں شامل ایک علاقائی رپورٹر نے پوچھا "کیا یہ وزیراعظم کی دوسری بیوی ہیں؟" سننے والے ہنس پڑے تھے۔ ایک دانا نے بتایا نہیں یہ اس شخص کی نہ ہونے والی بیوی ہے جس کے بغیر وزیراعظم کی حکومت قائم نہیں رہ سکتی۔

ناصر بھٹی نے فیروزہ اسلم کی بات پہلے تو ٹال دی تھی۔ لیکن اس نے جب دوبارہ یہ بات چھیڑی تو ایسے وقت اور اس لمحے کا انتخاب کیا تھا جب ناصر بھٹی منع کر ہی نہیں سکتا تھا۔ ناصر بھٹی نے خود کو مطمئن کر لیا تھا۔ اس کے وزیراعظم بننے میں فیروزہ کی ماں کا جو کردار تھا اس کے مقابلے میں یہ عہدہ کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ اس کے وزیراعظم بننے کی کنجی قومی اسمبلی میں اس کے وہ چالیس ارکان تھے جنہیں ہر قیمت پر وزیراعظم عامر نذیر کی پہنچ سے دور رکھنا تھا۔ عامر نذیر کی قوت خرید اس کے

مقابلے میں بہت زیادہ تھی۔ انہیں کئی دنوں تک زیر زمین رکھنے کے لئے جنرل کانی کی مہارت چاہیے تھی۔ ہر رات چالیس شوخ اور چنچل لڑکیوں کا انتظام کرنا آسان نہیں تھا۔ جنرل کانی جیسی پہنچ رکھنے والی عورت کو بھی ایک سے زائد فون کرنے پڑے تھے۔

رحمت بھٹی وہیں بیٹھا ہوا جنرل برلاس کو اپنے نیویارک کے کارنامے سنا کر متاثر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ناصر بھٹی نے نظریں اٹھا کر اکیلی بیٹھی ہوئی فیروزہ اسلم کی طرف دیکھا جو کوچ پر لیٹی ہوئی جنرل کانی کی پتھر والی آنکھ کو گھور رہی تھی۔ فیروزہ جانتی تھی کہ ناصر بھٹی کو اس کا رحمت کے ساتھ گھلنا ملنا پسند نہیں آیا۔ لیکن اسے پرواہ نہیں تھی۔ وہ ان تھکے ہوئے سیاسی وڈیروں سے بیزار ہو گئی تھی۔ وہ عورت کو زمین سمجھ کر ہر وقت اپنا قبضہ رکھنا چاہتے تھے۔ پھر بھی ڈرتے تھے۔ کسی سے بات کرتے دیکھ کر خوفزدہ ہو جاتے تھے۔ انہیں خود پر اعتماد نہیں تھا۔ فیروزہ کو رحمت اچھا لگا تھا۔ نڈر اور بے دھڑک۔ خطرے میں کودنے کے لئے تیار۔ ہر وقت حرکت میں رہنے والا۔ فیروزہ جانتی تھی کہ رحمت کو ناصر بھٹی کی ناراضی کی خبر ہے۔ پھر بھی اس کی نظروں کے سامنے فیروزہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال رہا تھا۔ فیروزہ کو سچ مچ غصہ آنے لگا۔ کسی کو پسند کرنے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ اس کے ساتھ سیدھی بستر میں چلی جائے گی۔ لیکن ناصر اگر یہی سمجھتا ہے تو یہی سہی۔ پہلے اسلم اسے نچوڑتا اور اس کا گھی نکالتا رہا تھا۔ اور اب ناصر۔ یہ بھی پورا ٹھیکیدار بن گیا تھا۔ اس نے سوچا آج رات کو جب سب چلے جائیں گے تو وہ ناصر کو صاف صاف بتا دے گی کہ اس نے اپنی زندگی کا ہر پل اور ہر خواہش اس کے ہاتھ بیچ نہیں دی۔ ناصر اگر شیخوپورہ جا کر اپنی بیوی کے ساتھ راتیں گزار سکتا ہے تو اسے بھی حق ہے اور وہ تو اس کی بیوی ہے بھی نہیں۔ ٹھیک ہے رحمت کے ساتھ نہیں جائے گی، کسی اور کے ساتھ جائے گی۔ لیکن جائے گی ضرور۔ وہ ناصر کی غلام بن کر نہیں رہے گی۔

فیروزہ کی آنکھوں میں اس ڈپٹی سیکرٹری کی شبیہہ آ گئی جو اس کی ماں کے پاس اپنا تبادلہ انکم ٹیکس کے محکمے میں کرانے آیا تھا۔ کتنا وجیہہ اور خوش شکل تھا۔ کیا اچھی حس مزاح تھی۔ کھل کر ہنستا تھا۔ فیروزہ کو معلوم تھا کہ اس کی ماں نے دونوں کی ہنستی

ہوئی آنکھوں میں کچھ پڑھ لیا تھا اور اسی وقت فون کر کے اس کے تبادلے کا کام کرا دیا تھا۔ دوسروں کی طرح اسے چکر نہیں لگوائے تھے۔ جنرل کانی جانتی تھی دوسرا چکر لگا تو اس کی بیٹی بھی اپنا تبادلہ کرا لے گی۔ فیروزہ کو لگا جیسے اس کی ماں کی پتھر والی آنکھ اسے خبردار کر رہی ہو۔ ٹھیک ہے وہ واپس لندن چلی جائے گی۔ اس نے گھورتی ہوئی پتھریلی آنکھوں کو بھی چیلنج کیا۔ لیکن پھر خود کو ڈھیلا چھوڑ کر ایک گہری سانس لی' ساتھ ہی غصہ اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔ سب کچھ اتنا آسان نہیں تھا۔ اس کی ماں غلط نہیں کہتی تھی۔ ایک لمحے کی جذباتیت مستقبل کی ساری منصوبہ بندی خراب کر سکتی تھی۔ وہ اپنے ماضی کی طرف واپس جانا نہیں چاہتی تھی۔ اپنی طرف دیکھتے ہوئے ناصر بھٹی کو دیکھ کر اس نے اپنی آنکھوں میں بہت سا پیار سمیٹ لیا اور اس ادا سے مسکرائی کہ ناصر بھٹی کے دل کی دھڑکنوں میں جشن برپا ہو گیا۔ کچھ دیر پہلے جو غصہ آیا تھا وہ ہوا ہو گیا۔

جنرل کانی نے سچ مچ کی آنکھ کھول کر اپنی بیٹی کو دیکھا اور اسے مسکرا کر ناصر بھٹی کی طرف دیکھتے ہوئے دیکھ کر اپنی آنکھ پھر میچ لی۔ فیروزہ کو وقت پر عقل آ گئی تھی۔ فیروزہ کو رحمت بھٹی میں دلچسپی لیتے دیکھ کر جنرل کانی کو اپنے سارے منصوبے ریت کا مکان لگنے لگے تھے۔ ساتھ ہی غصہ بھی آیا تھا۔ فیروزہ اس کی بیٹی ہو کر بھی کبھی کبھی بیوقوف ہو جاتی تھی۔ جذبے آخر پاگل ہو کر اتنے بے قابو کیوں ہو جاتے ہیں۔ جنرل کانی جوانی کے دیوانے پن کو جانتی تھی۔ لیکن اس کا خیال تھا کہ اسلم کے تجربے نے فیروزہ کا دیوانہ پن کم کر دیا ہو گا۔ کبھی کبھی اسے اپنا خیال غلط لگتا۔ ایک لمحے کے لئے لگتا جیسے فیروزہ اس کی ساری محنت پر پانی پھیر دے گی۔ اس نے فیروزہ کو جوانی کے کھیل کھیلنے سے کبھی منع نہیں کیا تھا۔ لیکن کیا ضروری تھا کہ ناصر بھٹی کی ناک کے نیچے' اس کے بھانجے کے ساتھ شوخیاں کی جائیں۔ سب کچھ خاموشی سے بھی ہو سکتا تھا۔ پچھلی گلی کے کئی دروازے کھلے ہوئے تھے۔ لیکن کوئی چیلنج نہ ہو تو شاید جذبوں کے وحشی پن میں ابال نہیں آتا۔ حسد' جلن' مقابلے کی تڑپ' ملنے کی آرزو' کھو دینے کا خوف' ان سب کے بغیر جوانی کی محبتیں شاید غیر دلچسپ کھیل بن

جاتی ہوں۔ یا پھر جستجو کے بغیر وصل کا پھل مزا نہ دیتا ہو۔ کچھ بھی ہو' اس وقت فیروزہ نے جس طرح اپنی بہکی خواہشوں کو لگام دی تھی اسے دیکھ کر جنرل کانی نے اطمینان کی سانس لی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر سائڈ کی میز سے مخمل کی لال ڈبیا اٹھائی اور اپنی آنکھ نکال کر اس میں رکھ دی۔ تھوڑی دیر کے لئے وہ سچ مچ سو جانا چاہتی تھی۔ سونے سے پہلے اپنی جاگتی آنکھ سے اس نے ایک بار اختیار رضوی اور جنرل برلاس کو دیکھا۔ اسے بڈھوں کی اداکاری پر حیرت ہوئی تھی۔ انہوں نے اسے دیکھ کر برسوں کی شناسائی کا ہلکا سا اظہار بھی نہیں کیا تھا۔

"تمہارا کیا خیال ہے' عامر نذیر کو پتہ چل گیا ہو گا۔" جنرل برلاس نے رحمت کے چپ ہوتے ہی ناصر بھٹی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں نہیں سمجھتا۔ انہیں شبہ ہوا ہو گا لیکن یقین نہیں۔ فیروزہ آج آصفہ کا انٹرویو کرنے وزیراعظم ہاؤس گئی تھی۔ میں نے اسے یہی جاننے کے لئے بھیجا تھا کہ وہ لوگ کیا سوچ رہے ہیں۔ عامر اور آصفہ کو اب تک یقین نہیں ہے کہ ان کے آخری دن آ گئے ہیں۔ انہیں اپنے پیر پر زیادہ بھروسہ ہے۔" ناصر بھٹی نے ہنستے ہوئے کہا۔ ناصر کا ذہن اب پوری یکسوئی کے ساتھ سیاسی گتھیاں سلجھانے لگا تھا۔

"میرا خیال ہے انہیں اندازہ ہے اور وہ پوری طرح باخبر ہیں۔" اختیار رضوی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"اب کوئی فرق نہیں پڑتا۔ صرف چند گھنٹوں کی بات ہے۔ صبح جب ہم اسمبلی میں عدم اعتماد کی تحریک پیش کریں گے تو پوری دنیا کو پتہ چل جائے گا۔ بس ہمارے لوگ ان کی پہنچ سے باہر ہو جائیں۔ اس کے بعد مجھے پرواہ نہیں ہے۔" ناصر بھٹی نے اطمینان سے کہا۔

"پیسوں کا انتظام آج رات ہی کرنا ہو گا۔ ورنہ ہو سکتا ہے کوئی ساتھ جانے سے انکار کر دے۔" رحمت بھٹی نے دبے لہجے میں اپنے ماموں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ناصر بھٹی جنرل برلاس کو دیکھنے لگا۔ جنرل برلاس نے اپنے پاس رکھے ہوئے موٹے بریف کیس کو تھپ تھپاتے ہوئے سر کو ہلایا۔

"تو پھر انتظار میں وقت ضائع کیوں کریں۔ جب فون آئے گا تب آئے گا میں کارروائی شروع کرتا ہوں۔" رحمت نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"نہیں بیٹے اتنی جلدی نہیں۔" بوڑھے اختیار حیدر رضوی نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ چودہ کروڑ روپے کی رقم ہے۔ معمولی بات نہیں ہے۔ ایک دفعہ ہاتھ سے نکل گئے تو واپس نہیں آئیں گے۔ جب تک ایوان صدر سے اشارہ نہیں ملے گا، فون نہیں آئے گا، ہم پیسہ حرکت میں نہیں لائیں گے۔"

"لیکن کیوں؟ جب فیصلہ ہو چکا ہے تو پھر پہلے یا بعد کی کیا بات ہے۔ جتنا وقت گزرے گا مشکلات بڑھیں گی۔" رحمت بیٹھا نہیں تھا اسی طرح کھڑے کھڑے اصرار کر رہا تھا۔ ناصر بھٹی دل ہی دل میں مسکرایا۔ وہ اپنے بھانجے کو اچھی طرح جانتا تھا۔ اسے پتہ تھا رحمت کو پیسہ حاصل کرنے کی جلدی کیوں تھی۔ اس نے چودہ میں سے کم از کم ایک کروڑ اپنی جیب میں ڈالنے کا بندوبست کیا ہو گا۔

"تم ان معاملوں کو نہیں سمجھو گے۔" اختیار رضوی رحمت کو سمجھا رہا تھا۔ "کچھ اور شکاری بھی اپنا جال بچھائے بیٹھے ہیں۔ اس کھیل کے کچھ کردار ہماری پہنچ سے باہر ہو گئے ہیں۔ صدر آخری وقت میں اپنا فیصلہ تبدیل کر سکتے ہیں۔" اختیار رضوی کے ساتھ جنرل برلاس کے ماتھے پر بھی فکر کی لکیریں کھنچ گئیں۔

"آپ کے علاوہ بھی کوئی اور طاقت ہے؟" رحمت کو واقعی حیرت ہوئی تھی۔

"ہاں، اب کچھ عرصے پہلے والی بات نہیں رہی۔ ہمارے اپنوں نے صفیں توڑ کر ہمیں تتر بتر کر دیا ہے۔ اگر چند مہینے پہلے......" اختیار کو گھورتا دیکھ کر جنرل نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔ کچھ بھی ہو ناصر اور رحمت جیسے کچے پکے سیاستدانوں کے سامنے وہ اپنے راز بیان نہیں کر سکتے تھے۔

"ریاض توصیف پر تمہیں پورا یقین ہے؟ عین وقت پر دھوکہ تو نہیں دے گا؟" اختیار رضوی نے ناصر کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں، میری ایاز توصیف سے کچھ دیر پہلے بات ہوئی ہے۔ ہمارا فون ملتے ہی وہ بھی حرکت میں آ جائے گا۔" ناصر نے بڑے یقین سے کہا۔

"عامر نذیر نے ستر کروڑ روپے نکلوائے ہیں۔ آصفہ پیسے لے کر کل خود لاہور جانے والی ہے۔ ریاض توصیف کے آدمی ان کی بس میں سوار ہو کر مری چلے گئے تو تمہاری کہانی ختم ہو جائے گی۔" جنرل کے لہجے میں تشویش تھی۔ ناصر بھٹی نے اب اس پر حیرت کرنا چھوڑ دی تھی کہ ان بڈھوں کو اندر کی باتیں کیسے معلوم ہو جاتی ہیں۔

"ریاض توصیف ستر کے سامنے ایک سو چالیس کروڑ کی دیوار کھڑی کر دے گا۔ ایاز نے کہا ہے کہ وہ عامر نذیر کے ہر روپے کا دو روپے سے مقابلہ کرے گا۔ پیسوں میں وہ لوگ عامر نذیر سے کم نہیں پڑیں گے۔" ناصر بھٹی نے ایک بار پھر بڑے یقین سے کہا۔ برلاس اور رضوی دونوں کے ماتھوں کی لکیریں غائب ہونے لگیں۔

"توصیف آپ کے ساتھ ہیں تو پھر اور کون سی طاقت ہے؟" رحمت بھٹی اپنے سوال پر قائم تھا۔

"اپنے ماما سے پوچھو۔" اختیار رضوی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"رضا سروہی اپنی شیروانی ہاتھ میں لئے حلف اٹھانے کے لئے تیار بیٹھا ہے۔" ناصر نے ہنس کر بتایا۔

"رضا سروہی؟" رحمت نے حیرت سے کہا۔ "لیکن اس کی پارٹی تو ایک تانگے کی سواری کے برابر ہے۔ خود اس کے پاس مانگے کی سیٹ ہے۔"

"ایجنسی نے صدر سے کہا ہے کہ اسمبلی میں نمبروں کا کھیل کھیلنا مشکل ہو گا' سب کو پروں کے نیچے چھپا کر بیٹھنا آسان نہیں ہے۔ اس کھیل میں وہ پہلے بھی چوٹ کھا چکے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ صدارتی اختیار استعمال کر کے اسمبلی توڑنا سب سے آسان اور سیدھا حل ہے۔ رضا سروہی تین مہینے کے لئے پھر نگراں بننے کو تیار ہے۔" جنرل برلاس نے کہا۔

"مجھے حیرت ہے صدر نے ایجنسی کی بات نہیں مانی۔" فیروزہ نے کہا۔ وہ بھی اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے پاس ایک کرسی پر آ کر بیٹھ گئی تھی۔

"ہو سکتا ہے مان بھی لیں۔ اسی لئے ہم کچھ کرنے سے پہلے فون کے انتظار میں ہیں۔" اختیار رضوی نے کہا۔

"لیکن آپ تو کہتے تھے کہ....." رحمت نے کہنا چاہا۔ اس کے لہجے میں مایوسی سی آ گئی تھی۔

"ہاں ہمیں یقین تو ہے۔ لیکن اب اشارہ دینے والی طاقت ایک نہیں رہی۔ کئی طاقتوں میں بٹ گئی ہے۔ جب تک ان سب کے اشارے ایک طرف نہ ہو جائیں کچھ نہیں ہو گا۔"

"ہمیں جو یقین دہانی کرائی گئی ہے اس پر یقین کرنے کی وجہ بہت صاف ہے۔" ناصر بھٹی نے اس کی مایوسی دور کرنے کی کوشش کی۔ "صدر نے اگر اسمبلی توڑی تو تین مہینے میں انتخاب کرانے پڑیں گے۔ انتخاب میں ریاض توصیف کو جیتنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ صدر کو ریاض توصیف کا وزیراعظم بننا پسند نہیں ہے۔ ریاض توصیف جیتا تو وہ صدر کو اگلے سال دوبارہ منتخب نہیں ہونے دے گا۔ پھر سپریم کورٹ کو بھی آج کل اپنے با اختیار ہونے کا مرض لگ گیا ہے۔ صدر کو ڈر ہے کہ وہ ان کی اور جنرل کی بات نہ مانے اور حکومت کو بحال کر دے۔"

"ریاض توصیف کی مدد سے عدم اعتماد لا کر ہم برسراقتدار آئے تو.....؟" فیروزہ اسلم نے سوال کیا۔

"اسمبلی کی مدت ختم ہونے میں ابھی ڈیڑھ سال باقی ہیں۔ اس عرصے میں ہم عامر نذیر کے لوگوں کو توڑ سکیں گے۔ کابینہ کے بہت سے عہدے اسی لئے خالی رکھے ہیں۔ ہمارے ٹوٹے ہوئے دھڑے بھی ہم سے آ کر مل سکتے ہیں۔ حکومت ہماری ہو گی۔ طاقت کے ستون ہمارے پیچھے ہوں گے۔ صدر ہمارے ساتھ ہو گا۔ ڈیڑھ سال بعد انتخاب ہوں گے تو ہمارے لئے ریاض توصیف کو ہرانا مشکل نہیں ہو گا۔" ناصر بھٹی نے آنے والے اچھے دنوں کی روشنی دکھائی تو سب کے چہرے یقین سے چمکنے لگے۔

"ریاض توصیف یہ سب کچھ جان کر بھی ہمارا ساتھ دے رہا ہے؟" رحمت کو ابھی پورا یقین نہیں ہوا تھا۔

"ریاض توصیف کی سب سے پہلی ترجیح عامر نذیر کی حکومت ختم کرنا ہے۔

اس کے لئے آنے والا کوئی بھی کل آج سے زیادہ برا نہیں ہو سکتا۔ عامر نذیر نے اسے مقدموں کی دلدل میں پھنسا رکھا ہے۔ اس کے خاندان کے لئے کاروبار کرنا حرام کر دیا ہے۔ اس کے مکان کا جنگلہ تک اکھڑوا پھینکا ہے۔ ریاض کو سانس لینے کی جگہ چاہئے۔ عامر نذیر رہا تو اس کا دم اور گھٹ جائے گا۔ رضا سروہی آیا تو وہ بھی ریاض توصیف کا جینا آسان نہیں کرے گا۔ توصیف خاندان کے اچھے دنوں کی امیدیں صرف ہم سے وابستہ ہیں۔" ناصر بھٹی نے فیروزہ اسلم کی طرف فخر سے دیکھتے ہوئے کہا۔ فیروزہ بھی اسے واری ہونے والی نظروں سے دیکھنے لگی۔ تھوڑی دیر پہلے کے سارے گلے ذہن سے نکل گئے تھے۔ دور کی نگاہ رکھنے والا عظیم سیاستدان' کل کا وزیراعظم جو اس کا اور صرف اس کی زلفوں کا اسیر تھا۔ فیروزہ کو پاکستان ٹیلی ویژن کے مینجنگ ڈائریکٹر کے کمرے کے باہر لگی ہوئی پیتل کی تختی پر اپنا نام چمکتا ہوا نظر آنے لگا۔ دروازے کے باہر ٹی وی ڈراموں کے خوبرو ہیرو لائن لگائے کھڑے تھے۔ "وہ کسی کو گھاس نہیں ڈالے گی۔" اس نے سوچا۔ پھر بھی جانے کہاں سے طویل قامت' گھنے گھنگھریالے بالوں اور خوابیدہ آنکھوں والا اس کا پسندیدہ ہیرو مسکراتا ہوا سامنے آگیا۔ "ٹھیک ہے ٹی وی کے ہر ڈرامے کا ہیرو اب وہی ہو گا۔" فیروزہ کو اپنی سوچیں مزا دینے لگی تھیں۔

فیروزہ کے چہرے پر آتے جاتے رنگوں کی بہاریں دیکھ کر رحمت سوچ رہا تھا کہ اس کا ماما شیخوپورہ کب جائے گا۔ فیروزہ کی آنکھوں میں اپنے لئے تیرتے ہوئے پیغام وہ پہلے ہی پڑھ چکا تھا۔ فیروزہ اس کے معیار کی نہیں تھی۔ اسے بھری بھری شوخ لڑکیاں پسند تھیں۔ لیکن اسے دیکھنا تھا سانولے رنگ کی سوکھی سی فیروزہ کے بدن میں وہ کون سی بجلیاں بھری ہوئی تھیں جو اس کے ماموں کو اتنا بے تاب کر گئی تھیں۔

اختیار حیدر رضوی مطمئن ہو کر اونگھنے لگا۔ لیکن بوڑھا جنرل پیسوں والے بریف کیس کا ہینڈل مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہوشیار بیٹھا تھا اور نگاہیں ناصر بھٹی کے سامنے رکھے ہوئے نیلے رنگ کے فون پر گڑی ہوئی تھیں۔ جنگ کا بگل بجنے ہی والا تھا۔ لیکن ناصر بھٹی کو اب انتظار کی تاب نہیں رہی تھی۔ اس نے سوچا فون آئے نہ

آئے وہ اب فیروزہ کو لے کر اوپر چلا جائے گا۔ اس کے پیچھے فون آیا بھی تو جنرل برلاس بات کر لے گا۔ وہ اٹھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ فون کی گھنٹی نے سب کو اپنے اپنے خیالوں سے چونکا دیا۔ رضوی چوکنا ہو کر بیٹھ گیا۔ رحمت کرسی سے اچھل کر کھڑا ہو گیا' فیروزہ جنرل کانی کو دیکھنے لگی جو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی تھی اور سرخ ڈبیا سے آنکھ نکال کر لگانے کی کوشش کر رہی تھی۔ سکتے میں آئے ہوئے ناصر بھٹی نے تیسری گھنٹی پر ریسیور اٹھا کر کانوں سے لگا لیا۔

وزیراعظم ریاض توصیف

ریاض توصیف سب کو چھوڑنے ڈرائنگ روم کے دروازے تک گیا تھا اور واپس آکر سفید بے داغ صوفے پر بیٹھ کر قہوے کے گھونٹ لے رہا تھا۔ اسے ایاز توصیف کا انتظار تھا جو مہمانوں کو رخصت کرنے باہر کے دروازے تک گیا تھا۔ اہم مہمانوں کو خدا حافظ کہنے کے کام کو دونوں بھائیوں نے اسی طرح تقسیم کیا ہوا تھا۔ انہیں وڈیروں کی طرح بیٹھے بیٹھے ہاتھ ملا کر خدا حافظ کہنے کا سرپرستی کرنے والا انداز پسند نہیں تھا۔ جب وہ وزیراعظم تھا اس وقت بھی اس نے رخصت کرنے کے لئے دروازے تک جانے کی روایت ترک نہیں کی تھی۔ اس وقت جنہیں خدا حافظ کہا تھا وہ تو اس کی پارٹی کا اعصابی نظام تھے۔ ہزارہ کے خان' گجرات کے چوہدری' پنڈی کے شیخ' نواب شاہ کے شاہ' کوئٹہ کے سردار' کراچی کے دہلوی دو اور دو چار کا ماہر سابق بیوروکریٹ اور وہ سابق ایڈیٹر جس کی پہنچ امریکہ تک تھی۔ آج سب جہاں جہاں تھے وہاں سے اپنی ہر مصروفیت چھوڑ کر ریاض توصیف کے گھر بروقت پہنچ گئے تھے اور کھانے میں ان کے ساتھ شریک ہوئے تھے۔ ان سب کے اپنے اپنے معتبر ذرائع

تھے۔ توصیف کا فون آنے سے پہلے ہی ان تک اطلاع پہنچ چکی تھی کہ آج کی رات کرامات والی رات ہے۔ آج کچھ ہونے والا ہے اور جو کچھ ہونے والا ہے ان کے لئے اچھا ہونے والا ہے۔ آج سب نے نوالے نہیں چبائے تھے۔ اپنی بھوک کو غور و فکر کی نذر نہیں کیا تھا بلکہ ڈٹ کر اور مزے لے کر کھایا تھا۔ جی کھول کر قہقہے لگائے تھے۔ ایاز توصیف نے اعلان کیا تھا:

"آج کی رات بلڈ بینک (Blood Bank) کی چوکیداری سے ڈریکولا کو برطرف کر دیا جائے گا۔" اور پھر انار کے تازہ رس سے بھرے ہوئے گلاس کو ہونٹوں سے لگا کر ایک ہی سانس میں خالی کر دیا تھا۔ شیخ کا ذہن گنگنایا تھا "لو پیو خون دل کی کشید۔"

ابھی تک صرف یہی پتہ تھا کہ عامر نذیر کی حکومت آج جانے والی ہے۔ یوم نجات آ گیا ہے۔ یہ پتہ نہیں تھا کہ نیا چوکیدار کون ہو گا۔ سب کا خیال تھا کہ ریاض اور ایاز توصیف کو خبر ہو گی۔ ریاض توصیف کو بھی ابھی نہیں معلوم تھا۔ شاید ایاز کو پتہ ہو۔ نہیں ہے تو پتہ ہو جائے گا۔ ریاض توصیف میز پر ایک قطار میں رکھے ہوئے آلات صوت میں سبز پتھر کے بنے ہوئے فون کو دیکھنے لگا۔ اس فون کا نمبر جس کے پاس تھا اسے معلوم ہو گا۔ اس فون کی گھنٹی رات میں کسی وقت بھی بج سکتی تھی۔ ریاض بے چینی سے ایاز توصیف کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ اسے اکیلے میں ایاز سے بات کرنی تھی۔ صورتحال کو سمجھانا تھا۔ فیصلے کرنے تھے۔

ایاز توصیف اپنی پارٹی کے رہنماؤں کو رخصت کرتے وقت شاید پھر کسی بحث میں الجھ گیا تھا۔ ریاض توصیف کو بیٹھے بیٹھے کشمیری پلاؤ کی ڈکاریں آنے لگیں۔ اس نے اپنے موٹے ہوتے ہوئے سراپے کو دیکھ کر سوچا اسے اب کھانے میں احتیاط کرنی پڑے گی۔ صبح ناشتے میں مرغ چھولے اور پراٹھے' دوپہر کے کھانے میں نان اور پائے اور اب رات میں قورمہ پلاؤ اور پستے کی آئس کریم۔ کھانے کے اس مینو کو بدلنا پڑے گا۔ ملازم کو آواز دے کر ریاض توصیف نے قہوے کی ایک اور پیالی طلب کی۔ زیادہ کھانے کی وجہ سے طبیعت بوجھل ہو رہی تھی۔ کوئی اور رات ہوتی تو اب تک سونے کے کمرے میں چلا گیا ہوتا۔ اسے معلوم تھا اس کی بیوی سو چکی ہو گی۔ ایک

وقت تھا جب اس کی بیوی کو بچے جگائے رکھتے تھے۔ لیکن اب بچے بڑے ہو گئے تھے اور اپنے سونے جاگنے کا حساب خود رکھ سکتے تھے۔ اس کی بیوی کے جلدی سونے کی وجہ اس کا جلدی اٹھنا تھا۔ وہ اپنے نمازی سسر کو فجر پڑھنے سے پہلے اپنے ہاتھوں سے چائے بنا کر پلاتی تھی۔ جب سے وہ اس گھر میں آئی تھی اس نے یہ فرض اپنے ذمہ لے لیا تھا۔ اب تو ایسی عادت ہو گئی تھی کہ جب اس کا سسر گھر سے باہر گیا ہوتا تب بھی چائے لے کر اس کے کمرے میں پہنچ جاتی اور اسے نہ پا کر چائے خود پیتی، کمرے میں بچھے ہوئے اپنے سسر کے مصلے پر نماز پڑھ کر اپنے کمرے میں واپس آتی اور ریاض توصیف کے جاگنے کے انتظار میں دوبارہ سو جاتی۔

ریاض نے قہوے کا پیالہ میز پر رکھ کر دیوار پر لگی ہوئی اپنی اور اپنی بیوی کی شادی کے زمانے کی تصویر کو دیکھا۔ اس وقت ریاض کا اپنا جسم کتنا متناسب تھا۔ سر بھی بالوں سے بھرا ہوا تھا۔ چھریرے بدن والی بہت نازک سی اس کی بیوی شرمائی ہوئی اس کے پہلو میں کھڑی تھی۔ ''شادی کے بعد بیویاں موٹی اور شوہر گنجے کیوں ہو جاتے ہیں؟'' اس نے ایک ہاتھ سے اپنی توند اور دوسرے ہاتھ سے بالوں سے بے نیاز سر کو سہلاتے ہوئے سوچا۔ ہر بچے کے بعد اس کی بیوی نے اپنے وزن اور حجم میں اضافہ کر لیا تھا۔ ''ایک وہ بھی تو ہے۔'' کسی کا سراپا نگاہوں میں سمایا تو ہونٹوں پر خود بخود ایک مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ جس کے بارے میں ریاض توصیف کا خیال تھا کہ اس کی کمر کا ناپ اس کی گردن کے برابر تھا۔ کیا صراحی دار گردن تھی۔ کندھوں سے کم از کم ایک بالشت اونچی۔ اس نے خود ناپ کر دیکھی تھی۔ فاصلہ طویل تھا اسی لئے سر بھی زیادہ میٹھے ہو کر نکلتے تھے۔ کمر بھی ایسی ہی تھی۔ ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے۔ اس نے سوچا آنے والے چند روز گزر جائیں گے تو اسے لے کر دور کہیں جائے گا اور سکون کے کچھ دن گزار کر آئے گا۔ لیکن اس دفعہ سنگاپور نہیں جائے گا۔ سنگاپور کا نام آتے ہی خریداری کے علاوہ کسی اور چیز کا خیال ہی نہیں آتا۔ عمارتوں کے اس جنگل میں خریداری کے علاوہ کوئی کر بھی کیا سکتا تھا۔ ریاض توصیف نے بھی خریداری ہی کی تھی۔ ہیروں کا نیکلس خرید کر اس کے گلے میں ڈالتے ہوئے پہلی بار شاعری بھی کی

تھی۔

"تمہاری گردن کے سفر نے میرے ہاتھ تھکا دیئے۔" وہ سن کر شرمائی نہیں بلکہ اسے حیرت سے دیکھنے لگی۔

"ایسے میٹھے بول تو کبھی ایک شاعر میرے کانوں میں گنگنایا کرتا تھا۔" اس نے سوچا تھا مگر وہ کیا کرتی' زمانہ صاحب زر اور صرف شاعر تو۔ ہیروں کی چکاچوند آنکھوں کو خیرہ کرنے لگی تو اس نے بانہیں ریاض توصیف کے گلے میں ڈال دی تھیں۔

ریاض توصیف نے سوچا وہ اگر اپنا جہاز لے کر نہیں جاتا تو کسی کو پتہ بھی نہیں چلتا۔ اخباروں میں اسکینڈل بھی نہیں بنتا۔ اس نے اس زمانے میں نیا نیا جہاز لیا تھا۔ اس پر سب کی نظر تھی۔ بات چھپی نہ رہ سکی تھی۔ لیکن وہ اپنا جہاز لے کر نہ جاتا تو شاید وہ جاتی بھی نہیں۔ جہاز میں کسی کے ساتھ اکیلے سفر کرنے کا رومانس ایسا تھا کہ منع نہیں کر سکی تھی۔ دراصل جانے کے لئے انہوں نے غلط جگہ کا انتخاب کیا تھا۔ سنگاپور ان کے جانے کی جگہ نہیں تھی۔ گلی گلی پاکستانی گھومتے نظر آتے تھے۔ کون تھا جو ان دونوں کو نہیں پہچانتا تھا۔ کتنا بھی چھپ کر رہیں' کبھی باہر تو نکلنا تھا۔ اور پھر وہ جیولر جس سے اس نے ہیروں کا ہار خریدا تھا۔ جب بیوی اور بچوں کو سنگاپور لے کر گیا تھا تو وہ جیولر انہیں دیکھ کر کتنے معنی خیز انداز میں مسکرایا تھا۔ ریاض کو پتہ تھا اس کی بیوی جیولر کی ان معنی خیز نگاہوں کا مطلب جانتی ہے۔ اس نے بھی اخباروں میں ہیروں کی کہانی پڑھی تھی۔ لیکن اسے اپنی بیوی کی یہ بات پسند تھی کہ اس نے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ ریاض توصیف جھوٹ بولنے کے امتحان سے بچ گیا تھا۔ ریاض توصیف نے کاروبار کے جھوٹے بہی کھاتوں کی طرح سیاست میں بھی بہت کچھ سیکھا تھا۔ جھوٹ بولنا' وعدے کرنا اور پھر انہیں بھول جانا' کسی سے کسی وقت کچھ بھی کہہ کر مکر جانا۔ ہر سچی بات کی تردید کرنا اور کسی بھی جھوٹی بات کو سچ کہہ دینا۔ لیکن تین لوگ ایسے تھے جن سے وہ جھوٹ نہیں بول سکتا تھا۔ اپنے باپ نیاز توصیف' بھائی ایاز توصیف اور اپنی بیوی معصومہ توصیف سے۔ وہ اسے جھوٹ بولنے کا موقع دیتے بھی نہیں تھے۔ کوئی ایسی بات نہیں پوچھتے جو انہیں جاننے کی ضرورت نہیں

تھی۔

اس نے سوچا اس دفعہ وہ اسے تھائی لینڈ کے جزیرے پھوکٹ لے کر جائے گا جہاں یورپ اور امریکہ کے سیاح جاتے ہیں۔ پاکستانیوں کی نگاہوں سے دور، کسی کی مداخلت سے بے نیاز، سکون کے چند دن جنت جیسے جزیرے میں گزار کر آئے گا۔ وہ دن میں ساحل پر پڑی ہوئی جھولے جیسی کرسی پر بیٹھی انناس کا شربت پیتے ہوئے اسے سمندر کے ٹھنڈے پانی میں ڈبکیاں لگاتے دیکھ کر شرمائے گی۔ شام کو جب اس کے رخسار پر شفق اتر آئے گی تو دونوں ساحلی ریستوران میں بڑے بڑے لابسٹر اور جمبو سائز کے جھینگے چھیل کر کھانے اور ایک دوسرے کو کھلانے کا کھیل کھیلیں گے۔ رات کو وہ اپنی شلوار کے پائینچے اٹھائے ساحل کی گیلی ریت پر ٹہلے گی تو چاندنی میں چمکتی ہوئی پنڈلیوں کو دیکھ کر اس کے ہاتھوں سے ناریل گر پڑے گا۔ پھر دونوں گرم بھاپ اڑاتی کافی کے مزے لے کر ہوٹل کے سوانا میں پسینہ بہائیں گے یا پینٹ ہاؤس جیسے ہوٹل کے کمرے میں غسل خانے کی تکونی حوض SPA میں جا بیٹھیں گے جہاں پانی کی جھاگ اڑاتی فوارے جیسی تیز دھاریں ان کا بدن گدگدائیں گی۔ وہ شیشے کے سامنے بیٹھی اپنی کھلی ہوئی گھنی زلفوں کے بل نکالے گی اور وہ سونے سے پہلے گرم گرم دودھ کا ایک گلاس پئے گا۔ کیسی مزے کی نیند آئے گی۔ خوابوں سے بے نیاز، گہری اور میٹھی نیند۔

ریاض توصیف کو سوچتے سوچتے سچ مچ جھونکا آ گیا۔ لیکن آنکھوں میں سپنا ابھی تک جاگ رہا تھا۔ اس نے سر کو جھٹک کر نیند بھگانے اور سپنا بھولنے کی کوشش کی۔

"ایاز صاحب باہر کیا کر رہے ہیں۔" اس نے قہوے کے خالی پیالے اٹھانے کے لئے آنے والے ملازم سے پوچھا۔

"باہر گاڑی کے پاس کھڑے صاحب لوگوں سے باتیں کر رہے ہیں۔" نوکر پیالیاں سمیٹ کر چلا گیا۔ ریاض توصیف کو معلوم تھا شیخ اسے آصفہ اور عامر نذیر کے لطیفے سنا رہا ہو گا۔ شیخ لطیفوں اور ذومعنی گفتگو کا ماہر تھا لیکن ریاض توصیف کے سامنے محتاط رہتا تھا۔ اب ایاز توصیف کو اکیلا پا کر نئے سیاسی لطیفوں کا ذخیرہ اگل رہا ہو گا۔

ریاض کو معلوم تھا کہ اس کا بھائی وقت ضائع کرنے کا قائل نہیں تھا۔ لیکن آج کی رات مختلف تھی۔ آج کی رات اس طویل رات کا اختتام بن کر آئی تھی جو ان کے ساتھیوں اور خاندان نے گزاری تھی۔ اس لئے ایاز توصیف بھی اپنے اعصاب ڈھیلے چھوڑ کر لطیفوں میں شامل ہو گیا ہو گا۔

ریاض توصیف نے گھڑی دیکھی۔ ابھی صرف نو بجے تھے۔ وہ ٹی وی کا ریموٹ کنٹرول اٹھا کر چینل بدلنے کا شغل کرنے لگا۔ اسپورٹس چینل پاکستان اور آسٹریلیا کے درمیان کرکٹ میچ کی ریکارڈنگ دکھا رہا تھا۔ یہ میچ اس نے نہیں دیکھا تھا اور سب کو منع کر دیا تھا کہ کوئی اسے میچ کا نتیجہ نہ بتائے' وہ میچ دیکھنے کا مزا ختم نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن چوہدری صاحب نے آتے ہی میچ جیتنے کی مبارکباد دے کر سارا تجسس ختم کر دیا تھا۔ وہ مسکرا دیا تھا لیکن دل میں کھول کر رہ گیا تھا۔ پھر یہ سوچ کر خود کو تسلی دی تھی کہ جیتا ہوا میچ دوبارہ بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ ۱۹۹۲ء کے ورلڈ کپ کے سیمی فائنل اور فائنل اس نے اتنی بار دیکھے تھے کہ اسے ہر گیند اور ہر شاٹ یاد ہو گیا تھا۔ اب بھی جب کوئی اہم فیصلہ کرنا ہوتا تو وہ اس میچ کا ٹیپ لگا کر بیٹھ جاتا۔ کہتا تھا اس طرح اسے فیصلہ کرنے کی طاقت ملتی ہے۔ ریاض توصیف کی اس کمزوری سے سب واقف تھے۔ جب وہ وزیراعظم تھا تو کابینہ کے اجلاس اور اہم ملاقاتیں اس طرح طے کی جاتیں کہ وہ کرکٹ کے کسی اہم میچ سے متصادم نہ ہوں۔ کم اہم ملاقاتوں کا مسئلہ نہیں تھا کیونکہ وہ میچ دیکھتے ہوئے بھی کی جا سکتی تھیں۔ ایک دفعہ ورلڈ کپ کے ایک اہم میچ کے دوران کابینہ کا اجلاس رکھ لیا گیا تھا۔ پرنسپل سیکرٹری نے اصرار کیا تھا کہ اجلاس ملتوی نہ کیا جائے' چاروں صوبوں کے وزرائے اعلیٰ آ گئے ہیں' اہم فیصلے کئے جانے ہیں لیکن ریاض توصیف کو پرواہ نہیں تھی۔

"کابینہ کا اجلاس دوبارہ ہو سکتا ہے۔ میچ دوبارہ نہیں ہو گا۔" اس نے کہا تھا اور وزیراعظم ہاؤس میں اپنے دفتر سے اٹھ کر اوپر اپنے رہائشی کمروں کی طرف چلا گیا تھا۔

کرکٹ ریاض توصیف کا ایک ٹوٹا ہوا سپنا تھا۔ جب وہ کالج میں تھا تو کرکٹ کی

دنیا میں تہلکہ مچانے کے خواب دیکھتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کے مستقبل میں لوہا کوئلے والی فیکٹریاں لکھی ہیں۔ باپ کی گدی اسی کو سنبھالنی تھی۔ سیاست کے بارے میں تو سوچا بھی نہیں تھا۔ سیاست سے اسے زیادہ دلچسپی تھی بھی نہیں۔ لیکن کاروبار سنبھالنے سے پہلے وہ کرکٹ کی دنیا میں نام پیدا کرنا چاہتا تھا۔ اس کی ماں دن رات اس کھیل کو کوستی تھی جس نے اس کے بیٹے کا دودھیا جیسا رنگ سانولا کر دیا تھا۔ کھانا پینا تک بھلا دیا تھا۔ اس کا باپ اس کے شوق کی راہ میں کبھی رکاوٹ نہیں بنا۔ شوق پورا کرنے کے لئے وسائل کی کمی نہیں تھی۔ لندن میں کرکٹ کی اکیڈمی گرمیوں میں جو کیمپ لگاتی اس میں ہر سال شریک ہوتا۔ لیکن اس کی کرکٹ کھیلنے کی کارکردگی ایک مقام پر آکر ٹھہر گئی تھی۔ ایسی ٹھہری تھی کہ اس کے باپ کے تعلقات بھی اسے قومی ٹیم میں شامل نہ کرا سکے۔ تعلقات نے ٹرائل تک پہنچا دیا تھا اور دوستوں نے وعدہ بھی کیا تھا کہ اس کی گیند پر آؤٹ ہو کر اس کے امکانات بڑھا دیں گے۔ لیکن وہ دوست آؤٹ ہونے کی کوشش کے باوجود آؤٹ نہ ہو سکے۔ اس کی کوئی گیند وکٹوں کو نشانہ نہ بنا پائی۔ شرمندہ ہو کر واپس آیا تو اس کے بعد دوبارہ کرکٹ کے میدان میں واپس نہیں گیا۔ کم از کم کھیلنے کے ارادے سے نہیں گیا۔ صرف ایک بار جب وزیراعلیٰ تھا تو نمائشی میچ کھیلا تھا۔ چوکے چھکے لگا کر بہت خوش ہوا تھا۔ لیکن اندر سے شرمندہ تھا۔ اسے معلوم تھا کہ گیند کرنے والے اس کے عہدے کا لحاظ کر رہے تھے۔

کاروبار میں شریک ہوا تو اسی زمانے میں اس کے بارے میں ایک اور فیصلہ ہو گیا۔ اسے سیاست میں حصہ لینا تھا۔ ریاض توصیف کا خیال تھا ایاز توصیف سیاست کے لئے زیادہ موزوں ہے۔ لیکن ایاز اس وقت پوری طرح تیار نہیں تھا۔ اور ان کے پاس انتظار کا وقت نہیں تھا۔ کاروبار چمکانے کے لئے اقتدار میں رہنا اور اقتدار میں رہنے کے لئے سیاست کرنا ضروری تھا۔ موقع ہاتھ سے نکل جاتا تو دوبارہ مشکل سے آتا۔ سیاست میں آیا تو پھر اسے پیچھے مڑ کر دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ وزیراعظم تک بن گیا، لیکن دل سے اس ناکامی کی کسک نہیں گئی جس کا سامنا اس نے کرکٹ کے میدان میں کیا تھا۔ کتنا آسان تھا وزیراعظم بننا اور کتنا ناممکن تھا کرکٹر بننا۔ اسے یقین نہیں

آیا تھا جب دنیا بھر میں اپنی کرکٹ کے لئے مشہور اس کے دوست نے وزیراعظم بننے کے لئے اپنا سیاسی سفر شروع کیا تھا۔ اسے حیرت تھی کہ جو کرکٹ کے آسمان پر پہنچ گیا ہو وہ وزیراعظم جیسی پستی میں کیوں گرنا چاہتا تھا۔ یہ ریاض توصیف کے لئے ایسا ہی تھا جیسے ہاتھی پر بیٹھا ہوا سکندر گدھے پر بیٹھنے کی تمنا کرنے لگے۔ سیاست اس کے لئے بریف کیسوں کا کھیل تھی۔ سیدھا سادھا دو اور دو چار والا کھیل۔

فون کی گھنٹی نے اسے اپنے خیالوں سے چونکا دیا۔ یہ گھنٹی اس فون کی نہیں تھی جس کے بجنے کا اسے انتظار تھا۔ یہ بے تار کا سفید فون تھا۔ لیکن یہ بھی براہ راست لائن تھی۔ اس کا نمبر بھی صرف خاص لوگوں کے پاس ہی تھا۔ فون اٹھا کر سلام دعا کے بعد دوسری طرف سے ہونے والی گفتگو سن کر "ہوں ہوں" کرتا رہا۔ فون بند ہوا تو میچ کے آخری دلچسپ اوور شروع ہو گئے تھے۔ اعجاز نے ابھی ابھی دو لگاتار چھکے مارے تھے۔ ریاض توصیف کے خون کی گردش تیز ہو گئی۔ ساری توجہ ٹی وی کے اسکرین پر مرکوز ہو گئی تھی۔ اسی وقت ایاز بھی ڈرائنگ روم میں آ گیا' اسے پتہ تھا اس وقت ریاض توصیف کو ٹوکنا ٹھیک نہیں ہے۔ اس لئے خاموشی سے صوفے پر بیٹھ کر فیکس اور فون کے وہ پیغامات پڑھتا رہا جو باہر دفتر میں بیٹھے ہوئے ریاض توصیف کے سیکرٹری نے اسے دیئے تھے۔ باہر کے دفتر میں فون کی گھنٹیاں مسلسل بج رہی تھیں لیکن سیکرٹری کو ہدایت تھی کہ کسی کا بھی فون اندر منتقل نہ کیا جائے۔ جن کی فون کال اہم ہو سکتی تھی ان کے پاس براہ راست فون کرنے کے لئے نمبر موجود تھا۔ میچ ختم ہوتے ہی ریاض توصیف نے ٹی وی بند کر دیا۔ اسے آسٹریلوی مبصر کی اس کمنٹری میں کوئی دلچسپی نہیں تھی جس میں وہ جیتنے والی پاکستانی ٹیم کی کارکردگی کی جگہ ہارنے والی آسٹریلوی ٹیم کے اچھے کھیل کی تعریف کرتے ہوئے خراب وکٹ کو ان کی شکست کی وجہ قرار دے رہا تھا۔

"چوہدری صاحب نے نتیجہ بتا کر آپ کے میچ کا مزا خراب کر دیا۔" ٹی وی بند ہوتے ہی ایاز نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس نے پڑھنے والا چشمہ اور سرخ قلم جس سے وہ پیغامات پر نشان لگا رہا تھا جیب میں رکھ لئے تھے۔

''چوہدری صاحب نے کبڈی کے علاوہ زندگی میں کوئی کھیل نہیں کھیلا۔ پچھلی بار جب کابینہ میں تھے تو مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ کبڈی کو اولمپکس میں کس طرح شامل کرایا جائے۔'' ایاز توصیف ہنسنے لگا۔

''مجھے معلوم تھا آج میچ دیکھنا مشکل ہو گا۔ میں نے بھابھی کو بتا دیا تھا' انہوں نے بچوں سے کہہ کر میچ ریکارڈ کرا لیا ہے۔'' ایاز نے بتایا تو ریاض سرہلا کر سوچنے لگا ایاز کو چھوٹی چھوٹی باتیں بھی کس طرح یاد رہتی ہیں۔

''شیخ کوئی نیا لطیفہ سنا رہا تھا یا پرانے قصے ہی دہرا رہا تھا۔'' ریاض توصیف نے پوچھا۔

''اس کے لطیفوں کا ذخیرہ ختم ہو گیا ہے۔ عامر نذیر کا نام ڈال کر سکھوں کے پرانے لطیفے سنا رہا تھا۔'' ایاز توصیف نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کبھی کبھی وہ حد سے بڑھ جاتا ہے۔ اسے سمجھاؤ کہ لطیفوں کے ذریعے شہرت حاصل کر کے وہ پیر تو بن سکتا ہے وزیراعظم نہیں بن سکتا۔'' ریاض توصیف نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

''وہ اب آپ کے حق میں دستبردار ہو گیا ہے۔ کہتا ہے جب تک آپ ہیں وہ وزیراعظم بننے کے بارے میں سوچے گا بھی نہیں۔'' ایاز توصیف پھر مسکرایا۔

''ہماری پارٹی میں کون ہے جس نے مجھ پر یہ احسان نہ کیا ہو۔'' ریاض توصیف نے سرہلاتے ہوئے کہا۔

''اس میں ان کا کوئی قصور نہیں ہے۔ وزیراعظم بننا آج کل سب سے آسان کام بن گیا ہے۔ جس کا نام تین چار بار اخبار کی سرخیوں میں آ جائے اور صدر سے ایک دو بار ملاقات کر لے وہ خود کو وزیراعظم کا امیدوار سمجھنے لگتا ہے۔ آج رات کم از کم آدھے درجن لوگ شیروانیاں سنبھالے تیار بیٹھے ہیں۔ سب نے اپنی اپنی کابینہ بنا رکھی ہے اور سب کا خیال ہے کل وزیراعظم کا حلف وہی اٹھائیں گے۔'' ایاز توصیف بولا۔

''اسلام آباد میں کوئی ایسا بھی ہے جسے یہ نہیں معلوم کہ آج رات عامر نذیر

کی حکومت جانے والی ہے؟" ریاض توصیف نے پوچھا۔
"ایک شخص ہے۔ بلکہ ایک نہیں دو۔"
"کون؟"
"عامر نذیر اور اس کی بیوی آصفہ فریال۔" ریاض توصیف ہنس پڑا۔ لیکن ایاز توصیف کی سنجیدگی اسی طرح قائم تھی۔
"پیر کرامت نے انہیں یہ یقین دلا دیا ہے کہ اگلے سال کے آخر تک ان کی حکومت کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ انہیں تو شاید یہ بھی نہیں معلوم کہ پیر حقہ اور ملا ٹوپی جنہیں وہ انکل کہتے ہیں اور آصفہ کا منہ بولا بھائی شیر پنجاب تینوں اس وقت رضا سروہی کے پاس بیٹھے نئی حکومت میں شامل ہونے کی تیاری کر رہے ہیں۔"
"یہ لوگ نا اہل ہی نہیں بیوقوف بھی ہیں۔ انہوں نے خود اپنے تجربوں سے کوئی سبق نہیں سیکھا۔ ان کے بھائی اور انکل وہ لوگ ہیں جو اقتدار کے لئے اپنے سگے بھائیوں کی لاشیں روند کر گزر جاتے ہیں' باپ کی آنکھیں نکال لیتے ہیں۔" ریاض توصیف نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔
"فون آنے میں ابھی دیر ہے۔ ابھی تک شاید کھچڑی پک رہی ہو گی۔ نام کٹ رہے ہوں گے۔ نئے نام لکھے جا رہے ہوں گے۔" ایاز نے سبز ماربل کے فون پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔
"چودھری' شیخ اور زاہدہ میں سے تم نے کس کا نام بھیجا ہے۔" ریاض توصیف پوچھنا بالکل ہی بھول گیا تھا۔
"زاہدہ حسین کا۔ چوہدری اور شیخ کو تین مہینے کے لئے وزیر بننے میں دلچسپی نہیں ہے۔ لیکن زاہدہ جلدی میں لگتی ہے۔ کسی نے اسے رضا سروہی کے وزیراعظم بننے کی خبر سنا دی ہے۔ ہم سے چھپ کر اس سے ملاقاتیں کر رہی ہے۔"
"یہ عورت اب میرے اعصاب پر سوار ہونے لگی ہے۔" ریاض توصیف نے ماتھے پر بل ڈال کر کہا۔ "اس کا شوہر ایوان صدر کے چکر لگا کر اخباروں میں اپنے وزیراعظم بننے کی افواہیں چھپوا رہا ہے۔ مجھ سے کہتی ہے خبر اخبار والوں نے اپنی طرف

سے بنا کر چھاپی ہے۔"

"الیکشن تک برداشت کرنا پڑے گا۔ بعد میں سفیر بنا کر ایران، لیبیا یا شمالی کوریا بھجوا دیں گے۔ اسے ڈپلومیٹ بننے کا بہت شوق ہے۔ رضا سروہی نے بھی شاید اسے سفیر بنانے کا دانہ ڈالا ہے۔" ایاز توصیف نے لاپرواہی کے انداز میں کہا۔

"رضا سروہی کا نام مت لو۔ تمہیں پتہ ہے کہ مجھے اس آدمی سے چڑ ہے۔" ریاض توصیف نے ناگواری سے کہا۔ "یہ آدمی جو پرچون کی ایک دکان نہیں چلا سکتا وہ ملک چلانا چاہتا ہے۔ سمجھتا ہے حکومت اس کے باپ کی جاگیر ہے۔ جب چاہا دعویٰ کر دیا۔ ایجنسی والوں کو رضا سروہی کے سوا کوئی اور نہیں ملتا؟" ریاض توصیف نے اپنا سارا غصہ رضا سروہی پر نکال دیا۔ ایاز جانتا تھا کہ رضا سروہی نے ان کا اتحادی بن کر کتنا پریشان کیا تھا۔

"ایجنسی والے کوئی پرانا ادھار چکانا چاہتے ہیں۔ ان کا خیال ہے تین مہینے کی بات ہے۔ وفادار آدمی ہے۔ بیٹھنے کو کہیں گے ضد نہیں کرے گا۔ شریف آدمی ہے اس لئے کسی کو کوئی اعتراض بھی نہیں ہو گا۔" ایاز توصیف نے ریاض توصیف کا غصہ کم کرنے کے لئے کہا۔

"شرافت نا اہلی کا دوسرا نام ہے۔ اس احمق کو یہ بھی نہیں معلوم کہ ایجنسی اب پہلے والی ایجنسی نہیں رہی۔ اسے چلانے والا وہ ہاتھ کٹ چکا ہے جو کسی کے سر پر بھی ہما بٹھا دیتا تھا۔ ایجنسی وہی کرے گی جو اسے کرنے کے لئے کہا جائے گا۔" ریاض توصیف کا غصہ ابھی دھیما نہیں ہوا تھا۔

"تھوڑی ہی دیر میں اسے خود پتہ چل جائے گا۔ آج رات کے بعد اس کے پاس اس گانے والی کی ماں کے علاوہ کوئی اور نہیں بچے گا۔" ایاز توصیف نے بات ختم کرنی چاہی۔

"ہمیں فنکاروں کا تذکرہ احترام سے کرنا چاہیے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو دنیا میں ہمارے ملک کا نام اونچا کرتے ہیں۔" ریاض توصیف نے سرد لہجے میں کہا۔ ایاز توصیف نے نظریں جھکا لیں۔ کیسی بیوقوفی ہوئی تھی۔ سب کچھ جانتے ہوئے بھی بے

خیالی میں کیسا جملہ زبان سے نکل گیا تھا۔

"ناصر بھٹی بار بار کیوں فون کر رہا ہے۔" ریاض نے بات بدلتے ہوئے پوچھا۔

"ہماری دی ہوئی یقین دہانی تازہ کرانا چاہتا تھا۔ اس کا بھانجا اس کے چالیس ممبروں کو چھپاتا پھر رہا ہے۔ جنرل کانی ان کے لئے لڑکیاں ڈھونڈ رہی ہے۔ جنرل برلاس اور رضوی اس کے ساتھ بیٹھے ایوان صدر سے آنے والے فون کا انتظار کر رہے ہیں۔" ایاز توصیف نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ناصر بھٹی سمجھتا ہے اقتدار بھنگی کی توپ ہے' آنکھ بچی اور اٹھا کر لے بھاگے۔ بڈھوں کو یقین بھی آ گیا ہے۔ ان کا خیال ہے ناصر بھٹی کو وزیراعظم بنوا کر میراج طیاروں کی ڈیل حاصل کر لیں گے۔ بیوقوف بڈھے۔" ریاض توصیف کے لہجے میں بہت حقارت تھی۔

"بیوقوف وہ نہیں اسلحے کے ڈیلر ہیں جنہوں نے پیسے دیئے ہیں۔ مارکیٹ میں ۲۲ کروڑ کی خبر ہے۔ ناصر بھٹی ۱۴ کروڑ بتا رہا ہے۔" ایاز نے بتایا۔

"بڈھوں نے ۸ کروڑ درمیان میں اچک لئے ہوں گے۔ باقی ناصر' اس کا بھانجا اور جنرل کانی کھا جائیں گے۔" ریاض نے کہا اور پھر کچھ سوچ کر بولا۔ "جنرل کانی کی بیٹی کیا اب بھی ناصر کے پاس ہے؟ آج اس کا فون آیا تھا۔ کہتی تھی انٹرویو کرنا ہے۔"

"ابھی تک ہے لیکن کل نہیں رہے گی۔ کل ناصر کو سب سے پہلے ماں بیٹی چھوڑ کر بھاگیں گی۔ اس کے بھانجے نے سب کو بتا رکھا ہے کہ وہ وزیر خزانہ بننے والا ہے۔" ایاز توصیف نے مسکرا کر کہا۔

"کل کے بعد ناصر کے پاس یہی ایک بھانجا بچا رہ جائے گا۔" ریاض توصیف بھی کھل کر مسکرایا۔

"رہے گا تو بچے گا۔" ایاز کے لہجے میں تشویش تھی۔ "چوہدری کہتے ہیں وہ اسے چھوڑیں گے نہیں۔ وہ اپنے آدمیوں کا قتل ابھی تک بھولے نہیں ہیں۔"

"ہم بھی نہیں بھولے۔ اور ایک ناصر کا بھانجا ہی نہیں ہے۔ بہت سے ہیں۔ کئی بدلے چکانے ہیں۔ لیکن ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔ چوہدریوں کو سمجھا دو خود پر

قابو رکھیں۔ الیکشن تک کچھ اور نہیں کرنا۔ صرف الیکشن لڑنا ہے۔" ریاض توصیف بھی سنجیدہ ہو گیا تھا۔

"میں نے چوہدری صاحب کو سمجھایا ہے۔ کل سب اسلام آباد میں ملیں گے تو دوبارہ بات کر لیں گے۔" ایاز نے کہا۔

ریاض توصیف سوچنے لگا کل کا دن بہت ہنگامہ خیز ہو گا۔ لیکن اسے یہ پرواہ نہیں تھی کہ کل کس کے سر پر دستار بندھے گی۔ صرف تین مہینوں کی بات تھی۔ کسی کے پاس ایسا جادو نہیں تھا جو تین مہینے کی حکومت لے کر ریاض توصیف کو ہرا سکتا۔ تین مہینے اور صرف تین مہینے۔ اس کے بعد سب کچھ اس کا تھا۔ اپنی سیاسی زندگی میں وہ اتنے طویل عرصے تک اقتدار سے الگ نہیں رہا تھا۔ اسے معلوم تھا اس کے ساتھی بھی اب بے چین ہونے لگے ہیں۔ گزرے ہوئے چند سالوں میں اس نے اور اس کے ساتھیوں نے بہت کچھ کھویا تھا۔ لیکن حساب کتاب برابر کرنے کے دن اب زیادہ دور نہیں تھے۔ بہت سے حساب برابر کرنے تھے۔ کئی بدلے لینے تھے۔ بہت سے صلے دینے تھے۔ اس نے سوچا اسی ہفتے چند دنوں کے لئے "پھوکٹ" بھی ہو آئے گا۔ اس کے بعد شاید بہت عرصے تک وقت نہ ملے۔ وزیراعظم بننے کے بعد تو اور مشکل ہو جائے گا۔ اس کی نقل و حرکت پر ہر آنکھ نگراں ہو جائے گی۔ اسے یاد تھا جب پچھلی بار وزیراعظم بنا تھا' وہ سمجھا تھا کہ کشمیر فتح کر آیا ہے۔ ایاز نے بروقت اسے نہ جگایا ہوتا تو یہ فتح اس کے سیاسی کیرئیر کو ہمیشہ کے لئے ٹھکانے لگا سکتی تھی۔

"جہاز ٹھیک ہونے میں ابھی وقت لگے گا۔ پرزے نہیں پہنچے۔ میں نے آج پھر عزیز جمال کو نیویارک فیکس کیا ہے۔" ایاز توصیف نے ریاض کو دیکھے بغیر کاغذوں کو الٹ پلٹ کرتے ہوئے کہا۔ ریاض توصیف کو کبھی کبھی حیرت ہوتی تھی کہ ایاز کس طرح اس کا ذہن پڑھ لیتا تھا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ سوچ رہا تھا اسے اب جہاز چارٹر کرنا پڑے گا۔ وہ کمرشل ایئر لائنز سے جانے کے لئے تیار نہیں ہو گی۔

"دیکھا جائے گا۔" اس نے کندھے اچکائے' ساتھ ہی باپ کی یاد آ گئی جو عمرہ کرنے گیا ہوا تھا۔

"ابا جی کو فون لگواؤ۔ میری دو دن سے بات نہیں ہوئی۔"

"وہ ابھی مدینے میں ہیں۔ کل جدہ پہنچیں گے۔" ریاض توصیف نے ایاز کا جواب سن کر سر ہلا دیا۔ فون کا انتظار طویل ہو رہا تھا۔ اسے نیند آنے لگی تھی۔ اچانک اسے کچھ یاد آ گیا۔

"جنگلہ لگوانے کا کام شروع کروا دو۔ ہمیں اس کے لئے تین مہینے انتظار کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" ایاز توصیف نے بھی سر ہلا دیا۔ جنگلہ لگوانے کی فوری ضرورت نہیں تھی۔ لیکن ان کے گھر کا جنگلہ طاقت اور اختیار کی علامت تھا۔ عامر نذیر نے "ناجائز قبضہ" کہہ کر بڑی بیدردی سے اکھڑوا کر بلڈوزر چلوائے تھے۔ کل کے بعد دیکھے گا کس کو انگلی اٹھانے کی ہمت ہوتی ہے۔ اس نے انگڑائی کے لئے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ یہ ہرے رنگ کے اس فون کی گھنٹی تھی جس کا انہیں انتظار تھا۔ ریاض کا اٹھا ہوا ہاتھ درمیان سے ہی واپس آ گیا۔ ایاز اٹھ کر فون کی طرف بڑھ گیا۔ چوتھی گھنٹی پر اس نے ریسیور اٹھا کر ریاض توصیف کی طرف بڑھا دیا۔ ریاض توصیف نے ایک ہاتھ اپنے شفاف سر پر پھیرتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے ریسیور لے کر کانوں سے لگا لیا۔

وزیراعظم عامر نذیر

فرش پر بیٹھے بیٹھے رخشندہ خان کے کولہے دکھنے لگے تھے۔ قالین بہت دبیز تھا اور رخشندہ کے کولہوں پر بھی نرم گوشت کی کمی نہیں تھی۔ لیکن ایک گھنٹے سے زائد ہو گیا تھا۔ کولہے کی نکیلی ہڈیاں گوشت کو چیر کر کیلوں کی طرح فرش میں گڑ گئی تھیں۔ اس نے بڑی حسرت سے خالی پڑے ہوئے نرم صوفوں کی طرف دیکھا۔ اس وقت صوفے پر بیٹھنے یا کمرے سے باہر چلے جانے کی گستاخی ممکن نہیں تھی۔ نگاہیں کمرے کے مرکزی صوفے کی طرف اٹھ گئیں۔ پرسوں اس صوفے پر نیپالی وزیراعظم بیٹھا تھا۔ وزیراعظم سے ملنے آنے والے کتنے صدر اور وزیراعظم اس صوفے پر بیٹھ چکے تھے۔ صوفے پر جس جگہ وہ آ کر بیٹھتے تھے اس پر اس وقت عجیب سے حلیے والا ایک شخص بیٹھا تھا۔ گھنی مونچھوں نے چھجے کی طرف اس کے پتلے پتلے ہونٹوں کو ڈھانپا ہوا تھا۔ چہرہ داڑھی سے بے نیاز تھا لیکن بالوں کی لٹیں شانوں تک آئی ہوئی تھیں۔ مونچھیں برف کی طرح سفید تھیں۔ رخشندہ کو یقین تھا اس نے ڈائی کرائی ہوئی ہیں۔ سر کے بال خضاب لگا کر بالکل سیاہ کئے ہوئے تھے۔ سفید اور سیاہ بالوں کے امتزاج' پھولی

ہوئی موٹی سی ناک' چوڑی پیشانی پر پڑے ہوئے موٹے موٹے بل اور بڑی بڑی سرخ انگارہ سی آنکھوں نے مل کر اس کی شخصیت کو بہت پر اثر بنا دیا تھا۔ اس کی ایک ٹانگ دوسرے پاؤں کے گھٹنے پر ٹکی ہوئی مسلسل ہل رہی تھی۔ کھدر کے سنہرے رنگ کے کلف دار کڑکڑاتے ہوئے کرتے اور شلوار پر گہرے سرخ رنگ کی بنڈی بہار دکھا رہی تھی۔ موزے بھی بنڈی کی طرح سرخ رنگ کے تھے۔ رخشندہ نے اپنی جوانی کا بہترین زمانہ رنگوں کے اسی کھیل میں گزارا تھا۔ اسے پتہ تھا کہ اسٹیج شو کرنے والے اپنے لباس کے لئے رنگوں کی یہی حکمت عملی اختیار کرتے ہیں۔ سب سے الگ' سب سے مختلف نظر آنے کے لئے چیختے اور ایک دوسرے سے لڑتے ہوئے رنگوں کی دوستی ضروری تھی۔ لیکن وہ رنگوں کے جادو جگانے والا مصور' غیر ملکی مہمان یا دوسری دنیا کی مخلوق نہیں تھا بلکہ وزیراعظم عامر نذیر اور اس کی بیوی آصفہ کا پیر کرامت تھا۔ وہ صرف رنگوں کے جادو جگا کر وزیراعظم تک نہیں پہنچا تھا بلکہ کرامت دکھانے والے کئی پیروں کو چت کر کے عامر نذیر اور آصفہ کا پیر بنا تھا۔

وزیراعظم عامر نذیر پیر کرامت کے قدموں میں اپنی صوفے کی نشست سے ٹیک لگا کر نیچے فرش پر نیم دراز تھا۔ عامر نذیر کے برابر میں آصفہ فریال بھی زمین پر بیٹھی ہوئی تھی۔ سر پر دوپٹہ اور چہرے پر بڑے بڑے شیشوں والا چشمہ چڑھا ہوا تھا لیکن عامر نذیر کی ہی طرح اس کی آنکھیں بھی بند تھیں۔ پیر کرامت کی طرح دونوں کے ہاتھوں میں تسبیح تھی جس کے دانے تیزی سے گردش کر رہے تھے۔ مراقبے میں بیٹھ کر پانچ دس منٹ کے وظیفے کا یہ عمل ہر رات ہوتا تھا۔ لیکن عامر نذیر آج کل مشکل میں تھا۔ اس لئے پیر صاحب خصوصی چلہ کھینچ رہے تھے۔ رخشندہ کو معلوم نہیں تھا کہ یہ وظیفہ کب تک چلے گا۔ وظیفوں کے دوران وہ وہاں موجود نہیں ہوتی تھی۔ لیکن آج اے ڈی سی کے کمرے میں عامر نذیر کی کابینہ کے کئی وزیر منتظر بیٹھے تھے۔ عامر نذیر اور آصفہ پیر کرامت کے ساتھ اکیلے ہوں اور رخشندہ کو اندر جانے کی اجازت نہ ہو' ایسا ہو جاتا تو اس کی ساکھ بگڑ جاتی۔ ایک بار ساکھ بگڑ گئی تو وہ جو اس کے اشارے پر اب تک ناچ رہے تھے آنکھیں دکھانے لگتے۔ صرف ایک بار وہ عامر

نذیر اور آصفہ کے ساتھ اندر نہیں بیٹھی تھی۔ لیکن اس دفعہ رخشندہ کی ساکھ کم نہیں ہوئی تھی بلکہ بڑھی تھی۔ وہ بھی بحران کا زمانہ تھا۔ کابینہ کا اہم اجلاس ہونے والا تھا۔ پیر صاحب نے اچانک وظیفہ شرع کر دیا اور کہا تھا کہ وظیفہ ختم ہونے سے پہلے اگر سورج غروب ہو گیا تو وظیفے کا اثر جاتا رہے گا۔ وظیفے میں عامر نذیر اور آصفہ دونوں کی موجودگی ضروری تھی۔ عامر نذیر نے رخشندہ کو کابینہ کے اجلاس کی صدارت کرنے بٹھا دیا تھا۔ تھوڑی دیر کے لئے اسے لگا تھا وہ آدھی نہیں رہی' پوری وزیراعظم ہو گئی ہو۔ کیسا اچھا احساس تھا۔ جیسے دنیا اس کی ہو گئی ہو۔

رخشندہ کے ہاتھ میں تسبیح نہیں تھی' کیونکہ پیر کرامت نے اسے وظیفہ نہیں بتایا تھا۔ رخشندہ کو معلوم تھا کہ پیر کرامت کو اس کا موجود رہنا بھی اچھا نہیں لگا ہو گا۔ لیکن وہ بیوقوف نہیں تھا۔ وہ رخشندہ کے اثر اور طاقت سے بخوبی واقف تھا اور وہ اسے کمرے سے نکال کر ایک دشمن کا اضافہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ رخشندہ نے ایک بار پھر آنکھیں اٹھا کر پیر کرامت کی طرف دیکھا جو ابھی تک مراقبے میں بیٹھا تسبیح کے دانے گن رہا تھا۔ رخشندہ کے سینے سے ایک ٹھنڈی سانس نکل گئی۔ بابا جیلانی نہ بھاگا ہوتا تو پیر کرامت کی جگہ آج بھی وہی بیٹھا ہوتا۔ اس نے بہت جتن کر کے جیلانی کو اس مقام تک پہنچایا تھا۔ لیکن قد کی طرح اس کی سوچیں بھی چھوٹی ہی رہیں۔ ایک پلاٹ اور چند لاکھ روپے ملتے ہی ایسا غائب ہوا کہ دوبارہ شکل نہیں دکھائی۔ اسے شاید یہ ڈر تھا کہ رخشندہ اس سے حصہ نہ مانگ لے۔ آصفہ اور عامر نذیر بابا جیلانی سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ متاثر ہی نہیں خوفزدہ بھی ہوئے تھے۔ جیلانی نے ان کی پیشانیوں پر ہاتھ رکھ کر ان کے ماضی کا سارا سیاہ و سفید بتا دیا تھا۔ جیلانی کو یہ کہانی رخشندہ نے پڑھائی تھی جس کا اس نے بہت محنت سے کھوج لگایا تھا۔ اس سے رخشندہ کو یہ فائدہ ضرور ہوا تھا کہ عامر نذیر اور آصفہ اسے خود سے الگ کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ وہ اب خصوصی نائب ہی نہیں ان کے اچھے برے ہر کام کی رازدار تھی۔ جیلانی کے غائب ہونے پر دونوں کو تشویش ہوئی تھی۔ رخشندہ نے یہ کہہ کر اطمینان دلا دیا تھا کہ بابا ہمیشہ کے لئے تارک الدنیا ہو گئے ہیں اور کسی

پہاڑی گپھا میں عبادت کرنے چلے گئے ہیں۔

بابا جیلانی نے عامر اور آصفہ کی زندگی میں جو روحانی خلا چھوڑا تھا اسے پر کرنا کافی مشکل ہو گیا تھا۔ عامر نذیر کے کئی وزیر اور وزیر بننے کے کئی امیدوار اپنے اپنے پیروں کو لے کر پہنچے تھے۔ لیکن عامر نذیر کو استعمال شدہ اور ایسا پیر نہیں چاہیے تھا جس کی وفاداریاں بٹی ہوئی ہوں۔ رخشندہ نے ایک پیر کا پتہ لگایا جس کی سندھ میں بہت شہرت تھی۔ مشہور تھا کہ اس کی دعا کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ راتوں رات سڑک اور ہیلی پیڈ بنوا کر وہ سائیں جھنڈے شاہ کے گاؤں پہنچے تھے۔ سائیں سے زیادہ وہاں کے گاؤں والوں نے دعائیں دی تھیں۔ جھنڈے شاہ کی برکت سے ان کے گاؤں تک پکی سڑک پہنچ گئی تھی۔ سائیں جھنڈے شاہ اس روز پہلی بار اپنے حجرے سے باہر نکلا تھا۔ بحری جہاز کی طرح تیرتی ہوئی لیموزین اور ہوا میں اڑنے والا بڑا سا لوہے کا پرندہ دیکھ کر سکتے میں آ گیا۔ عامر نذیر نے ساتھ چلنے کی دعوت دی تو لیموزین میں بیٹھ کر بچوں کی طرح خوش ہو کر تالیاں بجانے لگا تھا۔ ہیلی کاپٹر انہیں لے کر اڑا تو اسے چکر آ گئے۔ دروازہ کھول کر کودنا چاہتا تھا' روکا گیا تو وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ جھنڈے شاہ کو بیہوشی کی حالت میں اسپتال چھوڑ کر وہ اس آستانے سے بھی مایوس ہو کر لوٹے تھے۔ لیکن اسلام آباد پہنچے تو ایک نیا بحران سر پر کھڑا تھا۔ پیر کی تلاش پھر زور شور سے شروع ہو گئی۔

پیر کرامت نے کسی ذریعے سے وزیراعظم ہاؤس تک رسائی حاصل کر لی تھی۔ عامر اور آصفہ دونوں اس کی شخصیت سے متاثر تھے۔ انہوں نے پہلی بار ایسا پڑھا لکھا پیر دیکھا تھا جو روانی سے انگریزی بول سکتا تھا۔ پھر بھی پیر کرامت کے قدم نہیں جم رہے تھے۔ اس زمانے میں وزیراعظم ہاؤس میں پتھر کی ڈبل روٹی کا بہت چرچا تھا۔ کراچی کا ایک بنگالی بابا پتھر لے کر ہاتھوں میں رگڑتا اور ڈبل روٹی برآمد کر کے لوگوں کو حیران کر دیتا۔ پیر کرامت نے ایک دن عامر نذیر کے وزیر خوراک سے کہا تھا۔

"بابا کو قومی تحویل میں لے لیجئے۔ ملک سے روٹی کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔"

یہ سن کر سب ہنس پڑے تھے لیکن عامر نذیر کے چہرے پر ناگواری کی لکیریں ابھرتی دیکھ

کر سنجیدہ ہو گئے تھے۔ پیر کرامت سمجھ گیا تھا کہ رنگ گہرا ہے۔ اسے بنگالی بابا کا سحر توڑنے کے لئے جلد کوئی کرامت دکھانی پڑے گی۔

وزیراعظم ہاؤس میں بابا کی آمد و رفت اور کمالات کا طلسم بڑھتا جا رہا تھا۔ ایک دن اس نے پتھر سے ڈبل روٹی کی جگہ ناشپاتی برآمد کر کے آصفہ کو دی تھی اور کہا تھا اس کو کھانے سے اس کی جوانی سدا بہار ہو جائے گی۔ آصفہ نے اسی وقت بڑے شوق سے پوری کی پوری ناشپاتی کھا لی تھی۔ بیج تک نہیں چھوڑے تھے۔ بابا نے پیر کرامت سے بھی اس کی فرمائش پوچھی تھی۔ اس نے چکن تکے کی فرمائش کر دی۔ بابا نے اس وقت تک ہنس کر بات گول کر دی اور پتھر سے پیڑا بنا کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ کہا تھا بدایوں کے کسی مشہور حلوائی کا ہے۔ وہ اگلی بار جب آیا تو چکن تکے کا تذکرہ نکال بیٹھا اور تھوڑی ہی دیر میں چمڑے جیسا مرجھایا ہوا چکن تکہ پیر کرامت کے ہاتھوں میں دے کر بتانے لگا کہ کراچی کے بندو خان کی دکان سے آیا ہے۔ پیر کرامت نے اس کے اور سب کے اصرار کے باوجود نہیں کھایا بلکہ بہت احترام سے رومال میں لپیٹ کر کہا تھا کہ وہ بابا کے اس تبرک کو وضو کر کے کھائے گا۔

ایک روز پیر کرامت کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اس روز بنگالی بابا نے ہاتھ کی صفائی کا کمال دکھا کر عامر نذیر کے دل میں اپنے اعتقاد کی ایک اور کیل گاڑ دی تھی۔ اس نے عامر نذیر سے رومال مانگ کر جادوگروں کی طرح دونوں ہاتھوں کی مٹھیوں میں بند کر کے اپنے بدن کے آگے پیچھے گھمایا اور پھر مٹھیاں کھول کر کپڑے کو جھٹکا دیا تو اس کے ہاتھ میں عامر نذیر کی پارٹی کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ پورا کمرہ تالیوں سے گونج اٹھا تھا۔ اس روز حاضری بھی زیادہ تھی۔ کابینہ کے اجلاس کے بعد سب رات کے کھانے اور پتھر سے ڈبل روٹی بنانے والے بابا کی قدم بوسی کے لئے رک گئے تھے۔ عامر نذیر تالیاں بجاتا ہوا کھڑا ہو گیا تو سب کھڑے ہو کر دیر تک تالیاں بجاتے رہے۔ بابا نے ان کی پارٹی کو فتح کی بشارت دے دی تھی۔ بابا نے اپنی نشست سے اٹھ کر وزیراعظم کو ان کی پارٹی کا جھنڈا پیش کیا تو عامر نذیر نے جھنڈے کو آنکھوں سے لگا کر ہونٹوں سے چوم لیا۔

اپنی نشست کی طرف واپس جاتے ہوئے بابا نے پیر کرامت کو مسکراتی ہوئی نظروں سے دیکھا تھا۔ جیسے اپنی جیت پر اس کا مذاق اڑا رہا ہو۔ پیر کرامت نے اپنی سرخ انگارہ سی آنکھیں اس کی آنکھوں میں گاڑ دیں۔ بنگالی بابا ایک لمحے کے لئے ٹھٹک گیا۔ پیر کرامت اسی طرح آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بابا کی طرف بڑھا۔ بابا کھڑا ہو کر اپنی طرف آتے ہوئے پیر کرامت کو دیکھنے لگا تھا۔ یہ پیچھے ہٹنے کا وقت نہیں تھا۔ پیر کرامت بنگالی بابا سے صرف چند انچ کے فاصلے پر جا کر رک گیا۔ آدھا قدم اور بڑھتا تو اس کی ناک بابا کی ناک سے ٹکرا جاتی۔ دونوں کی آنکھیں ایک دوسرے کی آنکھوں میں گڑی ہوئی تھیں۔ پیر کرامت کی آنکھیں چنگاریاں برسا رہی تھیں جبکہ بنگالی بابا کی آنکھوں میں ابھی تک اپنی فتح کی مسکراہٹ ناچ رہی تھی۔ کمرے میں سناٹا چھا گیا تھا۔ سب سانسیں روکے مرغوں کی طرح لڑتے ہوئے پیروں کی کشتی دیکھنے لگے تھے۔ عامر نذیر اور آصفہ کے ماتھے پر لکیریں ابھر آئی تھیں۔ رخشندہ کو یقین تھا کہ آج وزیراعظم ہاؤس میں پیر کرامت کا آخری دن ہو گا۔ لیکن اس سے پہلے کہ عامر نذیر پیر کرامت کو اپنے عتاب کا نشانہ بناتا سب کے منہ حیرت سے کھلے کے کھلے رہ گئے۔ پیر کرامت نے حرکت ہی ایسی کی تھی۔

اس نے بنگالی بابا کی چار خانے والی ڈھیلی دھوتی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر پوری قوت سے جھٹکا دیا تھا۔ بنگالی بابا نے اچانک حملے سے بوکھلا کر پیچھے ہٹنے کے لئے زور لگایا تو دھوتی کے باقی بل بھی کھل گئے اور دھوتی پیر کرامت کے ہاتھوں میں آ گئی۔ دھوتی کی تہوں سے سوکھی ڈبل روٹی اور مٹھائیوں کے ٹکڑے' سیب' ناشپاتی اور چھوٹے چھوٹے وہ پتھر جن سے وہ ڈبل روٹی بنایا کرتا تھا نکل کر اس کے چاروں طرف پھیل گئے تھے۔ عامر نذیر کو زیادہ غصہ اپنے سب سے بڑے سیاسی دشمن ریاض توصیف کی پارٹی کے جھنڈے کو دیکھ کر آیا تھا۔ بنگالی بابا نے شاید آج رات ریاض توصیف کے گھر جا کر اسے بھی فتح کی بشارت دینے کا اہتمام کر رکھا تھا۔ بابا کی آنکھوں میں مسکراہٹ کی جگہ خوف چھا گیا تھا۔ پیر کرامت کی قہر برساتی ہوئی سرخ آنکھوں نے سب کو سحرزدہ کر دیا تھا۔

"چلا جا ورنہ بھسم کر دوں گا۔" پیر کرامت حلق کے بل اس زور سے چیخا کہ سب سہم کر رہ گئے۔ عامر نذیر بھی کانپ گیا تھا۔ بنگالی بابا کے چہرے کو دیکھ کر رخشندہ کو لگا جیسے قالین گیلا ہو گیا ہو۔

"معاف کر دو پیر شاب۔ مجھ کو معاف کر دو۔" بنگالی بابا نے جھک کر پیر کرامت کے پاؤں پکڑ لئے۔ عجیب منظر تھا۔ سرپاؤں پر اور دھوتی پیر کرامت کے ہاتھوں میں تھی بابا کو احساس بھی نہیں رہا تھا کہ اس کا کرتا اس کے نچلے دھڑ کو ڈھکنے کے لئے کافی نہیں ہے۔ ننگے سیاہ کولہے ہوا میں معلق نظر آتے تھے۔ آصفہ کو بابا کی دی ہوئی وہ ناشپاتی یاد آ گئی جو اس نے بڑے شوق سے کھائی تھی۔ اسے ایک زور کی ابکائی آئی اور وہ غسل خانے کی طرف دوڑ گئی۔ غصے اور نفرت نے عامر نذیر کا چہرہ بگاڑ دیا تھا۔ اس کا بس چلتا تو جعلی بابا کو اپنے ہاتھوں سے اٹھا کر باہر پھینک دیتا۔ لیکن اس نے اے ڈی سی کو اشارہ کر کے منہ موڑ لیا۔ اس سے پہلے کہ اے ڈی سی آگے بڑھتا' پیر کرامت نے بابا کے ننگے دھڑ پر اس کی دھوتی ڈالی' اس کے سر کو ٹھوکر لگائی اور تیزی سے باہر چلا گیا۔ اس کے کچھ کہے بغیر اچانک چلے جانے نے ایک بار پھر سب کو حیران کر دیا تھا۔ عامر نذیر نے اپنے ایک وزیر کو اسے روکنے کے لئے پیچھے دوڑایا تھا۔ لیکن پیر کرامت کو روکنے کی ہمت نہیں ہو سکی۔ پیر کرامت کی سرخ انگارہ سی آنکھوں میں ابھی تک خوفزدہ کرنے والا وہی اثر تھا جس نے بنگالی بابا کو قدموں میں لا گرایا تھا۔

پیر کرامت اس کے بعد وزیراعظم ہاؤس نہیں آیا۔ عامر نذیر نے کئی دن انتظار کیا' فون پر رابطے کی کوشش کی' اے ڈی سی کو لینے کے لئے گھر بھیجا لیکن پیر کرامت نے منع کر دیا تھا۔ عامر نذیر کی بے تابی بڑھ گئی تھی۔ ایک رات آصفہ اور رخشندہ کے ساتھ وہ خود پیر کرامت کو لینے خود اس کے گھر چلا گیا۔ اس دفعہ پیر کرامت نے منع نہیں کیا۔ اس کے بعد شاید ہی کوئی ایسی رات ہو جب پیر کرامت وزیراعظم ہاؤس نہ پہنچا ہو۔ ہر غیر ملکی دورے میں ساتھ جاتا۔ ہر بحران کے وقت وظیفہ پڑھتا' چلہ کھینچتا' تعویذ لکھتا۔ عامر نذیر کو اس کے وظیفوں اور تعویذوں پر اندھا یقین تھا۔ جس

زمانے میں بحران شدید تھا' اس نے چودھویں کی رات کو بارہ بجے راوی کے کنارے ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر وظیفہ پڑھا تھا۔ عامر نذیر اور آصفہ ہاتھ باندھے اور سر جھکائے اس کے پیچھے کھڑے رہے تھے۔ دریا کے کنارے کیچڑ ہی کیچڑ تھی۔ ان کے کپڑے اور پاؤں لت پت ہو گئے تھے۔ لیکن یہ مہنگا سودا نہیں تھا۔ ایک ہفتے کے اندر اندر عامر نذیر کی حکومت بحران سے نکل آئی تھی۔ اس کا لکھا ہوا وہ تعویذ جادوئی کہانی کی طرح یاد کیا جاتا تھا جس کے اثر نے عامر نذیر کے ایک بڑے دشمن کو زیر کیا تھا۔

رخشندہ خان کو اپنے سینے پر سانپ لوٹتے محسوس ہوئے۔ اس کا خیال غلط نہیں تھا۔ پیر کرامت' جیلانی اور بنگالی بابا کی طرح محدود عزائم رکھنے والا پیر نہیں تھا۔ اسلام آباد کے ایک قیمتی پلاٹ اور پنجاب کی زرعی زمین لینے کے بعد اب ایک کارخانہ لگانے کے لئے اس نے عامر نذیر سے ۳۸ کروڑ روپے کے بینک کا قرضہ منظور کرایا تھا۔ رخشندہ کو لگتا جیسے کوئی اس کی دولت لوٹ رہا ہو۔ لیکن عامر نذیر کو پرواہ نہیں تھی۔ اس کی اپنی جیب سے کچھ نہیں جا رہا تھا۔ اور پھر پیر کرامت کارخانے لگا رہا تھا جن میں سینکڑوں لوگوں کو ملازمتیں ملنی تھیں' بیروزگاری کا مسئلہ حل ہونا تھا۔ پیر کرامت کو اس کا' اس کی حکومت اور اس کے عوام کا کتنا خیال تھا۔ یہ سوچ کر عامر نذیر کے دل میں اپنے پیر کا احترام اور بڑھ جاتا۔

رخشندہ نے فرش پر بیٹھے بیٹھے اپنی نشست بدلی۔ بار بار کولہے بدلنے کے باوجود آرام نہیں مل رہا تھا۔ پیر کرامت کا وظیفہ آج کچھ لمبا ہو گیا تھا۔ آنکھیں کھولنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ رخشندہ کو لگا جیسے آج کی رات قیامت کی رات بن گئی ہے۔ وہ جانتی تھی پورا شہر افواہوں کی زد میں ہے۔ صبح سے ہر شخص حکومت جانے کی خبر لے کر آ رہا تھا۔ لیکن عامر نذیر کو اپنی ایجنسیوں پر پورا بھروسہ تھا۔ ایجنسیوں نے سب اچھا ہے کی خبر دی تھی۔ رخشندہ کو پتہ تھا باہر جو وزیر ابھی تک باریابی کے انتظار میں بیٹھے ہیں وہ بھی انہیں افواہوں کا شکار ہو کر آئے ہوں گے کہ

کچھ ہونے والا ہے۔ عامر نذیر کو یقین تھا کہ کچھ نہیں ہو گا پھر بھی آصفہ کے کہنے پر اس نے پیر کرامت سے دعا کرنے کے لئے کہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ پیر کرامت اپنے وظیفے سے ایسا حصار کھینچے گا کہ اس کے خلاف سازش کرنے والوں کے پر جل جائیں گے۔ رخشندہ نے آصفہ کو اکیلا پا کر سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اس نے بھی ہنس کر نظر انداز کر دیا تھا۔ وہ آج شام ہی پیرا کی کرنے ایوان صدر گئی تھی۔ سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ نئے سوئمنگ پول کے گرم اور نیلے پانی میں تیر کر نکلی تو ایوان صدر کے عملے نے زیادہ ہی گرمجوشی کا مظاہرہ کیا تھا۔ صدر اسے خود دروازے تک چھوڑنے آئے تھے۔ آصفہ کو یقین ہو گیا تھا صدر اپنی کارروائیوں پر نادم ہیں۔ اس نے عامر نذیر کو بھی خوشخبری سنائی تھی اور جب رخشندہ نے اپنے خدشے کا اظہار کیا تو یہ کہہ کر اس کا مذاق اڑایا تھا کہ افواہوں کا شکار ہو کر اسے بھی وہم کی بیماری لاحق ہو گئی ہے۔ رخشندہ کو پتہ تھا کہ عامر نذیر کو ایک ہفتے سے ٹیپ کی ہوئی کسی اہم گفتگو کی رپورٹ نہیں ملی ہے۔ عامر نذیر کو پرواہ نہیں تھی۔ اس نے کہا کوئی اہم بات ہو گی تو ایجنسی والے خود بتا دیں گے۔ رخشندہ سوچنے لگی عامر نذیر نے بار بار کے تجربے سے بھی نہیں سیکھا کہ فیصلہ اگر ہو چکا ہے تو ایجنسی والے کفن دفن کے انتظام میں لگے ہوں گے۔ رخشندہ کی چھٹی حس بتا رہی تھی کہ چل چلاؤ کا وقت آ گیا ہے۔

رخشندہ کی چھٹی حس نے کبھی جھوٹ نہیں بولا تھا۔ اس نے سوچا آج کی رات خیریت سے گزر جائے تو پھر وہ سنجیدگی سے اپنے مستقبل کے بارے میں فیصلہ کرے گی۔ وزیراعظم ہاؤس میں رہنا ہر وقت سولی پر لٹکے رہنے کی طرح تھا۔ ایک بار پہلے لٹک چکی تھی اب دوبارہ لٹکنے کی ہمت نہیں تھی۔ لیکن کسی طرح یہ ڈبہ پیر اپنا وظیفہ تو ختم کرے۔ اسے پیر کرامت پر سچ مچ غصہ آنے لگا۔ کتنا قیمتی وقت ضائع کر رہا تھا۔ باہر بیٹھے ہوئے وزیروں کے پاس شاید کوئی اہم خبر ہو۔ عامر نذیر اپنے ذرائع کو فون کر کے افواہوں کی تصدیق کرا سکتا تھا۔ کوئی کھچڑی پک رہی تھی تو اس کے تدارک کی تدبیر کر سکتا تھا۔ لیکن پیر کرامت نے تو اسے آنکھیں بند کر کے بٹھا دیا تھا۔

رخشندہ نے ایک بار پھر اپنی بیٹھک بدلی اور صمدانی کے بارے میں سوچنے لگی جو اس کے انتظار میں بستر پر لیٹا کروٹیں بدل رہا ہو گا۔ اس نے سوچا تھا کہ جب عامر نذیر اور آصفہ اپنے وزیروں سے مشورہ کریں گے وہ کچھ دیر کے لئے صمدانی کے پاس ہو آئے گی۔ رات کے آخری سیشن میں عامر نذیر اور آصفہ کے پاس اس کی موجودگی ضروری ہوتی تھی۔ اہم فیصلے اسی وقت ہوتے تھے۔ لیکن پیر کرامت نے آج وقت کی ترتیب الٹ دی تھی۔ رخشندہ کو معلوم تھا وہ اب بیچ میں اٹھ کر نہ جا سکے گی۔ رات گئے جب پہنچے گی تو صمدانی سو چکا ہو گا۔ سونے کے بعد اسے اٹھانا ممکن نہیں ہوتا تھا۔ بستر پر اکیلی لیٹ بھی گئی تو نیند آنکھوں سے کوسوں دور ہو گی۔ آدھی بوتل ختم کئے بغیر نیند کی گولیاں بھی اثر نہیں کریں گی اور جب نیند آئے گی تو جاگنے کا وقت ہو چکا ہو گا۔ کتنی شدید پیاس تھی لیکن اس وقت تو وہ ایک گلاس پانی پینے بھی نہیں اٹھ سکتی تھی۔

رخشندہ کی دعا آخر کار قبول ہو گئی۔ پیر کرامت نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ ٹانگ دوبارہ فرش پر رکھ دی اور تسبیح اپنی بنڈی کی جیب میں رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ عامر نذیر اور آصفہ بھی اس کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔ رخشندہ کھڑی ہوئی تو ایک گھنٹے سے مڑے ہوئے گھٹنے کڑکڑائے تھے۔ پیر کرامت کمرہ عبور کر کے باہر جانے لگا۔ عامر نذیر نے بھی قدم بڑھایا تھا لیکن پیر کرامت نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔

"مجھے تازہ ہوا اور کھلا آسمان چاہئے۔ مجھے ستاروں سے باتیں کرنی ہیں۔" پیر کرامت یہ کہہ کر باہر نکل گیا۔ اور عامر نذیر انٹرکام پر اے ڈی سی کو فون کرنے لگا۔

رخشندہ کو معلوم تھا پیر کرامت کو کھلی ہوا کس لئے چاہئے تھی۔ وہ کم از کم ایک گھنٹے تک باہر ٹہلے گا اور چرس کے تین چار سگریٹ پی کر ہی واپس آئے گا۔ رخشندہ پہلے سمجھتی تھی کہ آنکھیں سرخ کرنے کے لئے آنکھوں میں دوا کے قطرے ٹپکاتا ہے۔ لیکن ایک روز اس کے پیچھے وہ بھی تازہ ہوا کھانے باہر آ گئی تھی۔ وہ پیر کرامت کے سگریٹ سے نکلنے والے دھوئیں کو سونگھ کر اچھی طرح پہچان گئی تھی۔ اس کا ریکروٹنگ کا کاروبار چرس کے اسی دھوئیں میں اڑا تھا۔ اپنے جس شراکت دار

کو اس نے بے ضرر چڑی سمجھ کر نظر انداز کر دیا تھا وہ لیبیا بھجوانے کے بہانے سینکڑوں مزدوروں سے لاکھوں روپے لے کر بھاگ گیا تھا۔ رخشندہ اگر لندن فرار نہ ہو جاتی تو مزدور اس کی تکہ بوٹی کر دیتے۔ لیکن وہ لندن فرار نہ ہوتی تو آصفہ اور عامر نذیر کے پاس کیسے پہنچتی۔ اس خرابی میں بھی بھلائی کی جو تدبیر تھی اسی نے اس کی تقدیر بنا دی تھی۔ اپنا پرس سنبھالتی ہوئی وہ بھی تیزی سے غسل خانے کی طرف بڑھ گئی۔ دو گھونٹ لینے کی شدید طلب ہو رہی تھی۔

پیر کرامت نے کھلی ہوا میں آتے ہی جیب سے سگریٹ نکالا جسے وہ اپنے ہاتھ سے بھر کر لایا تھا۔ بدن بری طرح ٹوٹ رہا تھا۔ آنکھیں بند کئے دیر تک اسی لئے بیٹھا رہا تھا کہ اٹھنے کی ہمت نہیں تھی۔ تین چار گہرے کش لیتے ہی ستارے آسمان سے اتر کر اس کے سامنے رقص کرنے لگے تھے۔ اس نے غلط نہیں کہا تھا۔ تیسرے سگریٹ کے بعد یہ ستارے اس سے باتیں بھی کرنے لگتے۔ اسے وزیراعظم ہاؤس کی بلندی سے شہر کو دیکھنا اچھا لگتا تھا۔ قدموں کے نیچے دور تک پھیلی ہوئی اسلام آباد کی روشنیاں ایسی لگتیں جیسے تاروں بھرا آسمان اس کے پاؤں چومنے زمین پر اتر آیا ہو۔ اس نے ایک اور گہرا کش لے کر نیچے سے اوپر آنے والے راستے کو دیکھا جو اس وقت سنسان تھا۔ دونوں بڑے گیٹ بند تھے۔ باہر کے گیٹ پر جہاں دن بھر وزیراعظم ہاؤس میں داخل ہونے والے ضرورتمندوں کی بھیڑ رہتی تھی اب کوئی نہیں تھا۔ دور مرکزی شاہراہ پر دودھیا رنگ کی ٹھنڈی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ ابھی رات کے صرف دس بجے تھے۔ گھٹتے ہوئے چاند کی زرد روشنی سڑک کی بتیوں پر حاوی نہ ہو سکی تھی۔ فوجی طرز کے دو ٹرک سڑک سے رینگتے ہوئے گزر رہے تھے۔ شاید گارڈز کی تبدیلی کا وقت آ گیا تھا۔ سیاہ رنگ کی ایک لمبی سی لیموزین جناح ایونیو کے راؤنڈ اباؤٹ سے دائیں ہاتھ کو گھوم کر ایوان صدر کو جا رہی تھی۔ شاید کوئی اہم مہمان صدر سے ملنے جا رہا تھا۔ اتنی دور سے وہ گاڑی پر لگا ہوا جھنڈا نہیں دیکھ سکا تھا۔

پیر کرامت نے سوچا اسے بھی اب ایوان صدر میں داخل ہونے کا کوئی راستہ

تلاش کرنا پڑے گا۔ وہ ان لوگوں کے درمیان تھا جو اس ملک کے سیاہ و سفید کے مالک تھے۔ ان کی افواہوں میں بھی آنے والے دنوں کا احوال چھپا ہوتا تھا۔ وہ روز نئی افواہیں سن رہا تھا۔ وہ جانتا تھا عامر نذیر نہیں رہا تو جو کچھ اسے عامر نذیر سے ملا ہے وہ بھی نہیں رہے گا۔ اسے اپنی زمینیں' فیکٹری اور بینک کا قرضہ بچانے کے لئے کوئی ایسی کرامت دکھانی تھی کہ اس کے لئے ایوان صدر کے دروازے کھل جاتے۔ پیر کرامت نے نگاہیں جھکا کر نشیب میں اس طرف دیکھا جہاں بری امام کا مزار تھا۔ شاید وہ بری امام سے مدد مانگ رہا تھا۔ چرس سے بھرا ہوا سگریٹ ختم ہوا تو اس نے اسے پھینک کر بنڈی کی اندر کی جیب سے سلائی پھرا ہوا سگریٹ نکالا اور ہونٹوں سے لگا کر سلگانے لگا۔

رخشندہ باتھ روم میں جا کر اپنے پرس میں رکھی ہوئی مارٹینی کی چھوٹی شیشی خالی کر کے اور منہ میں خوشبو کے اسپرے سے اپنی سانسیں خوشگوار کر کے آئی تو اس کے چہرے کا رنگ واپس آ گیا' اعصاب بھی قابو میں آ گئے تھے۔ اپنی چھٹی حس کو دماغ کے کسی اندھیرے تہہ خانے میں سلا دیا تو اعتماد بھی بحال ہونے لگا۔ "کون انہیں نکال سکتا ہے۔ کس کی مجال ہے؟" اس نے سوچا اور عامر نذیر کے اطمینان کو دیکھ کر اور زیادہ مطمئن ہو گئی۔ عامر نذیر اب اٹھ کر اس صوفے پر بیٹھ گیا تھا جس سے ٹیک لگائے ہوئے پہلے نیچے بیٹھا تھا۔ لیکن اب بھی وہ اس مقام پر نہیں بیٹھا جہاں پیر کرامت بیٹھا ہوا تھا بلکہ اپنی اسی نشست پر بیٹھا تھا جہاں اہم مہمانوں سے ملتے وقت بیٹھا کرتا تھا۔ رخشندہ کا خیال تھا کہ وہ اٹھ کر کیبنٹ روم میں چلا جائے گا لیکن اس نے انتظار کرنے والے وزیروں کو وی آئی پی مہمانوں والے اسی کمرے میں بلا لیا تھا۔ آصفہ بھی تھوڑے فاصلے پر رکھے ہوئے ایک نشستی صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔ اس نے "راتھمین انٹرنیشنل" کے نیلے پیکٹ سے سگریٹ نکال کر سلگا لیا تھا۔ میز پر وزیراعظم ہاؤس کے لئے خاص طور پر تیار کئے ہوئے حکومت پاکستان کے سنہری مونو گرام والے سگریٹ بھی رکھے تھے لیکن وہ سگریٹ آصفہ کو سخت ناپسند تھے۔ وہ کہتی تھی صرف

پیکٹ وزیراعظم ہاؤس کا ہے لیکن سگریٹ دیسی ہیں۔

کمرے میں سب سے پہلے تعویذ علی شاہ داخل ہوا۔ اس کا نام کچھ اور تھا لیکن ہر وقت ایک تعویذ لٹکائے رکھتا جس کی وجہ سے وہ تعویذ علی شاہ مشہور ہو گیا تھا۔ کالے ڈورے میں بندھا اور لال کپڑے میں سلا ہوا تعویذ میلا ہو کر اب گہرے عنابی رنگ کا ہو گیا تھا۔ جس پیر کا وہ تعویذ تھا اس نے شاید بتایا تھا کہ تعویذ کو کھلی ہوا نہ لگی تو تاثیر جاتی رہے گی اس لئے کرتے کے بٹن اس مقام تک کھلے رہتے جہاں سینے پر لٹکا ہوا تعویذ پھوڑے کی طرح ابھرا ابھرا نظر آتا۔ یہ تعویذ اس کی بیوی اس کے لئے سائیں جھنڈے شاہ سے اس وقت لے کر آئی تھی جب تعویذ علی شاہ جیل میں تھا۔ جب سے تعویذ پہنا تھا اس کی کایا پلٹ گئی تھی۔ جیل سے فوراً ہی رہا ہو گیا تھا اور اس کا نام سندھ کے بڑے سیاسی رہنماؤں کے ساتھ لیا جانے لگا تھا۔ الیکشن میں پیر فلک کو ہرا کر اتنی شہرت حاصل کی تھی کہ عامر نذیر کی پہلی حکومت میں وزیر بنا دیا گیا۔ شاید تعویذ اب پرانا ہو گیا تھا اس لئے اس کی تاثیر کم ہو گئی تھی' یا تعویذ لے کر آنے والی اس کی بیوی کی بددعاؤں میں اثر زیادہ تھا۔ عامر نذیر دوبارہ اقتدار میں آیا تو تعویذ علی شاہ وزیراعلیٰ بننے کا امیدوار تھا۔ عامر نذیر نے ایک دوسرے شاہ کو اس پر فوقیت دی تھی لیکن تعویذ علی شاہ نے ہمت نہیں ہاری تھی۔

تعویذ علی شاہ کے پیچھے پیچھے عامر نذیر کا وزیر قانون ڈی ڈی ٹی خان اور اس کے پیچھے ایک اور وزیر رے رے افغانی تھا۔ رے رے اس کے ناموں کے پہلے حروف تھے۔ جب وہ انگلینڈ میں پڑھتا تھا اس کے انگریز دوست اسے رے رے کہا کرتے تھے۔ عامر نذیر اسے ڈبل آر کہتا تھا۔ ڈی ڈی ٹی خان بھی دلدار توقیر جیسے بھاری بھرکم نام کو مخفف کر کے بنایا گیا تھا۔ لیکن اس نام کے استعمال کی وجہ یہ نہیں تھی۔ ڈی ڈی ٹی خان کو تیز خوشبو استعمال کرنے کا شوق تھا۔ آصفہ خوشبو کے معاملے میں بہت حساس تھی۔ اس کے لئے پیرس سے خاص طور پر کشید کیا ہوا پرفیوم آتا تھا۔ ایک دن کسی اجلاس میں دلدار توقیر خان کی نشست آصفہ کے پاس تھی۔ خوشبو اتنی تیز تھی کہ آصفہ کو چھینکیں آ گئیں اور ایسی آئیں کہ پھر رکی نہیں۔ چھینکیں کچھ

رکیں تو اس نے غصے سے پوچھا۔

"یہ ڈی ڈی ٹی چھڑک کر کون آیا ہے۔" عامر نذیر دلدار خان کو دیکھ کر ہنس پڑا تو وہ ہنسی جو سب نے دبائی ہوئی تھی قہقہوں کی پھلجڑی بن کر چھوٹ پڑی۔ خان صاحب کو اجلاس سے جلدی رخصت ہونا پڑا تھا۔ اسی کے بعد سے وہ ڈی ڈی ٹی خان کہلایا جانے لگا۔ تینوں حروف اس کے نام کا مخفف تھے اسی لئے اخبار والے بھی ڈی ڈی ٹی خان لکھنے لگے تھے۔ لیکن وہ جب وزیر بنا تو ریڈیو ٹی وی اور سرکاری سرپرستی میں چلنے والے اخباروں کو ہدایت تھی کہ پورا نام اور ساتھ میں پروفیسر بھی لکھیں۔ اس نے فرسٹ اور سیکنڈ ایئر کی جماعتوں کو سال دو سال کے لئے شہریت پڑھائی تھی جس کے بعد سے اس نے خود کو پروفیسر کی اعزازی ڈگری دے دی تھی۔

تینوں خاموشی سے آ کر بیٹھ گئے۔ عامر نذیر سگریٹ نکال کر سلگانے لگا۔ اسے تمباکو نوشی کی عادت نہیں تھی لیکن کبھی کبھی خالی لمحوں کو بھرنے کے لئے ایک آدھ سگریٹ سلگا لیتا تھا۔ منہ آگے بڑھا کر سگریٹ کا کش لینے کے لئے ہونٹوں کا گول دائرہ بناتا تو رخشندہ کو لگتا کوئی اناڑی عاشق پہلی بار بوسہ لینے کی کوشش کر رہا ہو۔ ڈی ڈی ٹی خان خوشبو کے بارے میں اب بہت محتاط ہو گیا تھا اور مزید احتیاط کے طور پر آصفہ سے دور ہو کر بیٹھتا تھا۔ آصفہ سے وہی نہیں سب ڈرتے تھے۔ سب کو پتہ تھا آصفہ کو ناراض کر کے وہ کہیں کے نہ رہیں گے۔ اور جب تک اسے خوش نہیں رکھیں گے کچھ پا نہیں سکیں گے۔ آصفہ ڈی ڈی ٹی خان کو دیکھ کر مسکرائی اور ڈی ڈی ٹی خان سوچنے لگا کہ خدا خیر کرے۔

"کہئے خان صاحب! آپ کسے وزیراعظم بنوا رہے ہیں؟" عامر نذیر نے آدھے سے زیادہ بچا ہوا سگریٹ ایش ٹرے میں مسلتے ہوئے کہا۔

"جی؟" ڈی ڈی ٹی خان کی سمجھ میں نہیں آیا۔ رخشندہ عامر نذیر کے اس موڈ کو پہچانتی تھی۔ وہ سمجھ گئی آج ان تینوں کی خیر نہیں ہے۔ دن بھر کا دبا ہوا غصہ انہیں پر نکلے گا۔

"آج صبح سے ہر آدمی یہی خبر لے کر آ رہا ہے۔" عامر نذیر طنزیہ انداز میں

بولا۔ ''اب تک ایک درجن سے زائد لوگ وزیراعظم کا حلف اٹھا چکے ہیں۔ افسر خان' ملک سراج زاہد' ناصر بھٹی' رضا سروہی' ایمان علی' ریاض توصیف' ظفر امام' جنرل محبوب علی خان' آصف وفا جیلانی' متین رحیم اور جانے کون کون۔ آپ کے ایک دوست شام کو آئے تھے وہ تو اسمبلیاں توڑ کر ماشل لاء تک لگوا چکے ہیں۔''

''سائیں وہ رضا سروہی سب کو فون کر کے بول رہا ہے کہ کل اس کی گاڑی پر جھنڈا لگ جائے گا۔ سائیں نواب صاحب' مولانا صاحب اور شیر پنجاب تینوں اس کے گھر پر بیٹھے ہیں۔'' تعویذ علی شاہ نے ڈی ڈی ٹی خان کے کچھ بولنے سے پہلے اپنی خبر نشر کر دی۔

''شیر پنجاب ہمارے بھائی ہیں۔ وہ ہمیں بتا کر گئے ہیں۔ حقے والے انکل کے مرید نے رضا سروہی کے گھر میں حلیم کی دعوت کی تھی' سب اس میں گئے ہیں۔'' آصفہ نے تعویذ علی شاہ کو سختی سے گھورتے ہوئے کہا۔

''رضا سروہی کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ وہ ہر دعوت میں حلف اٹھانے کی بات کرتا ہے۔ اسے خواب میں بھی جھنڈا لگی ہوئی گاڑی نظر آتی ہے۔'' عامر نذیر کی آواز غصے سے تیز ہو گئی۔

''سائیں آپ حکم دیں تو ان سب کا دماغ میں ٹھیک کرتا ہوں۔ میں نے ایل کیو این میں بھی ایک روزن نکالا ہے۔ وہ میرے ساتھ بیٹھنے کو تیار ہیں۔ سائیں آپ ایک موقع دو سب کو فلک پیر بنا دوں گا۔ دو دن میں سب کو ٹھیک کر دوں گا۔'' تعویذ علی شاہ نے کہا تو رخشندہ کو اس کی بیوقوفی پر غصہ آنے لگا۔ وہ عامر نذیر کا موڈ سمجھے بغیر بے محل بکواس کئے جا رہا تھا۔

''آپ کو موقع دوں' یعنی آپ کو وزیراعلیٰ بنا دوں۔ آپ اپنا تعویذ لہرائیں گے اور دو دن میں سب کو ٹھیک کر دیں گے۔'' عامر نذیر نے طنز اور حقارت سے بھری ہوئی آواز میں کہا۔

''سائیں مرشد کی دعا میرے ساتھ ہے۔ آپ بس حکم کر دیں۔''

''وزیراعلیٰ بننے کے بعد دو دن تک آپ سو کر بھی نہیں اٹھیں گے۔ اور

اٹھیں گے تو ایک اور شادی کر لیں گے اور پھر سو جائیں گے۔" عامر نذیر نے شاید آج تعویذ علی شاہ کو آئینہ دکھانے کا تہیہ کیا ہوا تھا۔

"میں نے آپ کو جب پہلی بار وزیر بنایا تھا تو ایک ہفتے تک آپ صرف مجرے کرتے رہے تھے۔ ٹھیک ہے مجرے کیجئے مگر کام بھی کیجئے۔ لیکن آپ نے کیا کیا۔ سر پر وگ لگوائی اور شادی کر کے بیٹھ گئے۔ آپ کی پہلی بیوی رو رو کر آج بھی چٹھیاں لکھتی ہے۔"

"تعویذ شاہ نئی وگ بنوا لو۔ یہ وگ ڈھیلی ہو گئی ہے۔ شاید تمہارا سر چھوٹا ہو گیا ہے۔" آصفہ نے مسکراتے ہوئے ماحول کی سنجیدگی کو ختم کرنا چاہا۔ وہ عامر نذیر کے وزیروں اور پارٹی لیڈروں سے اسی طرح مخاطب ہوتی تھی۔ چند لوگوں کے سوا کسی کی تعظیم نہیں کرتی تھی۔ رخشندہ کو معلوم تھا کہ آصفہ کو تعویذ شاہ کی وگ پسند نہیں تھی۔ تعویذ شاہ شاید وزیراعلیٰ بن بھی جاتا۔ کئی بار ایسے بحران آئے تھے کہ عامر نذیر نے سنجیدگی سے تبدیلی کے بارے میں سوچا تھا۔ لیکن آصفہ نے مخالفت کی تھی اور کہا تھا وگ والا وزیراعلیٰ تماشا بن جائے گا۔ تعویذ علی شاہ نے آصفہ کے مذاق پر دانت نکال دیئے۔

"کیوں مذاق کرتی ہیں۔ کیوں مذاق کرتی ہیں۔" ڈی ڈی ٹی خان اور رے رے افغانی خاموشی سے مسکراتے ہوئے تعویذ شاہ کی درگت بنتی دیکھ رہے تھے۔ اور دل ہی دل میں خوفزدہ تھے کہ غصے کی یہ لہران کی طرف نہ پلٹ پڑے۔

"یہ مذاق نہیں ہے۔" عامر نذیر کا غصہ اسی طرح قائم تھا۔ "تم سمجھتے ہو فلک پیر کو ہرا کر تم نے بڑا تیر مارا ہے۔ فلک پیر کو تم نے نہیں میں نے ہرایا تھا۔ میرا اور میری پارٹی کا نام لئے بغیر اس علاقے میں جاؤ گے تو فلک پیر تمہاری بوٹیاں اپنے شکاری کتوں کو کھلا دے گا۔"

"سائیں آپ بادشاہ ہیں۔ ہماری سرکار ہیں۔ ہماری طاقت ہیں۔ آپ کی لاٹھی سے ہم نے فلک پیر کو مارا تھا۔ پھر ماریں گے۔ سائیں آپ کی لاٹھی سے اس کے شکاری کتوں کا بھی شکار کریں گے۔ کوئی ہماری بوٹی بوٹی کر دے تب بھی یہی کہیں گے

جئے سائیں عامر۔ سدا جئے۔" تعویذ علی شاہ نے نعرہ لگا کر بڑے فخر سے ڈی ڈی ٹی خان اور رے رے افغانی کو دیکھا۔ دونوں دم سادھے ہوئے چپ چاپ بیٹھے تھے۔ تعویذ شاہ کو پتہ تھا عامر نذیر اپنے وفاداروں کی ایسی تقریروں سے بہت خوش ہوتا تھا۔ لیکن رخشندہ کو حیرت ہوئی جب تعویذ شاہ کا نعرہ بھی عامر نذیر کا موڈ نہ بدل سکا۔

"تقریر مت کرو۔ یہ جلسہ کرنے کا وقت نہیں ہے۔ میں لاٹھی نہیں تم سب کے لئے سونے کے انڈے دینے والی مرغی بن گیا ہوں۔ آج پھر آپ لوگ میری حکومت جانے کی خبریں لے کر آئے ہیں۔ میں نہیں رہا تو کوئی آپ کو ٹکے سیر بھی نہیں پوچھے گا۔ ٹکے سیر۔"

"بیشک سائیں۔ آپ ہیں تو ہم ہیں۔ آپ کو ہم نے پہلے بھی نہیں چھوڑا تھا اب بھی نہیں چھوڑیں گے۔ پارٹی کے پرانے خادم ہیں سائیں پرانے خادم۔" سیاست نے تعویذ شاہ کی کھال بہت موٹی کر دی تھی۔

"خادم نہیں آقا بن گئے ہیں آپ لوگ۔ خادم رہتے تو میری پارٹی کا یہ حال نہ ہوتا۔ اپنی جڑیں کاٹ کر اسلام آباد میں آ بیٹھے ہیں' کلفٹن میں رہتے ہیں۔ اپنے گھروں کو عبداللہ شاہ غازی کا مزار بنا لیا ہے آپ لوگوں نے۔ مرادیں لے کر آنے والے آپ کے چوکیدار سے دھکے کھاتے ہیں۔" عامر نذیر نے اچانک ہی توپوں کا رخ تعویذ شاہ سے ڈی ڈی ٹی خان کی طرف کر دیا۔

"خان صاحب سے پوچھئے یہ اس محلے میں کتنے سالوں سے نہیں گئے جہاں سے انہیں میری پارٹی اٹھا کر لائی تھی۔ گارڈز کے بغیر خود اپنے شہر میں نہیں جا سکتے۔ کیسے کیسے شیر پالے ہیں میں نے۔" کوئی نہیں بولا تو وقفہ لے کر عامر نذیر نے اپنا رخ دوبارہ تعویذ شاہ کی طرف کر لیا۔

"آپ لوگ مجھ پر اپنی وفاداریوں کا بہت احسان جتاتے ہیں۔ یہ وفاداری نہیں آپ کی مجبوری ہے۔ کہاں جائیں گے۔ کس کے پاس اور کیا لے کر جائیں گے۔ سو ووٹوں کے آدمی نہیں ہیں آپ لوگ سو ووٹوں کے۔ میرا اثاثہ وہ لوگ ہیں جو میرے بغیر بھی الیکشن جیتنے کی طاقت رکھتے ہیں۔ وہ نہ ہوں تو میری پارٹی بے نام کھمبوں کی

پارٹی بن جائے گی۔ حزب اختلاف میں جوتیاں گھستے گھستے آپ کے پاؤں غائب ہو جائیں گے۔'' عامر نذیر خاموش ہوا تو تھوڑی دیر کے لئے پھر خاموشی چھا گئی۔ تعویذ شاہ نے سوچا کہ شاید اس کی جان چھوٹ گئی ہے۔ لیکن آصفہ نے ماحول سے تناؤ دور کرنا چاہا تو نشانہ ایک بار پھر تعویذ شاہ تھا۔

''خیر پور والے بتا رہے تھے کہ آپ ایک شادی اور کرنے والے ہیں۔'' تعویذ شاہ جانتا تھا یہ خبر کس نے سنائی ہو گی۔ لیکن اسے اب مزید تختۂ مشق نہیں بننا تھا۔ پرانا سیاستدان تھا اور توپوں کا رخ بدلنا جانتا تھا۔

''مہراللہ شاہ والے میرے خلاف افواہیں اڑاتے ہیں۔ شادی میں نہیں سائیں ڈی ڈی ٹی خان کر رہا ہے۔''

ڈی ڈی ٹی خان نے تعویذ شاہ کو اس طرح گھورا جیسے کچا چبا جائے گا۔ لیکن تعویذ شاہ لاپرواہی کے انداز میں باہر دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی حکمت عملی کامیاب ثابت ہوئی تھی۔ عامر نذیر ڈی ڈی ٹی خان کو گھورنے لگا تھا۔ ڈی ڈی ٹی خان کی پہلے سے دو بیویاں تھیں۔ رخشندہ کو اس کے نئے معاشقے کا علم تھا۔ ڈی ڈی ٹی خان کی پہلی بیوی نے جو خود بھی پارٹی کی ایک رہنما اور آصفہ کی منہ لگی تھی اسے اور آصفہ کو بتایا تھا۔ کوئی وکیل لڑکی تھی جسے ڈی ڈی ٹی خان نے پبلک پراسیکیوٹر بنوا دیا تھا۔ ڈی ڈی ٹی خان آج کل ویسے بھی بہت دباؤ میں تھا۔ اسمبلی میں سوال ہو گیا تھا کہ اس نے اپنے بیٹے کو ایک سرکاری وفد کا رکن بنا کر امریکہ بھجوایا تھا۔ اخبارات خوب چٹخارے لے رہے تھے۔

''خان صاحب کچھ خیال کیجئے۔ آپ کی دو بیویاں خارجہ دفتر کے لئے مسئلہ بنی ہوئی ہیں۔ تیسری آ گئی تو قانون کی پوری وزارت ہل جائے گی۔'' عامر نذیر نے سنجیدگی سے کہا۔

''کیا نعیمہ نے کوئی شکایت کی ہے؟'' ڈی ڈی ٹی خان نے تشویش کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔ پہلی بیوی اس کے لئے ایک مسئلہ بن گئی تھی۔

''نعیمہ خان ہماری بہادر ساتھی ہے۔ وہ شکایت نہیں کرتی، گریبان پکڑنا جانتی

ہے۔" آصفہ نے گرہ لگائی۔

یہ واقعہ بھی ڈی ڈی ٹی خان کی زندگی کے شرمناک واقعات میں سے ایک تھا۔ نعیمہ واقعی ایک بے دھڑک عورت تھی۔ وہ ایک غریب بستی کے دواخانے میں نرس تھی اور ایک طویل فاصلہ طے کر کے قومی اسمبلی تک پہنچی تھی۔ اس زمانے میں ڈی ڈی ٹی خان الیکشن ہار کر سندھ کی حکومت میں پہلی بار مشیر بنا تھا اور کلفٹن کے ایک بنگلے میں رہتا ہوا اقتدار کے مزے لے رہا تھا۔ ایک دن اندر کمرے میں نازک اندام سی نئی نویلی دوسری بیوی کا ہاتھ پکڑے رومیو جیولٹ کھیل رہا تھا کہ نعیمہ کمرے میں گھس آئی اور گریبان پکڑ کر گھسیٹتی ہوئی باہر لے گئی جہاں پارٹی کے بہت سے کارکن اپنے اپنے کاموں کے لئے کئی گھنٹوں سے اس کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ نعیمہ نے اپنے شوہر کی دوسری شادی کو اپنی ذات کا نہیں پارٹی کا مسئلہ بنا دیا تھا۔ سب سمجھ گئے کہ آصفہ کا اشارہ کس طرف تھا۔ ڈی ڈی ٹی خان کو پسینے آنے لگے، چشمے کے شیشے دھندلے ہو گئے۔ چشمہ اتار کر وہ قمیض کے دامن سے شیشے صاف کرنے لگا۔

"مصری حکومت نے وزارت خارجہ کو آپ کے بارے میں ایک نوٹ بھجوایا ہے۔" عامر نذیر نے ڈی ڈی ٹی خان کو اسی طرح گھورتے ہوئے کہا۔ ڈی ڈی ٹی خان حال ہی میں مصر کا سرکاری دورہ کر کے آیا تھا۔

"مصری حکومت نے؟" ڈی ڈی ٹی خان نے حیرت سے کہا۔ مصر میں تو اس نے ایسا کچھ نہیں کیا تھا۔ بلکہ وہاں تو سب اس کی فلسفیانہ تقریروں سے متاثر ہوئے تھے۔

"آپ اہرام مصر دیکھنے گئے تھے تو شاید خود کو فرعون سمجھنے لگے تھے۔ اپنی دونوں بیویوں کو آپ نے ہمراہ لے جانے اور ہوٹل کے کمرے میں ساتھ رکھنے پر اصرار کیا تھا۔" عامر نذیر کا لہجہ اسی طرح تلخ تھا۔

"لیکن نعیمہ کو تو عورتوں کی نمائندگی کے لئے آپ نے خود وفد میں شامل کیا تھا۔" ڈی ڈی ٹی خان نے آصفہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ آنکھوں میں بیچارگی آ گئی تھی۔ آصفہ کو بھی ترس آنے لگا۔ لیکن عامر نذیر بے رحم ہو رہا تھا۔

”جی ہاں کیا تھا۔ اس لئے نہیں کیا تھا کہ آپ حرم سجانے لگیں۔ کب عقل آئے گی آپ لوگوں کو۔ آپ کو پتہ ہے مصریوں نے آج تک ہمارے بزرگوں کے گناہ معاف نہیں کئے۔ ہمیں بدنام کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ خود کو ہم سے برتر سمجھتے ہیں۔ وہ آپ کو نہیں عامر نذیر کو جانتے ہیں۔ مذاق آپ نہیں میں بنا ہوں۔“

”آئی ایم ساری۔“ ڈی ڈی ٹی خان کے منہ سے بمشکل نکلا۔

”ساری کہنے سے کچھ نہیں ہو گا۔ اپنی حرکات درست کیجئے۔ میں نے جیلوں اور مقدموں کے یہ عذاب آپ کی بیویوں' محبوباؤں اور بیٹوں کے لئے نہیں سہے تھے۔ میں نے اور آصفہ نے آج دن بھر اپنے بچوں کی شکل نہیں دیکھی ہے۔ پیر صاحب اپنے گھر کو چھوڑ کر شام سے یہاں بیٹھے ہوئے وظیفہ کھینچ رہے ہیں۔ یہ ان کی دعاؤں کا اثر ہے کہ آپ لوگوں کی گاڑیوں پر جھنڈا لہرا رہا ہے لیکن آپ لوگوں کی حرکات یہی رہیں تو کوئی وظیفہ کام نہیں کرے گا۔ میں آپ سب کو خبردار کر رہا ہوں۔ اپنے اعمال درست کر لیجئے۔ ٹھیک کر لیجئے اپنے آپ کو۔“

ڈی ڈی ٹی خان خاموشی سے سر جھکائے عامر نذیر کا لیکچر سن رہا تھا۔ اس کی ترقی میں اس کے خاموش رہنے والے فدویانہ انداز کا بہت دخل تھا۔ تعویذ علی شاہ اسی طرح لاپرواہی سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اخباروں میں اہرام مصر والی خبر کو کس طرح چٹپٹا بنا کر چھپوائے گا۔ اور رے رے افغانی سوچ رہا تھا کاش عامر نذیر ایسی ہی تقریر آصفہ' اپنے وزیر اور مشیر دوستوں اور کچن کیبنٹ میں بیٹھنے والوں کے لئے بھی کر سکتا جو قومی خزانے کو اپنا جیب خرچ سمجھ کر استعمال کر رہے تھے۔ تاہم اسے اطمینان تھا کہ عامر نذیر کی توپوں کا رخ اس کی طرف نہیں ہو گا۔ اس کی ذات سے کوئی اسکینڈل وابستہ نہیں تھا۔ اس نے تو جوانی میں سفید ہو جانے والے اپنے بالوں پر کبھی مہندی یا خضاب تک نہیں لگوایا تھا۔ صرف اس کی مونچھیں بڑی ہو کر نوکدار ہو گئی تھیں۔ لیکن عامر نذیر کی مونچھیں بھی ایسی ہی بڑی بڑی تھیں۔ رے رے افغانی اتنا محتاط ضرور تھا کہ عامر نذیر کے سامنے اپنی مونچھوں کو تاؤ دینے کی

عادت پر قابو رکھتا تھا۔

رے رے کی سیاسی زندگی تنے ہوئے رسے پر سنبھل سنبھل کر چلنے میں گزر رہی تھی۔ ایک تو اس کی سیاسی بنیاد بہت کمزور تھی۔ اس کا اپنا کوئی حلقہ نہیں تھا۔ وہ کہیں سے انتخاب نہیں جیت سکتا تھا۔ دوسری وجہ اس کی خالہ تھی۔ خالہ وہ پل تھی جس پر چل کر وہ یہاں تک پہنچا تھا۔ لیکن خالہ ہی اس کے زوال کی وجہ بھی بن سکتی تھی۔ اسے معلوم تھا آصفہ اس کی خالہ کو ناپسند کرتی ہے' اسی لئے رے رے افغانی نے اپنی خالہ سے ملنا جلنا تک بند کر دیا تھا۔ پھر بھی وہ خوفزدہ رہتا تھا۔ بڑی مشکل سے سینٹ میں پہنچ کر وزیر بنا تھا۔ ایک ذرا سی غلطی اس کے بے بنیاد محل کو کسی وقت بھی گرا سکتی تھی۔ لیکن اس وقت تو وہ ایک تشویشناک خبر لے کر آیا تھا۔ وہ بھی دن بھر حکومت کے چلے جانے کی خبریں سنتا رہا تھا۔ ان پر اس نے کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ یہ افواہیں ایک سال سے اڑ رہی تھیں۔ کسی کسی دن افواہوں کا مطلع زیادہ ابر آلود ہو جاتا۔ لیکن آج شام جس خبر کی تصدیق ہوئی تھی اس نے اسے پریشان کر دیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ عامر نذیر کو ابھی معلوم نہیں ہوا ہو گا۔

"ڈبل آر آج تم کیوں خاموش ہو۔ کیا تمہارے پاس میرا تختہ الٹنے کی کوئی خبر نہیں ہے؟" عامر نذیر نے اسے مخاطب کر کے کمرے کی خاموشی توڑی۔

"ناصر بھٹی کے چالیس ممبر غائب ہو گئے ہیں۔ خبر یہ بھی ہے کہ ناصر بھٹی کا ریاض توصیف سے کوئی معاہدہ ہو گیا ہے۔ وہ صبح عدم اعتماد کی تحریک پیش کرنے والا ہے۔" رے رے نے اپنے سینے سے خبر کا بوجھ فوراً" اتار دیا۔ اس کا خیال تھا عامر نذیر اچھل پڑے گا۔ پریشان ہو کر فون اٹھا لے گا۔ اسے اور رخشندہ کو دوڑائے گا۔ رخشندہ کا نام اور اس کے ساتھ ہونے کے خیال نے دل میں مٹھاس گھول دی۔ اسے جانے کیوں یقین تھا کہ اگر صمدانی درمیان میں نہ ہو تو رخشندہ اس کی ہو سکتی ہے۔ ایک بار رخشندہ اس کی ہو جاتی تو تنی ہوئی رسی چوڑی شاہراہ میں بدل جاتی۔ لیکن یہ رخشندہ کے بارے میں سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ اس وقت اس کی پریشانی کچھ اور تھی۔ اس نے اتنی چونکانے والی خبر سنائی تھی اور عامر نذیر اسے اس طرح دیکھ رہا تھا

جیسے مذاق اڑا رہا ہو۔ آصفہ کی تو آنکھوں میں ہی نہیں ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ تھی۔

"آپ لوگوں کو پتہ ہے کہ آپ کا مسئلہ کیا ہے؟" عامر نذیر نے ان سب کی طرف اپنی انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔ "آپ لوگ سمجھتے ہیں میں اندھا بہرا ہو کر حکومت کر رہا ہوں۔ مجھے کچھ نہیں معلوم کہ اس ملک میں اور میرے اردگرد کیا ہو رہا ہے۔ آپ میں سے ہر آدمی یہ سمجھتا ہے کہ وہ مجھ سے زیادہ باخبر ہے۔ آپ لوگوں کو سب کچھ پتہ ہے۔"

"نہیں، میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ میں تو......" عامر نذیر کے وقفہ لیتے ہی رے رے افغانی نے کچھ کہنا چاہا لیکن عامر نذیر نے اسے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔

"وحیدہ شمشاد نے رضا سروہی کے واٹر بیڈ پر جتنی کروٹیں لی ہیں مجھے ان کی بھی گنتی معلوم ہے۔" رخشندہ کو ایسا لگا جیسے افغانی کا چہرہ خون میں بھیگ گیا ہو۔ رخشندہ نے عامر نذیر اور آصفہ کی موجودگی میں یہ ٹیپ سنے تھے۔ بہت آزاد خیال ہونے کے باوجود تینوں دیر تک ایک دوسرے سے نظریں چراتے رہے تھے۔ رے رے سوچنے لگا اس کی خالہ کا بھوت کب تک اس سے چمٹا رہے گا۔

"مجھے پتہ ہے وہ چالیس ممبر کہاں ہیں۔ وہ مجھ سے پوچھ کر چھپائے گئے ہیں۔" عامر نذیر کی آواز میں فتح کے نقارے بج رہے تھے اور رے رے ہی نہیں تعویذ شاہ اور ڈی ڈی ٹی خان بھی اسے حیرت سے دیکھنے لگے تھے۔

"ناصر بھٹی مجھے بتا کر اپنے آدمیوں کو محفوظ جگہ لے گیا ہے۔ ریاض توصیف ناصر بھٹی کے آدمی خریدنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اس کے آدمی خرید لئے ہیں۔ کل جب ریاض توصیف کے چودہ آدمی گورنر ہاؤس میں پریس کانفرنس کریں گے تو وہ عدم اعتماد کا خیال ہمیشہ کے لئے دل سے نکال دے گا۔ اس بار ہونے والی لڑائی میں بھی زخم اسی کو آئیں گے۔"

"جئے سائیں عامر۔" تعویذ شاہ بے ساختہ کھڑا ہو کر نعرہ لگانے لگا۔

"سدا جئے۔" رے رے اور ڈی ڈی ٹی خان بھی بھول گئے کہ وہ جلسہ عام کے ہجوم میں نہیں، وزیراعظم ہاؤس کے کمرے میں بیٹھے ہیں۔ اس دفعہ عامر نذیر بھی

خوش ہوا تھا۔

"آپ اب جا کر چین کی نیند سو سکتے ہیں۔ آپ کی گاڑیوں پر جھنڈا کل بھی اسی طرح لہراتا رہے گا۔" عامر نذیر اپنے بیوقوف درباریوں پر انعام و اکرام کی بارش کرنے والا بادشاہ بن گیا۔ تینوں سمجھ گئے یہ انہیں رخصت کرنے کا اشارہ ہے اس لئے کھڑے ہو گئے۔ عامر نذیر نے بیٹھے ہی بیٹھے اپنا ہاتھ ان کی طرف بڑھا دیا۔

"نو مور وگ اینڈ نو مور شادی۔" اس نے تعویذ شاہ اور ڈی ڈی ٹی خان سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا اور جب رے رے افغانی کی باری آئی تو مسکرا کر کہنے لگا۔ "اینڈ نو مور آنٹی۔" رے رے کا چہرہ ایک بار پھر سرخ ہو گیا۔ ڈی ڈی ٹی خان خاموشی سے سر جھکائے آگے بڑھ گیا تھا لیکن تعویذ شاہ پلٹ آیا۔

"سائیں وگ کیا چیز ہے میرا تو سر بھی آپ کے قدموں پر قربان ہے۔" یہ کہہ کر اس نے سر سے اپنی وگ اتار کر عامر نذیر کے قدموں میں رکھ دی۔ تیز روشنی میں سر کا چاند چمکنے لگا تھا۔

"ارے ارے شاہ صاحب کیوں گنہگار کرتے ہو۔ اسے اٹھا کر پہنو ورنہ لوگ تمہاری شکل نہیں پہچانیں گے۔" عامر نذیر نے پاؤں پر رکھی ہوئی وگ پیروں سے ہی تعویذ شاہ کی طرف اچھال دی۔

"جو حکم سائیں کا۔" تعویذ شاہ نے ایک خوبصورت کیچ لے کر وگ دوبارہ اپنے سر پر منڈھ لی اور رے رے افغانی اور ڈی ڈی ٹی خان کی طرف فخر سے دیکھنے لگا جو دروازے کے پاس جا کر اس کے انتظار میں ٹھہر گئے تھے۔ تعویذ شاہ خوش تھا کہ اس نے اپنی وفاداری کا بھرپور مظاہرہ کیا تھا ساتھ ہی وگ بھی بچا لی تھی۔ اسے یقین تھا جلد یا بدیر سائیں اسے وزیراعلیٰ بھی بنا دے گا۔

ان کے جانے کے بعد آصفہ اور رخشندہ کی وہ ہنسی آزاد ہو گئی جو انہوں نے بہت دیر سے دبا رکھی تھی۔ لیکن عامر نذیر برے برے منہ بنا رہا تھا۔

"خود کو ڈھیلا چھوڑ دو ڈارلنگ۔ یہ تناؤ تمہارے اعصاب کے لئے ٹھیک نہیں ہے۔ تم آج لان پر ٹہلنے بھی نہیں گئے۔" آصفہ نے بہت پیار سے عامر نذیر کو دیکھتے

ہوئے کہا۔

"کس کے ساتھ جاتا۔ سب غائب ہو گئے ہیں۔ میری حکومت جانے کی افواہیں سنتے ہی سب کو ایک ساتھ لندن، دوبئی اور نیویارک یاد آ جاتا ہے۔ چوہوں کی طرح جہاز چھوڑ کر بھاگنے لگتے ہیں۔ سب کی چھٹی کر کے کسی دن سب کو بیچ بچ کے چوہے بنا دوں گا۔" عامر نذیر کا غصہ واپس آ گیا۔

"ریلیکس ڈارلنگ۔ وہ سب ہمارے دوست ہیں۔ پرانے ساتھی ہیں۔ ہمارے ہی کاموں سے باہر گئے ہیں۔ رخشی ڈیئر، صاحب کو شولڈر مساج دو۔ پھر میرے کندھے بھی دبانا۔ جسم میں کیسی تھکن بس گئی ہے۔" آصفہ اس طرح کراہی جیسے دن بھر گھر کے جھاڑو برتن کرتی رہی ہو۔ رخشندہ عامر نذیر کے کندھوں اور گردن کی مالش کرنے اٹھی ہی تھی کہ پیر کرامت کمرے میں داخل ہوا۔ جس حالت میں وہ کمرے میں آیا تھا اسے دیکھ کر عامر نذیر اور آصفہ بھی گھبرا کر کھڑے ہو گئے۔

پیر کرامت جوتیاں ہاتھوں میں لئے ننگے پاؤں آ کر کمرے کے وسط میں کھڑا ہو گیا تھا۔ انگارہ بنی ہوئی سرخ آنکھوں سے وحشت ٹپک رہی تھی۔ عامر نذیر پریشان نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ آصفہ نے دوپٹہ دوبارہ سر پر رکھ لیا اور رخشندہ سوچ رہی تھی کہ پیر کرامت اب کیا چمتکار دکھانے والا ہے۔

"غضب ہو گیا۔ گناہ عظیم ہوا ہے۔ اب کوئی نہیں بچے گا۔ سب تباہ ہو جائیں گے۔ اب یہاں کوئی نہیں رہے گا۔ سب کو جانا پڑے گا۔ جلدی جانا پڑے گا۔" وہ اس طرح بڑبڑا رہا تھا جیسے بہت خوفزدہ ہو۔

"کیا گستاخی ہو گئی پیر صاحب۔ آپ تو کہتے تھے ہم یہاں سے نہیں جائیں گے۔ بہت دنوں تک یہیں رہیں گے۔" عامر نذیر نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"اندھا ہو گیا تھا میں۔ لیکن اب جاگ گیا ہوں۔ بری امام نے مجھے وقت پر جگا دیا ہے۔"

"بری امام نے؟" آصفہ نے حیرت سے پوچھا۔ کل ہی تو اس نے مزار پر چادر چڑھوائی تھی۔

"میں ستاروں سے آنے والے وقتوں کا حال پوچھ رہا تھا کہ بری امام آ گئے' بہت جلال میں تھے۔ سخت بے حرمتی ہوئی ہے ان کی۔ ہم نے وزیراعظم ہاؤس اتنی اونچی جگہ بنوایا ہے کہ ان کا مزار ہمارے قدموں میں آ گیا ہے۔ جوتوں کی دھمک سے ان کی عبادت میں خلل ہوتا ہے۔ گھوڑوں کی ٹاپیں انہیں سونے نہیں دیتیں۔"

"تو اب کیا ہو گا۔" عامر نذیر سچ مچ تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ "نہ مزار کہیں جا سکتا ہے اور نہ وزیراعظم ہاؤس۔ پیر صاحب کوئی وسیلہ نکالئے۔ کچھ کیجئے۔" عامر نذیر نے سوچا کہ بات غلط نہیں تھی۔ وزیراعظم ہاؤس بنواتے وقت کسی نے بھی یہ بات نہیں سوچی تھی۔

"بہت مشکل سے منایا ہے۔ جوتے اپنے سر پر رکھ کر وظیفہ کیا ہے تب مہلت ملی ہے۔" رخشندہ خوفزدہ ہو گئی۔ کہیں پیر کرامت ان سے بھی جوتیاں سر پر نہ رکھوا دے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی تعویذ شاہ اپنے سر کی ٹوپی قدموں پر رکھ کر گیا تھا۔ کیا مکافات کا عمل اتنا تیز رفتار ہو گیا ہے؟ لیکن رخشندہ کا خوف غلط ثابت ہوا۔ پیر کرامت اتنی دور نہیں جا سکتا تھا۔

"چالیس دن تک ننگے پاؤں کھڑے ہو کر وظیفہ کرنا ہو گا۔" پیر کرامت نے اعلان کیا۔

"کل سے آپ جو جگہ کہیں آپ کے وظیفے کے لئے مخصوص ہو جائے گی۔" عامر نذیر نے کہا۔ اس کی جان میں جان آ گئی تھی۔

"نہیں' یہاں نہیں۔ میرے قدم اس وقت تک یہاں نہیں آئیں گے جب تک وظیفہ مکمل نہیں ہو گا۔ وظیفہ ادھر پڑھا جائے گا۔ وہاں۔ جہاں سے وزیراعظم ہاؤس نظر میں رہے گا اور بری امام بھی۔" پیر کرامت نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"وہاں؟" عامر نذیر نے حیرت سے کہا۔ "لیکن وہاں تو ایوان صدر ہے۔ شاید صدر نہ مانیں۔"

"ماننا پڑے گا۔ نہیں مانیں گے تو نہ وہ رہیں گے اور نہ ہم۔ کوئی نہیں رہے

گا۔ کوئی نہیں بچے گا۔" پیر کرامت نے غصے سے کہا۔ آنکھیں سکڑ کر اور بھیانک لگنے لگی تھیں۔ عامر نذیر خاموشی سے آصفہ کی طرف دیکھنے لگا۔

"صدر میرے بھائی ہیں۔ مجھے منع نہیں کریں گے۔ میں کل ہی جا کر ان سے بات کروں گی۔ پیر صاحب آپ وظیفے کی تیاری کریں۔" آصفہ نے پر یقین لہجے میں کہا۔ پیر کرامت کو جیسے قرار آ گیا تھا۔ جوتے پہن کر وہ آہستہ آہستہ قدموں سے چلتا ہوا صوفے پر اپنی پرانی جگہ آ کر بیٹھ گیا۔ ایوان صدر کا دروازہ کھلنے کا سامان ہو گیا تھا اس لئے جوتے ہاتھ میں یا سر پر رکھنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ آصفہ' عامر نذیر اور رخشندہ بھی بیٹھ گئے۔ لیکن وہ اس بار زمین پر نہیں صوفوں پر بیٹھے تھے۔ تھوڑی دیر میں سفید رنگ کی وردی اور کلاہ پہنے ہوئے ایک بیرا سنہرے رنگ کی ٹرالی دھکیلتا ہوا کمرے میں آیا اور پیر کرامت کے سامنے سجا کر باہر چلا گیا۔ یہ پیر کرامت کے ایجنڈے کا آخری آئٹم تھا۔ اس نے ٹرالی پر رکھی ہوئی مٹھائی کی پلیٹ پر سے کپڑا ہٹایا' ہاتھ اٹھا کر دعا کی' برفی کے ایک ٹکڑے کے تین حصے کر کے عامر نذیر' آصفہ اور رخشندہ کو اپنے ہاتھ سے کھلائے اور قلاقند کا ایک بڑا سا ٹکڑا اٹھا کر اپنے منہ میں رکھ لیا۔ سب نے اپنے اپنے اعصاب اور بدن ڈھیلے چھوڑ دیئے تھے۔ بحران کا وقت گزر گیا تھا۔

"اخبار میں چھپا ہے میرے پاس ایک سو ملازم ہیں' میں شام سے اسی ایک بیرے کو آتے جاتے دیکھ رہا ہوں۔ باقی ننانوے کہاں گئے۔" عامر نذیر نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"اخبار والے بکواس چھاپتے ہی رہتے ہیں۔" رخشندہ نے کہا جو عامر نذیر اور آصفہ کو کافی دے کر اپنی کافی لئے دوبارہ اپنی نشست پر بیٹھ گئی تھی۔ بیرے کو اتنی دیر تک کمرے میں رکنے کی اجازت نہیں تھی کہ وہ کافی بنا کر سب کو پیش کر سکے۔

"اس لئے چھاپتے رہتے ہیں کہ ہم ان کے جواب میں معذرت خواہانہ انداز اختیار کرتے ہیں۔" پیر کرامت نے مٹھائی کا ایک اور بڑا سا ٹکڑا منہ میں رکھ کر دانش کے موتی بکھیرنے شروع کئے۔

"ہمیں دفاع کرنے کی نہیں حملہ آور ہونے کی ضرورت ہے۔ آپ کے پاس ایک سو ملازم ہیں تو سینہ ٹھونک کر کہئے کہ ہاں ہیں۔ اس لئے ہیں کہ یہ آپ کا حق ہے۔ یہ حق آپ کو اس ملک کے بارہ کروڑ عوام نے دیا ہے۔" پیر صاحب نے مٹھائی کا ایک اور ٹکڑا اٹھا کر منہ میں رکھا۔ سب ہمہ تن گوش تھے۔ رخشندہ کو معلوم تھا کہ چرس کے کئی سگریٹ پینے اور بہت سی مٹھائی کھانے کے بعد پیر کرامت پر دانشوری کا دورہ پڑتا تھا۔

"آپ کے پاس صرف ایک سو ملازم ہیں۔" پیر کرامت نے مٹھائی نگلنے کے بعد کہنا شروع کیا۔ "آج سے پانچ سو سال پہلے جب پورے ہندوستان کی آبادی آج کے پاکستان کی آبادی سے کم تھی علاء الدین خلجی کے ذاتی غلاموں کی تعداد پچاس ہزار اور فیروز شاہ تغلق کے بندگان خاص دو لاکھ سے زیادہ تھے۔ سلطان محمد تغلق کے دستر خوان پر روزانہ پانچ سو آدمی کھانا کھاتے تھے اور شاہی باورچی خانوں کے لئے ڈھائی ہزار بیل، دو ہزار بھیڑیں اور سینکڑوں پرندے ذبح ہوتے تھے۔ اس کے پاس ۱۲ سو ڈاکٹر، اتنے ہی موسیقار اور ایک ہزار شاعر ملازم تھے۔ ایک ہزار سے زائد گلوکار شاہی خاندان کو گانا سکھانے پر اور چار ہزار درزی کپڑے سینے پر مامور تھے۔ وہ خود ساختہ سلطان تھے، آپ کو تو عوام نے ووٹ دے کر اپنے سر کا تاج بنایا ہے۔ آپ کیوں شرمندہ ہیں کہ آپ کے پاس ایک سو ملازمین ہیں۔"

پیر کرامت نے بات ختم کر کے پھر مٹھائی کی پلیٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس دفعہ اس کا حملہ امرتی پر ہوا تھا۔ عامر نذیر متاثر نظر آتا تھا۔ اسے پیر کرامت اسی لئے پسند تھا کہ وہ صرف تعویذ لکھنے اور وظیفے پڑھنے والا پیر نہیں تھا بلکہ عامر نذیر کی حکومت کے ہر عمل کو اخلاقی جواز بھی فراہم کرتا تھا۔

"ہمارے صحافیوں کو تاریخ کا شعور ہوتا تو یہ معاشرہ زوال کا شکار نہ ہوتا۔" عامر نذیر نے کہا اور آصفہ کو دیکھنے لگا۔ لیکن آصفہ کا ذہن کہیں اور تھا۔ اس نے تو شاید پیر کرامت کی تقریر بھی نہیں سنی تھی۔ رخشندہ کو معلوم تھا کہ وہ کوئی اہم بات کہنے کی تیاری کر رہی ہے۔ اسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔

"پیر صاحب! صدر کا کوئی انتظام کیجئے۔ انہوں نے ہمیں بہت پریشان کیا ہے۔ ہماری بلی ہمیں ہی میاؤں کرنے لگی ہے۔ پچھلی دفعہ آپ نے اشفاق حسین کے لئے جو تعویذ لکھا تھا ایسا ہی زود اثر تعویذ صدر کے لئے لکھ دیجئے۔" یہی بات جو کئی دنوں سے عامر نذیر کہنا چاہتا تھا' آج آصفہ نے کہہ دی تھی۔ عامر نذیر پرامید نظروں سے پیر کرامت کو دیکھنے لگا۔

"ہوں!" پیر نے امرتی ختم کر کے انگلیاں اپنے بالوں پر پھیر کر صاف کرتے ہوئے ہنکارا بھرا اور تھوڑے سے توقف کے بعد کہنے لگا۔ "ٹھیک ہے۔ چاند کی چودہ تاریخ ہے۔ ستاروں کی چال بھی موافق ہے۔ صدر صاحب کو آج ہی رخصت کئے دیتے ہیں۔" عامر نذیر اور آصفہ کے چہروں پر خوشیوں کے کنول کھل گئے اور رخشندہ سوچنے لگی آج کی رات بھی گئی۔ اسے پتہ تھا یہ پوری رات کا عمل تھا۔ پچھلی دفعہ بھی صبح کے چھ بج گئے تھے۔ ماں کا نام ڈھونڈا جائے گا' پھر زعفران گھولا جائے گا' کاغذ پاک کیا جائے گا اور سانٹھے کا کنوارا قلم منگوایا جائے گا۔ تعویذ کو لکھ کر موم جامے میں لپیٹا اور ہرے رنگ کے کپڑے میں سلوایا جائے گا۔

"صدر کی والدہ کا نام؟" پیر کرامت نے کاغذ قلم لے کر کاغذ پر چار خانے بناتے ہوئے پوچھا۔ وہ تعویذ لکھنے سے پہلے کاغذ پر اسی طرح چار خانے کھینچ کر اور نقش و نگار بنا کر برجوں کے طلسم کدے تعمیر کرتا تھا۔ پچھلی بار جب اشفاق حسین کا زور توڑنے کے لئے تعویذ لکھا جا رہا تھا سب سے زیادہ پریشانی اشفاق حسین کی ماں کا نام حاصل کرنے میں ہوئی تھی۔ کراچی میں کتنے سوئے ہوئے لوگوں کو جگایا گیا تھا۔ پھر بھی صبح کے چار بج گئے تھے۔

"رخشی' مسعود کو فون لگواؤ صدر کے خاندان کا آدمی ہے' ان سے ناراض بھی ہے۔ اس کو صحیح پتہ ہو گا۔" آصفہ نے رخشندہ سے کہا۔ رخشندہ اٹھ کر اس طرف جانے لگی جہاں فون رکھے تھے۔ اسے پتہ تھا کہ عامر نذیر نے اے ڈی سی اور دوسرے انتظامی عملے کی چھٹی کر دی ہے۔ لیکن رات کی شفٹ میں کام کرنے والا عملہ اور آپریٹر موجود ہوں گے۔ عامر نذیر نے ہاتھ اٹھ کر رخشندہ کو فون کی طرف جانے

سے روک دیا۔

"مجھے نمبر دو میں خود فون کروں گا۔ رات کے بارہ بج چکے ہیں' وہ نواب آدمی ہے۔ اس وقت میرے علاوہ کسی کا فون اسے نہیں اٹھا سکے گا۔"

رخشندہ اپنی ڈائری میں "ایم" کے صفحات پلٹنے لگی لیکن اس سے پہلے کہ وہ نمبر تلاش کر سکتی اسے عامر نذیر کی چنگھاڑ سنائی دی۔ وہ بار بار سائڈ کی میز پر رکھے ہوئے فون کا کریڈل کھٹ کھٹا رہا تھا۔ یہ عامر نذیر کا خصوصی فون تھا۔

"رخشی' متین رحیم کو فون کر کے جگاؤ۔" متین رحیم کمیونیکیشن کا وفاقی وزیر تھا۔ "مجھے ابھی اس کا استعفیٰ چاہئے۔ اس ملک کے وزیراعظم کا فون خراب ہے اور اس کی وزارت سو رہی ہے۔ پی ایس او کو جگا کر ابھی یہیں بلاؤ۔ آپریٹر سے کہو پی آئی او صاحب کو فون کر کے انہیں میرے پاس آنے کو کہے۔" عامر نذیر نے اس زور سے ریسیور پٹخا کہ اونگھتا ہوا پیر کرامت بھی اچھل پڑا۔ رخشندہ اٹھ کر تیزی سے اس طرف لپکی جہاں ایک قطار میں کئی فون رکھے ہوئے تھے۔ اس کی چھٹی حس بیدار ہو کر خطرے کی گھنٹیاں بجانے لگی تھی۔ آصفہ عامر نذیر کے پاس پہنچ کر انگلیوں سے اس کے کندھے دباتے ہوئے تسلی دے رہی تھی۔

"ریلیکس ڈارلنگ ریلیکس!" رخشندہ نے ایک ایک کر کے سارے فون آزما لئے۔ اس کے اپنے اندر خطرے کی جو گھنٹیاں بج رہی تھیں اسے صرف ان کی ہی آواز آ رہی تھی۔ تمام فون خاموش پڑے تھے۔ وہ پلٹی تو اس کے چہرے کے بدلے ہوئے رنگ کو دیکھ کر آصفہ کا چہرہ بھی سفید ہو گیا۔ پیر کرامت نے آنکھیں بند کر کے سر صوفے کی پشت سے ٹکا دیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ آج کی افواہیں غلط نہیں تھیں۔

"مجھے پتہ ہے میرا فون خراب ہے تو دوسرے فون بھی ٹھیک نہیں ہوں گے۔ پوری لائن خراب ہوئی ہو گی۔ متین رحیم کو میں چھوڑوں گا نہیں۔ رخشی' اے ڈی سی کے کمرے میں جا کر دیکھو شاید کوئی فون کام کر رہا ہو۔" عامر نذیر کا پارہ اسی طرح چڑھا ہوا تھا۔ وہ دیوار پر لکھی ہوئی تحریریں پڑھنا پہلے بھی نہیں جانتا تھا۔ اس وقت تو غصے کی حالت تھی۔ بڑے بڑے حرفوں سے لکھی ہوئی عبارت بھی سمجھ میں نہیں آ

رہی تھی۔ رخشندہ ایک موہوم سی امید میں خاموشی سے اے ڈی سی کے کمرے کی طرف چلی گئی۔ عامر نذیر اپنے فون کے ساتھ ہی رکھی ہوئی بے تار والی اس گھنٹی کا بٹن دبانے لگا جس کے ایک بار دبتے ہی کئی ملازم دوڑے آتے تھے۔ کئی منٹ گزر گئے کوئی نہیں آیا۔ دور سے گھنٹی کی بازگشت آتی ہوئی سنائی دی لیکن کسی کے قدموں کی آواز نہیں آئی۔

"کیا مر گئے سب؟" عامر نذیر زور سے چیخا۔ اسی وقت اسے رخشندہ واپس آتی ہوئی دکھائی دی۔ اس کے چہرے کی رنگت غائب تھی۔ ہاتھوں میں ایک فیکس تھا جس پر صدر کا مونوگرام دور سے ہی چمکتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ جو کچھ عامر نذیر کے سوا سب پہلے ہی سمجھ چکے تھے وہ اب عامر نذیر کی سمجھ میں بھی آ گیا۔ لیکن دوسروں کی طرح اس کے چہرے کی رنگت نہیں بدلی اور وہ تن کر بیٹھ گیا۔ اسے لگا جیسے اس کے جسم پر کانٹے اگ آئے ہوں۔ دانتوں پر دانت اس سختی سے جمائے کہ جبڑے اور نمایاں ہو گئے۔ جسم پر اگے ہوئے کانٹے اتنے سخت ہو گئے تھے کہ ان سے جو بھی ٹکرائے گا چھلنی ہو جائے گا۔ اس نے سوچا اور پھر خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ میز سے سنہرے مونوگرام والا سگریٹ اٹھایا اور اس سے بوسہ بازی کی مشق کرنے لگا۔ اسے پتہ تھا اس وقت کچھ نہیں ہو سکتا۔ ایسی ہی ایک رات وہ پہلے گزار چکا تھا۔ اس موقع پر جو ڈرل ہوتی ہے اس سے اچھی طرح واقف تھا۔

پیر کرامت آنکھیں بند کئے بیٹھا پچھتا رہا تھا کہ اسے بری امام والی کرامت پہلے کیوں نہیں سوجھی تھی۔ اسے ایوان صدر تک جانے کا اب کوئی اور ذریعہ تلاش کرنا پڑے گا۔ رخشندہ خان عامر نذیر کے سامنے فیکس رکھ کر آصفہ کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی تھی اور سوچ رہی تھی کہ سولی پر ایک بار پھر لٹکنا پڑے گا۔ جانے اس بار مدت کتنی طویل ہو۔ کچھ بھی ہو۔ مصیبت کے ان دنوں میں وہ عامر نذیر اور آصفہ کو چھوڑ کر نہیں جا سکتی تھی۔ آصفہ بھی پیر کرامت کی طرح پچھتاوے کا شکار تھی اور سوچ رہی تھی کہ وہ دو دن پہلے لندن جانا ملتوی نہ کرتی تو کتنا اچھا ہوتا۔ اچانک ہی عامر نذیر کے برابر میں رکھے ہوئے اس کے خصوصی فون کی گھنٹی کی تیز آواز نے سب کو

اپنی اپنی سوچوں سے چونکا دیا۔ صرف ایک فون کال کے لئے فون کی لائن جوڑی گئی ہو گی۔ عامر نذیر نے مسکراتے ہوئے سوچا۔ اسے معلوم تھا کہ یہ کس کا فون ہو گا۔ اس نے جلتا ہوا سگریٹ قالین پر پھینک کر پاؤں سے مسلا اور پانچویں گھنٹی پر فون اٹھا کر دوسرے ہاتھ سے مونچھوں کو تاؤ دینے لگا۔

صدر محترم

جنرل منصف کو رخصت کرنے کے بعد ایوان صدر کے اندر آ کر صدر نے ایک گہری سانس لی اور اپنے چاروں طرف دیکھا۔ خدام ہاتھ باندھے دور دور کھڑے تھے۔ صدر کو ایوان صدر کے در و دیوار سے مغلیہ دور کے درباروں کی شان و شوکت ٹپکتی ہوئی نظر آئی۔ بڑے بڑے ستون سلطنت روم کی یاد دلا رہے تھے۔ چھتیں آسمان سے اونچی لگنے لگی تھیں اور شیش محل کو شرماتے ہوئے فانوس کی روشنی چاند ستاروں کو ماند کر رہی تھی۔ صدر نے فرش کی طرف دیکھا تو لال رنگ کے قالین کی سرخی شوخ نظروں سے مسکرائی۔ لفٹ کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے صدر کو لگا جیسے وہ بادلوں میں تیر رہے ہوں۔

جنرل منصف کو چھوڑنے صدر آج خود نیچے تک آئے تھے اور انہوں نے ایوان صدر کے مرکزی دروازے کی سیڑھیوں پر جنرل کو گلے لگا کر رخصت کیا تھا۔ جنرل کو اتنا پروٹوکول پہلے کبھی نہیں دیا گیا تھا۔ اور یہ بھی پہلی بار ہوا تھا کہ جنرل کی کوئی بات نہ مانی گئی ہو۔ "زیرو آور" (Zero hour) پر شروع ہونے والے آپریشن کا

پہیہ متحرک ہو گیا تھا' لیکن اس کے بعد جو کچھ ہونا تھا اس پر صدر اور جنرل میں اختلاف تھا۔ صدر کو اپنی بات منوانے میں بہت مشکل پیش آئی تھی۔ ایک ایک جنرل اور کمانڈر کو خود بات کر کے قائل کیا تھا اور ان سے جنرل منصف پر زور ڈالنے کے لئے کہا تھا۔ قانون کے اعلیٰ ایوانوں میں جنرل منصف کی بات کرائی تھی۔ یہ وعدہ بھی کیا تھا کہ تین مہینے میں سب کچھ اتنا شفاف ہو جائے گا کہ ایمان علی سے دو سال میں بھی ممکن نہ ہو سکے گا۔ صدر کا دعویٰ جنرل منصف کو معصوم بچے کی تعلی لگا تھا۔ جنرل کو پتہ تھا کہ صدر نے بہت مہارت سے اسے چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے۔ منصف خان فوج کا مانا ہوا جنرل تھا۔ میدان جنگ میں پسپا ہونے کی حکمت عملی بھی جانتا تھا۔ لیکن اسے افسوس ہوا۔ اسے پتہ تھا جب وہ صدر کو گھیرے گا' جب اس کے آگے بڑھنے کا وقت آئے گا تو صدر کے قدم جمے نہ رہ سکیں گے۔ ایک اچھا انسان ضائع ہو جائے گا۔ واپس جاتے ہوئے جنرل نے بھی گرمجوشی کا مظاہرہ کیا تھا اور مسکراتے ہوئے رخصت ہوا تھا۔ صدر کو ایسا لگا جیسے انہوں نے یہ بازی بھی جیت لی ہے۔ صدر کو باہر تک آ کر جنرل منصف کو رخصت کرنے کے اپنے فیصلے پر خوشی ہوئی۔ جنرل منصف خوش خوش گیا تھا تو صدر بھی خوش تھے۔ جنرل منصف کو خوش رکھنا صدر کے لئے بہت ضروری تھا۔ آج کے بعد قدم قدم پر جنرل منصف کی مدد کی ضرورت تھی۔

صدر اپنے دفتر میں داخل ہو کر تھوڑی دیر کے لئے پھر اسی طرح کھڑے رہے۔ ایوان صدر کی طرح صدر کو اپنا دفتر بھی بدلا بدلا اور امریکی صدر کے دفتر سے زیادہ کشادہ لگ رہا تھا۔ انہوں نے وہائٹ ہاؤس کا اوول آفس فلموں میں دیکھا تھا۔ پچھلی دفعہ جب وہ امریکہ گئے تھے تو صرف امریکی نائب صدر سے مل سکے تھے۔ امریکی صدر کے پاس ملاقات کے لئے وقت نہیں تھا۔ لیکن پچھلی دفعہ کی بات الگ تھی۔ اب وہ جائیں گے تو اوول آفس میں امریکی صدر سے ون ٹو ون ملیں گے۔ امریکی صدر کو بتائیں گے کہ نئے عالمی نظام کو چلانے کے لئے کیا کرنا ضروری ہے۔ انہیں یقین تھا کہ ان کی سیاسی دانش امریکی صدر کو متاثر کرے گی۔ وہ امریکی صدر کو قائل

کر دیں گے کہ نئے عالمی نظام کو چلانے میں پاکستان کتنا اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ پاکستان کے عالمی وقار میں ایسا اضافہ ہو گا جو پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ امریکی صدر کا اعتماد مل گیا تو پھر ان کی طرف کون نگاہ اٹھا کر دیکھ سکتا تھا۔

میز کے پیچھے رکھی ہوئی کتھئی رنگ کی چرمی کرسی کی طرف جاتے ہوئے صدر کی چال میں کچھ اور تمکنت آ گئی۔ کرسی پر بیٹھ کر پہلی بار انہیں اس کی پوری اہمیت کا احساس ہوا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کرسی سے طاقت کی لہریں اٹھ کر ان کے بدن کے ذریعے روح میں جذب ہو رہی ہوں۔ انہوں نے کرسی کے دونوں ہتھوں کو مضبوطی سے تھام لیا۔ آج سے اس کرسی کی شان میں نیا اضافہ ہونے والا تھا۔ طاقت کا نیا باب کھلنے والا تھا۔ پچاس سال بعد وہ ایک نئے پاکستان کا آغاز کرنے والے تھے۔ "نیا پاکستان۔" صدر نے میز پر رکھی ہوئی اس ضخیم فائل کو دیکھا جو جنرل منصف خان نے انہیں دی تھی۔ صدر نے حقارت سے اس فائل کو اٹھا کر دوسری طرف پھینک دیا۔ ایمان علی کا "نیا پاکستان" کمزور پاکستان تھا۔ ایمان علی فوج کے بجٹ میں کمی چاہتا تھا۔ ایوان صدر اور وزیراعظم ہاؤس خالی کرا کے انہیں اسپتال اور کالج بنانا چاہتا تھا۔

"کوتاہ نظر۔ نعرہ باز۔" صدر کی سوچیں بڑبڑائیں۔ انہوں نے جنرلوں سے فوج کے بجٹ میں اضافہ کرنے، نئے میزائل اور نئے طیارے خریدنے کا وعدہ کیا تھا۔ ایوان صدر کی شان و شوکت کو بھی ابھی اور بڑھانا تھا۔ صدر نے ایک ایسا نیا پاکستان بنانا تھا جس کی فوجی طاقت دیکھ کر دشمن لرزہ بر اندام ہو جائیں اور جس کے صدر کی شان و شوکت کو دیکھ کر دوست فخر کرنے لگیں۔ صدر کو معلوم تھا کہ نئے پاکستان کو تعمیر کرنے کی صلاحیت اور طاقت ان کے سوا اور کسی کے پاس ممکن بھی نہیں تھی۔ یہ نسلوں کا ورثہ اور ان بزرگوں کا عطیہ تھی جنہوں نے حکومت کرنے کے نسلی حق کو بڑی شان کے ساتھ اور بہت بے خوفی سے استعمال کیا تھا۔ جن کی حویلیوں کی وسعت آج بھی اقتدار کے نئے محلوں کو شرماتی تھی۔

لیکن صدر نے نئے دور کی سیاست کو صرف نسلی ورثہ سمجھ کر قبول نہیں کیا تھا۔ انہوں نے حکومت کرنے کے آداب مستند اداروں سے سیکھے تھے۔ آج اقتدار

اپنے پورے معنوں کے ساتھ پہلی بار اقتدار کے صحیح حقدار کے پاس آیا تھا۔ صدر کو لگا جیسے ان کے آباؤ اجداد کی روحوں کو قرار آگیا ہو اور انہوں نے ایوان صدر کے دروبام میں بسیرا کر لیا ہو۔ صدر کے گرد طاقت کا ایسا حصار قائم کر دیا ہو جسے کوئی نہیں توڑ سکے گا۔ عامر نذیر بھی نہیں۔ ریاض توصیف بھی نہیں۔ اور..... اور..... جنرل منصف بھی نہیں۔ ملک چلانا فصل اگانے' دکانداری کرنے یا لیفٹ رائٹ کرنے کا کھیل نہیں۔ یہ ان تمنداروں اور سرداروں کا کام ہے جن کی صلاحیت خوشحالی کی نہریں نکال سکے' جن کا زور بازو مضبوط قلعوں کی طرح ہو' جن کے فیصلوں میں عدلیہ کا وقار چھپا ہوا ہو۔

ایک باوردی بیرا صدر کے لئے بغیر دودھ اور چینی والی سیاہ کافی لے کر آگیا۔ صدر کے ذاتی خادم نے چاندی کی طشتری میں رکھی ہوئی پیالی سے چمچہ بھر کافی نکال کر چکھی' دو منٹ تک اپنے مرنے کا انتظار کیا اور پھر اثبات میں سر ہلا کر بیرے کے ہاتھوں سے طشتری لے کر کافی کی پیالی صدر کے دائیں طرف میز پر رکھ دی۔ صدر کا یہ ذاتی خادم بھی نسلی ورثے کے سلسلے کی ایک کڑی تھا۔ وہ پیدا ہی اس لئے ہوا تھا کہ اگر صدر کی طرف موت آئے تو اسے درمیان سے اچک کر گلے لگا لے۔ صدر کو یہ عمل پسند نہیں تھا۔ ان تک آتے آتے کافی ٹھنڈی ہو جاتی تھی۔ لیکن مجبوری تھی۔ انہیں معلوم تھا کہ دشمن تاک لگائے بیٹھے ہیں۔

صدر نے کافی کا گھونٹ لیا۔ آج کافی بھی اتنی ہی گرم تھی جتنی کہ انہیں پسند تھی۔ ان کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔ آج ہر کام ان کی مرضی کے مطابق ہو رہا تھا۔ صدر کافی کا کپ ہاتھ میں لئے لئے کرسی کی پشت سے ٹک گئے اور نظریں سامنے رکھے ہوئے ٹیلی فون پر گاڑ دیں۔ تھوڑی دیر میں فون پر لگی ہوئی سرخ بتی روشن ہو کر سگنل دیتی جس کے بعد انہیں ایک فون کال کرنا تھی۔ اس ایک کال کے لئے انہیں بہت ہمت جمع کرنے کی ضرورت تھی۔ ایمان علی کو فون کرنے کی ذمہ داری خود جنرل منصف نے لے لی تھی۔ باقی فون کالوں کا کام صدر نے فیاض منگی کے سپرد کر دیا تھا۔

فیاض منگی بہت کام اور کمال کا آدمی ثابت ہوا تھا۔ جب وہ خصوصی مشیر کے طور پر مقرر ہو کر ایوان صدر آیا تھا تو اس کے بارے میں بہت چہ مہ گوئیاں ہوئی تھیں۔ کسی نے کہا تھا ایجنسی کا آدمی ہے' کسی نے جنرل برلاس کا وفادار قرار دیا تھا۔ لیکن صدر نے اسے آزمانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کی سفارشیں اور حوالے بہت مضبوط تھے۔ فیاض منگی ہر امتحان میں پورا اترا تھا۔ اس نے اپنے ہر عمل سے ثابت کیا تھا کہ اس کی وفاداریاں اولاً" صدر کے ساتھ ہیں۔ اس نے جنرل برلاس اور ناصر بھٹی کے درمیان ہونے والے معاہدے کی تفصیلات صدر کو لا کر دی تھیں۔ اس بات کو یقینی بنایا تھا کہ ایجنسیوں کی اہم رپورٹیں عامر نذیر کے پاس صدر کی نگاہ سے گزر کر پہنچیں۔ پچھلے ایک ہفتے میں تو اس نے ایجنسیوں اور وزیراعظم ہاؤس کے درمیان مواصلات کا سلسلہ تقریباً" توڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس نے صدر کو بتایا تھا کہ عامر نذیر اور آصفہ کے سروں پر وہ ایسا ٹرانسمیٹر لگانے کی تیاری کر رہا ہے کہ وہ جہاں بھی ہوں گے ان کی خبریں نشر ہو کر اس تک پہنچ جایا کریں۔ صدر کو یقین تھا اس کا دعویٰ غلط نہیں ہو گا۔ صدر کو آنے والے زمانوں کے لئے ایسے ہی آدمی کی ضرورت تھی۔ اقتدار پر صدر کی گرفت مضبوط کرنے کے لئے فیاض منگی کو کلیدی کردار ادا کرنا تھا۔ لیکن اس کے لئے فیاض منگی کو ایک اور امتحان سے گزرنا تھا۔ فیاض منگی اس امتحان میں کامیاب ہو گیا تو اسے وزیراعظم سے زیادہ بااختیار بنا دیا جائے گا۔ صدر نے سوچا۔ اسی وقت فون کی سرخ بتی جلنے بجھنے لگی۔ فون کا رابطہ قائم کر دیا گیا تھا۔ صدر کافی کا کپ میز پر رکھ کر اپنی کرسی پر آگے کی طرف جھک آئے۔ ایک گہرا سانس لے کر فون کا ریسیور اٹھایا اور بولنے کے لئے گلا صاف کرنے لگے۔

حصہ دوئم

چند سال پہلے...

ذہین جلالی

ذہین جلالی خالی جیبوں میں ہاتھ ڈالے کلب کے باہر کھڑا تھا۔ سردیوں کا موسم تھا لیکن سردی ایسی نہیں تھی۔ گیٹ پر بیٹھے ہوئے چوکیدار نے حسب عادت سینہ تان کر فوجی انداز میں سلام کیا اور پوچھا "صاحب ٹیکسی روکوں۔" جلالی نفی میں سر ہلاتا ہوا اس سے نظریں ملائے بغیر باہر نکل آیا تھا۔ چوکیدار مایوس ہو کر اسٹول پر بیٹھ گیا اور سگریٹ سلگانے لگا۔ جلالی جاتے ہوئے ہمیشہ چوکیدار کو دس روپے دے کر جایا کرتا تھا۔ لیکن اس وقت تو اس کی جیب میں دس پیسے بھی نہیں تھے۔ جیب میں پیسے نہ ہونے کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ کنگال تھا۔ بس جیب سے پیسے ختم ہو گئے تھے۔ رمی کھیلتے ہوئے جو کچھ بھی جیب میں تھا ہار گیا تھا۔ اس وقت اس نے پرواہ نہیں کی تھی۔ سوچا تھا امیر خان سے لے لے گا۔ کارڈ روم کا بیرا امیر خان اس کا بینکر تھا اور جلالی امیر خان کا سب سے اچھا گاہک تھا۔ ادھار لے کر دوسرے ہی دن دگنے سود کے ساتھ اصل واپس کرتا تھا۔ امیر خان کی جیب میں رکھے ہوئے کاغذ کے چھوٹے سے ٹکڑے پر نادہندگان کی جو فہرست درج تھی اس میں جلالی کا نام کبھی نہیں لکھا گیا تھا۔ اس

لئے امیر خان سے پیسے لینے میں کوئی رکاوٹ حائل نہیں تھی۔ سوائے اس کے کہ اس وقت امیر خان موجود نہیں تھا۔ وہ آج چھٹی لے کر جلدی گھر چلا گیا تھا۔ اس کی جگہ کوئی نیا بیرا تھا جو زیادہ سے زیادہ ٹپ لینے کی کوشش میں پوری طرح مستعدی دکھا رہا تھا۔ آج رمی اور برج کی میزوں پر کوئی بھی ایسا دوست نہیں تھا جس سے جلالی ٹیکسی کا کرایہ ادھار مانگ سکتا۔ کسی سے لفٹ ملنے کی امید بھی نہیں تھی۔ ابھی رات کے صرف نو بجے تھے۔ کارڈ روم کی رونق اپنے شباب پر تھی۔ سب اس طرح ڈٹے ہوئے تھے جیسے صبح سے پہلے نہیں جائیں گے۔ دوسرے روز چھٹی تھی اس لئے کسی کو وقت کی پرواہ نہیں تھی۔ جلالی کے پاس سگریٹ بھی ختم ہو گئے تھے۔ کچھ دیر تو مانگ مانگ کر پیتا رہا۔ لیکن پھر سب نے اپنے اپنے پیکٹ جیبوں میں رکھ لئے تھے یا تاش کے پتوں میں کھو جانے کی اداکاری کرتے ہوئے اس کی سگریٹ مانگتی ہوئی نگاہوں سے نظریں چرانے لگے تھے۔

جلالی نیچے اتر آیا۔ بلیرڈ کے کمرے میں ٹورنامنٹ ہو رہا تھا اس لئے ماحول تناؤ کا شکار تھا۔ ڈائننگ روم میں بھی کوئی شناسا چہرہ نظر نہیں آیا۔ باہر نکل کر آیا تو لان کے ملگجے اندھیرے میں مختلف میزوں کے گرد ٹولیاں بجی ہوئی تھیں۔ قریب جا کر کسی کو پہچاننے کی کوشش بدتہذیبی تھی۔ وہ اس روش سے گزرا جہاں روشنی زیادہ تھی۔ کوئی جاننے والا ہوتا تو دیکھ کر آواز دے سکتا تھا۔ وہ بہت آہستہ قدم اٹھا رہا تھا لیکن کوئی شناسا آواز نہیں آئی تو تیزی سے گیٹ کی طرف چلا گیا۔ اس کا خیال تھا تھوڑی دیر باہر انتظار کرے گا۔ کوئی دوست داخل ہوتا نظر آیا تو کہے گا کارڈ روم جانے سے پہلے اسے گھر چھوڑ آئے۔ کارڈ روم میں جانے کے بعد کسی کو وہاں سے نکالنا ناممکن تھا۔ دس منٹ اسی طرح کھڑا رہا لیکن کوئی جاننے والا آتا نظر نہیں آیا۔ جلالی بار بار ہاتھوں کو خالی جیبوں میں ڈال کر گھماتا اور پھر باہر نکال لیتا۔ سگریٹ کی طلب شدید تھی۔ اسے چوکیدار پر رشک آنے لگا جو مٹھی میں دبے ہوئے سگریٹ کے کش لے کر "کے ٹو" کی دھن میں مگن تھا۔ کئی بار سوچا کہ ایک سگریٹ اسی سے مانگ لے لیکن پھر جھجک آڑے آ گئی۔ سب سے آسان حل یہی تھا کہ ٹیکسی لے کر نواب ٹن کی

طرف چلا جائے۔ لیکن اگر نواب ٹن گھر میں نہ ہوا تو؟

جلالی کو اچانک بشیر پان والا یاد آ گیا۔ بشیر اس کے قلندری کے زمانے کا جاننے والا تھا۔ اب بھی جب کبھی وہ پی آئی ڈی سی پر بشیر کی دکان جاتا تو وہ گاہکوں کے ہجوم کو نظر انداز کر کے اپنی گدی سے اترتا اور گلے مل کر خیریت معلوم کرتا۔ جلالی نے ایک دفعہ پان کے پیسے دینے کی کوشش کی تھی تو ناراض ہو کر اس سے بات کرنا چھوڑ دی تھی۔ پی آئی ڈی سی زیادہ دور نہیں تھا' آرام سے ٹہلتا ہوا جاتا تب بھی بیس منٹ سے زیادہ نہ لگتے۔ وہاں کم از کم سگریٹ کا مسئلہ حل ہو سکتا تھا۔ بشیر اس سے پیسے نہیں لیتا۔ بلکہ جلالی کسی جھجک کے بغیر اس سے ادھار بھی مانگ سکتا تھا۔ وہ بشیر کا پرانا قرضدار تھا۔ برسوں پہلے اس سے ڈھائی روپے لئے تھے آج تک واپس نہیں کئے تھے۔ وہ بھی ایک ایسی ہی رات تھی۔ جلالی کی جیبیں اس رات بھی خالی تھیں۔ آج کی رات تو صرف جیبیں خالی تھیں بینک اکاؤنٹ میں پیسے بھرے تھے۔ اس زمانے میں پیسے بینک کی شکل دیکھتے ہوئے شرماتے تھے اور جیبیں ہمیشہ خالی رہا کرتی تھیں۔ برسوں پہلے وہ ایک رات اس کی زندگی میں انقلاب اور بہت سے اتار چڑھاؤ لے کر آئی تھی۔ وہ ایک رات جلالی کے لئے سنڈریلا کی کہانی بن گئی تھی۔ خالی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اور سیٹی بجاتے ہوئے خوش خرامی سے وہ پی آئی ڈی سی کی طرف چلا تو اس رات کے منظر بھی آنکھوں میں جگمگانے لگے۔ اس رات کو یاد کرتے ہوئے اسے آج بھی مزا آ رہا تھا۔ اسے ایسا لگا تھا جیسے یہ برسوں پرانی نہیں کل کی بات ہو۔

اس رات بھی وہ خوش خرامی سے جیبوں میں ہاتھ ڈالے ریز گاری گنتا اور سیٹی بجاتا ہوا جیکب لائنز سے ایمپریس مارکیٹ کی طرف رواں دواں تھا۔ پندرہ منٹ سے زیادہ کا راستہ نہیں تھا لیکن اسے پتہ تھا کہ کورنگی جانے والی آخری بس جا چکی ہو گی اور پہلی بس صبح پانچ بجے سے پہلے نہیں آئے گی۔ ابھی رات کا ڈیڑھ بجا تھا۔ جلالی نے درمیانی گھنٹے ایمپریس مارکیٹ کی بارونق فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کر گزارنے تھے۔ وہ جیب میں ہاتھ ڈالے ڈالے سکوں کے کناروں پر انگلیاں پھیر کر دوبارہ ریزگاری کا

حساب کرنے لگا۔ ایک چونی' ایک دونی' اور دو اکنیاں۔ کل آٹھ آنے تھے۔ بس کا ٹکٹ پانچ آنے کا۔ بچی ایک دونی اور ایک اکنی۔ ایرانی ہوٹل کی سنگل چائے بھی چار آنے کی ہو گئی تھی۔ ایک آنا کم پڑ رہا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب محاورے غلط نہیں ہوتے تھے اور روپے پیسے کی جگہ آنے پائی میں حساب ہو سکتا تھا۔ اس وقت فقیر ریزگاری لے کر گندی نالی میں نہیں پھینکتا اور روپے کا نوٹ لے کر ناک بھوں نہیں چڑھاتا تھا بلکہ ایک آنا لے کر بھی دعا دے جاتا تھا۔

کراچی بھی ابھی تک کراچی ہی تھا۔ اسے دوسرے شہروں سے نسبت نہیں ہوئی تھی۔ نہ لاہور کی طرح پولیس والے رات کے مسافروں کا منہ سونگھتے تھے اور نہ اسلام آباد کی طرح شام کا سایہ پڑتے ہی شہر کی روشنیاں بجھ جاتی تھیں۔ نہ پشاور کی طرح اسلحہ لے کر گھومنے کا رواج ہوا تھا اور نہ بارود سونگھ کر کسی نے کراچی کو بیروت سے تشبیہہ دینا شروع کی تھی۔ کراچی ہی نہیں اس زمانے میں پاکستان بھی پورا پاکستان تھا اور مارشل لاء کی صورت میں اس کے سر پر خدا کے فضل و کرم کا سایہ دراز تھا۔ اس وقت تک پیروں وڈیروں کے عوامی دور کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ حب الوطنی کے رکھوالوں کا پرانا اتحاد ابھی قائم تھا۔ لیکن کفر پر کسی ایک ٹل کی اجارہ داری نہیں تھی۔ روٹی' کپڑا اور مکان کا نعرہ لگا کر کوئی بھی یہ تمغہ حاصل کر سکتا تھا۔

جلالی آہستہ آہستہ قدموں سے چلتا ہوا ایمپریس مارکیٹ پہنچا تو سڑک اور فٹ پاتھ کی رونق شباب پر تھی۔ کونے کے ایرانی ہوٹل کی بیشتر میزیں بھری ہوئی تھیں اور چائے کی پیالیوں اور پانی کے گلاسوں کے کھنکنے اور کھانے کی پلیٹوں کے میز پر پٹخنے کی آوازوں نے سماں باندھا ہوا تھا۔ ہوٹل کے سامنے ڈھائی روپے فی سواری کے حساب سے کورنگی لانڈھی جانے والی ٹیکسیوں کی لائن لگی تھی۔ کچھ ڈرائیور جن کی باری آنے میں دیر تھی اندر ہوٹل میں بیٹھے تھے' کچھ آوازیں لگا رہے تھے اور کچھ ٹیکسیوں کے پاس فٹ پاتھ پر اکڑوں بیٹھے دانتوں میں خلال کر رہے تھے۔ ایک فقیر ہر نئے آنے والے کے سامنے اپنا ٹنڈا بازو ہلا کر چیپڑ بھری آنکھوں کو دست سوال بنائے ہوئے تھا۔ ہوٹل کے اندر گھس کر بھیک مانگنے والی ایک عورت کو جس نے کالے

برقعے میں اپنے پھٹے ہوئے کپڑے اور دودھ چوستا بچہ چھپایا ہوا تھا' بیرے دھکے دے کر باہر نکال رہے تھے۔ ابھی صرف دو بجے تھے لیکن باہر کاؤنٹر کے پاس لگے ہوئے تخت پر پوریاں تلنے کے لئے کڑہائی میں تیل گرم کیا جانے لگا تھا اور دھوتی اور بنیان پہنے ہوئے ایک پہلوان نما شخص نے پیڑے بنانے کا کام شروع کر دیا تھا۔

ہوٹل کے برابر والی گلی میں نہاری کا ہوٹل تھا جو نیا نیا کھلا تھا۔ نہاری کی بڑی دیگ کے ساتھ مغز' نلی اور بگھار کرنے والی گھی کی دیگچیاں قطار سے لگی تھیں۔ "حاجی کریم دہلی والے کی مشہور نہاری" والا حاجی کریم رکابیوں میں نہاری نکال کر کرچھے کو زور زور سے دیگ کے منہ پر مار کر سوئی ہوئی مکھیوں کو اڑا رہا تھا یا پھر مغز کی دیگچی کے برابر میں رکھے ہوئے اگالدان میں پان کی پیک تھوک کر دلی والوں کے مخصوص لہجے میں ان بھکاریوں کو ننگی ننگی گالیاں بک رہا تھا جو کسی کی پلیٹ میں بچے ہوئے سالن کے امیدوار بنے اس کی دیگ کو گھیرے کھڑے تھے۔ نہاری ہاؤس کے سامنے والی فٹ پاتھ پر زیادہ پی جانے والا ایک شرابی بری بری آوازیں نکالتا ہوا قے کر رہا تھا۔ ایرانی ہوٹل کے دوسری طرف بڑی سڑک کے رخ پر جہاں برابر برابر سگریٹ پان کی دو دکانیں تھیں' آسمانی رنگ کی ایک بڑی امریکی کار ترچھی ہو کر کھڑی تھی۔ ڈرائیور دکان پر کھڑا پان لگوا رہا تھا۔ کار کی کھڑکی کے شیشے ایسے تھے کہ باہر سے اندر کی طرف نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ برقعے والی بھکارن ان شیشوں کی سیاہی کو شاید اپنا مقدر جان کر اندر جھانکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اچانک پیچھے والی کھڑکی کا شیشہ نیچے سرکا اور سونے کی چوڑیوں سے بھرے ہوئے ایک گورے ہاتھ نے دس روپے کا نوٹ بھکارن کے ہاتھ میں تھما کر شیشہ جلدی سے دوبارہ اوپر کر دیا۔ جلالی نے بھکارن کو رشک بھری نظروں سے دیکھا۔ بھکارن اتنا بڑا خزانہ پا کر تھوڑی دیر کے لئے گنگ ہو گئی۔ ہوش آیا تو منہ سے دعاؤں کا فوارہ پھوٹ پڑا۔ دعائیں بند شیشے سے ٹکرا کر واپس آنے لگیں تو وہ نہاری ہاؤس کے سامنے کھڑے ہوئے اپنے قبیلے والوں کو کار کی طرف متوجہ کرنے لگی۔ وہ سب ٹنڈے بازو ہلاتے' ایک ٹانگ سے اچکتے اور کولہوں کے بل گھسٹتے ہوئے گاڑی کی طرف دوڑ پڑے۔ ڈرائیور اس یلغار کو دیکھ کر پان کی پڑیا

سنبھالتا ہوا گاڑی کی طرف پلٹا اور گاڑی میں بیٹھ کر اس تیزی سے گاڑی ریورس کی کہ پیچھے کھڑے ہوئے آٹو رکشا سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔ رکشہ ڈرائیور گاڑی والوں کی شان میں بھاگتی ہوئی کار سے زیادہ تیز رفتاری سے گالیاں بک کر دوبارہ اپنے رکشہ کی طرف متوجہ ہو گیا جو اسٹارٹ کئے جانے کی کوشش میں پھٹ پھٹ کی آوازیں نکالتا ہوا دھوئیں کا غبار باہر پھینک رہا تھا۔

جلالی نے ہوٹل کے اندر ایک چکر لگا کر دیکھا لیکن کوئی جاننے والا نظر نہیں آیا۔ رات کو ایک بجے کے بعد ایرانی ہوٹل کی رونق رات کی شفٹ میں کام کرنے والے صحافیوں یا طبلہ ہارمونیم بجانے والے ان میراثیوں کے دم سے قائم تھی جو نیپئر روڈ کے کوٹھوں پر رقص و سرود کی محفلوں میں موسیقی کا جادو جگاتے تھے۔ ایک میز پر کچھ صحافی بیٹھے اپنی سرخی پر خوش ہو رہے تھے جو کل کے اخبار کے صفحہ اول پر لگا کر آئے تھے جبکہ ان کے برابر کی میز پر بیٹھے ہوئے لوگ چٹخارے لیتے ہوئے کوٹھے پر آنے والی کسی بے سری لڑکی کے ہونٹوں کی سرخی کا تذکرہ کر رہے تھے یا طشتری میں چائے ڈال کر پھونکوں سے بھنور بنا رہے تھے۔

جلالی نے سوچا بخارا ہوٹل میں جھانک کر آئے شاید وہاں کوئی جاننے والا بیٹھا ہو۔ بخارا وہاں سے صرف تین گلیاں چھوڑ کر اور پانچ منٹ کے فاصلے پر تھا۔ نیچے کے عوامی حصے میں رکشوں اور ٹیکسیوں کے پٹھان ڈرائیوروں کی رونق ہوتی تھی جو چپلی کباب کھا کر پشاور کو اور سواریوں کا انتظار کرتے ہوئے مسرت شاہین کو یاد کرتے۔ اوپر کی منزل پر خصوصی گاہکوں کے لئے علیحدہ ایئر کنڈیشنڈ ہال تھا جس کا دروازہ شیشے کا تھا۔ اندر کے مناظر کو باہر سے جھانکنے والی نظروں سے بچانے کے لئے بند دروازے پر سفید پردہ بھی منڈھ دیا گیا تھا۔ اس خصوصی حصے میں آکر بیٹھنے والوں میں رومانہ' شبانہ نائٹ کلب میں کام کرنے والی وہ عورتیں بھی تھیں جو جسمانی مشقت کے بعد ہونے والی تھکن اتارنے بخارا آتیں اور اس کا مشہور چکن تکہ کھا کر آنے والے دن کے لئے نئی توانائی حاصل کرتیں۔ مہینے کی شروع کی تاریخوں میں صحافیوں کی ایک ٹولی بھی چپلی کباب کھا کر دل پشاوری کرنے بخارا کے اسی ایئر کنڈیشنڈ ہال میں آکر بیٹھا کرتی

تھی۔

جلالی نے سوچا بخارا جانا ٹھیک نہیں۔ کوئی جاننے والا مل گیا تب بھی خالی جیب ان کے ساتھ بیٹھ کر شرمندگی کا سامنا ہو سکتا تھا۔ اس سے بہتر تھا کہ وہ برنس روڈ چلا جائے۔ زیادہ سے زیادہ بیس منٹ کا پیدل راستہ تھا۔ وہاں رات بھر کھلا رہنے والا ملباری ہوٹل رات کی شفٹ میں کام کرنے والے بعض صحافیوں کا مستقل اڈہ تھا۔ اخباروں میں بیان چھپوانے کے شوقین اپنے اخباری رابطے بڑھانے اس ہوٹل میں آ کر بیٹھتے اور صحافیوں کو سگریٹ پیش کرنے اور ان کی چائے کا بل دینے کو سعادت جانتے تھے۔ اس زمانے میں ملباری ہوٹل کے سامنے کھڑے ہوئے ٹھیلوں کی روشنیوں میں رات جاگا کرتی تھی۔ برنس روڈ پر ملباری کی چائے کے علاوہ تقریباً ہر چیز دہلی کی تھی۔ رنگ برنگے شیشوں سے سجے ٹھیلوں پر بکتی ہوئی ربڑی' سرخ رنگ کے مٹی کے بڑے سے مٹکے کے دہی بڑے' دہکتے ہوئے کوئلوں پر ڈوریوں میں لپٹے ہوئے سیخ کباب' گھسیٹے خان کا حلیم' صابری کی نہاری۔ صرف گولہ کباب بہار کے اور گل بہار لسی پنجاب کی تھی۔ گلی نمبر اے ایم ۔ ۶ کے نکڑ پر کھٹ کھٹے کا ایک بڑا سا توا بھی لگ گیا تھا لیکن اس نے اپنی نسلی شناخت ظاہر نہیں کی تھی۔

جلالی کو صرف ہوٹل میں بیٹھنے کے لئے برنس روڈ جانا بیکار لگا۔ برنس روڈ کا حوالہ زبان کا چٹخارہ تھا' وہاں چائے پینے کے لئے جانا ایسا تھا جیسے کوئی تیرنے کے لئے کنوئیں میں اتر جائے۔ جلالی کو کھانے پینے کی کوئی خواہش تھی بھی نہیں۔ اسے تو بس کے آنے تک تین گھنٹے گزارنے تھے۔ اتنی دیر تک کھڑا رہنا مشکل تھا۔ پیسے ہوتے تو ایرانی ہوٹل میں بیٹھ کر ایک چائے کی پیالی پر کم از کم ایک گھنٹہ گزارا جا سکتا تھا۔ وہ ہوٹل کے سامنے کی روشن فٹ پاتھ پر ٹہلتا ہوا دوسرے نیم روشن کنارے تک چلا گیا۔ نظریں زمین پر جمی ہوئی تھیں' شاید کہیں اکنی پڑی ہوئی مل جائے۔ چار آنے پورے ہو جاتے تو ہوٹل میں جا کر کرسی پر ڈھیر ہو جاتا۔ مستقل کھڑے کھڑے اور چلتے چلتے ٹانگیں اب دکھنے لگی تھیں۔ کمر میں درد ہو رہا تھا۔ پورا بدن ٹوٹ رہا تھا۔ خون کی گردش میں جو الکحل شامل تھی شاید اس کے زوال کا وقت آ گیا تھا۔ کتنی قیمتی

الکحل اور کتنے خوبصورت ماحول میں بیٹھ کر پی تھی لیکن اس کا انجام کتنا خراب ہوا تھا' کس مقام پر آ کر زوال پذیر ہوئی تھی۔

جلالی نے دبی زبان سے انٹر کانٹی نینٹل میں شراب پینے کی مخالفت کی تھی لیکن وہ سب سے جونیئر مہمان تھا۔ میزبان کے اصرار اور دوسرے مہمانوں کے شوق کا جو عالم تھا اس کے سامنے جلالی کی نہیں سنی گئی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مے کشوں کو اپنی جیب' حیثیت اور اوقات کے مطابق اپنی اپنی تباہی کا گڑھا کھودنے کی مکمل آزادی تھی۔ ریگل سینما کے برابر میں یا اس کے مقابل کیفے ٹیریا کے اوپر' ریکس سینما کے ساتھ' ریو سینما کے سامنے پام گرو میں' پیراڈائز سینما کے بغل میں' وکٹوریہ روڈ یا گرو مندر کے بس اسٹاپ پر' بمبئی ہوٹل کے نیچے' طارق روڈ کی پچھلی گلیوں اور نیپئر روڈ کی سرخ بتیوں میں کہیں بھی کھلے عام بہکنے' شور مچانے' لڑنے اور لڑھکنے کی آزادی تھی۔ جیب ان سستے مقامات کی متحمل نہ ہو تو پھر صدر کی مسجد قصاباں والی سڑک کے سامنے کی چھوٹی گلی میں گلابی پری کا گلاس پی کر صرف سوا روپے میں ہوش و حواس کو ٹھوکر ماری جا سکتی تھی۔ جس دن سوا روپے بھی نہ ہوں تو ایمپریس مارکیٹ پر کونے کے چھوٹے سے تکونے پارک میں کسی چرس فروش سے چار آنے کی گولی لے کر غم غلط اور خوشیاں خراب کی جا سکتی تھیں۔

اس زمانے میں شراب خانے ہی نہیں کراچی میں شراب کی دکانیں بھی قدم قدم آباد تھیں جہاں سے نو روپے میں خرید کر پرانے اخبار میں لپٹی ہوئی بیئر کی ٹھنڈی بوتل فریئر گارڈن کے دراز ہوتے ہوئے سایوں کے نیچے یا اولڈ کلفٹن کے پارکنگ لاٹ میں گاڑی کے بونٹ پر بیٹھ کر پی جا سکتی تھی۔ گرم دوپہر ہو تو سوئمنگ پول کے ٹھنڈے پانی میں نہاتی ہوئی سفید فام عورتوں کو دیکھتے ہوئے انٹرکان کے دم تازی میں یا سیاست پر بحث کرتے ہوئے میٹروپول میں بیٹھ کر ڈرافٹ بیئر کے مزے لئے جا سکتے تھے۔

جلالی کو پیلس ہوٹل کے لان کا ملگجی اندھیرا زیادہ پسند تھا۔ یا پھر رات گئے سینٹرل ہوٹل کا بار۔ سینٹرل ہوٹل میں پارکر جب پیانو پر پرانے گانوں کی دھنیں چھیڑتا

اور گھیردار غرارہ پہنے سفید بالوں اور نورانی چہرے والی ببو جو اردو کی پہلی بولتی فلم کی ہیروئین تھی ایک جام کے حصول کی کوشش میں میز میز گردش کرتی تو جلالی کو لگتا جیسے وہ وقت کے عجائب گھر میں پہنچ گیا ہو۔ لیکن ان مقامات پر جلالی صرف اپنے متمول دوستوں کے طفیل جا سکتا تھا۔ کبھی کبھی جلالی کے دوست اسے خوش کرنے کے لئے ایک جام منگا کر ببو کو بھی ساتھ بٹھا لیتے۔ ببو ماضی کی یادیں کرید کر کوئی چنگاری برآمد کرنے کی کوشش میں کچھ اور بجھ جاتی اور جلالی اس کے چہرے کی جھریوں میں راستے تلاش کرتا گزرے ہوئے کسی لمحے کو پکڑ لیتا۔ اس وقت چونکتا جب ببو اپنا جام ختم کر کے کسی دوسری میز کی طرف چلی جاتی اور جلالی کے دوست اس کا مذاق اڑانے لگتے۔ جلالی کے دوستوں کو اپنی شام ماضی کے کسی اہرام میں بھٹک کر برباد کرنے کا شوق نہیں تھا۔ انہیں مصر کی بیلی ڈانسرز کے لئے مشہور ایکسیلسئر زیادہ پسند تھا جہاں بوتل اکیلی منگوائی جائے تو ڈھائی سو روپے کی اور ساتھ بیٹھ کر شراب پینے والی عورت کے ساتھ منگوانے پر ساڑھے تین سو روپے کی تھی۔ جلالی یہ سوچ کر کڑھنے لگتا کہ شراب کے مقابلے میں عورت اب بھی سستی تھی۔

اس روز ایک ہوائی کمپنی کے تعلقات عامہ کے منیجر نے چند صحافیوں کو دعوت دی تھی اور انٹرکان جانے کا فیصلہ ہوا تھا۔ انگریزی اخبار کے ایک سینئر رپورٹر نے مینا بار میں بیٹھ کر کبھی شراب نہیں پی تھی۔ جلالی نے بھی نہیں پی تھی، اسے نو روپے والی بیئر چالیس روپے میں پینے کا شوق بھی نہیں تھا۔ لیکن پلانے والا تیار تھا تو اسے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ بارہ بجے تک بیٹھے پیتے رہے تھے۔ اردو اخبار کے ایک صحافی افسانہ نگار نے ڈھاکہ میں رہنے والے اپنے شاعر دوست کا قصہ چھیڑ کر ماحول اداس کر دیا تھا۔ ڈھاکہ کے اس شاعر کو اپنی حاملہ بیوی کے لئے دوا خریدنی تھی لیکن جیب میں پیسے نہیں تھے۔ طوفانی رات میں دوستوں سے مدد لینے نکلا تو رات بھر اس کے دوست اسے شراب خانوں میں گھماتے، شراب پلاتے اور اس سے شعر سنتے رہے۔ اس پر پانچ سو روپے خرچ کر دیئے، لیکن کسی نے اسے بیوی کی دوا کے لئے پچاس روپے

نہیں دیئے۔ صبح گھر پہنچا تو بیوی اسپتال جا چکی تھی اور اس کو مرا ہوا بچہ پیدا ہوا تھا۔ سب نے شاعروں اور فنکاروں کی ناقدری پر زبردست مکالمے بولے تھے۔ صرف جلالی دل ہی دل میں خوش ہوا تھا۔ اسے ترینیداد کا وہ ادیب یاد آگیا تھا جس نے اپنے بے اولاد ہونے پر بھی فلسفہ بگھارا تھا اور کہا تھا کہ دکھوں کا عذاب سہنے کے لئے وہ کسی وجود کو اس دنیا میں لانے کی وجہ بننا نہیں چاہتا۔ جلالی سوچنے لگا کہ بچہ زندہ پیدا ہوتا تو ڈھاکہ کا وہ شاعر دوست بچے کے دودھ اور پھر اس کی دوا کے لئے قرض مانگنے بار بار دوستوں کے پاس جاتا اور ہر بار پہلے سے زیادہ شراب پی کر واپس آتا۔

"شاعروں اور صحافیوں کو اپنی بیویوں کو حاملہ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔" جلالی نے میز پر مکہ مار کر کہا اور سب نے اسے اس طرح دیکھا جیسے اسے نشہ ہو گیا ہو۔

بارہ بجے سب نے اس پر اتفاق کیا کہ انٹرکان کے بے مزہ کھانے کے بجائے جیکب لائنز جا کر بندو خان کے کباب پراٹھے کھائے جائیں۔ میزبان نے ساڑھے چار سو روپے کا بل دیا۔ جلالی نے سوچا کہ رپورٹروں کو ملنے والا آمد و رفت کا کرایہ بھی شامل کر لے پھر بھی یہ بل اس کی تنخواہ سے زیادہ تھا۔ سب میزبان کی پیلے رنگ کی فاکس ویگن میں سوار ہو کر بندو خان کے ہوٹل پہنچے۔ ڈیڑھ سو روپے کے کباب پراٹھے اور قلفی کھائی۔ اٹھتے ہوئے جلالی نے پانچ روپے کے اس نوٹ کو بہت لالچی نظروں سے دیکھا تھا جو میزبان نے ٹپ کے طور پر بیرے کے لئے پلیٹ میں چھوڑ دیا تھا۔ باہر نکلے تو سب کو مخالف سمتوں میں جانا تھا۔ سب اس سے ہاتھ ملا کر چلے گئے۔ جلالی تیزی سے دور جاتی ہوئی گاڑی کو دیکھ کر سوچ رہا تھا کہ شمال اور جنوب میں صرف دنیا بٹی ہوئی نہیں ہے بلکہ امیر اور غریب علاقوں کو تقسیم کرنے والی لکیر ملک ملک، شہر شہر اور محلے محلے میں کھنچی ہوئی ہے۔ پھر بھی جلالی نے اطمینان کی ایک گہری سانس لی تھی۔ اس کی بیوی نہیں تھی۔ بیوی ہوتی تو حاملہ ہوتی۔ حاملہ ہوتی تو..... "بیوی کا حاملہ ہونا ضروری کیوں ہے؟" اس نے سوچا لیکن پھر سر جھٹک دیا۔ اسے واقعی نشہ ہو گیا تھا۔

جلالی کی کمر اور ٹانگیں جواب دینے لگیں تو وہ ایرانی ہوٹل کے ساتھ کی فٹ پاتھ پر اس دیوار کے ساتھ کمر ٹیک کر کھڑا ہو گیا جو نسبتاً" اندھیرے میں تھی۔ دن کے وقت یہاں ایک چینی دندان ساز پاؤں کے پیڈل سے چلنے والے بڑے سے پہیئے کی ایک مشین پر داڑھیں کھینچ کھینچ کر لوگوں کی چیخیں نکلواتا تھا۔ یہ مشین دیکھ کر جلالی کو چاقو چھری تیز کرنے والی وہ مشین یاد آتی جسے کمر پر لاد کر آواز لگاتے ہوئے پٹھان گلی گلی گھوما کرتے تھے۔ دندان ساز یاد آیا تو جلالی کو ماں کی یاد آ گئی۔ ماں نے پچھلی بار جب خط لکھا تھا تو بتایا تھا کہ اس کی داڑھ میں سخت درد ہے اور جیسے ہی کوئی ساتھ لے جانے والا مل گیا وہ داڑھ نکلوانے شہر جائے گی۔ گاؤں کے حکیم کی معجونیں اس کی داڑھ ٹھیک نہیں کر سکی تھیں اور انہوں نے درد کرتے دانت پر لونگ رکھنے کا نسخہ تجویز کیا تھا۔ لیکن یہ نسخہ بھی زیادہ زود اثر ثابت نہیں ہو سکا تھا۔ جلالی کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ اس کا ماں کے اور ماں کا اس کے علاوہ تھا بھی کون۔ ماں کو تڑپتے ہوئے کتنے برس ہو گئے تھے۔ اکلوتے بیٹے کی جدائی اور اب یہ دانت کا درد۔ اتنی دور بیٹھ کر وہ کچھ کر بھی تو نہیں سکتا تھا۔ ماں نے تو خط تک لکھنے کو منع کر دیا تھا۔ ماں کا خط آئے ہوئے بھی ایک مہینہ ہو گیا تھا۔

جلالی صرف سترہ سال کا تھا اور انٹر کا امتحان دے کر نتیجے کا انتظار کر رہا تھا کہ باپ کا انتقال ہو گیا۔ اس کی ماں پر بیوگی ایک ناگہانی آفت کی طرح آئی تھی۔ صرف شوہر نہیں سب کچھ چلا گیا تھا۔ جلالی کا باپ اپنی پہلی بیوی کے مرنے کے بعد اسے بیاہ کر لایا تھا۔ شادی ہو کر آئی تو تینوں سوتیلے بیٹے جوان تھے۔ انہوں نے کبھی اسے ماں تسلیم نہیں کیا۔ کبھی سر پر ہاتھ نہیں رکھنے دیا۔ کبھی سیدھے منہ بات نہیں کی۔ وہ سوتیلی ماں اور باہر کی عورت تھی۔ سید زادی راجپوتوں کے گھر بیاہ کر آ گئی تھی۔ لیکن جلالی کی ماں کو پرواہ نہیں تھی۔ شوہر کا سایہ' اس کا پیار اور سہارا دینے والا ہاتھ اس کے ساتھ تھا۔ باپ کے ڈر سے سوتیلے بیٹے بھی نظر انداز کرنے سے زیادہ کچھ اور نہ

کر سکے۔ اسے ان کی توجہ چاہیے بھی نہیں تھی۔ اس کا شہزادے جیسا سکندر بیٹا اس کے ساتھ تھا۔ جلالی کا اصل نام سکندر علی خان تھا۔ وہ ذہین جلالی اخبار کی نوکری حاصل کرنے کے بعد بنا تھا۔ نام بدلنے کی ہدایت بھی ماں نے دی تھی۔

اپنے سوتیلے بھائیوں کے لئے وہ ان کے باپ کا نہیں اس عورت کا بیٹا تھا جس نے ان کی ماں کی جگہ حاصل کر لی تھی۔ شاید وہ اپنے سوتیلے بھائی کو قبول کر لیتے لیکن ماں جلالی کو ہر وقت مرغی کی طرح اپنے پروں کے نیچے چھپا کر رکھتی تھی۔ اسے ہمیشہ خوف رہتا کہ سوتیلے بھائی اسے کوئی نہ کوئی نقصان پہنچائیں گے۔ وہ اسے ان کے سائے سے بھی دور رکھتی تھی۔ جلالی کالج گیا تب بھی اس کے سوتیلے بھائیوں نے اعتراض نہیں کیا۔ باپ سے پوچھا تک نہیں کہ وہ اسے اتنا کیوں پڑھانا چاہتے ہیں۔ انہوں نے خود بھی مڈل اور میٹرک سے زیادہ نہیں پڑھا تھا۔ ان کا رشتہ ان زمینوں سے تھا جسے سینچنے کے لئے انہیں ڈگری کی ضرورت نہیں تھی۔ تعلیم پیروں کو زمین سے اکھاڑ کر ان میں پہیے لگا دیتی تھی۔ انہیں پہیے لگا کر شہر نہیں جانا تھا۔ ان کے قدم جڑوں کی طرح اس زمین میں گڑے تھے جو ان کی محبت' ان کا خدا سب کچھ تھی۔ پہیوں کی ضرورت تو جلالی کو تھی۔ ان کی زمینوں پر جلالی کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی۔

جلالی کا باپ اسے فوج میں بھرتی کرا کے سچ مچ کا سکندر بنانا چاہتا تھا۔ یہ ان کے خاندان کی پرانی روایت تھی۔ ایک بیٹا فوج میں ضرور جاتا تھا۔ اس کے تینوں بیٹوں میں سے کوئی نہیں گیا تھا۔ اس لئے باپ کی امیدیں اب جلالی کے ساتھ تھیں۔ جلالی انٹر تک پہنچ گیا تھا اور اب سپاہی نہیں "لفٹان" بھرتی ہو سکتا تھا۔ ماں "کرنیل نیں جرنیل نیں" کہہ کر بلائیں لیتی۔ اسے اپنے بیٹے کے ماتھے پر فتح کے چاند چمکتے ہوئے نظر آتے تھے۔ جلالی نے اپنی ماں کو سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ اسے اپنے ہی ملک کے عوام کو بار بار فتح کرنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ وہ جب سے کالج میں داخل ہوا تھا فوجی حکومت کے خلاف ہونے والے ہر جلسے جلوس میں شامل ہوتا۔ اس نے پہلی بار جو مضمون لکھا تھا وہ بھی ایسا ہی تھا۔ کالج کے میگزین نے چھاپنے سے انکار کیا تو اس کے ساتھیوں نے سائیکلو اسٹائل کر کے اس کی کاپیاں تقسیم کرا دی

تھیں اور پھر کئی دنوں تک چھپتے پھرے تھے۔

انٹر کا امتحان دے کر نتیجے کا بہانہ کر کے باپ کی نظروں سے بچتا رہا۔ نتیجہ آنے سے پہلے ہی باپ کا انتقال ہو گیا تو اسے کرنیل جرنیل کی مشقت سے بھی آزادی مل گئی۔ ساتھ ہی زمین سے رشتے کی وہ زنجیر ٹوٹ گئی جس سے اس کے باپ دادا اور ان کی نسلیں بندھی رہی تھیں۔ اس کی ماں نے بیوگی کا سوگ ختم ہوتے ہی اپنے زیور بیچ کر سب پیسے جلالی کے ہاتھ پر رکھ دیئے تھے اور کہا تھا کسی دور شہر جا کر اپنی تعلیم مکمل کر لے۔ اس طرح بے نام و نشاں ہو کر رہے کہ کوئی ڈھونڈ نہ سکے۔ اس کی ماں کو یقین تھا کہ سوتیلے بھائی جلالی کو زندہ نہیں رہنے دیں گے۔ اپنی زمینوں کے سوتیلے حصہ دار کو کسی نہ کسی طرح ختم کرا دیں گے۔ زمینوں پر ہونے والے کشت و خون کو دیکھتے ہوئے اس کی زندگی گزر گئی تھی۔ اس نے بھائی کو بھائی کے ہاتھوں قتل ہوتے یا زندگی بھر ایک دوسرے کے خلاف مقدمے لڑتے ہوئے دیکھا تھا۔ جلالی تو سوتیلا بھائی تھا۔ اور سوتیلا بھی ایسا جس سے اس کے بھائی نفرت کرتے تھے۔

جلالی نے کبھی رشتوں کی ان پیچیدگیوں پر غور نہیں کیا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ ماں کو خوف کی بیماری لاحق ہو گئی تھی یا اس کے اندیشے صحیح تھے۔ ماں نے کہا تھا اور اس نے گاؤں چھوڑ دیا تھا۔ ماں کو وہ منع کر ہی نہیں سکتا تھا۔ سب سے دور کراچی تھا جہاں گم ہو جانا آسان تھا۔ ماں سے خط و کتابت گاؤں کے اس دوست کے ذریعے ہوتی جس پر جلالی اور اس کی ماں دونوں کو پورا بھروسہ تھا۔ ماں نے اپنا اثاثہ بیچ کر جو پیسے دیئے تھے کچھ ان کے اور کچھ ٹیوشنوں کے ذریعے وہ ایم اے تک پہنچ گیا تھا۔ یونیورسٹی سے نکلا تو نوکری کی تلاش اخبار کی دنیا میں لے آئی جہاں پیٹ پالنا دشوار لیکن شوق پورا کرنا آسان ثابت ہوا۔ غربت تکلیف تو دیتی لیکن جلالی کو عادت ہو گئی تھی۔ پیسوں کے بارے میں ایک عجیب سی بے حسی تھی۔ پیسے ملتے بھی اتنے کم تھے کہ ان کے ہونے یا نہ ہونے کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ جیب میں بس کا کرایہ ہونا ضروری تھا۔ کرائے کے لئے پانچ آنے مانگنا اسے پسند نہیں تھا۔ اس کے امیر دوستوں کو بھی اپنے امیر یا جلالی کے غریب ہونے کی پرواہ نہیں تھی۔ اس کے دوست

یونیورسٹی سے نکل کر دولت کمانے میں مصروف ہو گئے تھے اور جلالی دانش کے موتی سمیٹنے لگا تھا۔ اچھا زمانہ تھا۔ دولت ابھی دوستی کا پیمانہ اور بستیاں حیثیت پرکھنے کا معیار نہیں ہوئی تھیں۔ کورنگی کی نواحی بستی کے ایک کوارٹر میں کرائے پر لیا ہوا کمرہ اس کا گھر تھا جہاں وہ اطمینان کے ساتھ اپنی راتیں بسر کرتا۔ بس ایک ماں کی یاد تھی جو دل کو برے کی طرح چھیدا کرتی تھی۔ اس نے کوشش کی تھی کہ ماں اس کے پاس کراچی آ جائے۔ ماں ساتھ ہوتی تو شاید اسے آرام سے رکھنے کی کوشش میں پیسے کمانے کی لگن اور حیثیت بڑھانے کے لئے بستی بدلنے کی ضرورت بڑھ جاتی۔ لیکن ماں نے منع کر دیا تھا۔ شوہر مر گیا تھا لیکن اس کی ڈیوڑھی سے وہ بھی مر کر ہی نکل سکتی تھی۔ جلالی کو معلوم تھا کہ ماں کو اس کی کوئی عقلی دلیل قائل نہ کر سکے گی۔

ایرانی ہوٹل کی دیوار سے ٹیک لگائے اسی طرح کھڑے کھڑے اس کی بند آنکھوں میں ماں کا چہرہ سما گیا۔ ماں کا چہرہ نظر آیا تو لگا جیسے ماں تھپکیاں دے دے کر سلا رہی ہو۔ جلالی خوابوں کی گود میں جھولا جھولنے لگا لیکن ایک بار توازن کھو بیٹھا اور ایسا جھونکا آیا کہ دیوار کی ٹیک کے باوجود گرتے گرتے بچا۔ جھٹکا لگا تو آنکھ بھی کھل گئی۔ کچھ دیر اسی طرح دیوار سے ٹیک لگائے آنکھیں جھپک کر خوابوں سے باہر نکلنے کی کوشش کرنے لگا۔ سامنے فٹ پاتھ پر برقعے والی بھکارن اپنے بچے کو رانوں پر لٹائے تھپکیاں دے رہی تھی۔ اس سے تھوڑے فاصلے پر کٹے ہوئے بازو والا فقیر اپنی آنکھوں کے چیپڑ صاف کرتا ہوا اس کے برقعے کے اندر جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جلالی کو یاد آ گیا کہ وہ کہاں تھا۔ اس ڈر سے کہ دیوار سے ٹیک لگا کر سوتے ہوئے دوبارہ نہ گر پڑے وہ اپنی آنکھیں مسلتا اور سر کو جھٹکتا ہوا سائے سے روشنی میں آ گیا۔ بھکارن نے پہلی بار اسے پوری نقاب اٹھا کر دیکھا اور اس ٹانگ کو جس پر اس کا بچہ سو رہا تھا اور زور زور سے ہلانے لگی۔ اس کی عمر بیس سال سے زیادہ نہیں لگتی تھی۔ نہا دھو کر اچھے کپڑے پہنتی تو میک اپ کئے بغیر بھی چاند کو شرما سکتی تھی۔ ٹنڈے فقیر نے جلالی کو بہت کینہ توز نظروں سے دیکھا۔ بھکارن نے جلدی سے اپنے

چہرے پر نقاب ڈال لی۔ اس کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لئے جو چمک آئی تھی وہ پھر تاریکیوں میں کھو گئی۔ جلالی کو لگا نقاب کے پیچھے چھپی ہوئی آنکھیں اب بھی اسی پر جمی تھیں۔ ان نظروں سے بچنے اور نیند بھگانے کے لئے وہ فٹ پاتھ پر ٹہلتا ہوا دور تک گیا۔ سخت پیاس لگ رہی تھی۔ وہ ہوٹل میں جا کر پانی کا گلاس پی سکتا تھا۔ بیرے نظر انداز کر دیتے اور کاؤنٹر پر بیٹھا ہوا ایرانی سیٹھ بھی کچھ نہ کہتا' لیکن سمجھ جاتا کہ اس کے پاس ہوٹل میں بیٹھنے کے لئے پیسے نہیں ہیں۔ جلالی کے لئے مفلس ہونا عیب نہیں تھا لیکن غربت کے اشتہار بانٹنا شرم کی بات تھی۔

جلالی ٹہلتا ہوا ہوٹل کے داخلی دروازے والے نکڑ پر واپس آیا جس کے سامنے کورنگی لانڈھی جانے والی ٹیکسیاں کھڑی تھیں۔ ایک ڈرائیور جلالی کو دیکھ کر "کے ایریا' کے ایریا" کی آوازیں لگانے لگا۔ جلالی کو اکثر ڈرائیور پہچانتے تھے۔ ان ہی آوازوں کے درمیان ایک ٹیکسی سے آتی ہوئی "بابو جی" کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ ایک شخص آگے کھڑی ہوئی ٹیکسی سے اتر کر اس کی طرف بڑھا۔ وہ نزدیک آیا تو جلالی پہچان گیا۔ وہ بشیر پان والا تھا۔ ٹیکسی میں اکثر اس کا ہمسفر ہوتا تھا۔

"بابو جی بڑے دنوں میں نظر آئے' کیا ناشتے کے لئے رکے ہوئے ہو؟" بشیر نے ہوٹل کے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جہاں پوریاں تلی جا رہی تھیں۔

"ہمارے مقدر میں تو براہ راست دوپہر کا کھانا لکھا ہے۔ تم سناؤ کاروبار کیسا ہے۔" جلالی نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ تازہ پوریوں کی خوشبو سے بھوک لگنے لگی تھی۔

"اللہ کا کرم ہے۔ بابو جی کھڑے کیوں ہو' ٹیکسی میں آخری سواری کی جگہ بچی ہے' وہ لانڈھی جاتے ہوئے آپ کو کے ایریا اتار کے جائے گا۔" بشیر پان والے کو گھر جانے کی جلدی تھی۔ اسے صبح سویرے آ کر دکان کھولنی اور پان لگانے تھے۔

"نہیں تم جاؤ' میں آج بس سے جاؤں گا۔ گھنٹے بھر میں آنے والی ہے۔" جلالی نے رخ بدلتے ہوئے کہا۔

"بابو جی! گھنٹے بھر بعد والی بس لانڈھی کی ہے، آپ کو پانچ نمبر پر اتار دے گی۔ جنگل میں دو میل پیدل چلو گے، رستے میں کوئی چور اچکا مل گیا تو مال سے بھی جاؤ گے۔" بشیر نے سمجھانے کی کوشش کی اور جلالی سوچنے لگا کتنا بدقسمت ہو گا وہ راہزن جو اسے لوٹنے کی کوشش کرے گا۔ اسے معلوم تھا بشیر غلط نہیں کہہ رہا۔ جلالی کئی بار پانچ نمبر سے کے ایریا تک پیدل چل کر گیا تھا۔ اسے لگتا جیسے قافلے سے بھٹکا ہوا کوئی اداس مسافر تنہا ایک انجانی راہ پر چلا جا رہا ہو۔ دور افق کے اس پار جہاں مچھروں کی بستی تھی۔ اس سڑک کا افق وہ نالہ تھا جس کی کیچڑ میں پلنے والے مچھروں کی وجہ سے اس کی بستی مچھر کالونی کہلاتی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف بجلی کے کھمبوں پر لگے ہوئے جو بلب ٹوٹنے سے بچ گئے تھے وہ فیوز تھے۔ چوڑی سڑک کے بیچ میں چلتے ہوئے جلالی کو لگتا جیسے وہ ایک نہ ختم ہونے والی اندھیری سرنگ میں معلق ہو گیا ہو۔ بھونکتے ہوئے کتے زندگی کا احساس دلاتے۔ جلالی کتوں کے ڈر سے دونوں ہاتھوں میں پتھر لئے سڑک کے درمیان میں چلتا تھا۔ سڑک کے بائیں ہاتھ پر کوارٹروں کی قطاریں تھیں، دائیں ہاتھ پر نالہ اور وہ بڑا سا میدان تھا جو نالے اور کوارٹروں کے درمیان ساتھ ساتھ چلتا تھا۔ اس میدان میں دن کے وقت اسکولوں کے لڑکے کرکٹ کھیلا کرتے اور رات میں اپنے رقیبوں سے لڑتے اور افزائش نسل کی کوشش کرتے ہوئے کتے چھ ٹانگوں کی چال دکھاتے تھے۔ جلالی کا پتھراؤ انہیں نالے کی سرحد کے دوسری طرف کے میدان میں محدود رکھتا تھا۔ لیکن وہ جلوس کی شکل میں بھونکتے ہوئے جلالی کے ساتھ نالے پر بنی ہوئی پلیا تک جاتے جہاں شاید ان کی سلطنت کی حد ختم ہو جاتی تھی اور پھر اس پلیا سے اگلی پلیا تک کتوں کی دوسری ٹولی جلالی کا ساتھ دیتی۔ کارواں در کارواں یہ سفر اس آخری پلیا تک جاری رہتا جہاں سے جلالی اپنے کواٹر والی گلی میں مڑ جاتا تھا۔

کتوں کا اپنی اپنی حدود میں رہنا جلالی کے لئے بہت سبق آموز تجربہ تھا۔ دو تین دفعہ کے تجربوں کے بعد کتوں کے بھونکنے کا آرکسٹرا بھی کانوں کو بھلا لگنے لگا تھا۔ ایک رات اندھیری سڑک کے اس سفر میں اس نے سوچا تھا اگر بھونکتے ہوئے کتوں کو

زبان دے دی جائے تو...... ذہن میں ایک دم سیاستدانوں کے مکالمے اور ان کی تقریریں گونجنے لگی تھیں۔ جلالی کو اس ہم آہنگی پر حیرت ہوئی تھی اور اس نے سر جھٹک کر صرف کتوں کے بھونکنے پر اپنی توجہ مبذول کر دی تھی۔ لیکن پھر وہی آوازیں...... شاید اس روز بھی نشہ کچھ زیادہ ہو گیا تھا۔

اسی ویران سڑک پر ایک رات جلالی کی ملاقات ایک بھوت سے بھی ہوئی تھی۔ اس رات اندھیرا کچھ زیادہ گہرا تھا۔ کتوں کی دنیا میں شاید مارشل لاء لگ گیا تھا اور ان کا بھونکنا بند تھا۔ ہوائیں چڑیلوں کی طرح چیخ رہی تھیں۔ جلالی حسب عادت سیٹی بجاتا ہوا سڑک کے بیچ میں چل رہا تھا کہ اسے اپنے تعاقب میں قدموں کی آوازیں آتی ہوئی سنائی دیں۔ اس نے رک کر پیچھے دیکھا تو کوئی نہیں تھا۔ آوازیں بھی رک گئی تھیں۔ آوازوں کو اپنا وہم سمجھ کر اس نے پھر چلنا شروع کیا۔ تھوڑی دیر میں آوازیں پھر اس کا تعاقب کرنے لگیں۔ جسم کے اندر خوف کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے رک کر ایک بار پھر پلٹ کر دیکھا۔ کوئی نہیں تھا۔ آواز بھی بند ہو گئی تھی۔ لگتا تھا ہوائیں تھم گئی ہوں۔

"کون ہے؟" جلالی نے اپنا خوف کم کرنے کے لئے زور سے آواز لگائی۔ جواب میں دور سے کسی کتے کے رونے کی آواز آئی۔ "کیا کتے بھی آج بھوتوں کے ڈر سے چپ ہیں؟ کیا واقعی بھوت.....؟" اس نے اپنے سر کو جھٹکا دیا اور تیز تیز قدموں سے چلنا شروع کر دیا۔ کچھ دیر میں آوازیں پھر سنائی دینے لگیں۔ جلالی کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ اس نے اپنے قدم اور تیز کر دیئے۔ چلتے چلتے پلٹ کر دیکھا' کوئی نہیں تھا لیکن آواز اسی طرح آ رہی تھی۔ جلالی نے بھاگنا شروع کر دیا۔ اسے لگا اس کا تعاقب کرنے والے قدم بھی دوڑنے لگے ہیں۔ ہوائیں بھی تیز ہو گئی تھیں۔

"کیا حماقت ہے!" جلالی نے اپنے آپ سے کہا اور دوڑنا بند کر کے پیچھے کی طرف مڑ کر دیکھنے لگا۔ کوئی نہیں تھا لیکن آوازیں اسی طرح آ رہی تھیں۔ چند لمحوں بعد ایک خشک پتہ سڑک پر گھسٹتا ہوا اس کے پاس سے ہو کر گزر گیا۔ قدموں کی آوازیں اب آگے کی طرف چلی گئی تھیں۔ جلالی کو ہنسی آ گئی۔ ایک خشک پتے نے

کچھ دیر کے لئے اس کا یقین متزلزل کر دیا تھا۔ بھوت شاید اسی انجانے خوف کا نام تھا۔ ایک بے نام ڈر جو مجسم ہو کر نظر نہ آئے تو دماغ کی جھاڑیوں میں بھوت بن کر سرسرانے لگتا ہے۔ ناتمام خواہشوں کی طرح جو تشنگی ختم ہونے تک جن بن جسم سے چمٹی رہتی ہیں۔

''آؤ باؤ جی دیر ہو رہی ہے؟'' بشیر نے سڑک پر پان کی پچکاری مارتے ہوئے اسے خیالوں سے چونکا دیا۔

''بشیر میں.....'' جلالی نے کچھ کہنا چاہا لیکن بشیر کا بڑھتا ہوا ہاتھ دیکھ کر جملہ مکمل نہ کر سکا۔

''روز کا ساتھ ہے بابو جی۔ آج آپ میرے مہمان بن جاؤ۔ کل میرا کرایہ آپ دے دینا۔'' بشیر جلالی کی قمیض کے سامنے والی جیب میں پانچ روپے کا نوٹ ٹھونس کر جواب کا انتظار کئے بغیر ٹیکسی کی طرف پلٹ گیا۔ جلالی بھی کچھ کہے بغیر آہستہ آہستہ قدموں سے چلتا ہوا ٹیکسی میں آ بیٹھا۔ ٹیکسی چل پڑی تو بشیر جھونکے لیتا ہوا سو گیا۔ ڈرائیور کو معلوم تھا اسے کہاں اترنا ہے۔ لیکن اسے جگانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ اپنا اسٹاپ آتے ہی بشیر خودبخود اٹھ گیا۔

''میرا کرایہ بابو جی سے لے لینا۔'' بشیر نے اترتے ہوئے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا اور ''خدا حافظ بابو جی'' کہتا ہوا اتر کر کوارٹروں کی قطار کی طرف بڑھ گیا۔ جلالی نے جاتے ہوئے بشیر کو تشکر بھری نظروں سے دیکھا۔ ٹیکسی ڈرائیور اور ساتھی مسافروں کے سامنے بشیر نے جلالی کے خالی جیب والے سفید کپڑوں کا بھرم رکھ کر اسے شرمندہ ہونے سے بچا لیا تھا۔ جلالی دل ہی دل میں اپنے آپ سے شرمندہ ہونے لگا۔ بشیر کے لئے مفلسی کا اظہار عیب نہیں تھا۔ مفلس ہونا شاید بشیر کا طبقاتی حق تھا۔ اس کے لئے یہ کوئی نئی یا معیوب بات نہیں تھی۔ منافقتیں کتنی تہہ دار ہوتی ہیں۔ اس نے سوچا اور بشیر کے دیئے ہوئے پانچ روپے ٹیکسی والے کو دے کر اپنے اسٹاپ پر اتر گیا۔

گھر جاتے ہوئے اسے ابھی ایک اور شرمندگی کا سامنا کرنا تھا۔ اسے پتہ تھا کہ

اس کے گھر میں داخل ہونے کا کھٹکا سن کر کلو چاچا سوتے سے اٹھ جائے گا۔ اس کی خیریت معلوم کرے گا اور پھر دوبارہ سونے کی کوشش میں دیر تک "اللہ ہو اللہ ہو" کے نعرے لگاتا رہے گا۔ پھر بھی اسے نیند نہیں آئے گی تو باہر نکلے گا اور گلی کے نکڑ والے نل پر چپ چاپ بیٹھا بیڑی کا دھواں اڑائے گا۔ کلو چاچا ایک ٹانگ سے لنگڑاتی ہوئی اپنی بوڑھی ماں اور پانچ سالہ بیٹے کے ساتھ رہتا تھا۔ بیوی بچے کی پیدائش کے دن ہی مر گئی تھی۔ کلو چاچا کی دوسری شادی نہیں ہو سکی تھی۔ اس کے بیٹے کو اس کی بوڑھی ماں نے کینگرو کی طرح سینے سے چمٹا لیا تھا۔ کلو چاچا کی عمر چالیس سال سے زیادہ کی ہو گی لیکن بچوں کی طرح معصوم اور سادہ دل تھا۔ سینے میں خلوص کا ایک خزانہ موجود تھا جسے وہ دل کھول کر لٹاتا پھر بھی کم نہ ہوتا۔ وہ گودی کا مزدور تھا اور کمر پر بھاری بوریاں لاد کر بحری جہازوں پر چڑھانے یا اتارنے کا کام کرتا تھا۔ اس کی ایک ہفتے کی کمائی جلالی کی مہینے بھر کی کمائی سے زیادہ تھی۔ مسئلہ صرف یہ تھا کہ اکثر مہینے میں صرف ایک ہی ہفتے کام کرتا اور کمر کا درد بڑھ جاتا تو کام والے ہفتے میں بھی چارپائی پر پڑا کراہتا رہتا۔ ان دنوں میں جلالی کے وہ پچاس روپے نعمت بن جاتے جو وہ کرائے کے طور پر کلو چاچا کو دیا کرتا تھا۔

دو کمروں کے اس کوارٹر کا بیرونی دروازہ جلالی کے کمرے میں کھلتا تھا۔ کلو چاچا صحن میں چارپائی ڈال کر سونے کی کوشش میں رات بھر مچھروں سے کشتی لڑا کرتا تھا۔ دوسرا کمرہ کلو کی ماں اور بیٹے کا تھا۔ کوارٹر کا دروازہ کبھی بند نہیں ہوتا تھا۔ بس ایک ٹاٹ کا پردہ ہوا میں جھولتا رہتا۔ گرمیوں میں وہ بھی سمیٹ دیا جاتا تھا۔ کوارٹر میں چرانے کے لئے کچھ تھا ہی نہیں۔ جلالی کے کمرے میں صرف ایک چارپائی تھی جو ڈھیلی ہو کر جھولا بن گئی تھی۔ جلالی کا خیال تھا اس چارپائی پر اسی طرح سوتا رہا تو اس کی اپنی کمر بھی چارپائی کے سانچے میں ڈھل کر نصف دائرہ بناتی ہوئی دوہری ہو جائے گی۔ ایک دیوار پر کھونٹیاں لگی تھیں جو الماری کا کام کرتی تھیں جن پر لٹکے ہوئے کپڑے بھری ہوئی بس کے مسافروں کی طرح ایک دوسرے پر چڑھے ہوئے تھے۔ لانڈری سے دھل کر آنے والے کپڑے کمرے میں رکھے ہوئے واحد صندوق میں

رکھے تھے۔ اسی صندوق کو میز بنا کر اس پر ایک چھوٹا سا آئینہ' صابن دانی' ٹوتھ پیسٹ' ٹوتھ برش اور شیو کا سامان رکھا ہوا تھا۔ ایک طرف کونے میں بے ترتیبی سے کتابوں کے ڈھیر لگے تھے جنہیں دیکھ کر کلو چاچا کہا کرتا تھا۔ "بابو جی کتابوں کی دکان کھول لو۔"

محلے میں ایک کتب فروش کی ہی کمی تھی' ورنہ وہاں سب کچھ تھا۔ کونے میں حبیب کا تھلہ تھا جہاں سیمنٹ کے بلاک' ریتی اور بجری بکا کرتی تھی۔ حبیب جے یو پی کا حامی تھا اور ہر سال عید میلاد النبیؐ کا شاندار جلسہ کرتا' بڑا سا شامیانہ لگتا' پوری گلی پتنگ کے کاغذوں والی رنگ برنگی جھنڈیوں سے سجائی جاتی' شہر سے چابی والی پارٹی کے رہنما آ کر تقریریں کرتے' میلاد پڑھا جاتا' قورمہ بریانی اور کھیر کی ضیافت ہوتی۔ حبیب کے بالکل سامنے والے مکان میں فیصل آباد کے خواجہ صاحب رہتے تھے جن کی سڑک پر پنکچر لگانے کی دکان تھی۔ وہ اہل حدیث تھے اور جب عید میلاد النبیؐ کا جلسہ ہوتا تو صرف کھانے میں شرکت کرنے آتے تھے' لیکن جلسہ کرنے کے لئے حبیب کو باقاعدگی سے چندہ دیا کرتے تھے۔ خواجہ صاحب کے برابر میں تنظیم اسلامی کے صوفی صاحب رہتے تھے جو ہڈیوں کو تراش کر چھوٹے چھوٹے تحفہ جات اور نازک زیور بناتے تھے۔ ان کے گھر ہونے والے تنظیم کے اجتماع میں بھی محلے کے سارے بزرگ شرکت کرتے تھے۔ صوفی صاحب کے برابر میں وحید بھنڈی رہتا تھا جس کی مارکیٹ میں گوشت کی دکان تھی۔ وہ بھنڈی سے چڑتا تھا اس لئے وہ اس کی عرفیت بن گئی تھی۔ محلے کے لڑکے اسے بھنڈی دکھا کر بھاگ جاتے اور وہ گالیاں بکتا ہوا ان کا پیچھا کرتا۔ دیر تک کوئی چھیڑنے والا نظر نہیں آتا تو سخت بے چین ہو جاتا' نگاہیں ادھر ادھر بھٹکنے لگتیں۔ اپنے بیٹے کے ختنوں پر تو زبردست جشن کیا تھا۔ برادری اور پورے محلے کی دعوت کی تھی۔ رات میں ہیجڑوں کا ناچ بھی ہوا تھا جو جلالی کے گھر واپس آنے کے وقت تک جاری تھا۔ مجبوراً اسے بھی جانا پڑا تھا لیکن وہ پیچھے ایک تاریک گوشے میں خواجہ صاحب' صوفی صاحب اور گارڈ صاحب کے ساتھ خاموشی سے بیٹھ گیا تھا۔

گارڈ صاحب ریلوے کے ریٹائرڈ تھے۔ محلے میں رہنے والے سب سے پڑھے

لکھے اور بزرگ شخص تھے اسی لئے سب ان کا بہت احترام کرتے تھے۔ وہ پکے لیگی تھے اور گلی کے نکڑ پر نل کے ساتھ بنے ہوئے چبوترے پر بیٹھ کر محلے والوں کو اس زمانے کے قصے سناتے جب وہ علی گڑھ کالج میں پڑھا کرتے اور "بن کے رہے گا پاکستان" کے نعرے لگایا کرتے تھے۔ گارڈ صاحب کے برابر میں شاہ جی رہتے تھے جن کی پھل سبزی کی دکان تھی۔ گھر ہونے والی محرم کی مجلسوں اور رجب کے کونڈوں میں پورا محلّہ شریک ہوتا تھا۔ دوسرے کونے پر دو کوارٹروں کو ایک کر کے بنایا ہوا مکان دین محمد بلوچ کا تھا۔ اس نے اپنے گھر کی چھت پر عوامی پارٹی کا جھنڈا لگایا ہوا تھا۔ اسے پوری امید تھی کہ اگلے انتخاب میں اس حلقے سے صوبائی اسمبلی کے لئے ٹکٹ اسے ہی ملے گا۔ کلو چاچا کے گھر کے دوسری طرف نبی جان رہتا تھا جو رکشا چلاتا تھا۔ رات کو گلی کے نکڑ پر بیٹھ کر چرس پیتا اور جئے نذیر کے نعرے لگاتا۔ ایک شام ۱۴ اگست کو گارڈ صاحب کی صدارت میں ہونے والے یوم آزادی کے جلسے میں آکر جئے نذیر کا نعرہ لگانے لگا تھا۔ اس سے پہلے کہ کوئی اور اسے کچھ کہتا دین محمد بلوچ اسے گریبان سے پکڑ کر باہر لے گیا تھا اور دھمکی دی تھی کہ وہ اندر آیا تو اسے پولیس کے حوالے کر دے گا۔ دوسرے دن نبی جان نے گارڈ صاحب کے گھر جا کر معافی مانگی تھی اور گلی کے نکڑ کے بجائے سڑک والی پلیا پر بیٹھ کر اپنے نشے کا شوق پورا کرنے لگا تھا۔

کلو چاچا کا اپنا کوئی رنگ نہیں تھا۔ عید میلاد النبیؐ کے جلسے میں سب سے گرمجوشی سے "نبیؐ کا جھنڈا اونچا رہے گا" کا نعرہ کلو چاچا کا ہوتا۔ صوفی صاحب کے گھر تنظیم اسلامی کے اجتماع میں چندہ دیتے وقت سب سے بڑا نوٹ بھی کلو چاچا کا ہوتا تھا۔ شاہ صاحب کے گھر ہونے والی مجلس میں واقعہ کربلا سن کر سب سے زیادہ بلک بلک کر کلو چاچا ہی روتا تھا۔ دین محمد بلوچ کے مکان کی چھت پر لگا ہوا پارٹی کا جھنڈا ہوا کے زور سے گر گیا تو کلو چاچا نے دین محمد کے گھر آنے سے پہلے ہی چھت پر چڑھ کر اسے دوبارہ مضبوطی سے گاڑ دیا تھا۔ ہیجڑوں کا ناچ ہوا تھا تو وحید بھنڈی کے گال پر رکھ کر سب سے زیادہ پیسے بھی کلو چاچا نے ہی دیئے تھے اور پھر کمر کے درد کے باوجود پورے ہفتے بندرگاہ جا کر گندم کی بوریاں اتارنے اور لادنے کا کام کیا تھا۔ کلو چاچا نے

اعلان کیا تھا کہ وہ الیکشن میں ووٹ ڈالنے نہیں جائے گا۔ وہ کسی ایک پارٹی کو ووٹ دے کر دوسری پارٹی والوں کا دل نہیں دکھا سکتا۔

جلالی کو اپنی یہ گلی قوس قزح کی طرح لگتی۔ کتنے مختلف رنگ تھے لیکن آپس میں ایک دوسرے سے گھلے ملے اور جڑے ہوئے۔ سب اپنے اپنے عقیدوں میں مست لیکن ایک دوسرے کے حال سے باخبر' ایک دوسرے کے غم اور خوشی میں شریک۔ پوری بستی میں ایک یہی گلی ایسی تھی۔ اس کے بعد کی ساری گلیاں کھڈی والوں کی تھیں جن کے کوارٹروں میں ایک ذات' ایک برادری اور ایک لہجے کی زبان بولنے والے مختلف رنگوں اور ڈیزائنوں کی بنارسی ساڑھیاں بُننے کا کام کرتے تھے۔ صبح ہوتے ہی جب کھڈیاں چلنی شروع ہوتیں تو پورے محلے میں کھٹ کھٹ کی آواز ایسی یکسانیت سے گونجتی جیسے کمپیوٹر میں بنی ہوئی موسیقی۔ اس بستی کے دوسرے باسیوں کی طرح جلالی کو بھی اس موسیقی کی عادت ہو گئی تھی۔ یہ شور اب اس کی نیند خراب نہیں کرتا تھا۔

جلالی ٹیکسی سے اتر کر اپنی گلی میں داخل ہوا تو نل والے چبوترے پر کلو چاچا بیٹھا نظر آیا۔ شاید اسے مچھروں نے سونے نہیں دیا تھا۔ جلالی کو آتے دیکھ کر کلو چاچا اٹھ کھڑا ہوا اور بیڑی پھینک کر جلالی کی طرف بڑھنے لگا۔ جلالی کے کوارٹر کے سامنے ایک ٹیکسی کھڑی تھی۔ جلالی کو حیرت ہونے لگی۔ اسے پتہ تھا کلو چاچا کی ایک بہن تھی جو نیو کراچی میں رہتی تھی۔ اس کا شوہر ٹیکسی چلاتا تھا۔ لیکن اس وقت اتنی رات گئے؟ کیا کلو چاچا کی ماں......؟ کوارٹر کے دروازے پر ٹاٹ کے پردے کے پیچھے سے لالٹین کی کمزور روشنی جھانک رہی تھی۔ کلو چاچا نے قریب آ کر جلالی کو گلے سے لگا لیا' اس کے چوڑے چکلے وجود پر پھیلی ہوئی کالی داڑھی آنسوؤں سے تر ہونے لگی تھی۔ جلالی اس کی کمر کو تھپ تھپانے لگا۔ اسے خود پر غصہ آ رہا تھا۔ وہ جس وقت انٹرکان کے مینابازار میں اعلیٰ شرابیں پی کر بہک رہا تھا' اس وقت اس کے مہربان مالک مکان کی سب سے عزیز ہستی اس سے جدا ہو رہی تھی۔ وہ غریب شاعر کے ہاں مردہ بچہ

پیدا ہونے پر خوش ہوا تھا۔ لیکن یہاں تو ایک ماں مر گئی تھی۔ جلالی سوچنے لگا کوئی ماں کی موت کا غم کیسے جھیل سکتا ہو گا۔ کلو چاچا اس کے گلے میں ہاتھ ڈال کر اسے اپنے کوارٹر کی طرف لے کر چلنے لگا۔ ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر لیٹا کوئی سو رہا تھا۔ شاید کلو چاچا کا بہنوئی ہو گا۔ جلالی کو اس کی بے حسی پر افسوس ہوا۔ ساس کے مرنے کا غم نہ سہی، غم میں شرکت کی رسم تو نباہ سکتا تھا۔

جلالی کے اندر داخل ہونے کے لئے کلو چاچا نے ٹاٹ کا پردہ ہٹایا تو جلالی کو اپنے کمرے کا سماں بدلا ہوا نظر آیا۔ چارپائی ایک کونے میں کھڑی کر کے زمین پر بڑی سی دری بچھا دی گئی تھی۔ گلی کے تقریباً سبھی لوگ وہاں موجود تھے۔ وحید بھنڈی، خواجہ صاحب، دین محمد بلوچ، شاہ جی، حبیب، کھڈی والوں کی پنچایت کا سربراہ انصاری۔ ایک طرف دیوار سے ٹیک لگائے نبی جان بھی جھونکے لے رہا تھا۔ گارڈ صاحب اور صوفی صاحب ہاتھوں میں سپارے لئے پڑھ رہے تھے۔ پوری گلی میں یہی دونوں پڑھنا جانتے تھے۔ دروازے کی چوکھٹ میں جہاں دیمک نے ایک چھوٹی سی جھری بنا دی تھی ایک اگر بتی لگی ہوئی سلگ رہی تھی۔ درمیان میں چائے کے خالی گلاس رکھے تھے۔

جلالی کے اندر آتے ہی سب کھڑے ہو گئے۔ سب کے چہرے افسردہ تھے۔ ایسے نہیں جیسے غم کا رسمی اظہار کرنے والے بنایا کرتے ہیں۔ لگتا تھا دل کا دکھ چہروں پر آ گیا ہے۔ سب باری باری جلالی سے گلے ملنے لگے۔ جلالی کی سمجھ میں نہیں آیا۔ یہ لوگ اس سے گلے کیوں مل رہے تھے۔ شاید یہ بھی غم بانٹنے کا ایک طریقہ تھا۔ غم مشترک ہو جائے تو کسی ایک پر بھاری ہو کر نہیں گزرتا۔ آخر میں جب وہ گارڈ صاحب سے گلے ملا تو وہ دیر تک اسے سینے سے لگائے رہے۔ جلالی کی نظریں ان کے پیچھے دیوار کے ساتھ کھڑے ہوئے ایک وجود پر جم گئیں۔ فرش پر رکھی ہوئی لالٹین کی روشنی اس کے چہرے تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ کپڑوں سے خوشحالی ٹپک رہی تھی۔ وہ اس بستی کا رہنے والا تو نہیں ہو سکتا تھا۔ گارڈ صاحب سے گلے مل کر ہٹا تو اجنبی وجود بھی گلے لگانے جلالی کی طرف بڑھا۔ اسی وقت ہاتھ میں المونیم کی کیتلی لئے ہوئے کلو

چاچا کی ماں لنگڑاتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ جلالی کے قدم جم کر رہ گئے۔ یہ تو زندہ تھی! تو پھر کون.....؟ لیکن اس کے کچھ پوچھنے سے پہلے وہ اجنبی وجود جلالی کے بالکل قریب پہنچ گیا۔

''بھائی جی آپ؟!'' اپنے سوتیلے بھائی کو پہچانتے ہی جلالی کے ذہن میں آندھیاں چلنے لگیں۔ ''ماں'' دل میں ایک بے ساختہ چیخ گونجی تھی۔ یہ اس کا سب سے بڑا بھائی تھا جسے سب بھائی جی کہتے تھے۔ اتنی دور سے وہ کیا خبر سنانے آیا تھا۔

''نہیں نہیں۔'' بھائی کی طرف اٹھی ہوئی نگاہیں چیخ چیخ کر التجائیں کرنے لگیں۔

''سکندر! تمہاری ماں اس دنیا میں نہیں رہی۔'' بھائی جی نے یہ کہتے ہوئے اسے گلے سے لگا لیا۔ ایک جملے میں ساری کہانی ختم ہو گئی تھی۔ جلالی کے سارے احساس گنگ ہو گئے۔ بھائی کے گلے سے لگ کر بھی کوئی احساس نہیں جاگا۔ ڈھاکہ کا شاعر دوست' اس کی حاملہ بیوی' پیدا ہونے والا مردہ بچہ' کیسے کیسے آشنا نا آشنا چہرے سائے بن کر آنکھوں میں سمانے لگے۔ وہ گھر آتے ہوئے کتنا مطمئن تھا کہ اس کی بیوی نہیں تھی۔ یہ کیوں بھول گیا تھا کہ اس کی ایک ماں تھی۔ ماں جو دوبارہ جنم نہیں لے سکتی۔ زندگی بھر پیار دینے والی ماں جو اسے جدائی کا غم دے گئی تھی۔ جدائی کا یہ غم وہ کب سے سہہ رہا تھا۔ آج کی رات نے اس غم کو مستقل کر دیا تھا۔ جسم کے اندر آنسوؤں کی فصل لہلہانے لگی۔ بدن کا رواں رواں آنسو بہا رہا تھا لیکن آنکھوں میں کوئی موتی نہیں چمکا۔ اس کے بھائی نے اسے دیوار سے ٹکا کر بٹھا دیا اور خود بھی ساتھ بیٹھ گیا۔ سب تعزیتی جملے کہنے اور اپنے اپنے انداز میں دلاسہ دینے لگے۔ کلو چاچا کی ماں نے چائے کا ایک گلاس جلالی کے ہاتھ میں بھی دے دیا۔

''انصاری صاحب نے ایک قرآن شریف مسجد بھجوا دیا ہے' صبح فجر کی نماز میں ختم ہو جائے گا۔ ایک قرآن کے سپارے میں نے اور گارڈ صاحب نے تقسیم کر لئے ہیں اور گھروں میں خواتین کو بھجوا دیئے ہیں۔'' صوفی صاحب نے بتایا۔

''تمہارے بھائی صاحب رات نو بجے آ گئے تھے۔'' گارڈ صاحب بتانے لگے۔ ''ہم نے تمہارے دفتر فون کیا' کسی کو نہیں پتا تھا تم کہاں گئے ہو۔ تمہارے ایک

ساتھی نے بتایا کہ اسے پتہ ہے تم کہاں ہو سکتے ہو۔ نبی جان اپنا رکشہ لے کر اسی وقت تمہارے دفتر چلا گیا تھا۔ تمہارے دوست کو لے کر ہر جگہ تلاش کیا لیکن تم نہیں ملے۔" جلالی کو پتہ تھا اس کی تلاش میں ایک ایک شراب خانہ اور نہاری والا ایک ایک ہوٹل دیکھا گیا ہو گا۔ انترکان اور بندو خان کی طرف کسی کا دھیان بھی نہیں گیا ہو گا۔ یہ سب رات نو بجے سے بیٹھے اس کی ماں کا سوگ منا رہے تھے۔ ثواب بخشوانے کا اہتمام کر رہے تھے اور وہ...... جلالی کا دل چاہا دیوار سے اپنا سر ٹکرا دے۔

تھوڑی دیر میں ایک ایک کر کے سب اٹھے اور اسے صبر کی تلقین کر کے چلے گئے۔ کلو چاچا کی ماں چائے کے گلاس سمیٹ کر اندر لے گئی۔ کلو چاچا بھی بیڑی پینے باہر چلا گیا۔ لیکن جاتے جاتے اس نے چوکھٹ میں ایک اور اگر بتی سلگا کر لگا دی تھی، ساتھ ہی جلالی کو پریشان کن نظروں سے دیکھا تھا جس کی خشک آنکھوں میں صحراؤں کی سی وحشت سما گئی تھی۔ کلو چاچا چلا گیا تو جلالی کی آنکھیں اپنے بھائی کی طرف اٹھ گئیں۔ اسے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ انہوں نے اس کی آنکھوں میں "کب اور کیسے؟" کے سوال پڑھ لئے تھے۔

"انہیں کچھ عرصے سے دل کے درد کی شکایت رہنے لگی تھی۔ ڈاکٹر نے زبان کے نیچے رکھنے کے لئے گولی دے دی تھی جس سے دل کا درد ختم ہو جاتا تھا۔ ایک ہفتہ پہلے مغرب کی نماز کے لئے وضو کرنے بیٹھیں تو دل میں درد اٹھا۔ منت کا روزہ رکھا ہوا تھا اس لئے گولی بھی نہیں لی۔ تمہاری بھابی نے بہت کہا لیکن کہتی تھیں سکندر کے سر سے بلائیں بھگانی ہیں۔ روزہ نہیں توڑیں گی۔ مغرب میں تھوڑی ہی دیر رہ گئی تھی۔ دورہ شدید تھا اس لئے افطار کے بعد گولی لی تب بھی فائدہ نہیں ہوا۔ جب تک ہم ڈاکٹر کو لے کر آئے وہ ہمیشہ کے لئے ہمیں چھوڑ کر جا چکی تھیں۔" جلالی نے سوچا کاش اس وقت بھائی جی یہاں نہ ہوتے۔ آنکھوں کے لئے آنسوؤں کا بوجھ سہنا مشکل ہو رہا تھا۔

"ہمیں تمہارا پتہ نہیں معلوم تھا۔ ہمیں تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ تم کس شہر میں ہو۔ تمہارے جس دوست کو پتہ تھا اس نے بتانے سے انکار کر دیا تھا۔ کل

تمہاری بھابی کو ماں کے سامان سے تمہارا ایک خط ملا جو انہوں نے صندوق کی تہہ میں بہت چھپا کر رکھا ہوا تھا۔ اس میں تمہارا پتہ بھی تھا۔ پہلی فلائٹ آج شام کی مل سکی تھی۔ تمہارے دونوں بھائی بھی آنا چاہتے تھے لیکن میں نے یہ کہہ کر روک دیا ہے کہ میں تمہیں اپنے ساتھ لے کر گھر آؤں گا۔ صبح کی فلائٹ پر میں نے تمہاری سیٹ بھی کنفرم کرا لی ہے۔" بھائی جی سر جھکائے جلالی کو بتا رہے تھے۔ جلالی کو اپنے بھائی کا چہرہ تھکا ہوا لگا۔ لیکن دکھ کی کوئی لہر نظر نہیں آئی۔

"میں اب وہاں جا کر کیا کروں گا۔ میں یہیں ٹھیک ہوں۔" جلالی نے بمشکل کہا۔

"ماں کی قبر پر فاتحہ نہیں پڑھو گے۔ آنسو نہیں بہاؤ گے؟" اس کے بھائی نے اسے دیکھتے ہوئے تیز لہجے میں کہا۔

"میں اس کے گلے لگ کر نہیں رو سکا تو اب اس مٹی پر بھی آنسو نہیں بہاؤں گا جس کے نیچے وہ دبی ہوئی ہیں۔" جلالی نے سخت لہجے میں کہا۔ اس کی کنپٹی کی رگیں ابھر آئی تھیں۔

"یہاں اکیلے رہ کر اتنے بڑے غم کو کیسے جھیلو گے۔ گاؤں جا کر تمہیں دسویں کا کھانا بھی کرنا ہے۔ پوری برادری تمہارا انتظار کر رہی ہے۔" اس کے بھائی کا انداز سمجھانے والا تھا۔

"کون سی برادری؟" جلالی کے لہجے میں نہ چاہتے ہوئے بھی طنز ابھر آیا تھا۔

"میری برادری یہی ہے جو ابھی اس کمرے میں آپ نے دیکھی تھی۔ یہاں میں اکیلا نہیں ہوں، کلو چاچا ہیں۔ دوسرے ہیں۔ میں کچھ دنوں میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔" جلالی کو اپنے بھائی کے چہرے پر پہلی بار دکھ کا سایہ لہراتا ہوا نظر آیا۔

"میں کچھ دن تمہارے ساتھ رہتا لیکن کل کچہری میں ایک مقدمہ لگا ہوا ہے۔ صبح کی پہلی فلائٹ سے مجھے جانا ہے۔" جلالی کے بھائی نے آہستگی کے ساتھ کہا۔

"آپ کو اتنی دور آنے کی تکلیف کرنا بھی نہیں چاہئے تھی۔ مجھے ٹیلی گرام سے خبر دے سکتے تھے۔ میں کسی وقت ملنے خود گاؤں آ جاتا۔ آپ نے میری ماں کے

کفن دفن کا انتظام کیا' سوئم کی فاتحہ بھی کی ہو گی۔ مجھ پر آپ کا یہ احسان بھی کم نہیں ہے۔" جلالی نے کہا۔ اس دفعہ اس کے لہجے میں طنز نہیں تھا۔ اس کے بھائی کے چہرے پر آئے ہوئے دکھ کا سایہ اور گہرا ہو گیا۔ تھوڑی دیر تک وہ خاموش اس دیوار کو تکتا رہا جس پر لالٹین کے بھڑکتے ہوئے شعلے نے طوفان مچایا ہوا تھا۔ وہ کچھ کہنے کے لئے دماغ میں لفظوں کو جمع کر کے ترتیب دے رہا تھا۔ جب بولنا شروع کیا تو چہرے کا دکھ آواز میں آ گیا تھا۔

"ہمارے خلاف تمہارا غصہ غلط نہیں ہے۔ ہم نے تمہاری ماں کو کبھی اپنی ماں نہیں سمجھا۔ جب ہماری ماں مری تھی تو ہم سب کافی بڑے تھے۔ جب اباجی تمہاری ماں کو شادی کر کے لائے تو ہمیں بہت غصہ آیا تھا۔ تمہاری ماں سے سخت نفرت محسوس ہوئی تھی۔ ہماری جگہ تم ہوتے تو شاید تمہارے جذبات بھی کچھ ایسے ہی ہوتے۔"

جلالی نے سوچا شاید وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ ٹھیک نہ بھی کہہ رہا ہو تو اسے پرواہ نہیں تھی۔ اسی وقت کلو چاچا نے ٹاٹ کا پردہ اٹھا کر کمرے میں جھانکا لیکن انہیں باتیں کرتا دیکھ کر پھر واپس چلا گیا۔ جلالی کا بھائی اس کی طرف دیکھے بغیر اسی طرح بولے جا رہا تھا۔

"وقت نے ہماری نفرت تو ختم کر دی تھی لیکن ہم ان سے محبت نہ کر سکے۔ بس بے تعلق ہو کر رہ گئے تھے۔ تمہاری ماں نے تمہیں اپنے آپ سے اس طرح جوڑ کر رکھا تھا کہ ان کے ساتھ ہم تم سے بھی بے تعلق ہوتے گئے۔ ہوش اس وقت آیا جب اباجی کے مرنے کے بعد تم اچانک لاپتہ ہو گئے۔ لیکن اس وقت بہت دیر ہو چکی تھی۔ ہم نے تمہاری ماں کو وہ عزت دینے کی کوشش کی جو ان کا حق تھا لیکن وہ اسے ہماری چال اور چاپلوسی سمجھتی تھیں۔ انہوں نے ہمارے بہت پوچھنے پر بھی تمہارے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ ان کے دل میں یہ یقین گھر کر گیا تھا کہ ہم تمہیں قتل کرنا چاہتے ہیں۔ اس کا خون کرنا چاہتے ہیں جس کی رگوں میں خود ہمارا خون ہے۔ انہوں نے یہ نہیں سوچا کہ زمین کا رشتہ خون کے رشتے سے بڑا نہیں ہوتا۔ ہم اپنے خون کا

خون کیسے کرتے۔ ہم تو یہ سوچ کر خود اپنے اندر مر گئے تھے۔ تمہارے اچانک چلے جانے سے ہم تمہیں یہ بھی نہ بتا سکے کہ ہمیں تم پر کتنا مان تھا۔ تم پر ہم کتنا فخر کرتے تھے؟"

اس کی آواز بھرا گئی۔ آنسو روکنے کے لئے وہ خاموش ہو گیا تھا۔ جلالی کے دل میں بھی محبت کی لہریں اٹھنے لگیں۔ سمندر ابلنا چاہتا تھا۔ لیکن اسے خود پر قابو رکھنا تھا۔ جلالی کے بھائی نے رومال میں اپنی ناک سوں سوں کر کے ایک بار پھر بولنا شروع کر دیا تھا۔

"حکومت کے خلاف تمہارے لکھے ہوئے مضمون کا شور ہوا تو ہم تینوں بھائیوں کے سینے فخر سے تن گئے تھے۔ تمہاری بہادری نے راجپوتوں کی روایت تازہ کر دی تھی۔ گاؤں کی ایک دعوت میں کسی عورت نے تمہارے بارے میں کچھ کہا تو تمہاری چھوٹی بھابی نے اس کی چٹیا پکڑ لی تھی اور دوسری دونوں بھاوجیں جوتیاں لے کر اسے مارنے دوڑی تھیں۔ اس کے بھائی شکایت کرنے آئے تو تمہارے بھائیوں نے بندوقیں تان لی تھیں۔ کسی کا بھی سیاسی جلسہ ہو تمہارے بھتیجے مل کر "سکندر چاچا زندہ باد" کے نعرے لگاتے ہیں اور بڑے فخر سے اپنے ساتھی بچوں کو بتاتے ہیں کہ ان کا چاچا بھی وزیر بننے شہر گیا ہے۔ عامرہ اب کالج جانے لگی ہے۔ تمہاری طرح اسے بھی لکھنے کا شوق ہے۔ کالج کے میگزین میں اس کا مضمون چھپا تھا۔ تمہارے لئے ایک کاپی سنبھال کر رکھی ہے۔ کہتی ہے چاچا دیکھیں گے تو کتنا خوش ہوں گے۔ تم تو ہمارا اور ہماری اولادوں کا مان تھے۔ تمہیں مارنے کا ہم کیسے سوچ سکتے تھے۔ لیکن تمہاری ماں نے سوچ لیا تھا۔ انہوں نے ہمیں جیتے جی مار دیا تھا۔"

وہ جلالی کو گلے لگا کر کھل کر رو دیا۔ جلالی کا دل چاہا کہ وہ بھی اپنا بند کھول دے۔ لیکن ماں کو پسند نہیں تھا۔ ماں جس سے ناراض مری تھی اس کے کندھوں پر سر رکھ کر کیسے رو سکتا تھا۔ اس کے بھائی کا رونا بند ہو گیا تو وہ آنسو پونچھ کر اپنی ناک صاف کرنے لگا۔ جلالی کو اچانک اپنی ماں کا آخری خط یاد آگیا۔

"ماں کے دانتوں میں بہت درد تھا۔ اسے داڑھ نکلوانے شہر جانا تھا۔ کیا جا سکی

تھی؟" جلالی نے پوچھا تو اس کا بھائی اسے حیرانی سے دیکھنے لگا۔

"انہوں نے ہمیں کچھ نہیں بتایا۔" اس نے آہستہ سے کہا اور سر جھکا لیا۔ جلالی کے دل میں چند لمحے پہلے بھائی کی جو محبت جاگی تھی وہ پھر سرد ہو گئی۔ وہ ان کی ماں نہیں تھی۔ ہوتی تو اس کی تکلیف نے ان کا دل بھی تڑپایا ہوتا۔ انہیں تو اس کی داڑھ میں دبی ہوئی اس لونگ کا بھی پتہ نہیں ہو گا جس سے وہ دانت کے درد کا علاج کر رہی تھی۔ لونگ سمیت دفن کر دیا ہو گا۔ لیکن پتہ چلے گا۔ اس وقت پتہ چلے گا جب لونگ کی تیز خوشبو قبر سے نکل کر ان کے کھیتوں میں پھیل جائے گی۔

جلالی کا بھائی گھڑی دیکھنے لگا۔ چار بج گئے تھے اس کی پرواز جانے میں صرف دو گھنٹے باقی تھے۔ وہ اٹھا تو جلالی بھی کھڑا ہو گیا۔ اس کا بھائی کونے میں رکھے ہوئے اپنے بریف کیس کو کھول کر اس میں کچھ تلاش کرنے لگا۔ جلالی کی طرف پلٹا تو ہاتھ میں کاغذ کا ایک ٹکڑا تھا۔ جلالی اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

"ڈھائی لاکھ روپے کا ڈرافٹ ہے۔ پچھلے سات سالوں کی فصلوں میں سے تمہارا حصہ۔ جلدی میں ہم اتنے ہی پیسے جمع کر سکے تھے۔" اس نے جلالی کی طرف ڈرافٹ بڑھاتے ہوئے کہا۔ لیکن جلالی نے اپنے دونوں ہاتھ پتلون کی جیبوں میں ڈال دیئے اور ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔

"جس زمین پر میری ماں کا حق نہیں تھا' اس زمین سے مجھے بھی کچھ نہیں لینا۔" جلالی نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"اس زمین پر تمہاری ماں کا کوئی حق نہیں تھا۔ ہماری ماں کا بھی نہیں تھا۔ یہ ہماری یا تمہاری ماں کی زمین تھی بھی نہیں۔ یہ ہمارے باپ کی زمین تھی۔ اس پر تمہارا حق بھی اتنا ہی ہے جتنا ہمارا۔" جلالی کے بھائی نے کہا۔ اس کا ہاتھ اسی طرح جلالی کی طرف بڑھا ہوا تھا۔

"زمین پر حق اس کا ہے جو اس پر ہل چلاتا ہے' اس پر اپنا پسینہ بہاتا ہے۔ مجھے اپنا حق لینا ہو گا تو میں خود آؤں گا۔"

"ہم نے پسینے کی ہر بوند کا حساب رکھا ہے۔ یہ پیسے ان دنوں کا حساب ہیں جو

تم نے اپنی زمین سے کٹ کر بڑے شہر کی اس تنگ زمین پر گزارے ہیں۔" اس کے بھائی نے چھوٹے سے نیم تاریک کمرے کے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں بھائی جی! میں اس تنگ زمین پر بہت خوش ہوں۔ مجھے اپنے حالات سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ میرا کوئی حساب باقی نہیں ہے۔" جلالی کے ہاتھ اسی طرح جیبوں میں تھے اور سر مستقل نفی میں ہل رہا تھا۔

"ضد نہیں کرتے۔" بھائی جی نے کہا اور قدم آگے بڑھا کر ڈرافٹ جلالی کی قمیض کی اس جیب میں رکھ دیا جس میں دو گھنٹے پہلے بشیریان والے نے پانچ روپے کا نوٹ ٹھونسا تھا۔

"اس شہر میں سر اٹھا کر رہو تو ہمارا سر بھی فخر سے اونچا رہے گا۔ تم جہاں بھی رہو گے تمہارا حصہ تمہیں پہنچتا رہے گا۔ لیکن ہمیں بہت خوشی ہو گی اگر تم سال کے سال فصل پر گاؤں آیا کرو۔" جلالی کا بھائی یہ کہہ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ جلالی بھی آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے پیچھے باہر آ گیا۔ چبوترے پر بیٹھا ہوا کلو چاچا انہیں نکلتا دیکھ کر ان کی طرف آیا اور جلالی کے بھائی کو جانے کے لئے تیار دیکھ کر ٹیکسی میں سوئے ہوئے اس کے ڈرائیور کو جگانے لگا۔

"ہم تمہارے آنے کا انتظار کریں گے۔" جلالی کے بھائی نے گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے اسے گلے لگاتے ہوئے کہا۔

"میں ضرور آؤں گا۔ عامرہ کو بتانے کہ لکھنے والے اچھے حالوں میں نہیں رہتے۔ ان کی بیویاں مرے ہوئے بچے پیدا کرتی ہیں۔ بچوں کو سمجھاؤں گا کہ وزیر بننا فخر کی نہیں ذلت کی بات ہے۔"

جلالی کے بھائی کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ سر ہلاتا ہوا کلو چاچا سے ہاتھ ملا کر ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ جلالی مٹی اڑاتی ہوئی ٹیکسی کو جاتا دیکھتا رہا اور پھر تھکے تھکے قدموں سے چلتا ہوا نل کے ساتھ والے چبوترے پر جا کر بیٹھ گیا۔ دونوں ہاتھ میں سر کو تھام لیا۔ بھائی چلا گیا تو گھٹائیں گھر گھر کر آنے لگی تھیں۔ کلو چاچا نے قریب آ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو سارے بند ٹوٹ گئے۔

"کلو چاچا میری ماں مر گئی۔ میری ماں مر گئی۔" کلو چاچا کے گلے سے لگ کر دیر تک روتا اور بین کرتا رہا۔ کلو چاچا اس کی کمر تھپ تھپاتا رہا۔ گلی کے لوگ بالٹیاں اور گھڑے ہاتھوں میں لئے پانی بھرنے نل کی طرف آنے لگے تھے۔ جلالی کو پرواہ نہیں تھی۔ یہ گلی اس کے غم کی پناہ گاہ تھی۔ اس کے رہنے والے اس کے غم کے حصے دار تھے۔ اس گلی میں وہ سب کے سامنے سرعام کھڑے ہو کر اپنی ماں کا ماتم کر سکتا تھا۔

دوسرے دن اس کے اخبار کے ساتھی تعزیت کے لئے آ گئے تھے۔ شام تک اس کے دوسرے دوستوں کو پتہ چل گیا تھا۔ انہوں نے اصرار کیا تھا کہ وہ انکے ساتھ ان کے گھر چل کر رہے۔ جلالی نے کوارٹر کے اپنے کمرے سے نکلنے سے انکار کر دیا تو انہوں نے دوسرے روز اسی گلی میں دسویں کی فاتحہ کا انتظام کیا۔ بڑا سا شامیانہ لگا تھا۔ اسلم روڈ سے کھانے کی دیگیں آئی تھیں۔ شہر کے سارے دوست آئے تھے۔ گلی والوں نے کھانا کھلانے کا کام سنبھال لیا تھا۔ کھڈی والوں کی پوری برادری کو بھی بلایا تھا۔ مچھر کالونی سے تھوڑے فاصلے پر دارالعلوم تھا وہاں قرآن خوانی ہوئی تھی۔ کھانے کی ایک دیگ وہاں بھی بھجوائی تھی۔ جلالی اس پریشانی میں ماں کا غم بھول گیا تھا کہ دوستوں کے احسان کیسے اتارے گا۔ کلو چاچا کی کمر آج کل ٹھیک تھی لیکن وہ کام پر نہیں جا رہا تھا۔ اس کی بوڑھی ماں چائے کی کیتلی بھر کر لاتی اور جلالی کے پاس تعزیت کرنے کے لئے آنے والوں کے گلاس بھرتی رہتی۔ جلالی خون کے گھونٹ پینے لگتا۔ اسے یقین تھا کلو چاچا کا بیٹا دودھ پئے بغیر سوتا ہو گا۔ اس کے حصے کا دودھ چائے بنانے کے کام آ رہا تھا۔

تین دن تک اسکوٹروں' موٹر سائیکلوں اور گاڑیوں کی جو ریل پیل رہی تھی اس نے گلی کے بچوں کی عید کر دی تھی۔ لیکن چوتھے روز جو گاڑی آئی اسے دیکھ کر بڑوں کی آنکھیں بھی پھیل گئیں۔ جلالی کو نواب ٹن کو دیکھ کر حیرت ہوئی۔ اس کا نام کچھ اور تھا لیکن عادی شرابی تھا اس لئے دوست نواب ٹن کہتے تھے۔ نئی نئی دولت آئی تھی تو سب سے پہلی حسرت شو روم میں کھڑی ہوئی سب سے شاندار گاڑی خرید

کر نکالی تھی۔ جلالی کی اس سے دوستی تھی لیکن اتنی قریبی نہیں کہ وہ اتنی دور ایک غریب بستی میں اس کی ماں کی تعزیت کرنے آتا۔ اس لئے جلالی کو حیرت ہوئی تھی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ نواب ٹن کا آنا ایک گہری دوستی اور قربت کی ابتدا بن جائے گا۔

نواب ٹن تعزیت کر کے واپس جانے لگا تو باہر اس کی گاڑی کے گرد بچوں کا ہجوم تھا۔ ڈرائیور کے ڈر سے کوئی قریب نہیں آیا تھا۔ وہ ایک فاصلے پر کھڑے ہوئے حسرت بھری نظروں سے گاڑی کو تک رہے تھے۔ ڈرائیور نے نواب ٹن کے لئے گاڑی کا دروازہ کھولا تو نواب ٹن کا بڑھتا ہوا قدم رک گیا۔

"بچوں کو گاڑی میں بٹھا کر چکر لگوا کر آؤ۔ مجھے جلالی سے ابھی کچھ دیر اور باتیں کرنی ہیں۔" نواب ٹن نے ڈرائیور سے کہا تو وہ اسے حیرت سے دیکھنے لگا۔

"صاحب گاڑی گندی ہو جائے گی۔" ڈرائیور نے میلے جسموں اور گندے کپڑوں والے بچوں کو دیکھ کر کہا۔ نواب ٹن نے زبان سے کچھ نہیں کہا صرف ڈرائیور کو گھور کر دیکھا اور جلالی کے ساتھ دوبارہ کوارٹر کے اندر آگیا۔ جلالی نے پلٹ کر دیکھا تو خوشی اور حیرت سے چیختے ہوئے بچوں کا غول ایک دوسرے کو دھکے دیتا ہوا گاڑی میں گھس رہا تھا۔

"ڈرائیور غلط نہیں کہہ رہا تھا' تمہاری گاڑی واقعی گندی ہو جائے گی۔" جلالی نے اندر آکر زمین پر بچھی ہوئی دری پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"گاڑی دھل جائے گی لیکن بچوں کے دل میں حسرت کا جو میل رہ جائے گا وہ کبھی صاف نہیں ہو گا۔" نواب ٹن کہنے لگا۔ "بچپن میں ایک ایسی ہی گاڑی میری گلی میں بھی آیا کرتی تھی۔ اس کا ڈرائیور بہت جلاد تھا۔ ایک دفعہ میں نے گاڑی کو ہاتھ لگا کر دیکھنا چاہا تو اس نے میرا ہاتھ مروڑ دیا تھا۔ میرا پورا بچپن اس گاڑی میں بیٹھنے کی حسرت میں گزرا تھا۔" جلالی نے نواب ٹن کا یہ رخ پہلے نہیں دیکھا تھا۔ تھوڑی دیر کے لئے دونوں خاموش ہو گئے۔ اچانک نواب ٹن کو کچھ یاد آگیا۔

"تمہیں کچھ پیسوں کی ضرورت تو نہیں ہے؟" نواب ٹن نے پوچھا۔

"پیسے!؟" جلالی کو خیال آیا کہ اس کے پاس واقعی پیسے نہیں تھے۔ وہی آٹھ آنے جیب میں تھے جو چار روز پہلے گھر آتے ہوئے بچ گئے تھے۔ اچانک اسے ڈھائی لاکھ روپے کا وہ ڈرافٹ یاد آ گیا جو بھائی جی اسے دے کر گئے تھے اور جسے وہ بالکل بھول گیا تھا۔ اس نے قمیض کی جیب ٹٹولی' لیکن اس روز وہ دوسری قمیض پہنے ہوئے تھا۔ کھونٹی پر ٹنگے ہوئے کپڑوں کی تہوں میں سے اس نے وہ قمیض تلاش کر کے ڈرافٹ نکالا۔ نواب ٹن اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

"خیریت تو ہے؟" نواب ٹن نے پوچھا تو جلالی نے بینک ڈرافٹ نواب ٹن کو دے دیا۔ ڈرافٹ پر لکھا ہوا نام اور رقم دیکھ کر اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔

"تمہاری تو لاٹری نکل آئی ہے۔" اس نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"ماں کے مرنے سے میں لکھ پتی ہو گیا ہوں۔" جلالی ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ لا کر کہنے لگا۔ "میرے بھائی جو ماں کے انتقال کی خبر لائے تھے زبردستی دے گئے ہیں۔ مجھے واپس بھجوانا ہے۔"

"کیوں؟ کیا بڑے بھائی کے پیسوں کا احسان اچھا نہیں لگا۔" نواب ٹن نے پوچھا۔ ڈرافٹ ابھی تک اسی کے ہاتھ میں تھا۔

"نہیں یہ بڑے بھائی کے نہیں میرے اپنے پیسے ہیں۔ زمینوں کی آمدنی میں سے میرا حصہ ہیں۔ لیکن مجھے نہیں چاہئیں۔ میرا ان زمینوں اور ان کی آمدنی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں یہ ڈرافٹ آج ہی واپس بھجوا دوں گا۔" جلالی کو اچانک غصہ آ گیا۔

"یہ پیسے کہیں واپس نہیں جائیں گے۔" نواب ٹن نے ڈرافٹ کو تہہ کر کے اپنی جیب میں رکھ کر اٹھتے ہوئے کہا۔ "اٹھو اور جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ بینک ابھی کھلے ہوں گے۔ اکاؤنٹ کھلوا کر ڈرافٹ جمع کراتے ہیں۔ ڈیفنس کے پل کے قریب بہت خوبصورت اپارٹمنٹ بنے ہیں۔ ایک ابھی تک خالی ہے۔ ایجنٹ نے مجھے کل ہی بتایا تھا۔ اس کا ڈپازٹ جمع کرا دیتے ہیں۔ انٹرکان کی انٹیریئر ڈیزائنر ابھی تک مجھ پر عاشق ہے۔ اس کے ساتھ کافی پئیں گے اور اسے تمہارے اپارٹمنٹ کی کم سے کم

پیسوں میں بہترین فنشنگ کرانے کی بات بھی کریں گے۔ اخبار میں اس کی خبراور تصویر چھاپ دو گے تو تمہاری بھی مرید ہو جائے گی۔"

"لیکن......." جلالی نے احتجاج کرنا چاہا تو نواب ٹن نے اسے اس طرح گھور کر دیکھا جیسے تھوڑی دیر پہلے اپنے ڈرائیور کو دیکھا تھا۔ جلالی جملہ پورا نہ کر سکا۔

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔ مجھے پتہ ہے تمہیں پیسوں سے محبت نہیں ہے۔ دولت ہے بھی کمینی چیز۔ لیکن کام بہت آتی ہے۔ یہ خیرات یا چوری کے پیسے نہیں ہیں۔ ان پر تمہارا پورا حق ہے۔ اٹھو اور شہزادوں کی طرح زندہ رہنا سیکھو۔ ہاں تمہیں اگر دوستوں کی ہمدردیوں کے سہارے رہنے اور غریب صحافی کا لیبل لگانے کی عادت ہو گئی ہے تو یہ لو۔" نواب ٹن نے جیب سے بینک ڈرافٹ نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ جلالی کچھ نہیں بولا۔ بس اسی طرح اسے دیکھتا رہا۔

"چلو پھر اٹھو۔ دیر مت کرو' ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔" نواب ٹن نے ڈرافٹ دوبارہ اپنی جیب میں رکھ لیا اور جلالی خاموشی سے موزے اور جوتے پہننے لگا۔ باہر سے بچوں کے شور مچانے کی آواز دوبارہ آنے لگی تھی۔ گاڑی انہیں سیر کرا کر واپس آ گئی تھی۔

جلالی کو ڈیفنس کے اپارٹمنٹ میں منتقل ہونے میں ایک مہینہ لگ گیا۔ اس عرصے میں اس نے اپنے اخبار کی نوکری چھوڑ دی تھی۔ نوکری چھوڑنے کا ارادہ نہیں تھا لیکن اس کے دفتر کے ساتھی اس کے ہاتھوں میں دبے ہوئے گولڈ لیف کے پیکٹ کو شبے کی نظروں سے دیکھنے لگے تھے۔ اس زمانے میں گولڈ لیف صرف تھانیداروں سے اچھے تعلقات رکھنے والے کرائم رپورٹر پیتے تھے۔ ایک دن ولز پینے والے اس کے ایڈیٹر نے بھی اس کے سگریٹوں کو گھور کر دیکھا تھا۔ "جہنم میں جاؤ۔" اس نے دل میں کہا تھا اور اسی وقت استعفیٰ دے کر چلا آیا تھا۔ اسے اپنے دولت مند بننے کی کہانی کا چرچا کرنے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ چند دنوں کی کوششوں کے بعد ایک انگریزی اخبار میں رپورٹر کی نوکری مل گئی تھی۔ اردو اخبار کی طرح انگریزی اخبار کے صحافی کا امیر

ہونا شک کی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔

جلالی کا اپارٹمنٹ بہت کشادہ تھا۔ سونے کے تین کمرے اور ایک بڑا سا ڈرائنگ روم۔ فرنیچر بہت سادہ تھا لیکن نواب ٹن کی دوست نے اپنے اعلیٰ ذوق کا مظاہرہ کر کے اسے بہت دیدہ زیب انداز میں سجایا تھا۔ نواب ٹن کے ذریعے ایک سیکنڈ ہینڈ گاڑی بھی خرید لی تھی۔ نواب ٹن کا ڈرائیور اسے ڈرائیونگ سکھانے کے لئے بل پارک کے پارکنگ لاٹ میں لے گیا تھا جو دوپہر کے وقت سنسان ہوتا تھا۔ جلالی نے بریک کی جگہ ایکسیلیٹر دبا دیا تھا۔ چبوترہ توڑ کر گاڑی کے اگلے دو پہئے پہاڑی کے کنارے پر لٹک گئے تھے۔ جلالی کو لگا تھا ڈھلان کے نیچے موت کھڑی اسے گھور رہی ہو۔ اس نے دوسرے ہی دن گاڑی بیچ دی اور پھر کبھی اسٹیرنگ کو ہاتھ نہیں لگایا۔

ایک بار گاؤں بھی ہو آیا تھا۔ اس کی بھتیجی عامرہ کی شادی تھی۔ وہ اعلیٰ تعلیم اور مصنفہ بننے کے خواب ادھورے چھوڑ کر برادری کے ایک لڑکے سے بیاہ کر کسی دوسرے گاؤں چلی گئی تھی۔ وداع ہوتے ہوئے سب سے زیادہ جلالی سے مل کر روئی تھی۔ جلالی کو پتہ تھا اپنے خوابوں کا ماتم کر رہی ہے۔ جلالی اپنی ماں کی قبر پر نہیں گیا تھا۔ قبر سے پھوٹتی ہوئی لونگ کی خوشبو سونگھتا تو پشیمانی کا احساس واپس آ جاتا۔

بشیر کی دکان پر پہنچا تو وقت کا پتہ ہی نہیں چلا۔ بشیر کی دکان پھیل کر جنرل اسٹور بن گئی تھی۔ دکان پر ایسا ہجوم تھا جیسے لنگر بٹ رہا ہو۔ بھیڑ میں رستہ بنا کر بشیر تک پہنچتے پہنچتے پانچ منٹ لگ گئے۔ بشیر نے اسے دیکھ کر ہمیشہ کی طرح "بابو جی" کہہ کر بڑی گرمجوشی سے خیریت پوچھی، میٹھے پان کی گلوری اپنے ہاتھ سے اس کے منہ میں رکھی، دو ملی گرام والے سلک کٹ کے دو پیلے پیکٹ اس کے حوالے کئے اور ایک بار پھر مشینی انداز میں پان پر کتھا چونا لگانے لگا۔ جلالی نے اپنے پیچھے کھڑے ہوئے مجمع کے دباؤ کے باوجود وہیں سگریٹ کا پیکٹ کھول کر سگریٹ سلگایا۔ اس نے پیسے دینے کی کوشش نہیں کی۔ بشیر نے ایک لمحے کے لئے کنکھیوں سے اسے دیکھا اور سمجھ گیا "بابو جی کے پاس آج بھی کرائے کے پیسے نہیں ہیں۔"

"بابو جی آپ کی چینج۔" اس نے دس دس کے کچھ نوٹ جلالی کو دیتے ہوئے کہا۔ اس نے آج بھی دوسرے گاہکوں کے سامنے جلالی کے خالی جیب والے سفید کپڑوں کا بھرم رکھ لیا تھا۔

"میں کل شام آؤں گا۔" جلالی نے پیسے لیتے ہوئے کہا اور ہجوم میں سے نکل کر نواب ٹن کے گھر جانے کے لئے ٹیکسی روکنے لگا۔

نواب ٹن

ذہین جلالی کی ٹیکسی نواب ٹن کی گلی میں داخل ہوئی تو اسے بڑی بڑی گاڑیوں کی ریل پیل نظر آئی۔ کلفٹن کے اس علاقے میں گاڑیوں کا آنا جانا کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ جلالی کو حیرت یہ تھی کہ گاڑیاں برابر والے بنگلے پر جا کر رک رہی تھیں۔ اس سے پہلے جلالی نے اس بنگلے میں کسی کو آتے جاتے نہیں دیکھا تھا۔ باہر سے ہمیشہ ویران نظر آتا تھا' ایسا جیسے کوئی رہتا ہی نہ ہو۔ لیکن آج گیٹ پر فوجی حلئے کے دو مسلح پہریدار موجود تھے جو ایک گاڑی سے اترنے والے کسی شخص کے اندر جانے کے لئے بڑا گیٹ کھول رہے تھے۔ جلالی کو جیل کا پھاٹک یاد آگیا۔ آمد و رفت کے لئے ایک چھوٹا دروازہ کھولا جاتا تھا جس سے آنے جانے والوں کو سر جھکا کر گزرنا پڑتا تھا۔ جیل سپرنٹنڈنٹ یا کسی دوسرے اعلیٰ افسر کے لئے بڑا آہنی پھاٹک کھولنا ضروری تھا۔ جیل کی حدود میں حکمرانی کرنے والے سر جھکا کر داخل نہیں ہو سکتے تھے۔ برابر کے بنگلے میں آنے والے مہمان بھی شاید اپنی حکمرانی کے علاقے میں داخل ہو رہے تھے۔ قد سے چھوٹے دروازے سے سر جھکا کر گزرنا ان کے لئے بھی ایک توہین

آمیز فعل تھا۔ یہ انگریز سرکار کا قانون تھا۔ وہ اسے توڑ نہیں سکتے تھے۔

گاڑی اپنے مسافر کو اتار کر آگے بڑھ گئی۔ اسی وقت ایک اور گاڑی گیٹ پر آ کر رکی جس سے بڑے ڈیل ڈول والا ایک شخص اترا۔ وہ بھی سر جھکائے بغیر بڑے گیٹ سے اندر چلا گیا۔ جلالی کو اس کی شکل جانی پہچانی لگی لیکن یاد نہیں آ رہا تھا کہ کہاں دیکھا تھا۔ جلالی ٹیکسی والے کو پیسے دینے میں جان بوجھ کر دیر کرنے لگا۔ اس کی رپورٹروں والی حس بیدار ہو گئی تھی۔ اسی وقت کالے رنگ کی ایک مرسیڈیز اس کے برابر سے گزر گئی۔ کار کے شیشے سیاہ تھے اس لئے وہ اندر بیٹھے ہوئے مسافروں کو نہیں دیکھ سکا۔ لیکن وہ کار سے اترے تو گیٹ پر لگی ہوئی بتیوں کی روشنی میں انکی شکلیں صاف نظر آ رہی تھیں۔ جلالی انہیں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ انہیں پہچانتا تھا۔ سیکریٹری دفاع قریشی اور اس کے ساتھ اس کا سسر اکبر خان تھا جس کی طاقت ریٹائر ہو کر اور بڑھ گئی تھی۔ آج کل وہ وزیراعظم کا انتظامی امور کا مشیر تھا۔ قریشی کا ٹریڈ مارک پائپ اس کے منہ میں دبا ہوا تھا۔ دونوں کسی طرف دیکھے بغیر کھلے ہوئے بڑے پھاٹک سے اندر چلے گئے۔ جلالی کو کراچی میں بیس اکیس سال پہلے کی وہ رات یاد آ گئی جب وہ قریشی سے پہلی بار ملا تھا۔ قریشی اس وقت سیکریٹری نہیں بنا تھا۔ لیکن اس کا سسر اس وقت بھی نوکر شاہی کا اتنا ہی طاقتور ستون تھا جتنا کہ آج! اس رات بھی قریشی اکبر خان کے ساتھ تھا لیکن جلالی اکبر خان سے نہیں مل سکا تھا۔ اکبر خان جن لوگوں کے درمیان بیٹھا تھا ان تک جلالی کی پہنچ نہیں تھی۔ وہ ایک شرمناک رات تھی۔ جلالی ہی نہیں قریشی کو بھی متلی ہونے لگی تھی۔ جلالی سر کو جھٹکا دینے لگا۔ وہ اس رات کو یاد کرنا نہیں چاہتا تھا۔

ایک پہرے دار جلالی کی ٹیکسی کی طرف شک کی نظر سے دیکھنے لگا۔ نواب ٹن کے بنگلے کے گیٹ پر لگے ہوئے بلب کی مدھم روشنی میں جلالی کو پہچاننا مشکل تھا لیکن پیلی ٹیکسی کا ہیولہ دور سے نظر آ رہا ہو گا۔ بندوق پر پہرے دار کی گرفت مضبوط ہو گئی اور وہ ٹیکسی کی طرف بڑھنے لگا۔ ٹیکسی ڈرائیور خوفزدہ ہو کر فوری کرایہ دینے کا مطالبہ کر رہا تھا۔

جلالی ڈرائیور کو پیسے دے کر نواب ٹن کا پھاٹک کھٹ کھٹانے لگا۔ گیٹ کا بغلی دروازہ ہمیشہ کھلا ہوتا تھا لیکن آج جانے کیوں اندر سے بند تھا۔ ٹیکسی والا گاڑی واپس موڑنے کے لئے سامنے سے آتی ہوئی ایک اور کار کے گزرنے کا انتظار کر رہا تھا۔ جلالی کی طرف آتے ہوئے پہرے دار کے قدم رک گئے لیکن اب وہ ٹیکسی کے بجائے جلالی کو گھور رہا تھا۔ نواب ٹن کے دربان نے اسی وقت چھوٹا دروازہ کھول کر جھانکا اور جلالی کو دیکھ کر اندر آنے کا راستہ دے دیا۔ وہ سر جھکا کر داخل ہوا تو اندر بھی برابر کے بنگلے کے باہر کھڑے ہوئے پہرے داروں کے سے حلیئے کا ایک شخص راستے میں حائل تھا۔

"یہ جلالی صاحب ہے۔ صاحب نے ان کے واسطے بول کر رکھا ہے۔" دربان نے کہا تو پہرے دار ایک طرف ہٹ گیا۔

"گل خان! آج کیا معاملہ ہے؟ یہ نیا پہرے دار کب سے آگیا؟ تمہارا صاحب کدھر ہے؟" جلالی نے چوکیدار سے پوچھا۔

"برابر میں کوئی دعوت ہے۔ بڑا بڑا صاحب لوگ آیا ہے۔ ہمارا اور برابر کا بنگلے کا دیوار ایک ہے۔ ان لوگوں نے صاحب سے پوچھ کر ایک باڈی گارڈ ادھر بھی ڈال دیا ہے۔" گل خان نے جو جلالی کے ساتھ اندر تک آیا تھا' جواب دیا۔

"لیکن نواب صاحب کدھر ہیں؟" جلالی نے پھر پوچھا۔

"پتہ نہیں صاحب۔ شاید کسی دوست کے ساتھ گیا ہو گا۔ آپ اندر بیٹھو میں دلاور کو آپ کے پاس بھیجتا ہوں۔"

گل خان یہ کہہ کر ڈرائنگ روم اور اس سے متصل کھانے کے کمرے کی طرف چلا گیا۔ کھانے کے کمرے کے ساتھ ہی بڑا باورچی خانہ تھا جہاں جلالی کو یقین تھا کہ دلاور بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا ہو گا۔ دلاور نواب ٹن کا گھریلو نوکر تھا۔ وہ نواب ٹن کا نگہبان' گھر کا محافظ' خانساماں' ساقی' سب کچھ تھا۔ شام میں اس کا زیادہ وقت باورچی خانے کے پھیرے کاٹنے میں گزرتا تھا اس لئے اس نے وہیں چھوٹا سا ٹی وی رکھ لیا تھا۔ جلالی اس کمرے میں چلا گیا جہاں نواب ٹن کا دربار سجتا تھا۔ نواب اسے رزم گاہ

کہتا تھا۔ اس رزم گاہ میں بیٹھنے کے لئے کوئی اونچا مقام، کرسی یا صوفہ نہیں تھا۔ سب زمین پر رکھے ہوئے گدوں، تکیوں، دری یا قالین پر بیٹھتے تھے۔ جلالی ایک تکئے سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گیا۔ کمرے میں سجے ہوئے نوادرات تنہائی میں اسے خوفزدہ کر رہے تھے۔ جلالی کو لگا جیسے وہ دشمنوں کے محاصرے میں قلعہ بند ہو کر بیٹھا ہوا ایسا بادشاہ ہو جس کی فوجیں اسے چھوڑ کر بھاگ گئی ہوں۔ شاید یہ ان کہانیوں کا اثر تھا جو رزم گاہ میں موجود نوادرات سے وابستہ تھیں۔

نواب ٹن کی رزم گاہ اچھا خاصا عجائب گھر تھی۔ جس دن کوئی نیا مہمان آتا یا درباریوں کی حاضری زیادہ ہوتی، نواب ٹن ان یادگاروں کے سنگ میل پھلانگتا ہوا تاریخ کے سفر پر نکل پڑتا۔ ہر یادگار سے ایک کہانی جڑی ہوئی تھی۔ کہانی کے بغیر کوئی چیز کتنی نادر کیوں نہ ہو، نواب کے لئے بیکار تھی۔ جلالی کو یقین تھا نواب نوادرات کے بہانے کہانیاں خریدتا تھا۔ اسے حیرت تھی نواب ٹن ایک دولتمند تاجر کیسے بن گیا تھا۔ اسے تو مورخ، محقق، شاعر اور اس کے نتیجے میں خراب حال ہونا چاہئے تھا۔

فرش پر گدیلی نشستوں کے ساتھ جو تکئے تھے ان پر سندھی کام کے بہت خوبصورت غلاف چڑھے ہوئے تھے۔ نواب ٹن کے بقول یہ غلاف صحرائے تھر کی کنواری لڑکیوں نے اپنے زانوؤں پر رکھ کر رات رات بھر چاند کی روشنی میں بیٹھ کر بنائے تھے۔ نواب کا دعویٰ تھا اس نے صحرائی رات میں چاندنی کا یہ حسن تھر جا کر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

"ان کی تو نظریں تک کنواری ہیں۔ پلکوں کے جھروکوں سے کسی کو جھانک کر نہیں دیکھتیں، بس نظروں کا سارا کمال ٹانکوں میں پرو دیتی ہیں۔ ہر ٹانکا پلک کے برابر ہے۔ ناپ کر دیکھ لو۔ جس کو یقین نہ ہو تھر جا کر پیمائش کر لے۔"

نواب ٹن کا چیلنج سن کر سب سیدھے ہو کر بیٹھ جاتے کہ کہیں پلک کا خمدار خنجر کسی کی کمر میں نہ چبھ جائے۔ نواب زیادہ پی کر نشے میں نہیں آتا، بس جذباتی ہو جاتا تھا۔ ایک رات جب پورا چاند تھا، وہ چاندنی رات کا مزا لینے تکیہ اٹھا کر چھت پر

لے گیا۔ واپس آیا تو رو رہا تھا۔

"ہر ٹانکے پر ایک ایک آنسو بیٹھا چمک رہا تھا۔" چاندنی رات نے جو بصیرت دی تھی اس پر تھر کی کنواریوں کو دیر تک اپنے اشکوں کا خراج دیتا رہا۔ اس رات نواب ٹن نے وہسکی میں پانی نہیں ملایا۔

"آج میرے بدن میں تھر کے صحرا کی خشکی سما گئی ہے۔" یہ کہہ کر اس نے خالص وہسکی سے جسم کو "ڈی ہائیڈریٹ" کرنا شروع کر دیا تھا۔

ایک کونے میں لکڑی کی تپائی پر نارووال کی بنی ہوئی چکنی مٹی کی ہانڈی سجی ہوئی تھی۔

"کیا یہ بھی کسی کنواری کمہارن نے اپنے زانوؤں پر رکھ کر بنائی تھی؟" چچا صدیقی نے ہنس کر پوچھا تو نواب ٹن کو غصہ آ گیا۔

"یہ کنواری مٹی کی ہانڈی ہے چچا کنواری مٹی کی۔ جاؤ مٹی میں نہا کر آؤ۔ کمہارن کی طرح تم بھی پارسا ہو جاؤ گے۔"

اس کے ساتھ ہی انہیں اپنی کمہارن محبوبہ یاد آ گئی۔ جام ڈبل ہو کر پٹیالہ ہو گیا اور نواب ٹن جذباتی۔ تاریخ اور ثقافت کا سفر اس روز وہیں تھم گیا تھا۔

مٹی کی ہانڈی کے ساتھ ایک تپائی پر اونٹ کی کھال کے رنگین شیڈ والا ایک قدیم ٹیبل لیمپ رکھا تھا۔ یہ لیمپ آج کل نواب ٹن کو شرمسار کرنے لگا تھا۔ لیمپ خرید کر نواب بہت خوش ہوا تھا۔ کسی نے یہ کہہ کر اسے بیچا تھا کہ اس کا شیڈ اس اونٹ کی کھال کا بنا ہوا ہے جس نے اپنے غیرتمند سوار کے ساتھ جان دے دی تھی۔ کوٹ ادو میں کوئی ایک سو برس پہلے مرزا جٹ کے خاندان کا ایک نوجوان "غیرت کا قتل" کر کے ملتان بھاگ گیا تھا۔ وہ مہینوں اس شہید اونٹ کی پیٹھ پر بیٹھا صحرا صحرا بھٹکتا پھرا اور پھر اسی صحرا نوردی میں بھوک پیاس کے ہاتھوں یا شاید کسی سانپ کے کاٹے سے اونٹ کے ساتھ خود بھی مر گیا تھا۔ نواب ٹن نے اس لیمپ کو بہت اونچا مقام دیا تھا۔ جب رزم گاہ کی ساری بتیاں بند کر کے لیمپ میں لگا ہوا سرخ بلب روشن کرتا تو اس کی آنکھوں میں خون اتر آتا۔ دل "غیرت کا قتل" کرنے پر اکساتا۔ لیکن

غیرت جگانے والا کوئی وسیلہ نہیں تھا۔
"سوچ رہا ہوں ایک نوجوان نوکرانی رکھ لوں۔ تم لوگ اس پر بری نگاہ ڈالو گے اور میرے ہاتھوں مارے جاؤ گے۔" یہ حل نوجوان نوکرانی رکھنے کی حد تک سب دوستوں کو پسند آیا تھا۔
نواب کو یقین تھا کہ اونٹ کا تعلق صاحباں کے خاندان سے ہو گا۔ ابھی یہ تحقیق مکمل نہیں ہوئی تھی کہ لیمپ نواب کی نظروں سے گر گیا۔ نوادرات بیچنے والے کسی دوسرے تاجر نے نواب ٹن کو بتایا تھا کہ لیمپ سے وابستہ یہ کہانی غلط تھی۔ اس نے ایک اور کہانی سنائی تھی جس کے مطابق وائسرائے ہند نے گیلانیوں' گردیزیوں' قریشیوں' لغاریوں اور دوسرے جاگیرداروں کو انگریز سرکار کی خدمت کرنے پر انعام و اکرام دینے کے لئے ملتان میں دربار لگایا تھا۔ اس موقع پر اونٹ کی کھال کا ایک نقشین ہیٹ وائسرائے کو پیش کیا گیا تھا جو بعد میں انگریز کے کانگریسی خانساماں نے چوری کر کے بیچ دیا تھا۔ کسی کاریگر نے ہیٹ کو لیمپ کے شیڈ میں بدل کر اس سے وہ کہانی جوڑ دی تھی۔
دونوں کہانیوں کی صداقت کے بارے میں سب کو شبہ تھا۔ لیکن نواب ٹن کے لئے لیمپ داغدار ہو چکا تھا۔ اسے سخت غصہ آیا تھا اور اس نے لیمپ کا برقی سلسلہ منقطع کر کے اسے تپائی سے اتار کر زمین پر رکھ دیا تھا۔ تپائی کا اونچا مقام زمین پر رکھی ہوئی مٹی کی ہانڈی کو مل گیا تھا۔ لیمپ پر جب بھی نظر پڑتی نواب کا خون کھولنے لگتا۔
"اٹھا کر پھینک کیوں نہیں دیتے؟" چچا صدیقی نے مشورہ دیا تھا۔
"کیسے پھینک دوں۔ اس لیمپ کی روشنی نے میری تاریخ کے ہر صفحے کو تاریک کر رکھا ہے۔ کس کس ورق کو نوچ کر پھینکوں۔ دو چار ورق باقی بچیں گے صرف دو چار ورق!"
نواب ٹن پر جب بھی شرمندگی کا دورہ پڑتا وہ لیمپ سے نگاہیں بلند کرتا اور دیوار پر ٹنگے ہوئے بلوچی خنجر پر نظریں جما کر اپنا احساسِ شرمندگی دور کرنے کی کوشش

کرتا۔ ڈیڑھ سو سال پہلے قاسو نامی ایک بلوچی نے اس خنجر سے اس انگریز کو قتل کر دیا تھا جو قلات میں بلوچوں کو آپس میں لڑانے کی سازش کر رہا تھا۔ ایک روز نواب کا کوئی دوست اپنے امریکی مہمان کو نواب کے نوادرات دکھانے لے آیا تھا۔ نواب نے اس خنجر کو ہاتھ تک نہیں لگایا تھا اور سارا وقت طاق میں رکھے ہوئے اس پیالے سے وابستہ کہانیاں سناتا رہا جس میں روایت کے مطابق شیر شاہ سوری قہوہ پیا کرتا تھا۔ یہ رنگین پیالہ جس میں لوہے کے بہت سے ٹانکے لگے ہوئے تھے پانچ سو سال پرانا تھا۔ کم از کم پیالہ بیچنے والے بڈھے افغان کا یہی دعویٰ تھا۔ افغان کے مطابق اس نے یہ پیالہ ایک کاریگر سے خریدا تھا جسے ٹکڑوں کی شکل میں یہ پیالہ ہوتی خاندان والوں نے جوڑنے کے لئے دیا تھا اور پھر لے جانا بھول گئے تھے۔ ہوتیوں کو یہ پیالہ ہندوستان پر حکمرانی کرنے والے انگریز افسروں میں سے کسی نے دیا تھا۔ ہوتیوں نے اس انگریز کو جو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے مجاہدین سے بچنے کے لئے چھپا چھپا پھر رہا تھا پناہ دی تھی۔ انگریز نے یہ پیالہ ایک خاندانی بٹلر سے لیا تھا جس کے آباؤ اجداد میں سے کوئی شیر شاہ سوری کا ملازم تھا جس نے یہ پیالہ شیر شاہ کے خیمے سے چرایا تھا۔ انگریز نے اپنی جان بچانے والے ہوتیوں کو پیالہ دے کر کہا تھا۔ "آج یہ امانت اس کے صحیح حقداروں کے پاس پہنچ گئی۔"

امریکی مہمان کے جانے کے بعد نواب ٹن نے اطمینان کا سانس لیا اور دیوار سے خنجر کو اتار کر اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔

"شیر شاہ کے اس پیالے نے آج پھر ایک انگریز کی جان بچالی۔" اس نے دوسرے ہاتھ سے پیالہ اٹھا کر انگلیوں پر گھماتے ہوئے کہا۔ "یہ نہ ہوتا تو قاسو کا خنجر آج ایک اور 'لبدین' کے سینے میں اتر جاتا۔"

اس کے بعد نواب ٹن کو اسی بات پر فخر ہونے لگا تھا کہ اس کے نوادرات کا ذخیرہ تاریخی طور پر کتنا متوازن ہے۔ کسی نے توجہ دلائی کہ غیر ملکی مہمان انگریز نہیں امریکی تھا۔

گوواں نہیں پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں

نواب نے مصرعہ پڑھ کر لاپرواہی سے سر ہلا دیا تھا۔

خنجر کے سر پر ایک زنگ آلود برہنہ تلوار لٹک رہی تھی جس سے پانی پت کی لڑائی میں احمد شاہ ابدالی کے ایک سپاہی نے کسی مرہٹہ سردار کا سر اڑا دیا تھا۔ ایک دوست کسی ہندو مہمان کو ساتھ لایا تو اس نے آتے ہی وضاحت کر دی یہ مرہٹہ نہیں ٹھٹھہ کے سندھی ہیں۔

"کوئی فرق نہیں پڑتا!" نواب نے یہ کہہ کر ایک خوبصورت سے چھینکے میں لٹکے ہوئے گوتم بدھ کے سر پر نظریں جما دی تھیں۔ دو ہزار سال پرانی یہ مورتی کسی نے ٹیکسلا کے میوزیم سے چرا کر نواب ٹن کو بیچی تھی۔ یہ مورتی چندرا نے نروان حاصل کرنے کی خاطر ۶۷ء میں ٹیکسلا کے ایک اسٹوپا میں چڑھائی تھی۔

"چندرا کے نام پر میں نے مرہٹوں کے سارے گناہ معاف کر دیئے ہیں۔" اس نے کہا تھا اور آثار قدیمہ کے کسی ایسے ماہر کا پتہ پوچھنے لگا تھا جو یہ کھوج لگا سکے کہ اس زمانے میں چندرا کی عمر کیا ہو گی۔ شکل و صورت کیسی ہو گی۔

"دو ہزار سال پرانی عورت کے خدو خال جان کر کیا کرو گے!" ایک دوست نے کہا تھا۔

"تم کیا جانو۔ کبھی عشق کے کیپسول میں بیٹھ کر دیکھو۔ ہزاروں برس کا سفر لمحوں میں طے ہو جاتا ہے۔ لمحوں میں۔" نواب ٹن نے سرد آہ بھر کر کہا۔ ویسے نواب ٹن کو گوتم بدھ سے سخت شکایت تھی۔

"عجیب سی میٹھی مسکراہٹ ہے۔ جب سے اس مسکراہٹ کو دیکھا ہے کسی دشمن سے نفرت کرنے کو دل ہی نہیں چاہتا۔"

نواب ٹن کی پنجہ آزمائی صرف تاریخ اور پرانی تہذیبوں سے نہیں تھی، اس کی رزم گاہ میں کھیلوں کے میدان کی وسعت بھی سمائی ہوئی تھی۔ ایک کونے میں لکڑی کے دو بھاری مگدر کھڑے تھے جنہیں رستم زماں گاما پہلوان سر کے گرد گھما کر اپنے بازوؤں کے پٹھے مضبوط کرتا تھا۔ ہر مگدر کے گلے میں باکسنگ کا ایک ایک دستانہ ہار کی طرح لٹکا ہوا تھا۔ یہ دستانے پہن کر محمد علی کلے نے سونی لسٹن کو شکست دی تھی۔

اسی طرف کرکٹ کے دو چھوٹے چھوٹے بلے لٹکے ہوئے تھے۔ ایک پر عمران خان کے اور دوسرے پر جاوید میانداد کے آٹو گراف تھے۔ دونوں نے یہ بلے نواب ٹن کو ذاتی طور پر دیئے تھے۔ کراچی میں فسادات بڑھ گئے تو دونوں بلوں کو اتار کر ایک ساتھ کھڑا کر دیا تھا۔ کہا تھا کہ قوم کو متحد کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ گو اس ٹوٹکے نے کام نہیں کیا تھا لیکن نواب ٹن مایوس نہیں ہوا تھا۔ کہتا تھا کبھی نہ کبھی بلوں کا یہ اتحاد کام دکھائے گا۔

ایک کونا ادبی تاریخ کا حصہ تھا۔ ایک سادہ سا دیہاتی حقہ جو علامہ اقبال کا خادم علی بخش پیا کرتا تھا اور جسے نواب ٹن نے بہت منت سماجت کر کے فقیر فیملی سے حاصل کیا تھا۔ کونے میں سجاوٹی چیزیں رکھنے والی میز پر شاعری کی تاریخ بھی تھی۔ وہ ٹوپی رکھی تھی جو سجانی بابونس نے "مرزا غالب بندر روڈ پر" کے کھیل میں مرزا غالب بن کر پہنی تھی۔ نواب ٹن کو اس بات کا بہت صدمہ تھا کہ اس کے پاس ایسی کوئی چیز نہیں تھی جس کا براہ راست غالب سے تعلق ہو۔ تلاش میں دہلی کا چکر لگایا تھا۔ گلی قاسم جان کے اس مکان تک بھی پہنچ گیا تھا جہاں غالب رہا کرتے تھے۔ وہاں ڈرائی کلینرز کی ایک دکان کھلی تھی۔ ایک آدمی سے جو کپڑوں پر استری کر رہا تھا پوچھا تھا۔

"کیا غالب کا مکان یہی ہے؟"

"کام کیا کرتا ہے؟" یہ جواب سن کر نواب ٹن مزید کچھ کہے سنے بغیر واپس چلا آیا تھا۔

کمرے میں چھوٹا سا ایک کلاک بھی رکھا تھا جس کی سوئیوں کی گردش کے ساتھ جوش ملیح آبادی اپنا پیمانہ بھروایا اور خالی کیا کرتے تھے۔ ساتھ میں کرسٹل کا ایک گلاس تھا جس میں نواب ٹن نے ایک بار فیض احمد فیض کو ڈرنک بنا کر دی تھی۔ اسی کے ساتھ ایک چھوٹا سا گلاس تھا جس میں پانی ڈال کر احمد فراز نے اپنے سگریٹوں کے فلٹر بھگوئے تھے۔

"تمہارے ادبی کونے میں کوئی نثر نگار نہیں ہے۔" جلالی نے شکایت کی تھی۔

"یار نثر نگاروں کا احترام کیا جاتا ہے ان سے شاعروں کی طرح پیار نہیں کیا

جاتا۔ شاعروں سے دل کا رشتہ ہوتا ہے۔ وہ ہماری محبتوں کے رازدار ہوتے ہیں۔ دل کی دھڑکنوں کو ان کے شعروں کی زبان ملتی ہے تو جذبے بالغ ہونے لگتے ہیں۔ کوئی پاس نہ ہو پھر بھی سامنے آ کھڑا ہوتا ہے۔ تم نے کبھی تجربہ کیا ہے؟" جلالی نے مسکرا کر نفی میں سر ہلایا تو نواب ٹن نے جھوم جھوم کر شعر پڑھنے شروع کر دیئے تھے۔ تیسری غزل اور چوتھے جام کے بعد آنکھیں بند ہونے لگیں تو جلالی کو جانے کا اشارہ کر دیا تھا۔

"بس اب چلے جاؤ۔ میرے گرد ہجوم اکٹھا ہو گیا ہے۔" جلالی ہنستا ہوا چلا گیا۔

اس وقت یہ سب کچھ سوچ کر جلالی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ لیکن نواب ٹن آج جانے کہاں چلا گیا تھا۔ وہ رات کو اپنے آستانے سے باہر نہیں نکلتا تھا۔ اور اگر کہیں چلا بھی گیا تو کسی نہ کسی کو وہاں ہونا تھا۔ جلالی کو یاد نہیں تھا کہ شام گئے یہ کمرہ اس نے کبھی خالی دیکھا ہو۔ کوئی اور نہیں چچا صدیق ضرور ہوتے۔ ان کا کوئی اور ٹھکانہ تھا بھی نہیں۔ چچا صدیق نے تین شادیاں کی تھیں۔ تینوں بیویاں زندہ تھیں لیکن وہ ہر شام نواب ٹن کی رزم گاہ میں بیٹھے اپنی تنہائی کا رونا روتے اور رات گئے اٹھ کر گھر جاتے۔ نواب ٹن کو وہ اپنی چوتھی بیوی کہتے تھے جس کے جواب میں نواب ٹن کہتا تھا۔

"مجھے اس لئے قبول ہے کہ اب تمہارے پاس ایک اور عورت کو شادی کے شر کا شکار کرنے کی شرعی گنجائش نہیں رہی۔"

خود نواب ٹن نے شادی نہیں کی تھی۔ کہتا تھا۔

"حاملہ بیوی کو الٹیاں کرتے نہیں دیکھ سکتا۔ میری حسن پرستی کا اسقاط ہو جائے گا۔ لب و رخسار کی ساری شاعری نالیوں میں بہہ جائے گی۔"

اسے بچہ ہونے کے انتظار میں زچہ خانے کے باہر ٹہلنا بھی پسند نہیں تھا۔

"ایک دن ٹہل لیا تو پھر عمر بھر ٹہلنا پڑے گا۔" اس نے جلالی کو بتایا تھا۔ "بچہ روئے گا، کبھی بیماری سے کبھی بھوک سے۔ میرے وجود کا ایک حصہ روئے گا تو

دوسرے حصے بھی آنسو بہائیں گے۔ مجھے اپنا رونا پسند نہیں ہے۔" جلالی کا خیال تھا کہ وہ دل کی کسی چوٹ کو چھپانے کے لئے فلسفہ بگھار رہا ہے۔ لیکن وہ خاموش رہا۔

"بچہ پیدا مت کرنا۔" چچا صدیقی نے جو چپ رہنا نہیں جانتے تھے' مسئلے کا آسان حل پیش کیا تھا۔

"تو پھر شادی کیوں کروں؟" نواب ٹن نے حیرت سے کہا۔ چچا صدیقی بھی جواب میں اسے حیرت سے دیکھنے لگے تھے۔

سوال یہ ہے کہ دلاور اب تک کیوں نہیں آیا۔ جلالی نے سوچا۔ اسے وہاں بیٹھے ہوئے دس منٹ سے زیادہ ہو گئے تھے۔ اسے خود اندر جا کر دیکھنا پڑے گا۔ باہر باغ میں جاکر اپنی رات کی رانی کو بھی سونگھ کر آئے گا۔ لیکن اسی وقت ہاتھوں میں ٹرے لئے دلاور کمرے میں داخل ہوا۔

"معاف کرنا جلالی صاحب۔ برف بنانے میں دیر ہو گئی۔" دلاور نے ٹرے اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ چھوٹی سی نقرئی بالٹی میں شیشے جیسی ایک ہی سائز کی برف کی ڈلیاں بھری ہوئی تھیں۔ ساتھ میں پانی کی بوتل اور شیشے کے دو گلاس تھے۔

"آج کل کیا چل رہا ہے۔ سیدھا سیدھا شیشے کا گلاس یا کچھ اور۔" جلالی نے پوچھا۔ رزم گاہ کے ظروف بھی نواب ٹن کے مزاج کے ساتھ بدلتے رہتے تھے۔

"آج کل کچھ نہیں چل رہا۔ صاحب نے بولا ہے سارے گلاس اور کٹورے پھینک دو' اب ڈائریکٹ بوتل سے چلے گی۔" دلاور نے ہنستے ہوئے کہا۔ جلالی بھی ہنسنے لگا۔ وہ کئی دن بعد آیا تھا۔ پچھلی بار آیا تھا تو چاندی کے کٹورے چل رہے تھے۔

"آج کل جگر مراد آبادی کو پڑھ رہا ہوں۔" نواب ٹن نے جلالی کو بتایا تھا۔ "مراد آبادی کٹورے کے ہر نقش میں جگر کا شعر کھدا ہوا نظر آتا ہے۔" اور پھر چچا صدیقی کو برے برے منہ بنا کر کٹورے سے پیتے ہوئے دیکھ کر کہا تھا۔ "اسی لئے شاعری کی نزاکتیں تمہاری سمجھ میں نہیں آتیں۔"

ہفتے کا ایک دن کشکول کے لئے وقف تھا۔ اس دن رستے میں جو پہلی بھکارن

ملتی اسے ہزار روپے دے کر اس کا کشکول خرید لیتا۔ نواب ٹن اس طرح معاشرے سے ادائیگی کا عدم توازن دور کر رہا تھا۔ بھیک مانگنے والی ایک غریب عورت زندگی کے سفر سے جو ٹھوکریں کھا رہی تھی وہ پیالے کے گڑھوں میں چھپی نظر آتیں۔ گڑھوں کو سہلاتے ہوئے کبھی کبھی آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے اور شراب میں مل کر نشہ اور بڑھا دیتے۔ دلاور المونیم کے گندے پیالے کو اچھی طرح مانجھ کر صاف کر کے پینے کے قابل بناتا لیکن اس میں شراب پیتے دیکھ کر چچا صدیقی کو ابکائیاں آنے لگتیں۔ جلالی کو شکایت تھی کہ نواب ٹن بھیک کا پیالہ صرف بھیک مانگنے والی عورتوں سے کیوں خریدتا ہے۔ اس کا خیال تھا وہ بھکاریوں سے امتیازی سلوک کر رہا ہے۔

"عدم توازن کا سب سے بڑا شکار عورت ہے۔" نواب ٹن حقوق نسواں کا مبلغ بن کر کہتا۔ "اس کی کہانی جھوٹی ہو یا سچی' مظلوم ہونے کے لئے اس کا عورت ہونا کافی ہے۔"

چچا صدیقی کے لئے سب سے مشکل زمانہ وہ ہوتا جب نواب ٹن پر مٹی کے برتنوں کا دورہ پڑتا تھا۔ کسی اور نسل کے ظروف کا کمرے میں آنا ممنوع ہو جاتا۔ چچا صدیقی کو مٹی کے چھلیے ہوئے پیالے میں پینا سخت ناپسند تھا۔ اس کا خیال تھا مٹی میں مل کر "شی واز" جنس تبدیل کر کے "ہی واز" ہو جاتا ہے۔ جلالی کو معلوم تھا مٹی کے برتنوں کے پیچھے گجرات کی کسی کمہارن کا قصہ ہے۔ لیکن پوری کہانی کبھی نہیں سنی تھی۔ ایک روز مٹی کے گہرے پیالے نے رقت بڑھا دی تھی۔

"یہ میری زندگی کا واحد ناکام عشق تھا۔" نواب ٹن نے پیالے میں صہبا اور لہجے میں اداسی بھرتے ہوئے بتانا شروع کیا تھا۔

"ایک جرمن سیاح میرے ایک دوست کا حوالہ لے کر پاکستان آئی تھی۔ وہ پاکستان کے دیہات دیکھنا چاہتی تھی۔ میں اسے پنجاب کا گاؤں دکھانے گجرات لے گیا۔ میرے ایک زمیندار دوست کی گاؤں کی حویلی خالی تھی جس میں ہمارے رہنے کا انتظام ہو گیا تھا۔" نواب نے گھونٹ لینے کے لئے وقفہ لیا۔

"سنا ہے جرمن عورت بستر میں ہٹلر ہو جاتی ہے۔" چچا صدیقی نے وقفے کا

فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"یار تمہارے بستر میں تو چیونٹی بھی جا کر ہٹلر ہو جاتی ہے۔ چچا تم بیچ میں مت ٹوکا کرو۔ سارا مزا خراب کر دیتے ہو۔" نواب ٹن نے غصے سے کہا۔ چچا صدیقی سہم کر خاموش ہو گئے۔ نواب ٹن نے موڈ ٹھیک کرنے کے لئے دو تین گہرے گھونٹ لینے کے بعد کہانی پھر شروع کی۔

"ایک دن ہم جی ٹی روڈ پر پنکھوں کی دکانوں کی ہوا کھا رہے تھے کہ میری جرمن دوست مٹی کے برتن دیکھ کر ان پر ریجھ گئی۔ اگلے کئی دنوں تک وہ مٹی کے برتنوں میں اور میں برتن بنانے والی کمہارن پر متوجہ رہا۔ کمال کی چیز تھی۔ گہرا تانبے کا سا رنگ، ناک میں سونے کی بڑی سی کیل، اپنے جسم کے ابھاروں سے بے نیاز۔ تیزی سے گھومتی ہوئی کیل پر برتن تراشتے ہوئے اس کے ہاتھوں کو دیکھتا تو مجھے ڈر لگتا کہ کہیں یہ بھی مٹی میں تحلیل نہ ہو جائیں۔ میں اسے تکتا رہتا پھر بھی اس کے رخساروں پر کوئی نیا رنگ نہیں چمکتا تھا، بس دائیں بائیں حرکت کرتا ہوا اس کا چہرہ گھومتے ہوئے برتنوں کو شکل نکالتے ہوئے دیکھتا رہتا۔ شاید خود اسے بھی کسی نے مٹی کے برتن کی طرح کیل پر گھما گھما کر بنایا اور ہاتھوں کی جنبشوں سے اس کے بدن کے نشیب و فراز سجائے تھے۔"

نواب ٹن کی سوچوں میں شاید وہ نشیب و فراز سما گئے تھے اور اس نے خاموش ہو کر پیالہ منہ سے لگا لیا تھا۔ چچا صدیقی خاموش تھے۔ ان کی نگاہوں میں شاید کمہارن کا سراپا ابھرنے لگا تھا اس لئے ان کا منہ خفیف سا کھل گیا تھا۔ نواب نے پیالہ رکھ کر کہانی دوبارہ شروع کر دی۔

"جرمن لڑکی کی فرمائش پر ایک شام وہ مٹی کا ایک نیا برتن بنا کر ہمارے مکان پر لے کر آئی۔ اس کے بعد ہر شام کوئی نہ کوئی نیا برتن لے کر آتی اور دیر تک بیٹھی قصے کہانیاں سناتی۔ ہمارے کہنے پر بھی وہ اوپر مونڈھے پر نہیں بیٹھتی تھی۔ دیوار سے ٹیک لگا کر زمین پر بیٹھی مسلسل باتیں کئے جاتی۔ اس کی زبان نے تھکنا نہیں سیکھا تھا۔ جرمن لڑکی بھی اس کے گلے میں ہاتھ ڈال کر اس کے ساتھ بیٹھ جاتی۔ ان کے

سامنے بڑی سی کرسی پر بیٹھا ہوا میں سچ مچ کوئی نواب بن جاتا جس کی کنیزیں خدمت کے لئے اس کے قدموں میں بیٹھی ہوں۔ میرا دل سفیدی اور سیاہی کے درمیان پنگ پانگ کھیلتا رہتا۔ لیکن ایک شام میرا دل ایک جگہ اٹک کر رہ گیا۔ وہ کوئی دلچسپ کتھا سنا رہی تھی۔ میں اسے دیکھتا ہوا جرمن لڑکی کے لئے ترجمانی کرنا بھول گیا۔ دل نے زور زور سے دھڑک کر عشق میں مبتلا ہونے کا اعلان کر دیا تھا۔"

"کیا وہ اس وقت تک کنواری تھی؟" چچا صدیقی سے رہا نہیں گیا۔

"کنواریوں سے زیادہ کنواری۔" نواب ٹن نے تیز نظروں سے چچا صدیقی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس گاؤں میں اس کا کوئی نہیں تھا۔ وہ کسی دوسرے گاؤں سے شادی کے بعد ادھر آئی تھی۔ اس کا شوہر ایک بیٹے کو چھوڑ کر وبائی بخار کا شکار ہو کر مر گیا تھا۔ بیٹے کو اس کا چچا یہ کہہ کر لاہور لے گیا تھا کہ پڑھا لکھا کر بابو بنائے گا۔ میں نے اس سے بہت کہا کہ میرے ساتھ کراچی چلے۔ میں اسے مٹی کے برتنوں کی دکان کھلوا دوں گا۔ رہنے کے لئے مکان خرید کر دوں گا۔ شادی کرا دوں گا۔ اس نے انکار کر دیا۔ وہ اس گاؤں کو چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتی تھی۔ وہ کہتی تھی کہ اس کا بیٹا جب بابو بن کر آئے گا تو اسے کہاں ڈھونڈے گا۔ گاؤں والے بتائیں گے کہ وہ شہر بھاگ گئی ہے تو ٹوٹ کر مٹی کا ٹھیکرا ہو جائے گا۔"

"میری جرمن دوست کو پشاور جا کر کے ٹو کی چڑھائی کرنے والے جرمن سیاحوں کی ٹیم میں شامل ہونا تھا۔ میں نے اس کے جانے کا بندوبست کر دیا لیکن خود وہیں رہ گیا۔ میری سوہنی پہلے کی طرح ہر شام کوئی نہ کوئی نیا برتن لے کر میرے پاس آتی اور گھنٹوں بیٹھی نئی نئی کہانیاں سناتی اور چلی جاتی۔ مجھے لگتا جیسے دل بھی عشق کی آنچ پا کر کورا برتن بن گیا ہو۔ میری نیند گہری اور خواب زیادہ چمکدار ہو گئے تھے۔

"ایک شام طوفانی بارش تھی۔ اس روز حویلی کے نوکر شہر گئے ہوئے تھے اور شدید بارش کی وجہ سے وہیں رک گئے تھے۔ کھیتوں کے بیچ اکیلے مکان میں بادلوں کی گرج اور بارش کے شور میں تنہا شراب پینا ایک دلچسپ تجربہ تھا۔ زندگی کا مزا آ گیا تھا۔ مجھے یقین تھا آج وہ نہیں آئے گی۔ لیکن وہ بارش میں کانپتی ہوئی کسی نہ کسی

طرح پہنچ گئی۔ وہ اس روز میرے لئے مٹی کی ایش ٹرے بنا کر لائی تھی جو اس نے بہت احتیاط سے پلو میں لپیٹ رکھی تھی۔ جب اس نے ایش ٹرے نکال کر مجھے دی تو اس کی کانپتی انگلیاں میری انگلیوں سے چھو گئیں۔ میں نے پہلی بار اس کے رخسار کا رنگ بدلا ہوا دیکھا۔ وہ اسی طرح بھیگے بدن اور بھیگے کپڑوں کے ساتھ دیوار سے ٹیک لگا کر زمین پر بیٹھ گئی۔ میں نے اس سے بہت کہا کہ وہ اندر جا کر کپڑے بدل لے لیکن اس نے منع کر دیا۔ اس نے کہا وہ بارش کا زور کم ہوتے ہی چلی جائے گی۔"

"چلی جائے گی؟" چچا صدیقی چلائے۔ اس کے لہجے میں مایوسی تھی۔ جیسے کوئی کہانی کلائمکس تک پہنچنے سے پہلے ختم ہو گئی ہو۔ لیکن نواب ٹن نے جیسے کچھ سنا ہی نہیں تھا۔

"وہ روزانہ کی طرح تیز تیز بولنے لگی۔ وہ علاقے میں آنے والے پچھلے سیلاب کی کہانیاں سنا رہی تھی۔ میں اسی طرح خاموشی سے بیٹھا اسے تک رہا تھا۔ وہ کچھ ہی دیر میں کہانی مختصر کر کے خاموش ہو گئی۔ وہ پہلے کبھی اس طرح خاموش نہیں بیٹھی تھی۔ اب وہ مجھے تک رہی تھی اور میں نظریں چرا رہا تھا۔ بجلی زور سے چمکی، ساتھ ہی کمرے میں جلتے ہوئے لیمپ کا شعلہ بھڑکنے لگا۔ مجھے لگا جیسے وہ سردی سے کانپ رہی ہو۔ میں نے ایک بار پھر اس سے کہا کہ بارش ابھی نہیں تھمے گی، وہ بھیگے کپڑے اتار کر کرتا شلوار پہن لے۔ اس بار اس نے منع نہیں کیا۔ لیکن کپڑے بدلنے اندر نہیں گئی بلکہ اس پلنگ کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی جس پر میرا بستر بچھا تھا۔ اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور پھر خاموشی سے اپنے گیلے کپڑے اتار کر بستر میں گھس گئی۔ میں اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ چادر کے نیچے چھپے ہوئے ننگے بدن کے اتار چڑھاؤ میری آنکھوں میں چبھنے لگے۔ وہ اسی طرح لیٹے لیٹے مجھے دیکھتی رہی۔ مجھ میں کوئی حرکت نہ پا کر اس نے بڑی سی انگڑائی لی اور کہنے لگی "اب شرماتا کیوں ہے، آ جا اپنا شوق پورا کر لے!" نشہ تھا یا برسات، یا دعوت اتنی ظالم تھی کہ میں سحرزدہ ہو گیا اور وہ سب کچھ ہو گیا جو نہیں ہونا تھا۔" نواب ٹن خاموش ہو گیا تھا۔

"لیکن ہوا کیا؟" چچا صدیقی نے جنہیں شاید بیان نامکمل رہ جانے سے مایوسی

ہوئی تھی پوچھا۔

"وہی جو تم سے نہیں ہوتا۔" نواب ٹن نے چچا صدیقی کو غصے سے گھورتے ہوئے کہا تو چچا صدیقی جھینپ کر ہنسنے لگا۔ لیکن نواب ٹن کی سنجیدگی میں فرق نہیں آیا تھا۔

"میرے عشق کی آبروریزی ہو گئی تھی۔ میں لٹ گیا تھا۔" اس نے تاسف بھرے لہجے میں کہنا شروع کیا۔ "مجھے عشق کی ہلکی ہلکی آنچ میں سلگنا اچھا لگتا ہے۔ میں نے سوچا تھا اس کی میٹھی میٹھی یاد اور اس کے دیئے ہوئے برتنوں کو لے کر واپس آؤں گا اور رزم گاہ کے برابر میں ایک کمہار خانہ بنا کر اس میں اپنی محبت کا تاج محل سجاؤں گا۔ جدائی کی آگ میں سلگ کر کبھی کبھی اس کے گاؤں جایا کروں گا' اسے برتن بناتا دیکھوں گا' نئے برتن اور جدائی کے نئے دکھ سمیٹ کر واپس آؤں گا اور میرا عشق کبھی نہ بجھنے والے شعلے کی طرح تابد جلتا رہے گا۔ لیکن اس رات اس نے میرا سب کچھ لوٹ لیا تھا مجھے برباد کر دیا تھا۔ دوسری صبح وہ میرے اٹھنے سے پہلے اٹھ کر چلی گئی تھی۔ میں نے غصے میں اس کا لایا ہوا ایک ایک برتن توڑ دیا اور اسی دن واپس کراچی آ گیا۔"

نواب ٹن خاموش ہوا تو چچا صدیقی نے کچھ بولنا چاہا لیکن نواب ٹن نے ہاتھ اٹھا کر خاموش کر دیا اور اٹھ کر کونے میں رکھے ہوئے آڈیو سسٹم کو آن کرنے لگا۔ تھوڑی دیر میں اداس سروں میں بجتی ہوئی بانسری کی آواز نے کمرے کو بھر دیا تھا۔

دلاور گلاس میں برف ڈالنے لگا۔ لیکن جلالی نے روک دیا۔

"نہیں رہنے دو' میں نواب صاحب کا انتظار کروں گا۔" جلالی نے پلیٹ میں رکھے ہوئے مونگ پھلی کے دانے پھانکتے ہوئے سوچا دلاور کو کریدا جائے۔ اسے پتہ ہو گا برابر کے بنگلے میں کیا ہو رہا ہے۔

"دلاور تمہارے پڑوس میں بڑی رونق ہو رہی ہے۔"

"مہینے کی ہر آخری جمعرات ہوتی ہے۔" دلاور نے برا سا منہ بنا کر کہا۔ "آپ

جمعرات کو آتے نہیں ہو اس لئے آپ کو نہیں معلوم۔"

دلاور صحیح کہہ رہا تھا۔ جلالی کے لئے جمعرات کی رات کلب میں تاش کھیلنے کے لئے وقف تھی۔ آج بھی اگر پیسے ختم نہ ہو جاتے یا اسے ادھار دینے والا بیرا امیر خان چھٹی پر نہ ہوتا تو جلالی ابھی تک وہیں موجود ہوتا۔

"کیا تمہارا صاحب بھی ادھر ہی گیا ہے؟" جلالی نے پوچھا۔

"نہیں صاحب۔ لیکن نواب صاحب ہمیشہ کدھر چلا جاتا ہے' سب کو پتہ ہے اس لئے آج کے دن کوئی نہیں آتا۔" دلاور نے کہا اور پھر باہر جاتے ہوئے کہنے لگا۔ "آپ کو کچھ اور تو نہیں چاہئے مجھے کچھ دیر کے لئے باہر جانا ہے۔"

"نہیں کچھ نہیں تم جاؤ۔" دلاور اپنے پیچھے کمرے کا دروازہ بند کر کے چلا گیا اور جلالی کی نگاہوں میں ایک بار پھر سگار اور پائپ پیتے سفید بالوں اور گنجے سروں والے گھومنے لگے جو لمبی لمبی سیاہ کاروں سے اتر کر برابر کے بنگلے میں داخل ہوئے تھے۔ لیکن پھر اس نے اپنا جام بنا کر ایک بڑا سا گھونٹ لیا اور اپنے اعصاب کو آزاد چھوڑ دیا۔ وہ یہ سوچ کر مطمئن ہو گیا تھا کہ نواب ٹن آ جائے تو اس سے پوچھے گا۔ اسے سب پتہ ہو گا۔ نواب ٹن بھی کسی صحافی کی طرح خبر کو سونگھ لیتا تھا۔ وہ خبر کا ذریعہ بن کر ہی جلالی کا دوست بنا تھا۔

نواب ٹن کے سر پر اس وقت تک دولت کا ہما نہیں بیٹھا تھا۔ اس زمانے میں جو اس کے مطابق قبل مسیح کا دور تھا وہ انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل میں بینکویٹ منیجر تھا۔ جلالی نیا نیا رپورٹر بنا تھا۔ نئے سال کی رات تھی اور چیف رپورٹر نے جو خود بھی جشن منانے جا رہا تھا' جلالی کی ڈیوٹی ہوٹلوں کا چکر لگا کر خبر تلاش کرنے پر لگا دی تھی۔ ہر بڑے ہوٹل اور نائٹ کلب میں رات ناچ رہی تھی لیکن انٹرکان پہنچا تو وہاں بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ ایک بلوچ سردار کا بیٹا اور اس کے ساتھی اسٹین گنیں لئے ہوئے اپنے کسی دشمن سردار کے بیٹے کی تلاش میں ہوٹل کی راہداریوں میں دوڑ رہے تھے۔ دوسروں کی طرح جلالی بھی سہم کر ہوٹل کی دیوار سے چپک گیا۔ ہنگامہ ختم ہوا تو اس

نے ہوٹل کے ملازمین سے ہنگامے کی وجہ جاننے کی کوشش کی لیکن سب نے اپنے ہونٹوں پر زنجیر کھینچ لی تھی۔ ایسے میں نواب ٹن نے اس کی مدد کی۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے دفتر میں لے گیا۔ سردار کے اس بیٹے کو جس کی جان کو خطرہ تھا پچھلے دروازے سے فرار کرانے کا انتظام نواب ٹن نے ہی کیا تھا لیکن چہرے پر ایسی بے خوفی اور ایسا اطمینان تھا جیسے کسی عام مہمان کو خدا حافظ کہہ کر آیا ہو۔ اس نے جلالی کو نام اور واقعات بتائے، خبر لکھوانے کے لئے دفتر فون کرنے کی اجازت دی اور گرم گرم کافی پلوائی۔ دوسرے دن یہ خبر جلالی کے اخبار کے علاوہ کسی اور اخبار میں نہیں تھی۔ ایڈیٹر اور چیف رپورٹر دونوں نے اس کی پیٹھ ٹھونکی۔ دوسرے اخباروں کے رپورٹروں کی جواب طلبیاں ہوئی تھیں۔

اس کے بعد وہ جلالی کے لئے خبروں کا ایک مستقل ذریعہ بن گیا۔ جلالی باقاعدگی سے انٹرکان کے پھیرے لگانے لگا۔ لیکن ایک دن وہاں گیا تو نواب ٹن غائب تھا۔ وہ ہوٹل کی ملازمت چھوڑ گیا تھا۔ جلالی کے پاس اس کا کوئی اور رابطہ نہیں تھا۔ وہ بحرانوں کا زمانہ تھا۔ ایک مضبوط حکومت ٹوٹی تھی اور ایک حکوت مضبوط ہو کر کمزور ہونے لگی تھی۔ سڑکوں کے ہنگاموں اور سیاست کی قلابازیوں میں چکراتا ہوا جلالی نواب ٹن کو پرانی خبر کی طرح بھول گیا تھا۔ لیکن ایک دن نواب ٹن اچانک تازہ خبر بن کر نمودار ہوا۔ جلالی ہمیشہ کی طرح دفتر میں بیٹھا خبروں سے کشتی لڑ رہا تھا۔

"جلالی صاحب! نیچے کوئی بڑی سی گاڑی میں آپ سے ملنے آیا ہے، آپ کو نیچے بلایا ہے۔" دفتر کے چپراسی نے بتایا۔

"کوئی خبر لے کر آیا ہو گا، جا کر لے لو۔ میرے پاس نیچے جانے کا ٹائم نہیں ہے۔" جلالی نے کہا اور فون کا نمبر گھمانے لگا۔ جلالی کو یقین تھا ملکہ کوہستانی کا شوہر ہو گا اور اپنی بیوی کا بیان لے کر آیا ہو گا۔ ملکہ کوہستانی کو اخبار میں اپنا نام چھپوانے کا مرض تھا۔ جلالی کو کئی بار گھر آنے کی دعوت دے کر پراسرار طور پر مسکرائی تھی۔ لیکن آج جلالی کے پاس کوہ پیمائی کا وقت نہیں تھا۔ چوٹی کے سیاستدانوں نے اپنے خفیہ اجلاس میں کوئی نیا اتحاد بنایا تھا۔ چیف رپورٹر چھٹی پر تھا اور خبر تلاش کرنے کی ذمے

داری جلالی کے سر پر آ پڑی تھی۔ سب مہر بہ لب تھے۔ کہیں سے کوئی تصدیق ہو رہی تھی نہ تفصیل مل رہی تھی۔ اگر اسے خبر نہیں ملی یا خبر کہیں اور چھپ گئی تو وہ بڑی خبر کے پہلے امتحان میں ہی ناکام ہو جائے گا۔ اس کی انگلیاں پھر تیزی سے نمبر گھمانے لگیں۔

"صاحب' وہ خبر والا نہیں ہے' کوئی جنرل ہے۔ فوج کا جنرل۔" چپراسی نے کہا جو اسی طرح جلالی کے سر پر کھڑا تھا۔

"پاگل ہو گیا ہے کیا! فوج کے جنرل اخبار کے دفتر میں نہیں آیا کرتے' جس سے کام ہوتا ہے اس کی زنجیر پکڑ کر کھینچ لیتے ہیں۔ نام کیا بتایا ہے؟"

"جنرل ٹن!" چپراسی نے برا سا منہ بنا کر جواب دیا۔

"جنرل ٹن؟" جلالی نے حیرت سے کہا لیکن پھر فوراً ہی ریسیور پٹخ کر کھڑا ہو گیا۔ "پہلے کیوں نہیں بتایا تھا۔" وہ سمجھ گیا کون ہو گا۔ ابھی نوابوں کا دور پلٹ کر نہیں آیا تھا اور عرفیت کے لئے فوجی عہدے استعمال کئے جاتے تھے۔ انٹرکان کی نوکری کے زمانے میں وہ کرنل ٹن کہلاتا تھا۔ خود کو ترقی دے کر شاید جنرل بنا لیا ہو گا۔ فوجی خطابات اس نے مارشل لاء ختم ہونے کے بعد ترک کئے تھے اور نواب ٹن کہلانے لگا تھا۔

جلالی نیچے پہنچا تو نواب ٹن گاڑی سے اتر کر گیٹ پر کھڑے ہوئے چوکیدار کے بال بچوں کی خیریت پوچھ رہا تھا۔

"یار تمہارے دفتر والے بہت ظالم ہیں۔" نواب ٹن جلالی کو گلے لگاتے ہوئے خیریت پوچھے بغیر کہنے لگا۔ "ارمان گل کے نو بچے ہیں اور تم اسے صرف ڈیڑھ سو روپے تنخواہ دیتے ہو۔"

"ارمان گل اس دفتر کا سب سے امیر آدمی ہے۔ مہینے کے آخر میں سب اس سے ادھار لیتے ہیں۔ اس کا سب سے چھوٹا بیٹا تک کماؤ ہے اور منڈی میں ٹوکریاں ڈھوتا ہے۔" جلالی نے چوکیدار کو دیکھتے ہوئے کہا جس نے اپنے دانت نکال دیئے تھے۔

''نوکریاں نہیں ڈھوئے گا تو کھائے گا کہاں سے۔ اس کا ایک بیٹا بے روزگار ہے۔ میں نے اسے اپنے مکان پر بلا لیا ہے' مجھے گھر کے کام کے لئے ایک بھروسے کے آدمی کی ضرورت ہے۔'' نواب ٹن نے اس طرح کہا جیسے جلالی سے سفارش طلب کر رہا ہو۔

''بھروسے کا آدمی؟'' جلالی نے حیرت سے دہرایا۔ ارمان گل اسے چند منٹ پہلے ملا تھا' اس کے بیٹے کو اس نے دیکھا بھی نہیں تھا لیکن وہ بھروسے کا آدمی ہو گیا تھا۔

نواب ٹن کا یقین غلط نہیں تھا۔ دلاور کو نواب ٹن کے پاس کام کرتے ہوئے بیس سال سے زیادہ ہو گئے تھے۔ وہ آج بھی اس کا سب سے بھروسے کا آدمی تھا۔

''تم بتاؤ' تم کیسے صحافی ہو جو دفتر میں بیٹھے ہو؟ تمہیں پتہ ہے شہر میں کیا ہو رہا ہے؟'' نواب ٹن نے اپنا اور گفتگو کا رخ ارمان گل کی طرف سے موڑتے ہوئے کہا اور جلالی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ٹہلتا ہوا دفتر کے ساتھ والی فٹ پاتھ کے سنسان حصے کی طرف چلنے لگا۔

''آپ بتائیں کیا ہو رہا ہے۔ آپ تو اچانک غائب ہو گئے تھے۔'' جلالی نے پوچھا۔

''یہی بتانے آیا ہوں۔'' اس نے کچھ سوچ کر کہا اور پھر جلالی کے کانوں میں رس گھولنا شروع کر دیا۔ جلالی جس خبر کی تلاش میں سرگرداں تھا' جس کا کوئی سرا نہیں مل رہا تھا' نواب ٹن اس کی ایک ایک تفصیل سنا رہا تھا۔ کون کون اجلاس میں تھا' اجلاس کہاں ہوا تھا' کیا فیصلے ہوئے' آئندہ کیا ہو گا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ خود اجلاس میں موجود رہا ہو' سیدھا وہیں سے آ رہا ہو۔ جلالی کا اندرونی جوش چہرے پر آ گیا۔ پورے جسم پر عجیب سی سنسنی دوڑنے لگی تھی۔

''آئی لو یو ارجنٹینا! I Love You Argentina'' جلالی نواب ٹن کے گال پر بوسہ دیتے ہوئے گنگنایا۔

''میں نے اپنا وعدہ نبھا دیا ہے!'' نواب ٹن اپنا دوسرا گال پیش کرتے ہوئے

کہنے لگا۔

''جلدی سے خبر دے کر آؤ' تمہیں اپنا نیا ہیڈ کوارٹر بھی دکھانا ہے۔''

''لیکن.....'' جلالی نے ذرا تذبذب سے کہا ''مجھے دیر لگے گی' بہت سے فون کرنے ہیں' خبر کی تصدیق کروں گا' پکا کروں گا' ردعمل اکٹھا کروں گا' بہت رات ہو جائے گی۔''

''میری دی ہوئی خبر کی تصدیق کرو گے؟''

نواب ٹن نے اس طرح کہا جیسے دھمکی دے رہا ہو۔ وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ ہونٹوں کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ چہرے سے جیسے نقاب اتر گیا۔ وہ اب ایک بالکل مختلف چہرہ تھا۔

''نہیں میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ میں.......'' جلالی نے کچھ کہنا چاہا لیکن نواب ٹن نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔

''میں صرف بھروسے کا کاروبار کرتا ہوں۔ میں نے تو کبھی اپنے آپ کو بھی دھوکہ نہیں دیا۔ آؤ واپس چلیں۔'' نواب ٹن نے واپس دفتر کے گیٹ کی طرف چلتے ہوئے کہا جہاں اس کی گاڑی کھڑی تھی۔

''آپ ناراض نہ ہوں۔ واپس بھی مت جائیے گا۔ میں خبر اور اس کے ساتھ دو چار لوگوں کے ردعمل دے کر ابھی آتا ہوں۔''

جلالی دل ہی دل میں شرمندہ ہو رہا تھا۔ نواب ٹن کی دی ہوئی خبر کبھی غلط نہیں نکلی تھی۔ نواب ٹن چلتے چلتے رک گیا۔ اس کی مسکراہٹ واپس آ گئی۔ چہرے پر نقاب دوبارہ چڑھ گیا۔

''تم ایک بہت قیمتی اثاثہ ہو۔ میں تمہارا اعتبار کم کرنے نہیں بڑھانے آیا تھا۔ میرا کہا ہوا ہر لفظ صحیح ہے۔ پورے یقین سے خبر بنا کر آؤ۔ ردعمل اکٹھا کرنے کی کوشش کرو گے تو خبر تمہاری نہیں رہے گی۔ باہر نکل جائے گی۔''

جلالی کو معلوم تھا نواب ٹن ٹھیک کہہ رہا تھا۔ سیاستدانوں کے اپنے اپنے چہیتے صحافی تھے۔ جلالی کو پوچھنے سے پہلے کچھ بتانا پڑتا جس کے بعد خبر اس کی تنہا ملکیت

نہیں رہتی۔ وہ سر ہلاتا ہوا تیزی سے سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر چلا گیا۔

خبر لکھ کر ایڈیٹر کو دی تو ایڈیٹر کھڑا ہو گیا۔

"کیا تمہیں یقین ہے۔" ایڈیٹر نے جو ہمیشہ کا اعصابی مریض تھا' اپنے رعشہ زدہ ہاتھ میں خبر تھام کر سگریٹ کے لگاتار کش لیتے ہوئے پوچھا۔

"سو فیصد!" جلالی کہنے لگا۔ "ایک حرف بھی غلط ہوا تو میں دفتر نہیں آؤں گا' استعفیٰ بھجوا دوں گا۔" یہ کہہ کر وہ ایڈیٹر کے کمرے سے نکل گیا اور باہر جانے کے لئے سیڑھیاں اترنے لگا۔ بھروسے کے کاروبار میں وہ بھی آنکھیں بند کر کے کود گیا تھا۔

دوسرے دن ذہین جلالی کے نام سے چھپنے والی خبر نے ایک بار پھر دوسرے اخباروں کے رپورٹروں کی جواب طلبیاں کروائی تھیں۔ بازار صحافت میں جلالی کا بھاؤ ایک ہی دن میں کئی سالوں کی جست لگا گیا تھا۔

نواب ٹن جب اسے اپنے بنگلے پر لے کر آیا تو اس کی امارت کے مظاہرے دیکھ کر جلالی حیران رہ گیا۔ اس کے دل میں شک جنم لینے لگا تھا۔ راتوں رات امیر بننے کا تو ایک ہی طریقہ تھا.....

"میں نے یہ دولت اسمگلنگ کر کے نہیں کمائی۔" نواب ٹن نے شاید اس کی سوچیں پڑھ لی تھیں۔

"تو پھر؟" جلالی کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

"میں بین الاقوامی تجارت میں منہ مارتا ہوں' آج کل چینی چوروں کو چینی بیچ رہا ہوں۔ بس اس سے زیادہ مت پوچھنا۔" نواب ٹن نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی۔

کئی برس گزر گئے جلالی نے کبھی نہیں پوچھا تھا۔ لیکن اسے حیرت ہوتی تھی کہ وہ کاروبار کرتا کس وقت ہے۔ ایک دن اس نے ہمت کر کے پوچھ ہی لیا تھا۔

"میں کاروبار بھی شکار کی طرح کرتا ہوں۔ ہرن کے شکار کی طرح۔ بہت صبر اور بہت احتیاط کے ساتھ۔" وہ اس دن موڈ میں تھا۔ جھوم جھوم کر بتانے لگا۔ "مجھے معلوم ہے کہ ہرن کھٹکا سنتے ہی بھاگ جائے گا۔ مجھے اس کے پیچھے دوڑنا پسند نہیں ہے۔ میں دوڑ بھاگ میں ہرن سے جیت بھی نہیں سکتا۔ میں آہستہ آہستہ اس کا اعتبار

جیتتا ہوں۔ اسے مانوس کرنے کے لئے بہت سا وقت گزارتا ہوں۔ وہ میری بو پا کر پریشان نہیں ہوتا۔ میری آہٹ سن کر بھاگنا چھوڑ دیتا ہے۔ پھر ایک دن آتا ہے جب وہ خود میرے پاس آ کر اپنا سر میرے ہاتھوں پر رکھ دیتا ہے۔"

ایک دن جلالی کو اعتماد میں لے کر اس نے انکشاف کیا۔ "مجھے ذیابیطس ہو گئی ہے اس لئے میں نے چینی کا کاروبار چھوڑ دیا ہے۔"

"تو پھر؟" جلالی نے پوچھا۔

"ہرن کے پیچھے میں نے خودکار نشانہ لگانے والے میزائل چھوڑ دیئے ہیں۔" اس نے اپنے لہجے کو پراسرار بناتے ہوئے کہا۔

"اردو بولو نواب صاحب' اردو۔" جلالی نے جھنجھلا کر کہا۔

"بندوقیں' گولیاں' بم' میزائل' ٹینک' آبدوزیں......" لہجہ اسی طرح پراسرار تھا۔

"اوہ۔ تو آپ ہمارے عدنان خشوگی بننے والے ہیں۔" جلالی نے ہنستے ہوئے کہا۔

"عدنان خشوگی!" نواب ٹن نے اچانک سنجیدہ ہو کر کہا۔ "جسے عدنان خشوگی بننا تھا وہ بن چکا۔ میں تو اس کا چھوڑا ہوا جھوٹا شکار کھاتا ہوں۔"

"کون ہے وہ؟" جلالی کی صحافیانہ رگ پھڑک گئی۔

"بتانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ وہ اس ملک کا سب سے بااثر آدمی ہے لیکن کوئی اس کا نام تک نہیں جانتا۔ تمہارے لئے بھی وہ نام کوئی معنی نہیں رکھے گا۔"

"پھر بھی۔ شاید میں جانتا ہوں۔" جلالی نے اصرار کیا۔

"بس!" نواب ٹن نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ "تم مجھ سے رپورٹر بن کر مت ملا کرو۔ موڈ خراب کر دیتے ہو۔ میں پہلے ہی بہت اداس ہوں۔ تزئین کے ساتھ آج میرا آخری کھانا ہے۔ The Last Super۔" چہرے پر نقاب دوبارہ آ گیا۔

"تزئین؟" جلالی نے حیرت سے پوچھا۔

"وہی انٹرکان کی انٹیریئر ڈیزائنر' جس نے تمہارا فلیٹ ڈیزائن کیا تھا۔ اگلے ہفتے

اس کی شادی ہو رہی ہے۔" نواب ٹن نے ایک بڑا سا گھونٹ بھرتے ہوئے بہت ڈرامائی لہجے میں کہا۔

"کمال ہے۔ عشق آپ سے اور شادی کسی اور سے۔ آپ تو غریب شاعر یا بیروزگار صحافی بھی نہیں ہیں۔ پھر بھی؟" جلالی کی حیرت کم نہیں ہوئی تھی۔

"تم سے کس نے کہا وہ مجھ سے عشق کرتی تھی؟ وہ جس سے عشق کرتی تھی اسی سے شادی بھی کر رہی ہے۔"

"یار نواب صاحب' بات کچھ سمجھ میں نہیں آ رہی۔"

"تمہاری سمجھ میں آئے گی بھی نہیں۔ تمہارا تو نام تک عشق کے لئے موزوں نہیں ہے۔ ذہین جلالی! ذہانت اور جلال' دونوں عشق کی ضد ہیں۔ اپنا نام بدل دو۔ پرانا نام پھر بھی ٹھیک تھا۔ سکندر علی خان۔ صرف خان نکالنا پڑے گا۔"

"نواب صاحب' بات مت ٹالو۔ سچ سچ بتاؤ یہ تزئین والا معاملہ کیا ہے۔"

"میں ٹال نہیں رہا۔ میرا عشق ذرا افلاطونی قسم کا ہوتا ہے جو تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا۔" نواب ٹن نے چھوٹا سا وقفہ لیا اور پھر کہنے لگا۔

"میں تزئین کا صرف نام سن کر عاشق ہو گیا تھا۔ بہت دنوں تک چہرہ نہیں دیکھا۔ دیکھنا بھی نہیں چاہتا۔ بس نام سنتا تو دل میں گھنٹیاں سی بج اٹھتی تھیں۔ تزئین!! لگتا جیسے دل کے گلستاں میں پھولوں کی صف بندی ہو گئی ہو۔ ایک دن وہ نام مجسم ہو کر سامنے آیا تو اپنے نام کی مکمل تفسیر تھا۔ وہ بنکویٹ ہال کی نئے سرے سے آرائش کر رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہوٹل کا منیجر تھا۔ باتیں اس سے کر رہی تھی لیکن آنکھیں دیواروں کو ناپ رہی تھیں۔ انگلیاں ہوا میں تصویریں بنا رہی تھیں۔ منیجر چلا گیا تو مجھے اپنی قسمت پر یقین نہیں آیا۔ وہ دفتر میں بیٹھ کر میرے ساتھ کافی پینے کے لئے تیار ہو گئی تھی۔ بنکویٹ ہال کی آرائش شروع ہوئی تو میرا عشق بھی جوان ہوتا گیا۔ یادگار دن وہ تھا جب وہ پہلی بار میرے ساتھ ڈنر کرنے گئی۔ وہ مجھے اپنے منگیتر کے بارے میں بتانے لگی تو موم بتی کی روشنی میں چمکتا ہوا اس کا گلابی چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ میں بیٹھا صرف اسے دیکھتا رہا۔"

"جس طرح گجرات کی کمہارن کو دیکھا کرتے تھے۔" جلالی نے چوٹ کی۔
"شاید!" نواب ٹن نے کہیں کھو جاتے ہوئے کہا۔
"آپ نے اس سے کبھی اظہار عشق نہیں کیا' کبھی نہیں بتایا کہ آپ اسے کتنا چاہتے ہیں؟" جلالی نے پوچھا۔
"کیوں بتاتا۔" نواب نے پہلو بدلا۔ "یہ اس کا نہیں' میرا اور میرے دل کا معاملہ تھا۔ میں نے اپنے دل سے پوچھا تھا اور اس نے بتا دیا تھا۔ میں نے کہا نا کہ تم نہیں سمجھو گے۔ عشق میرے لئے ایک یکطرفہ عمل ہے۔ دو طرفہ ہو کر وہ عشق نہیں رہتا۔ جسموں کے ملن کی قبر بن جاتا ہے۔ میں کمہارن کی طرح شاید ایک اور عشق کی ناکامی برداشت نہیں کرپاتا۔"
"نواب صاحب' ڈرامہ مت بولو۔ جسم کے رشتے بھی دل کے تعلق سے قائم ہوتے ہیں۔" جلالی خواہ مخواہ بحث پر تل گیا تھا۔
"ہوتے ہوں گے۔ لیکن میرے لئے نہیں۔" نواب ٹن جو اچانک گوتم بدھ بن گیا تھا' کہنے لگا۔
"میں نے دونوں خانے الگ الگ رکھے ہیں۔ ایک دوسرے سے بہت دور۔ جنسی معاملات آپا شمیم اور نیک بابو کے حوالے ہیں۔ وہ ہفتے کے ہفتے ایک گڑیا بھیج دیتے ہیں۔ ذرا سا چمکارو' سیدھا ناڑے پر ہاتھ ڈالتی ہے۔"
جلالی ہنسنے لگا۔ اس نے دیکھا تھا۔ عشق کی پاکیزگی پر لیکچر دینے والا یہی نواب ٹن آپا شمیم اور نیک بابو کے اڈے سے آنے والی لڑکیوں کے فحش مذاق کا مزا لیتے ہوئے پورا تماش بین بن جاتا تھا۔ جلالی کا ذہن کبھی کبھی "فراڈ" کا نعرہ لگاتا۔ لیکن زبان سے کبھی کچھ نہیں کہا تھا۔ برسوں کی دوستی کے باوجود وہ فیصلہ نہیں کرپایا تھا کہ نواب کو کیا سمجھے۔ شاید سمجھنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ نواب ٹن ایک اچھا دوست تھا۔ جلالی کے لئے یہی کافی تھا۔ اس کے ایک آرٹسٹ دوست نے ایک روز جب نواب ٹن کو بیوقوف بنانے والا جعلساز قرار دیا تو جلالی اس سے جھگڑ پڑا تھا۔ اس زمانے میں نواب ٹن کی توجہ کا سب سے بڑا مرکز ایک اسپینی مصور کی تقریباً" دو سو سال پرانی

تصویر تھی جو نواب ٹن کے مطابق اس نے لاکھوں ڈالر میں خریدی تھی۔ اس نے دیوار پر ٹنگے ہوئے تمام نوادرات سرکا کر دوسری طرف کر دیئے تھے اور پوری دیوار صرف اس ایک تصویر کے لئے وقف کر دی تھی۔ ایک دن چچا صدیقی اس تصویر سے وابستہ کہانیاں سن کر جماہیاں لینے لگا تو نواب ٹن نے جلالی سے کہا تھا۔

"تم لوگ بدذوق ہو۔ تمہیں مصوری کی تاریخ کا کوئی علم نہیں۔ جلالی، آج کل تمہارا وہ مصور دوست کدھر ہے جسے برانڈی پینے کا شوق ہے۔"

"پتہ نہیں۔ بہت دنوں سے نہیں ملا۔"

"اس سے کہنا کہ میرے پاس ریمی مارٹن کا تازہ اسٹاک آیا ہے۔ اسے پورے کراچی میں کہیں سونگھنے کو نہیں ملے گی۔"

ریمی مارٹن کا نام سن کر جلالی کا مصور دوست دوسرے ہی دن اس کے ساتھ نواب ٹن کے دربار میں پہنچ گیا۔ جلالی نے اسے تصویر دکھائی۔ آرٹسٹ نے ایک نظر دیکھ کر اپنی ساری توجہ پھر اپنے گلاس پر مرکوز کر دی۔

"کیا خیال ہے؟" نواب ٹن سے برداشت نہیں ہوا تو وہ بیتابی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"اچھی ہے۔" آرٹسٹ نے تصویر کو دیکھے بغیر خالص برانڈی کا ایک چھوٹا سا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔

"اچھی ہے؟" نواب ٹن کو غصہ آنے لگا۔ "گویا کی ماہیا ہے ماہیا۔ بے لباس ماہیا۔"

"مجھے معلوم ہے۔" آرٹسٹ نے اسی طرح کوئی جذباتی تغیر ظاہر کئے بغیر کہا۔ "میں نے میڈرڈ کے پراڈو میوزیم میں دیکھی ہے۔ بے لباس ماہیا بھی دیکھی ہے اور بالباس بھی۔"

"آپ نے جو دیکھی تھی وہ نقل تھی۔ اصلی تصویر آپ اس خادم کے غریب خانے کی دیوار پر ٹنگی ہوئی دیکھ رہے ہیں۔" نواب ٹن نے سینہ پھلاتے ہوئے ذرا طنزیہ انداز میں کہا تو آرٹسٹ نے بھی کچھ کہنا چاہا لیکن پھر کچھ سوچ کر سر ہلاتا ہوا اپنی

برانڈی کے ساتھ انصاف کرنے لگا۔ نواب ٹن کا نوابی موڈ اپنے عروج پر پہنچ گیا۔

"یہ مصوری کی دنیا کا ایک بہت بڑا راز ہے جو صرف مجھے اور یورپ میں چند لوگوں کو معلوم ہے۔ چند سال پہلے تصویر چوروں نے یہ کارنامہ انجام دیا تھا۔ انہوں نے پراڈو کے میوزیم سے اصلی تصویریں اتار کر ان کی جگہ نقلی تصویریں لگا دی تھیں' کسی کو آج تک اس چوری کا پتہ نہیں چل سکا۔ وہ پولیس کے ڈر سے بھاگتے ہوئے ایک اسپینی دوست کے ذریعے مجھ تک پہنچے تھے۔ اسی گھر میں وہ کئی دن تک بے لباس اور بالباس ماہیا سمیت رہتے رہے ہیں۔" نواب ٹن نے کہا اور آرٹسٹ کے چہرے پر کوئی تاثر تلاش کرنے لگا۔ لیکن آرٹسٹ تو گہرے جام کو گھما گھما کر برانڈی پینے میں مگن تھا۔ اس کی خاموشی کو حوصلہ افزائی سمجھ کر نواب ٹن پھر شروع ہو گیا۔

"بہت کڑی سودے بازی کرنی پڑی تھی۔ مجھے بالباس ماہیا پسند نہیں آئی تھی۔ گویا بہت بڑا آرٹسٹ تھا لیکن اس نے لباس کا چناؤ اچھا نہیں کیا تھا۔ مجھے بلاؤز بالکل نہیں جچا تھا۔ میں نے ننگی ماہیا خرید لی۔ حالانکہ وہ بھی تضاد سے پر ہے۔ ماہیا خوش لباس اسپینی عورت کو کہتے ہیں۔ لیکن گویا نے اسے بے لباس کر کے بھی ماہیا کہا ہے۔" نواب ٹن نے تصویر پر نظریں جما دیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی استاد شاگردوں کو لیکچر دے رہا ہو۔

"نزدیک جا کر دیکھیے۔ سینے کے ابھار متوازن نہیں ہیں۔ دائیں بائیں دو مختلف سمتوں کو نشانہ بنائے ہوئے ہیں۔ تکئے پر رکھا ہوا جو ہاتھ سر کو تھامے ہوئے ہے اس کے بازو کی مچھلی کثرت کرنے والی کسی عورت کے عضلات کی طرح ابھری ہے۔ لیکن پھر بھی مجھے یہی تصویر پسند آئی تھی۔ میں صرف تصویر نہیں دو سو سال پرانی تاریخ خرید رہا تھا۔" آرٹسٹ نواب ٹن کو دلچسپ نظروں سے دیکھنے لگا۔

"دوسری تصویر کا کیا ہوا۔" جلالی نے پوچھا۔

"وہ میں نے کسی اور کو بکوا دی تھی۔ وہ بیوی بچوں والا تھا' اسے کپڑوں والی ماہیا چاہئے تھی۔ اس نے اس تصویر کے مجھ سے زیادہ پیسے دیئے۔ لیکن میں تمہیں اس کا نام نہیں بتاؤں گا۔ نشے میں بھی نہیں بتاؤں گا۔" نواب ٹن نے کہا اور ایک بار

پھر آرٹسٹ کی طرف رخ کر کے اسے چیلنج کرنے لگا۔

''آپ کو پتہ ہے گویا کی اس تصویر کی ماڈل کون تھی؟'' آرٹسٹ کچھ نہیں بولا۔ خاموش رہا۔ نواب ٹن کے چہرے پر فتح مندی کی مسکراہٹ ابھر آئی۔

''یہ ڈچز آف البا کی تصویر ہے۔ ملکہ کے بعد اسپین کی خاتون اول' آرٹ کی سب سے بڑی قدر داں اور گویا کی عاشق ڈچز آف البا کی۔''

جلالی سوچنے لگا کہ دو سو سال پرانی وہ بات جو کسی تاریخ میں نہیں لکھی تھی نواب ٹن کو کیسے معلوم تھی۔ لیکن یہی نواب ٹن کا کمال تھا۔ اس کے اپنے ذرائع تھے جو تاریخ سے بھی ماورا تھے۔ نواب ٹن کے لہجے میں روانی آگئی۔ آرٹسٹ ایک بار پھر اسے مسکراتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔

''یہ اسپین کے محلوں میں پلنے والی حسن و عشق کی داستان ہے۔ یہ نوجوان اور حسین ڈچز آف البا کی کہانی ہے جس کا ایک ایک بال خواہشوں کے بل کھاتے سانپ کی طرح تھا۔'' نواب ٹن نے پیشہ ور داستان گو کی طرح کہا۔

''ڈچز اپنے اندلس کے محل میں گویا کے ساتھ عشق کا کھیل کھیل رہی تھی۔ دوسری طرف ڈچز کا شوہر ڈیوک آف البا چالیس سال کی عمر میں پراسرار طور پر مر گیا۔ مجھے یقین ہے اس نے بیوی کے کرتوتوں کی وجہ سے زہر کھا کر خودکشی کی ہو گی۔ ڈچز نے سوگ کے ایام میں بھی اندلس کے محل میں گویا کے ساتھ برہنہ جسموں کی مصوری کے کھیل کھیلتے ہوئے گزارے۔ ماہیا اسی زمانے کا شاہکار ہے۔ جسم ڈچز کا ہے لیکن چہرہ ڈچز سے نہیں ملتا۔ تصویر کو غور سے دیکھو' جسم اور چہرے کی عمروں میں فرق صاف نظر آتا ہے۔''

آرٹسٹ کی برداشت جواب دے گئی تھی یا شاید وہ برانڈی سے اچھی طرح سیراب ہو چکا تھا۔ وہ کھڑا ہوا تو جلالی بھی اس کے ساتھ اٹھ گیا۔

''تمہارا دوست کمال کا آدمی ہے۔ جعلسازی کو اصلیت کا رنگ دینے کے لئے بہت محنت کرتا ہے۔ اسپینی مصور کی پوری تاریخ کھنگال ڈالی ہے۔'' نواب ٹن کے گھر سے واپس آتے ہوئے آرٹسٹ نے جلالی سے کہا۔

"کیا جعلسازی کی ہے اس نے؟ اس کی کون سی کہانی غلط ہے؟" جلالی نے ناگواری سے پوچھا۔

"حوالے درست ہیں، لیکن کہانی نواب کی اپنی ہے۔" آرٹسٹ نے بتایا۔ "گویا کی جو تصویر اس نے لٹکا رکھی ہے وہ ایک سستی سی ری پروڈکشن ہے۔ اصلی تصویر کو چرانا ممکن نہیں ہے۔ کوئی چرا بھی لے تو اس کی قیمت تمہارے نواب کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتی۔"

"تم نے تصویر کو قریب سے دیکھا تک نہیں تھا۔ پھر بھی فیصلہ سنا رہے ہو۔ تمہیں نواب کے غیر ملکی رابطوں اور اس کے دولتمند ہونے کا اندازہ نہیں ہے۔" جلالی کو سچ مچ غصہ آ گیا۔ نواب کی اتنی مہنگی برانڈی پینے کے بعد باہر نکلتے ہی اسے جعلساز قرار دے رہا تھا۔ آرٹسٹ پھر بھی متاثر نہیں ہوا۔ اس نے لہجے کو کسی بھی تاثر سے عاری رکھتے ہوئے جلالی کو جواب دیا تو جلالی کا غصہ نواب کی طرف منتقل ہو گیا۔

"گویا کی اوریجنل ماہیا اور بے لباس ماہیا جو اب بھی میڈرڈ کے میوزیم میں لگی ہوئی ہیں وہ سوا تین فٹ چوڑی اور سوا چھ فٹ لمبی ہیں۔ نواب نے جو نقل لٹکا رکھی ہے وہ ڈیڑھ بائی تین سے زیادہ کی نہیں ہے۔"

جلالی اگلے ہی روز واپس گیا۔ نواب ٹن اس وقت اکیلا تھا۔ جلالی نے اسے بتایا۔ نواب ٹن کچھ نہیں بولا۔ جلالی خاموش ہوا تو نواب ٹن تصویر کو اتار کر پیچھے باغ میں لے گیا اور دلاور کو بلا کر اپنے سامنے اسے جلوا دیا۔ کئی دوستوں نے تصویر کے بارے میں پوچھا تھا۔

"جلالی کے ایک مصور دوست کو پسند آ گئی تھی۔ میں نے اسے بخش دی۔" نواب ٹن نے یہ کہہ کر تصویر کے بارے میں مزید بات کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

جلالی کو کمرے میں اکیلے بیٹھے بیٹھے گھٹن ہونے لگی۔ رات تیزی سے گزر رہی تھی لیکن نواب کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ دلاور بھی ایسا غائب ہوا کہ پلٹ کر نہیں آیا۔ اسے بھوک لگنے لگی۔ سوچا دلاور سے جا کر پیاز کے پکوڑے بنوائے گا۔ تھوڑی دیر

پیچھے لان پر جا کر تازہ ہوا لے گا اور چاندنی رات میں رات کی رانی کی خوشبو سے اپنی روح کو مہکائے گا۔ پھر اسے برابر کے بنگلے کی پراسرار نقل و حرکت یاد آ گئی۔ کاش وہ کسی طرح اندر جا کر دیکھ سکتا۔ یقیناً" کوئی اہم اجلاس ہو رہا ہو گا۔ لیکن اسے ایک بار پھر یہ سوچ کر اطمینان ہو گیا کہ نواب کو اندر کی کہانی معلوم ہو گی۔ وہ آیا تو اسی سے پوچھے گا۔ لیکن سوال یہ تھا کہ وہ آئے گا کب؟ جلالی کھڑا ہو کر اپنے گھٹنے سیدھے کرنے لگا اور پھر دروازہ کھول کر کمرے سے باہر نکل آیا۔

دلاور باورچی خانے میں نہیں تھا۔ ٹی وی چل رہا تھا جس کا مطلب تھا کہ وہ یہیں کہیں تھا۔ شاید اوپر کے کمروں کی صفائی کر رہا ہو' یا ممکن ہے باہر چوکیدار کی کوٹھری میں بیٹھا اس سے گپیں لگا رہا ہو۔ جلالی مکان کے عقب میں واقع لان میں نکل آیا۔ برابر کے بنگلے سے ملی ہوئی دیوار پر گھنی بیل پھیلی ہوئی تھی جن کے قدموں میں پھولوں کی کیاریاں تھیں۔ جلالی نے کھڑے کھڑے دو تین گہرے سانس لئے۔ جسم کی سستی آہستہ آہستہ دور ہو رہی تھی لیکن روح تھکی تھکی سی تھی۔ کیوں؟ یہ خود جلالی کو نہیں معلوم تھا۔ شاید تنہائی کا احساس تھا۔ زندگی اکیلے پن کا شکار ہو کر تھک سی گئی تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ عورت بیزار تھا۔ اس کے جسم اور دل میں بھی چنگاریاں مچلتی تھیں۔ کئی نازک قدم ساتھ ساتھ چلے بھی تھے۔ لیکن کبھی وہ خود رک گیا تھا اور کبھی ان کے قدم تیز ہو گئے تھے۔ نواب ٹن کہتا تھا۔

"بیل کی طرح کوئی دیوار مضبوطی سے پکڑ لو۔ خود بخود پھیلتے چلے جاؤ گے۔"

جلالی نے کوشش کی تھی۔ لیکن کوئی دیوار بہت نیچی رہ گئی اور کسی تک اس کا ہاتھ نہیں پہنچ سکا۔

جلالی پھولوں کی کیاریوں کی طرف ٹہلتا ہوا جانے لگا۔ چاند بادلوں سے پنجہ آزمائی کر رہا تھا لیکن اس وقت سیاہ بادل کا ایک ٹکڑا چاند پر غالب تھا۔ جلالی ابھی کیاریوں کے قریب نہیں پہنچا تھا کہ اس نے دیوار پر چڑھی ہوئی گھنی بیل میں ہلچل مچی ہوئی دیکھی۔ ایک انسانی وجود اپنے قدم باہر نکال رہا تھا۔ پھر ایسا لگا جیسے بیلوں نے کسی کو اگل کر پھینک دیا ہو۔ جلالی کے جسم میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔

"کون ہے؟" اس نے کڑک کر اپنے خوف کو دبانا چاہا۔

"میں ہوں جلالی صاحب۔ میں ہوں۔ دلاور۔"

سایہ جو بیلوں سے نکل کر وہیں کھڑا رہ گیا تھا' سہمی ہوئی آواز میں بولا۔ جلالی نزدیک پہنچا تو دلاور خوف سے کانپ رہا تھا۔ جلالی نے اور آگے بڑھ کر بیل کو ہاتھ سے ہٹا کر دیکھا تو دیوار سے سیمنٹ کے تین چار بلاک نکال کر اتنا بڑا سوراخ بنا دیا گیا تھا جس میں سے ایک آدمی بہ آسانی گزر سکے۔ سوراخ میں سے برابر کے بنگلے کی کیاری میں لگی ہوئی گلاب کی ٹہنی جھانکتی نظر آ رہی تھی۔

"یہ کیا ہے دلاور؟ کیا تو چوری بھی کرتا ہے؟" جلالی نے سخت نظروں سے دلاور کو گھورتے ہوئے کہا۔ بیل ہاتھ سے چھوڑ دی جس سے سوراخ دوبارہ چھپ گیا تھا۔

"نہیں صاحب۔ میں چور نہیں ہوں۔ میں نے کبھی چوری نہیں کی۔ میں قرآن کی قسم کھاتا ہوں میں نے کبھی چوری نہیں کی۔" دلاور ابھی تک خوف سے لرز رہا تھا۔

"تو پھر یہ چوروں کی طرح نقب کیوں لگائی ہے؟"

"برابر کے بنگلے کا خانساماں اور میں آنے جانے کے لئے یہی راستہ استعمال کرتے ہیں۔"

"نواب صاحب کو پتہ ہے۔"

"نہیں! صاحب کو نہیں معلوم۔ صاحب' آپ بولنا بھی نہیں۔ صاحب آپ کو اپنی ماں کی قسم' نواب صاحب کو نہیں بولنا۔ وہ ہم کو جان سے مار دے گا۔" دلاور بہت زیادہ خوفزدہ تھا۔

"ایک شرط پر نہیں بتاؤں گا۔ مجھے سچ سچ بتاؤ کہ تم سامنے کے دروازوں سے آنے جانے کے بجائے یہ چور راستہ کیوں استعمال کرتے ہو۔" جلالی نے کیاری سے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔ دلاور بھی کیاری پھلانگ کر اس کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ لیکن کچھ بولتے ہوئے جھجک رہا تھا۔ جلالی کو پتہ تھا ایک چوٹ اور لگانا پڑے گی۔

”ٹھیک ہے مت بتاؤ۔ نواب صاحب تم سے خود پوچھ لے گا۔“ جلالی نے واپس مکان کی طرف جانے کے لئے قدم اٹھاتے ہوئے کہا۔

”نہیں صاحب نہیں۔“ دلاور نے جلالی کا بازو تھاما تو اس کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ ”میں آپ کو سب کچھ سچ بتاتا ہوں لیکن آپ وعدہ کرو نواب صاحب کو نہیں بولو گے۔“ جلالی منہ سے کچھ نہیں بولا' بس اس نے سر ہلا دیا۔

”آج کے دن سامنے کے گیٹ سے کسی کو اندر جانے کی اجازت نہیں ہے۔“ دلاور نے جھجکتے ہوئے جلالی کو بتانا شروع کیا۔ ”مہینے کے مہینے صاحب لوگ جب جمع ہوتے ہیں تو اپنی میٹنگ کے بعد ایک فلم لگاتے ہیں۔“

”فلم لگاتے ہیں؟“ جلالی نے بات کاٹتے ہوئے حیرانی سے پوچھا۔

”جی ہاں صاحب۔ ننگی فلمیں۔ ہم نے ایسی فلم کبھی نہیں دیکھی۔ خانساماں کو کسی طرح پتہ چل گیا تھا۔ اس نے باغ میں کھلنے والی کھڑکی کا ایک شیشہ کاٹ کر جگہ بنائی ہے۔ لیکن کھڑکی کافی اوپر ہے اس لئے اس نے مجھے رازدار بنایا ہے۔ ہم ایک دوسرے کے کندھے پر چڑھ کر باری باری دیکھتے ہیں۔“ جلالی دل ہی دل میں ہنس پڑا۔ وہ جانے کیا سمجھ رہا تھا۔ اس ساری کہانی میں تو صرف بلیو فلموں کی چوہیا نکلی تھی۔

”تمہیں ڈر نہیں لگتا؟ کسی نے اگر دیکھ لیا تو؟؟“ جلالی نے پوچھا۔

”باہر اندھیرا ہوتا ہے۔ فلم کے واسطے اندر بھی اندھیرا ہو جاتا ہے' ہم ٹوٹے ہوئے شیشے سے پردے کو آنکھ کے برابر ہٹا کر دیکھتے ہیں۔ ہمیں کوئی نہیں دیکھ سکتا۔“ دلاور نے بڑے فخر سے اپنا کارنامہ بتایا۔ اس کا خوف اب دور ہو گیا تھا۔

”اتنی بڑی دعوت اور اتنا کڑا پہرا صرف ننگی فلمیں دیکھنے کے لئے ہے۔“ جلالی نے مایوسی سے کہا۔

”نہیں صاحب' پہلے دیر تک میٹنگ ہوتی ہے۔ خوب تیز تیز بحث ہوتی ہے۔ میٹنگ کے بعد شراب اور فلم چلتی ہے۔ بڈھے لوگ ہیں دل پشاوری کرتے ہیں۔ صاحب آج آپ بھی ہمارے ساتھ دیکھو۔ مزا آ جائے گا۔“ دلاور شیر ہو گیا۔

”کیوں؟ کیا ابھی تک فلم شروع نہیں ہوئی۔“ جلالی کو امید کی کرن نظر آنے

گی۔

"نہیں صاحب ابھی ابھی میٹنگ شروع ہوا ہے۔ کوئی مہمان دیر سے آیا تھا۔ ایک دو گھنٹے میٹنگ چلے گا اس کے بعد فلم چلے گی۔ ابھی تو لڑکیاں بھی نہیں آئیں۔"

"لڑکیاں بھی آتی ہیں؟" جلالی نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں صاحب۔ فلم کے بعد سب الگ الگ کمروں میں جا کر لڑکیوں سے مالش کراتے ہیں۔ سب کے لئے ایک ایک لڑکی آتی ہے۔"

"تمہیں کیسے معلوم۔ کیا تم نے ان کے کمروں کی کھڑکیوں کے شیشے بھی توڑے ہوئے ہیں۔" جلالی کے دماغ میں ایک منصوبہ پروان چڑھ رہا تھا۔ اسی لئے وہ بات آگے بڑھانے لگا تھا۔

"نہیں صاحب۔ کمرے تو دوسرے مالے پر ہیں۔ ادھر چڑھنا مشکل ہے۔ ہم کو لڑکیوں نے بتایا ہے۔ بڈھے اکثر مالش کے دوران ہی سو جاتے ہیں۔ لڑکیاں کھانے کی تلاش میں خانساماں کو جگانے آ جاتی ہیں۔ کبھی کبھی ہمارا چانس بھی لگ جاتا ہے۔" دلاور نے بے حیائی سے ہنستے ہوئے کہا۔

"دلاور تم چاہتے ہو کہ میں نواب صاحب کو اس بارے میں کچھ نہ بتاؤں تو تمہیں میرا ایک کام کرنا پڑے گا۔" جلالی نے تیزی سے بولنا شروع کیا۔ "مجھے مہمانوں کے چہرے دیکھنے ہیں۔ مجھے سننا ہے وہ کیا باتیں کرتے ہیں۔ مجھے اندر لے کر چلو اور تھوڑی دیر اپنے کندھوں پر اٹھائے رکھو۔ میں میٹنگ ختم ہوتے ہی واپس آ جاؤں گا۔ بعد میں تم آرام سے خانساماں کے ساتھ مل کر فلم دیکھنا۔"

"نہیں صاحب یہ خطرناک کام ہے۔ کمرے میں روشنی ہو گی' پردہ ہٹایا تو آپ نظر آ جاؤ گے۔ ہم سب مارے جائیں گے۔" دلاور خوفزدہ ہو گیا۔

"میں پوری احتیاط رکھوں گا۔ ذرا بھی خطرہ ہوا تو پردہ نہیں سرکاؤں گا' صرف کان لگا کر سنتا رہوں گا۔ کچھ ہوا تو میری ذمہ داری ہے۔ میں اخبار کا آدمی ہوں۔ کوئی میرے آدمی کو ہاتھ نہیں لگائے گا۔ تمہیں یاد ہے جب تمہارا باپ بلوے میں پکڑا گیا تھا تو اسے کون چھڑا کر لایا تھا۔"

"وہ ٹھیک ہے صاحب لیکن خانساماں....."

"تم جا کر خانساماں سے بات کرو۔ میں تمہارا یہیں انتظار کروں گا۔ اسے بتاؤ اگر پہریداروں کو پتہ چل گیا کہ ادھر تم لوگ کیا کرتے ہو تو جان کی خیر نہیں۔" دلاور تھوڑی دیر کچھ سوچتا رہا اور پھر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا بیل کے پیچھے غائب ہو گیا۔

دس منٹ بعد جلالی باری باری دلاور اور خانساماں کے کندھوں پر چڑھ کے کھڑکی سے کان لگائے ہوئے تھا۔ ایک بار ذرا سا پردہ سرکا کر دیکھا تھا اور سامنے ہی جو چہرہ نظر آیا تھا اسے دیکھ کر آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ پردہ برابر کر کے اس نے گفتگو پر کان لگا دیئے تھے۔ ایسا لگا جیسے کان کے پردے پھٹ جائیں گے۔ صحافتی تاریخ کی سب سے بڑی کہانی اس پر آشکارا ہو رہی تھی۔ اقتدار مافیا ملک کا مستقبل طے کر رہا تھا۔

اقتدار مافیا

جلالی واپس آکر نواب ٹن کی آرام گاہ میں بیٹھا ہوا ایک تیز جام بنا کر لمبے لمبے گھونٹ لے رہا تھا۔ برف ختم ہو گئی تھی لیکن لانے والا کوئی نہیں تھا۔ اسے معلوم تھا دلاور اس وقت خانساماں کے کندھے پر چڑھا ہوا اندھیرے کمرے میں چلنے والی فلم دیکھ رہا ہو گا۔ جلالی کو پرواہ نہیں تھی۔ اس وقت تو وہ پانی کے بغیر خالص وہسکی بھی حلق سے نیچے اتار سکتا تھا۔ اس نے دلاور اور خانساماں کے کندھوں پر چڑھ کر جو کچھ دیکھا اور سنا تھا اسکے بعد سے اس کے ذہن میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ اسے لگا تھا جیسے وہ فلم کا کوئی منظر دیکھ رہا ہو یا شاید کوئی ناول پڑھ رہا ہو۔ جلالی کو تو یہ احساس بھی نہیں رہا تھا کہ وہ کسی کے کندھے پر کھڑا ہے۔ وہ اس وقت چونکا تھا جب دلاور نے اس کا پاؤں پکڑ کر زور سے ہلایا تھا۔ وہ اسے اترنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ جلالی کے کانوں میں بھی ایک گاڑی کے رکنے کی آواز آئی تھی۔

"صاحب لڑکیوں کی سواری آ گئی ہے۔ گاڑی باہر نہیں رکتی' لڑکیوں کو لے کر اندر تک آتی ہے۔ اترتی ہوئی لڑکیوں نے اس طرف دیکھ لیا تو ہم دکھائی دے جائیں

گے۔" دلاور نے جلدی جلدی جلالی کو بتایا۔ تینوں خاموشی سے جھاڑیوں کے پیچھے اندھیرے میں دبک گئے۔ پورٹیکو کی ہلکی روشنی میں اترنے والے جسم کو دیکھتے ہی جلالی ایک بار پھر حیران رہ گیا۔ جنرل کانی کو وہ کیسے بھول سکتا تھا۔ بیس برس پہلے ایوان صدر میں جب پہلی بار اسے دیکھا تھا' اس کا سراپا یادداشت میں نقش ہو گیا تھا۔ "کیا جنرل کانی دوبارہ برسراقتدار آ گئی ہے۔" جلالی نے سوچا۔

جنرل کانی کے پیچھے گداز بدنوں اور چست لباس والی چند لڑکیاں گاڑی سے اتری تھیں اور شوخیاں کرتی ہوئی پچھلے زینے سے اوپر کی طرف چڑھ رہی تھیں۔ جنرل کانی چوزوں کی رکھوالی کرنے والی مرغی کی طرح ان کے ساتھ تھی اور کرخت آواز میں مسلسل ہدایات نشر کر رہی تھی۔

"روبی چابک ذرا دیکھ کر چلایا کر۔ اس طرح کہ زمین پر چوٹ لگے۔ پچھلی بار چابک کا کنارا ٹانگ کو چھو گیا تھا' بڈھا ہفتے بھر لنگڑاتا پھرا۔ شمی حرام خور تو ہتھکڑیاں لگا کر گدگدی نہ کیا کر۔ اس کی کلائیوں پر زخم پڑ گئے تھے۔ روحی تجھے آج پیانو والے کمرے میں جانا ہے۔ جو لال نائٹی دی ہے وہ پہن کر پیانو کے اوپر چڑھ کر بیٹھ جا۔ پیانو وہ خود بجائے گا۔ انگریزی فلموں نے بڈھوں کا دماغ خراب کر دیا ہے۔"

جنرل کانی اوپر چڑھتے چڑھتے ہانپنے لگی تھی لیکن آواز اسی طرح پاٹ دار تھی۔ "کان کھول کر سن لو حرام خورو' رات میں کوئی نیچے اتر کر خانساماں کی کوٹھری میں گیا تو باہر چوکیدار کی کھولی میں پھنکوا دوں گی جہاں چھ چھ نشے پہریدار تمہارے چیتھڑے اڑا دیں گے۔"

"وعدہ!" ایک لڑکی پلٹ کر اٹھلائی تھی۔

"تیری جوانی بہت ابل رہی ہے۔ تجھے تو میں......" جلالی اس سے آگے نہیں سن سکا تھا۔ صرف بند ہونے والے دروازے کی آواز آئی تھی۔ جلالی کو معلوم تھا اس کے بعد جنرل کانی نے اپنی اصلی زبان بولی ہو گی۔ عورتوں کے منہ سے مردوں والی گالیاں جلالی کی برداشت سے باہر تھیں۔ جلالی اس کے بعد جھاڑیاں پھلانگ کر واپس نواب ٹن کے بنگلے میں آ گیا تھا۔ دلاور اور خانساماں ایک دوسرے کے کندھے پر چڑھ

کر فلم دیکھنے کے لئے دوبارہ اپنے مورچے کی طرف پلٹ گئے تھے۔ جلالی کو نواب ٹن کے آنے کا انتظار تھا۔ اب تک نواب ٹن حیران کرتا رہا تھا۔ نئی نئی کہانیاں اور ایسی خبریں جو کسی اور کو معلوم نہ ہوں وہ نواب ٹن کو پتہ تھیں۔ جلالی نے سوچا آج اس کی باری ہے۔ یہ موقع اسے پہلی بار مل رہا تھا اور پہلی بار وہ ایسا دھماکہ کرنے والا تھا کہ نواب ٹن جیسا باخبر آدمی بھی حیران رہ جائے گا۔

نواب ٹن ایک گھنٹے بعد آیا۔ جلالی نے حیرانی سے دیکھا۔ تازہ استری کی ہوئی شلوار قمیض پہنے ہوئے تھا۔ جلالی کو یقین تھا اس نے کپڑے گھر آکر ابھی ابھی بدلے ہوں گے۔ نواب ٹن کے پیچھے برف کی چھوٹی بالٹی اٹھائے ہوئے دلاور بھی آگیا۔ جلالی نے سوچا فلم شاید ختم ہو گئی ہو گی۔ جلالی کو رزم گاہ میں براجمان دیکھ کر نواب ٹن کو حیرت ہوئی۔

"آج کلب بند ہے یا سارے جواری دیوالیہ ہو گئے ہیں۔" نواب ٹن نے بڑی بیتابی سے شراب کا ایک بڑا سا گھونٹ بھر کر مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"آج میں خبروں کی لاٹری کھیلنے نکلا تھا۔ آپ کو پتہ ہے خبروں کا جیک پاٹ آپ کے پاس آکر ہی نکلتا ہے۔" جلالی نے بھی بظاہر مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہوں۔ خبر!" نواب ٹن دو تین اور بڑے بڑے گھونٹ لے کر سوچتے ہوئے بولا۔ "خبر تو ایک ہی ہے۔ اور جیک پاٹ جیسی ہے۔"

"کون سی؟"

"بیگم ٹین پر سنٹ!" نواب نے بہت ڈرامائی انداز میں کہا۔

"بیگم ٹین پر سنٹ؟" جلالی کے اندر غصہ نئے سرے سے ابلنے لگا۔ "بیگم ٹین پر سنٹ تو پرانی خبر ہے نواب صاحب۔"

"ہاں' لیکن سچ مچ کی خبر آج تک نہیں چھپی۔ بیگم ٹین پر سنٹ صرف افواہوں اور محفلوں کی گپ شپ کا نام ہے۔ آج میں سخت تھک گیا ہوں۔ کل آؤ تو تمہیں بیگم ٹن پر سنٹ کی کارگزاریوں کی ایک ایک تفصیل دوں گا۔ ایسی تفصیل کہ تم حیران رہ جاؤ گے۔ اور اگر اخبار میں دینے کی ہمت کر سکو تو ہر پڑھنے والا حیران رہ جائے

گا۔" نواب کے لہجے میں اور چہرے پر وہی سکون اور اطمینان تھا جو اس کی پہچان تھا۔
"نواب صاحب! بیگم ٹین پرسنٹ ماضی بننے والی ہے۔ چھ ہفتے میں اس کی حکومت کی کہانی ختم ہو جائے گی۔" جلالی نے دھماکہ کیا۔
"کیا کہہ رہے ہو؟" نواب ایک دم سنبھل کر بیٹھ گیا۔
"نواب صاحب! انجان مت بنو۔" جلالی کے لئے اب برداشت کرنا ناممکن ہو گیا تھا۔ "ان لوگوں کے ساتھ آپ بھی بیٹھے تھے جنھوں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے یہ فیصلہ کیا ہے۔" نواب ٹن کو سچ مچ یہی لگا جیسے کہیں زور کا دھماکہ ہوا ہو۔ جلالی نے پہلی بار اس کے چہرے کا رنگ کافور ہوتے ہوئے دیکھا۔

جلالی نے دلاور کے کندھے پر چڑھ کر ٹوٹے ہوئے شیشے سے پردہ کو تھوڑا سا سرکایا تھا تو کمرے کی تیز روشنی میں چمکتا ہوا جو سب سے پہلا چہرہ نظر آیا تھا وہ نواب ٹن کا تھا۔ جلالی کے ہاتھ سے پردہ چھوٹ گیا تھا۔ اگر دلاور نے توازن درست کر کے نہ سنبھالا ہوتا تو وہ دلاور سمیت زمین پر گر جاتا۔
"کیا کر رہے ہو جلالی صاحب! آپ گرو گے تو آواز پہریدار تک جائے گی۔ ذرا سنبھل کے۔" دلاور نے سرگوشی کرتے ہوئے خبردار کیا تھا۔ جلالی خود پر قابو پا کر سنبھل گیا۔ اس نے پوری توجہ اندر سے آنے والی آوازوں پر لگا دی اور ہلکی سی جھری کھول کر ایک بار پھر اندر کا منظر دیکھنے لگا۔ یہ اس نواب ٹن کا چہرہ نہیں تھا جسے وہ جانتا تھا۔ آنکھوں میں نشیلے ڈورے تھے نہ چہرے سے لاپرواہی ٹپک رہی تھی۔ وہ بہت سنجیدگی اور بہت ادب کے ساتھ بیٹھا تھا۔ سر کے گھنگھریالے بال بھی الجھے ہوئے نہیں تھے۔ کنگھی کر کے بہت سلیقے سے سمیٹے گئے تھے۔ جلالی نے اسے پہلی بار سوٹ میں دیکھا تھا۔ وہ کرتا یا قمیض جو بھی پہنتا اس کا گریبان کھلا ہوتا جس میں سے سفید ہو جانے والے سینے کے گھنے بال جھانکا کرتے تھے۔ اس وقت تو گہرے نیلے سوٹ کے نیچے ہلکے سفید رنگ کی ریشمی قمیض تھی جس کے ساتھ گردن میں نفاست سے بندھی ہوئی سرخ پھولدار ٹائی لٹک رہی تھی۔ نواب ٹن کے علاوہ سب ہلکے سبز رنگ کے

چمڑے کے آرام دہ صوفوں پر پھیلے بیٹھے تھے۔ صرف نواب ٹن کرسی پر بیٹھا تھا۔ شاید ابھی صوفے تک اس کی ترقی نہیں ہوئی تھی۔ اکبر خان کی انگلیوں میں سگار دبا ہوا تھا اور اسی کے ساتھ بیٹھا ہوا قریشی آنکھوں پر نصف شیشوں کی پڑھنے والی عینک لگائے اس فائل میں غرق تھا جو اس کی گود میں کھلی ہوئی رکھی تھی۔ قریشی کے برابر پڑی ہوئی چھوٹی سی میز پر فیتہ بندھی ہوئی فائلوں کا انبار تھا۔ دو نشستی صوفے پر کندھے سے کندھا ملائے ہوئے جنرل اسلم برلاس اور سیکریٹری خزانہ اختیار حیدر رضوی بیٹھے تھے۔ اکبر خان کے بعد حیدر نوکر شاہی کا سب سے بااثر شخص تھا اور بیورو کریٹ اسے اپنا گاڈ فادر کہتے تھے۔ ان کے ساتھ ایل بناتے ہوئے صوفے پر ایجنسی کا سابق سربراہ جنرل سعید ملک تھا اور اس کے ساتھ جو بیٹھا تھا اسے دیکھ کر جلالی کو سخت حیرت ہوئی تھی۔ جلالی اسے اچھی طرح پہچانتا تھا۔ شفیع رضا کوئی بیس برس پہلے اس وقت کی حکومت میں سینئر وزیر تھا۔ لیکن حکومت جاتے ہی وہ بھی کہیں غائب ہو گیا تھا۔ جلالی کو کسی نے بتایا تھا کہ وہ اور اس کی غیرملکی بیوی دونوں سی آئی اے کے کل وقتی ملازم تھے اور امریکی ایجنسی کے سینئر افسران میں سے تھے

"تو کیا آج بھی...... کیا آج بھی پاکستان کے کیس منیجر وہی ہیں؟" جلالی نے اپنی سوچوں کی اڑان کو روک کر اپنی توجہ پھر اندر بیٹھے ہوئے لوگوں پر مرکوز کر دی۔

جلالی ان دونوں کے چہرے اچھی طرح نہیں دیکھ سکتا تھا جو اس صوفے پر بیٹھے تھے جس کی پشت اس کھڑکی کی طرف تھی جس کے ٹوٹے ہوئے شیشے سے جلالی اندر کا منظر دیکھ رہا تھا۔ فلک پیر کو تو جلالی پہچان گیا تھا۔ اس نے گردن ایک بار دائیں طرف موڑی تھی تو مونچھوں سمیت اس کا بہت جانا پہچانا پروفائل نظر آ گیا تھا۔ شکل نظر نہ آتی تب بھی سگار پینے کے انداز سے اسے پہچاننا آسان تھا۔ لیکن اس کے ساتھ جو بیٹھا تھا اس میں جلالی کو شناسائی کی کوئی چمک نظر نہیں آئی۔ وہ ایک بار ڈرنک بنانے سامنے رکھی ہوئی ٹرالی کی طرف گیا تھا۔ واپس اپنی نشست کی طرف آیا تو جلالی نے اس کا پورا سراپا دیکھا تھا لیکن پھر بھی نہیں پہچان سکا تھا۔ انداز میں بہت لاپرواہی تھی۔ لباس میں بھی بے تکلفی برتی تھی، قمیض کے اوپر کے دو بٹن کھلے تھے۔ گرے

پتلون پر سیاہ رنگ کی اسپورٹس جیکٹ پہنے ہوئے تھا۔ تراش خراش کسی بڑے یورپی ڈیزائنر کی چغلی کھا رہی تھی۔ اس کی بول چال اور نقل و حرکت میں جو رکھ رکھاؤ تھا وہ جنرلوں اور کمرے میں بیٹھے ہوئے اعلیٰ افسروں سے بالکل مختلف تھا۔ اس میں نہ دیہاتی پن کا شائبہ تھا نہ نقالی کی جھلک۔ اس کا نام عارف علی لیا گیا تھا۔ جلالی کو یقین تھا عارف علی پاکستان کا وہی عدنان خشوگی تھا جس کے بارے میں ایک دفعہ نواب ٹن کچھ بتاتے بتاتے رک گیا تھا۔ نواب ٹن نے غلط نہیں کہا تھا۔ وہ بتا بھی دیتا تو عارف علی کا نام جلالی کے لئے کوئی معنی نہ رکھتا۔

جلالی نے جس وقت سننا شروع کیا اس وقت موضوع نواب ٹن تھا۔ اکبر خان گھٹنے پر رکھی ہوئی اپنی ٹانگ ہلاتے ہوئے سب کو بتا رہا تھا۔

"نواب ٹن سے ہم سب بہت برسوں سے واقف ہیں۔ وہ انٹرکان کے زمانے سے ہماری ملاقاتوں کا انتظام کر کے انہیں خفیہ رکھنے کی ذمہ داری سنبھالے ہوئے ہیں۔ انہیں آج ہم پہلی بار میٹنگ روم میں لے کر آئے ہیں۔ اس کی وجہ پر ہم پچھلے اجلاس میں بات کر چکے ہیں۔ ہم میں سے اکثر ریٹائر ہونے والے ہیں اور ہمیں اب نئے بااعتماد اور کارآمد لوگوں کی ضرورت ہے۔ دو تین اور ہیں جو قریشی کے انڈر اسٹڈی تھے۔ آخری جانچ پڑتال کے لئے ان کی فائلیں اگلے ہفتے جنرل سعید کو مل جائیں گی۔" اکبر خان نے سب کے چہروں کی طرف دیکھا لیکن کسی کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ یہ شاید ایسا مسئلہ نہیں تھا جو ان میں سے کسی کے لئے اہم ہوتا۔ اکبر خان نے تھوڑے سے توقف کے بعد پھر بولنا چاہا لیکن اس سے پہلے جنرل سعید ملک بول پڑا۔

"نواب کو ایک ہفتے کی ٹریننگ کے لئے ورجینیا بھیجنا پڑے گا۔ سیکوریٹی اب صرف پہریداری کا نام نہیں رہی ہے۔ یہ الیکٹرانک کا زمانہ ہے۔"

"میرے الیکٹرانک ماہرین ہر اجلاس سے پہلے Bugs تلاش کرنے کے لئے ایک ایک چپے کو چھانتے ہیں۔ ٹیلی فون تک "Unhook" کر دیتے ہیں۔ میں نے پہلے بھی قریشی صاحب کو بتایا تھا کہ......"

"مجھے معلوم ہے۔" جنرل سعید نے نواب ٹن کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔
" بگس پتھر کے زمانے کی چیز ہو گئے ہیں۔ مواصلاتی رابطے اب انفراریز ڈال کر حاصل ہو جاتے ہیں۔ آپ کے جو ماہر ہیں میں انہیں جانتا ہوں۔ ان کی مہارت اب قابل بھروسہ نہیں رہی۔ آپ نئے زمانے کے ماہرین کے ساتھ ایک ہفتہ گزار کر آیئے' آپ کے چودہ طبق روشن ہو جائیں گے۔" نواب ٹن نے کچھ کہنا چاہا لیکن اکبر خان نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔

"شفیع' تمہارے لوگ باہر کے آدمی کو ایک ہفتے کی ٹریننگ دینے پر تیار ہو جائیں گے۔" اکبر خان نے شفیع رضا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے اپنے بالوں پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔

"میں افغان ڈیسک کے ذریعے انتظام کر سکتا ہوں۔" شفیع رضا کے بولنے سے پہلے جنرل سعید ملک بول پڑا۔

"نہیں' اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ انتظام ہو جائے گا۔ لیکن ورجینیا میں نہیں۔ کہیں اور۔" شفیع رضا نے کہا اور پہلے کی طرح اطمینان سے اپنے سفید ہوتے ہوئے گھنے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرنے لگا۔

"نواب صاحب کو ایک بات اور سیکھنی پڑے گی۔" اس دفعہ عارف علی بولا تھا۔ سب ہمہ تن گوش ہو گئے۔ اکبر خان نے بھی حیرت سے عارف علی کو دیکھا۔ نواب ٹن کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں ابھر آئی تھیں۔

"ہم اپنے روایتی ذرائع سے بے وفائی نہیں کر سکتے۔" عارف علی نے اکبر خان کو دیکھتے ہوئے کہا۔ اس نے نواب ٹن پر نظر بھی نہیں ڈالی تھی۔ "افغانستان کے لئے میزائل خریدنے کا ٹھیکہ نواب صاحب کو دلوایا گیا تھا۔ وہ یورپ چھوڑ کر برازیل چلے گئے۔ ہمارے دوست سخت ناراض ہیں۔"

"میزائل کی ساخت اور معیار میں کوئی فرق نہیں تھا۔ میں نے ماہرین کو برازیل بھجوا کر آزمائش بھی کرائی تھی۔ لیکن قیمت میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ میں نے قریشی صاحب کو بتا کر ان کی منظوری لی تھی۔ قیمتوں کے فرق سے جو اضافی منافع

ہوا تھا وہ بھی میں نے......۔"

"اس سودے میں الگ سے پرائس لوڈنگ بھی ہوئی تھی۔" عارف علی نے نواب ٹن کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ لیکن اس دفعہ بھی نواب ٹن کی طرف نہیں دیکھا تھا بلکہ نظریں قریشی پر گاڑ دی تھیں۔ "مجھے نہیں معلوم کہ بیچ کے آدمی نے یا کسی اور نے۔ لیکن کسی نے کئی کروڑ روپے کا جیب خرچ الگ سے بھی وصول کیا ہے۔" نواب ٹن نے ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہوئے پھر کچھ کہنا چاہا لیکن، اس سے پہلے قریشی بول پڑا۔

"اس طرح کے سودوں میں پرائس لوڈنگ معمول کی بات ہے۔ یہ میزائل ہائی ٹیک نہیں تھے نہ ان پر کسی کی اجارہ داری تھی۔ دو روپے کی چیز ہم نے دس روپے کی بجائے تین میں خریدی تو یہ نقصان کا سودا نہیں تھا۔ وہ انتخابات کا زمانہ تھا۔ جو پیسے ہمیں بچے تھے ان سے ہم نے اپنے کئی آدمی کامیاب کرائے تھے۔" قریشی کی بات ختم ہوئی تو نواب ٹن کے چہرے کی رنگت بھی واپس آ گئی۔ لیکن فوراً ہی دوبارہ رخصت ہو گئی۔

"ملک کی سلامتی دکانداری کا سودا نہیں ہے۔" جنرل اسلم برلاس اپنی گرجدار آواز میں کہہ رہا تھا۔ "پرانے ذرائع ہمارے آزمائے ہوئے ہیں۔ ہم صرف میزائلوں کی قیمت نہیں دے رہے' بھروسے کے پیسے دے رہے ہیں۔ برازیل ہمیں میزائل بیچ کر اس کی پوری فائل اب تک بھارت کو دے چکا ہو گا۔ ہمارے خریدے ہوئے میزائل کل ہمارے اپنے سروں پر گریں گے۔ دفاعی سودوں میں آئندہ کوئی بنیا بننے کی کوشش نہ کرے۔" جنرل نے فیصلہ سنا دیا۔ قریشی نے نظریں جھکا لی تھیں۔

"ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہئے کہ میزائلوں کو خریدنے کے پیسے کس نے دیئے تھے۔" جنرل کے برابر میں بیٹھے ہوئے سیکرٹری خزانہ نے ٹکڑا لگایا۔

"ٹھیک ہے' دفاعی سودوں میں اب قیمتوں کو نہیں پرانے رابطوں کو ترجیح دی جائے گی۔" اکبر خان بات ختم کرتے ہوئے عارف سے مخاطب ہو گیا۔ "ایئرپورٹ کے ٹھیکے کا معاملہ طے ہوا یا نہیں؟"

"عامر نذیر پھر روڑے اٹکا رہا ہے۔ وہ اگر وزیراعظم رہا تو پھر یہ ٹھیکہ آصفہ کی بنائی ہوئی کمپنی کے ذریعے طے ہو گا۔ ہمارے ہاتھ ایک نیا پیسہ نہیں آئے گا۔" عارف علی سے پہلے سیکریٹری خزانہ حیدر رضوی بول پڑا۔

"کمیشن کی خبر لیک ہو گئی ہے۔ میں نے سنا ہے آصفہ نے آپ کے پاس بھی کسی کو بھجوایا تھا۔" قریشی نے عارف علی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"اس کے آدمی میرے پاس پیغام لے کر آئے تھے' میں نے انہیں بتا دیا ہے کہ جو قیمت طے ہوئی ہے اس میں کمیشن شامل نہیں ہے۔ کمیشن کے لئے انہیں قیمت بڑھانی پڑے گی۔ لیکن آصفہ ایک دوسری کمپنی سے بات کر رہی ہے۔" عارف علی نے بتایا۔

"یہ عامر نذیر اور اس کے گھر کی کھیتی نہیں ہے۔ یہ بین الاقوامی معاہدوں کا معاملہ ہے۔ معاہدہ طے ہوا ہے۔ اس پر دستخط ہو چکے ہیں۔ عامر نذیر یا آصفہ اب کچھ نہیں کر سکتے۔" اختیار حیدر نے اونچی آواز میں کہا۔

"وزیراعظم انتظامی سربراہ ہے۔ اسے ویٹو کرنے کا حق ہے۔" قریشی نے کہا۔

"کیسا حق۔ کس کا حق۔ میں عامر نذیر کی گدی پکڑ کر اسے وزیراعظم ہاؤس سے باہر پھینک سکتا ہوں۔ یہ کمیشن کا نہیں ملک کے مفاد اور اس کی سلامتی کا معاملہ ہے۔ ایئرپورٹ کا ٹھیکہ آصفہ کے ذریعے ہوا تو دوسرے دن اس کا بلیوپرنٹ راجیو گاندھی کی میز پر رکھا ہو گا۔" جنرل اسلم برلاس کی آواز گونجی۔ اختیار حیدر اور عارف علی زور زور سے سر ہلانے لگے تھے۔

"میں نے پہلے بھی منع کیا تھا کہ عامر نذیر کی مصیبت ہمارے سر پر نازل نہ کریں۔ ہماری نظریاتی سرحدیں خطرے میں پڑ جائیں گی۔ مجھے ایجنسی کے تین ہزار لوگوں کا نیٹ ورک ان کی دسترس سے محفوظ رکھنے کے لئے انڈر گراؤنڈ لے جانا پڑا تھا۔ آپ سب کو پتہ ہے کہ سب کچھ کتنا مشکل تھا۔ خود مجھے بھی ریٹائرمنٹ لینی پڑی تھی۔ شفیع رضا آپ بتائیں ہم کیا کریں۔ یہ مصیبت آپ کے کہنے پر سوار کی گئی تھی۔" جنرل سعید ملک نے کہا۔

"اس وقت کے حالات یہی تھے۔ آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ ایسا نہ ہوتا تو کیا ہوتا۔" شفیع رضا نے جنرل سعید کو مخاطب کئے بغیر اکبر خان کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"اس بحث کا اب کوئی فائدہ نہیں ہے۔ یہ بحث ہم پہلے بھی کئی بار کر چکے ہیں۔" اکبر خان نے بحث ختم کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ "پچھلے اجلاس میں ہم نے فیصلہ کر کے عمل درآمد روک دیا تھا' ہمارا خیال تھا کہ صورتحال میں شاید کوئی تبدیلی آئے گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ عامر نذیر اور آصفہ پلاٹوں اور ٹھیکوں کی حدود پھلانگ کر دفاعی معاملات میں ٹانگ اڑانے لگے ہیں۔ انہوں نے میری مخالفت کے باوجود نئی تقرریاں کی ہیں' وہ بھی ہمارے مفادات کو نقصان پہنچائیں گی۔ ہمارے مفاد کو نقصان پہنچا تو ملک کا مفاد بھی محفوظ نہیں رہے گا۔ ہمارے پاس اب کوئی اور طریقہ نہیں ہے۔ رضا' آپ کے لوگ کیا کہتے ہیں۔ پچھلی بار آپ نے کہا تھا کلیئرنس لے کر آئیں گے۔"

"میں نے یہاں آنے سے پہلے اپنے سفیر سے تفصیلی بات کی تھی۔ ان کا بھی یہی خیال ہے کہ یہ پاکستان کے اندرونی معاملات ہیں۔ ہمیں مداخلت کا حق نہیں ہے۔ فیصلہ کرنے کا اختیار آپ کو ہے۔ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ جمہوری عمل کو نقصان نہ پہنچے یا تبدیلی کے لئے غیر آئینی طریقہ اختیار نہ کیا جائے۔" شفیع رضا نے محتاط لہجے میں جنرل اسلم برلاس کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہمیں حکومت کرنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ آپ جانتے ہیں ہمیں ایسا کرنا ہوتا تو پہلے ہی معاملات اپنے ہاتھ میں لے لیتے۔ لیکن ہم ملکی مفادات کو بھینٹ چڑھتا ہوا بھی نہیں دیکھ سکتے۔" جنرل برلاس نے شفیع رضا کی طرف دیکھ کر نرم لہجے میں کہا۔

"اس مسئلے پر نئے سرے سے بحث کی ضرورت نہیں ہے۔" اکبر خان نے سب کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "پچھلی بار جس طرح طے ہوا تھا سب کچھ اسی طرح ہو گا۔ ہم ریاض توصیف کے ذریعے عدم اعتماد کی کوشش کریں گے۔ عارف علی دس کروڑ روپے پیر صاحب کو پہنچائیں گے جو ریاض توصیف سے رابطے کے ذمے دار ہوں گے۔"

"دس کروڑ کافی نہیں ہوں گے۔" فلک پیر نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ "عامر نذیر دولت کی پوری طاقت لے کر آئے گا۔ بیس کروڑ سے کم میں کام نہیں ہو گا۔"

"ایئر پورٹ کا ٹھیکہ ابھی تک خطرے میں ہے۔ پھر بھی عارف دس کروڑ روپے دے رہے ہیں۔ جنرل سعید کے ایجنسی کے تین ہزار لوگوں کے نیٹ ورک کا خرچ ہم لوگ سنبھال رہے ہیں۔ مزید دس کروڑ نکالنے آسان نہیں ہوں گے۔" اختیار حیدر نے عارف علی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ ڈھائی کروڑ روپے نواب دیں گے۔ مختلف فنڈز کے ذریعے ڈھائی کروڑ روپے کا انتظام قریشی کو کرنا ہو گا۔ پانچ کروڑ روپے جنرل برلاس اس بینک سے نکلوائیں گے جسے انہوں نے بہت سے ڈپازٹس دلوائے ہیں۔" سب لوگوں نے اپنے اپنے سر ہلا دیئے تھے۔

"پھر بھی مجھے عدم اعتماد کی کامیابی یقینی نہیں لگتی۔" عارف علی نے کہا۔ اختیار حیدر بھی سر ہلانے لگا تھا۔

"ایسا ہوا تو ہم پلان نمبر دو آزمائیں گے۔ جنرل سعید کے آدمی تیار ہیں۔ مزید ضرورت ہوئی تو یہ افغانستان سے مدد منگوا سکتے ہیں۔ میں نے وزیراعظم کے ایڈوائزر کی حیثیت سے استعفیٰ دے دیا ہے۔ صدر نے مجھے اپنا خصوصی مشیر مقرر کیا ہے۔ میری پرانی ٹیم ایوان صدر میں اپنی میزیں سنبھال لے گی۔ حکومت کے خلاف کیس بنانے کے لئے ہمیں صرف چار ہفتے چاہئیں۔ کیس مضبوط ہے۔ صدر بھی وزیراعظم سے ناراض ہیں۔ عامر نذیر نے ان کے دامادوں سے اچھا سلوک نہیں کیا ہے۔ ہم آٹھویں ترمیم کی تلوار استعمال کریں گے۔" اکبر خان نے فیصلہ سنا دیا۔

"اگر عدالت نے......" عارف علی نے کہنا چاہا لیکن جنرل اسلم برلاس نے اسے جملہ پورا نہیں ہونے دیا۔

"اس کی فکر مت کیجئے۔ ہمارا کیس بہت مضبوط ہو گا۔ ہماری عدالتیں بھی قومی مفاد کو ہر چیز سے زیادہ مقدم جانتی ہیں۔"

"ہمارے پاس کتنا وقت ہے؟" فلک پیر نے پوچھا۔

"چھ ہفتے۔ صرف چھ ہفتے۔" اکبر خان نے کہا۔ اسی وقت دلاور جلالی کی ٹانگیں ہلا کر کندھے سے نیچے اترنے کا اشارہ کرنے لگا تھا۔

"تم کیا کہہ رہے ہو۔ تمہیں کس نے بتایا ہے؟" نواب ٹن نے پوچھا۔ وہ اپنے جام کو بھول گیا تھا۔ آنکھیں جلالی کی آنکھوں میں گڑ گئی تھیں۔

"مجھے کسی نے کچھ نہیں بتایا۔" جلالی نے گلاس سے ایک گھونٹ بھر کر صورتحال کا مزا لیتے ہوئے کہا۔ "سب کچھ میں نے اپنے کانوں سے سنا اور اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ آپ کے عدنان خشوگی کو بھی دیکھا ہے اور مالش کے لئے آنے والی لڑکیوں کو بھی۔ نواب صاحب۔ آپ کا پول کھل گیا ہے۔ آج میں نے آپ کا اصلی چہرہ دیکھ لیا ہے۔"

"کس کا پول۔ کیسا اصلی چہرہ۔" سخت غصے کے باوجود نواب ٹن کی آواز اس کے قابو میں تھی۔ لہجہ برف کی طرح سرد تھا۔

"آپ کا نواب صاحب آپ کا۔" جلالی کے لہجے یں تلخی آ گئی تھی۔ "میں آپ کے لئے بہت قیمتی اثاثہ تھا۔ میرا شکار بھی آپ نے ہرن کی طرح کیا تھا۔ مانوس کرنے کے لئے بہت سا وقت ساتھ گزار کر۔ آہستہ آہستہ اعتبار جیت کر۔ میں نے اپنا سر کاٹ کر خود آپ کے ہاتھ پر رکھ دیا تھا۔ آپ کے ہاتھوں استعمال ہو کر آپ کو اپنا محسن سمجھتا رہا۔"

جلالی کو سوچ سوچ کر غصہ آ رہا تھا۔ اسے ایک ایک خبر یاد آ رہی تھی جو نواب نے اسے دی تھی۔ اس کی نگاہوں کے سامنے حقیقتیں پرت پرت ہو کر کھلنے لگی تھیں۔

"تمہیں پتہ ہے میں نے تمہیں کبھی کوئی غلط خبر نہیں دی۔ صحافت میں تمہارا نام میری دی ہوئی خبروں کی وجہ سے بڑا بنا ہے۔" نواب نے اسی طرح سرد لہجے میں کہا۔

"مجھے معلوم ہے۔ اسی لئے مجھے اپنے نام سے شرم آ رہی ہے۔" جلالی کے لہجے کی تلخی بھی اسی طرح قائم تھی۔ "صہبا خان کے بارے میں اسکینڈل چھاپ کر میں نے بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ لیکن پوری قوم ایک بڑے المیہ کو ایک بدکردار حکمران کی شراب نوشی کے سر رکھ کر دوبارہ سو گئی تھی۔ سیاستدانوں کے خفیہ اجلاس کی جو خبر آپ مجھے دینے میرے دفتر آئے تھے' اسی خبر نے آگے بڑھ کر ایک جمہوری حکومت توڑنے کی راہ ہموار کی تھی۔"

جلالی نے گلاس میں بچی ہوئی شراب ایک ہی گھونٹ میں حلق میں انڈیل لی۔ اندر سے غصہ اسی طرح ابل رہا تھا۔ نواب ٹن اسی طرح خاموشی سے اسے گھورے جا رہا تھا۔ جلالی نئے جام سے ایک اور گھونٹ لے کر دوبارہ بولنے لگا۔

"مجھے پتہ ہے آپ مجھے بیگم ٹین پرسنٹ کی جو کہانیاں سنائیں گے وہ سو پرسنٹ صحیح ہوں گی۔ آپ کے طفیل اخباروں میں میرے نام کا جھنڈا ایک بار پھر اونچا ہو جائے گا۔ اس کے بعد دوسرے سارے اخباروں میں بیگم ٹین پرسنٹ کی کہانیاں چھاپنے کی دوڑ شروع ہو جائے گی۔ اور چھ ہفتوں بعد جب آٹھویں ترمیم سے حکومت کا سر قلم ہو رہا ہو گا تو ماحول بن چکا ہو گا۔ عام آدمی اس قتل کو واجب قرار دے رہا ہو گا۔"

"مجھے خبر چھپوانے کے لئے کسی کو پالنے کی ضرورت نہیں تھی۔ تمہارے پیشے میں دو پیگ پی کر خبریں چھاپنے والوں کی کمی نہیں ہے۔" نواب ٹن نے بہت چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ نظریں بدستور جلالی کے چہرے پر تھیں لیکن ذہن کسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"دو پیگ پی کر خبر چھاپنے والے تین پیگ پی کر خبر کا ذریعہ بھی بتا دیتے ہیں۔ اپنی خبر کا نتیجہ دیکھنے کے لئے آپ باقی نہیں بچتے۔" جلالی نے چہرے پر زہریلی سی مسکراہٹ لا کر کہا۔

"دغا دینی ہے تو افسانے مت تراشو۔ غداری اپنا جواز خود ہوتی ہے۔ خاموشی سے پیٹھ موڑو اور چلے جاؤ۔" نواب ٹن نے اپنا لہجہ نرم کرتے ہوئے کہا۔

"غدار تم ہو نواب صاحب۔ دغا تم نے دی ہے۔ اپنے آپ کو۔ اپنے ملک کو۔ مجھے اپنے دوست کو۔" غصے سے جلالی کی آواز اونچی ہو گئی تھی۔

"اونچا مت بولو۔" نواب سانپ کی طرح پھنکارا۔ جلالی کو ایسا لگا جیسے اس کے غصے پر کسی نے ٹھنڈا پانی ڈال دیا ہو۔ نواب جلالی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہوئے شراب کا گھونٹ لینے لگا۔ جلالی ادھر ادھر دیکھنے لگا تھا۔ تھوڑی دیر کے لئے خاموشی چھا گئی۔

"تمہیں سب کچھ کیسے معلوم ہوا؟" نواب ٹن نے اچانک ہی خاموشی کا طلسم توڑا۔

"کیا؟" جلالی جیسے چونک پڑا۔ لیکن نواب منہ سے کچھ نہیں بولا۔ نظروں کی سختی بڑھ گئی تھی۔ آنکھوں میں سرخ ڈورے نمایاں ہونے لگے تھے۔ ماتھے پر لکیروں کا جال اور گنجلک ہو گیا تھا۔

"آپ کے نوکر بھی خبرساز ہیں نواب صاحب۔ آج میں نے ان کے کندھوں پر چڑھ کر خبر کی معراج کو پا لیا ہے۔" جلالی نے مسکرا کر کہا اور بڑی لاپرواہی سے جام منہ سے لگا لیا۔ وہ اندر ہی اندر خوش ہوا تھا۔

"دلاور!" نواب ٹن نے زیر لب کہا اور ایک دم اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ جلالی کو فوراً ہی اپنی حماقت کا احساس ہو گیا۔ اسے اپنے اوپر سخت غصہ آیا۔ اس نے کسی کچے صحافی کی طرح کتنی آسانی سے خبر کا ذریعہ بتا دیا تھا۔ جلالی یہ سوچ کر ہی خوفزدہ ہو گیا کہ نواب ٹن دلاور کے ساتھ کیا برتاؤ کرے گا۔

"دلاور اور خانساماں کو کچھ پتہ نہیں۔ میں نے ان کے صرف کندھے استعمال کئے تھے۔" جلالی نے تیزی سے کہا۔

"خانساماں بھی!" نواب ٹن نے جیسے اپنے آپ سے کہا اور کمرے سے باہر جانے کے لئے قدم بڑھا دیئے۔ جلالی نے ایک بار پھر سوچا کہ دیوار سے سر ٹکرا دے۔ وہ اتنا بیوقوف کیوں ہو گیا ہے۔ غلطی کا احساس ہونے کے بعد خانساماں کا نام لے کر اس نے ایک اور غلطی کی تھی۔

"نواب صاحب، انہیں کچھ مت کہنا۔ میں نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ ان کے بارے میں آپ کو نہیں بتاؤں گا۔" جلالی کی التجا کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ نواب نے جیسے سنا ہی نہیں تھا۔ وہ پلٹے بغیر کمرے سے باہر نکلنے کے لئے دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

"نواب صاحب، اگر آپ نے دلاور یا خانساماں سے کچھ کہا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔" جلالی نے مجبوراً" صحافیوں والی کھوکھلی دھمکی استعمال کی۔ نواب ٹن دروازے تک پہنچ کر رک گیا۔ جلالی کی طرف مڑا تو اس کے چہرے پر بلا کی سنجیدگی تھی۔

"یہ کیڑے مکوڑوں کے بارے میں سوچنے کا وقت نہیں ہے۔ ارمان گل کی نو اولادیں ہیں۔ ایک دلاور کے کم ہونے سے کسی کو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ مسئلہ تمہاری جان بچانے کا ہے۔" نواب نے کہا اور پلٹ کر دروازہ کھولنے لگا لیکن کچھ سوچ کر پھر رک گیا۔

"میرے واپس آنے تک اسی کمرے میں میرا انتظار کرنا۔" نواب یہ کہہ کر اپنے پیچھے کمرے کا دروازہ بند کرتا ہوا چلا گیا۔ جلالی کے اندر ایک ٹھنڈی سی لہر دوڑ گئی۔ لیکن پھر غصہ ابلنے لگا۔ "یہ سمجھتے ہیں کہ خدا ہو گئے ہیں۔ جس کو چاہے سولی پر چڑھا سکتے ہیں۔" اس نے سوچا اور تیزی سے اپنا جام ختم کرنے لگا۔ اس کا نواب ٹن کی ہدایت پر عمل کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ آج رات گھر جا کر پوری کہانی لکھے گا۔ کل صبح دفتر جاتے ہی خبر ایڈیٹر کے ہاتھ میں خود دے گا۔ اتنی بڑی تہلکہ مچانے والی خبر کے لئے خصوصی ایڈیشن کی ضرورت ہو گی۔ ہو سکتا ہے ایڈیٹر ضمیمہ نکالنے پر تیار ہو جائے۔

جلالی گلاس خالی کر کے اٹھا۔ باہر جانے کے لئے اس نے کمرے کا دروازہ کھولا لیکن باہر وہی طویل قامت پہریدار کھڑا تھا جسے اس نے شام کو اندر آتے وقت گیٹ پر دیکھا تھا۔ جلالی کو دیکھتے ہی وہ رائفل پر گرفت مضبوط کر کے اٹینشن ہو گیا۔ باہر نکلنے کے راستے میں وہ دیوار کی طرح حائل تھا۔ جلالی سمجھ گیا کہ دیوار سے ٹکرانا بیکار

ہو گا۔ اسے نواب ٹن کے واپس آنے تک قید رہنا ہو گا۔ اور نواب ٹن کے آنے کے بعد...... اس کا سر گھومنے لگا۔ وہ دروازہ بند کر کے دوبارہ کمرے کے اندر آگیا۔ لیکن بیٹھا نہیں اور جوتوں سمیت کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اسے پرواہ نہیں تھی کہ تھر کی کنواریوں کے آنسو اس کے جوتوں کے نیچے کچلے جا رہے ہیں۔ اس کا دل چاہا کہ شیر شاہ سوری کے قہوے کے پیالے کو اٹھا کر دیوار پر مار کے توڑ دے۔ اسے چھینکے میں ٹنگے ہوئے گوتم بدھ کی مسکراہٹ میں بھی عیاری کی جھلک نظر آ رہی تھی۔ اس نے سوچا کہ اپنی حفاظت کے لئے دیوار سے بلوچی خنجر اتار لے یا دیوار پر لٹکی ہوئی تلوار ہاتھوں میں لے کر دروازے پر کھڑے ہوئے دشمن سے لڑتا ہوا باہر نکل جائے۔ لیکن وہ بلوچی لوک کہانی یا اسلامی تاریخی ناول کا ہیرو نہیں تھا۔ اسے پتہ تھا نواب ٹن کے واپس آنے تک اسی کمرے میں بیٹھنا اور یہ انتظار کرنا ہے کہ وہ اس کی قسمت کا کیا فیصلہ لے کر آتا ہے۔

نواب ٹن دو گھنٹوں بعد واپس آیا تھا۔ اس وقت تک جلالی دیوار سے کمر لگا کر بیٹھا ہوا ٹھنڈے دماغ سے صورتحال پر غور کر رہا تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس سے بہت بڑی غلطی ہوئی تھی۔ یہ کوئی روزمرہ کی سیاسی کہانی یا سازشی سیاستدانوں کا معمولی ٹولہ نہیں تھا۔ یہ ملکوں اور حکومتوں کا سودا کرنے والے لوگ تھے۔ یہ اقتدار کا کھیل کھیلنے والوں کا مافیا تھا۔ اتنی بڑی بازی کھیلنے والوں کے لئے دوستیاں' رشتے' انسانی تعلقات بے معنی جذبے تھے۔ وہ لاشوں کو بے رحمی سے روند کر گزر جانے والے سفاک لوگ تھے۔ جلالی کو نواب ٹن کے سامنے زبان کھولنی ہی نہیں چاہئے تھی۔ وہ بھی انہیں میں سے ایک تھا۔ وہ نواب ٹن کو ان سب کے سامنے ہاتھ باندھے بیٹھا دیکھ چکا تھا۔ نواب ٹن اس مافیا کا حصہ ہی نہیں ان کے راز کی حفاظت کرنے والا پہریدار بھی تھا۔ جلالی بلا اجازت ان کی حدود میں جا کودا تھا۔ اس نے رپورٹروں کا یہ زریں اصول بھی توڑا تھا کہ لکھنے اور چھپنے سے پہلے خبر کو زبان سے مت بولو۔ اسے خاموشی سے اپنی ڈرنک ختم کر کے کچھ کہے بغیر چلے جانا چاہئے تھا۔ وہ خبر کا دھماکہ کر

کے نواب ٹن سے اپنی دوستی کا حساب چکا سکتا تھا۔ اس نے اپنی بیوقوفی سے خبر کو قتل کر دیا تھا۔ خبر کے ذریعوں کو افشا کر کے ان کی ہلاکت کا سامان فراہم کر دیا تھا۔ اس نے خود اپنی جان کو بھی خطرے میں ڈال دیا تھا۔ جلالی یہ سب کچھ سمجھتا تھا لیکن نواب ٹن کو ان سب کے ساتھ شریک دیکھ کر توازن کھو بیٹھا تھا۔ نواب ٹن کی دوستی جلالی کی زندگی کا ایک اہم حصہ تھی۔ نواب ٹن کی شخصیت کا پیکر ان کہانیوں نے تراشا تھا جو اس کمرے میں چاروں طرف رکھی اور لٹکی ہوئی تھیں۔ وہ پیکر ٹوٹا تو جلالی کے اندر بھی بہت کچھ ٹوٹ گیا۔

نواب ٹن واپس آیا تو وہ ایک بار پھر اسی سوٹ اور ٹائی میں تھا جو پہن کر اقتدار مافیا کے اجلاس میں بیٹھا تھا۔ اقتدار مافیا کے محافظوں کی حیثیت سے یہ شاید اس کی یونیفارم تھی۔ سر کے بال بھی کنگھی کر کے سلجھائے گئے تھے۔ نواب ٹن کمرے کے اندر نہیں آیا۔ دروازہ کھول کر جلالی کو دیکھنے لگا۔ جلالی خاموشی سے اٹھ کر کمرے سے نکل آیا۔ باہر پہریدار نہیں تھا۔ نواب ٹن نے شاید دروازہ کھولنے سے پہلے اسے ہٹا دیا تھا۔ کمرے سے نکل کر جلالی سوالیہ نظروں سے نواب ٹن کی طرف دیکھنے لگا۔ نواب ٹن کچھ بولے بغیر جلالی کی کمر میں ہاتھ ڈال کر مکان کے اندر ڈرائنگ روم کی طرف چل دیا۔ یہ بہت نرم اور دوستانہ گرفت تھی۔ جلالی مزاحمت کئے بغیر اس کے ساتھ قدم ملا کر چلنے لگا۔ اس کے اندر کا راجپوت اور وہ صحافی بیدار ہو گیا تھا جسے ڈر اور خوف کا جذبہ چھو کر نہ گزرا تھا۔ اسے دیکھنا تھا نواب ٹن کا اقتدار مافیا اس کے معاملے میں کس حد تک جا سکتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ نواب ٹن میں بڈھوں کو مالش کرتی ہوئی لڑکیوں کے نیچے سے کھینچنے کی ہمت نہیں ہوئی ہو گی۔ اسے فیصلہ خود کرنا ہو گا۔ اسی لئے وہ ڈرائنگ روم کے سنجیدہ اور رسمی ماحول میں لے جا کر بات کرنا چاہتا ہو گا۔ لباس اور چہرے کی سنجیدگی اور بازو کی دوستانہ گرفت یہی بتا رہی تھی۔ لیکن جلالی نے ایک بار پھر معاملے کی سنگینی کو کم سمجھنے کی غلطی کی تھی۔ جلالی نواب ٹن کے ساتھ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو قریشی مرکزی صوفے پر بیٹھا پائپ کے کش لے رہا تھا۔

جلالی ایک لمحے کے لئے ٹھٹکا لیکن پھر قریشی کی طرف بڑھ گیا جس نے کھڑے ہو کر مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھا دیا تھا۔ جلالی نے ہاتھ ملایا اور قریشی اسے بیٹھنے کا اشارہ کر کے دوبارہ اپنی نشست پر گر گیا۔ جلالی کے بعد نواب ٹن بھی اس کے سامنے رکھے ہوئے دوسرے صوفے پر بیٹھ کر سگریٹ سلگانے لگا۔ اس نے جلالی کو بھی سگریٹ پیش کی تھی لیکن جلالی نے لئے اور کچھ کہے بغیر جیب سے اپنی سگریٹ نکال کر سلگا لی تھی۔ کمرے میں تھوڑی دیر کے لے مکمل خاموشی چھا گئی۔ جلالی کو لگا جیسے وہ عدالت میں بیٹھا ہوا کوئی مجرم ہو۔ گواہیاں ہو چکی ہوں۔ بیان دیئے جا چکے ہوں۔ دلائل مکمل ہو گئے ہوں اور اب فیصلے کا انتظار ہو۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ فیصلہ کرنے کا اختیار نواب ٹن کے پاس نہیں ہو گا۔ ایک صحافی پر اقتدار مافیا کا راز افشا ہو گیا تھا۔ اتنے سنگین معاملے پر قریشی جیسا بااختیار شخص ہی فیصلہ کر سکتا تھا۔ جلالی کا خیال ایک بار پھر غلط تھا۔ فیصلہ کرنے کا اختیار قریشی کو بھی نہیں تھا۔

"جلالی صاحب! آپ نے ہمیں بہت مشکل میں ڈال دیا ہے۔" قریشی نے بجھا ہوا پائپ منہ سے نکال کر خاموشی توڑی۔ پچھلے ایک گھنٹے میں آپ کا مسئلہ حل کرنے کی کوشش کئی بڑے لوگوں کے آرام میں مخل ہوئی ہے۔"

"میری سمجھ میں نہیں آیا مسئلہ کیا ہے۔ میں صحافی ہوں اور خبروں کی تلاش میں رہتا ہوں۔ آپ لوگوں کا کام خبروں کو راز بنا کر ان کی حفاظت کرنا ہے۔ کبھی جیت ہماری ہوتی ہے اور کبھی آپ کی۔ یہ ایک معمول کا قصہ ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا وہ کون سی نئی بات ہوئی ہے جو آپ کی رات کی تفریحات میں مخل ہوئی ہے۔" جلالی خود پر پوری طرح قابو پا چکا تھا۔ اس کا اعتماد بحال ہو گیا تھا۔

"کوئی نئی بات نہیں ہوئی۔" قریشی جلالی کے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ "یہ کوئی ایسا مسئلہ بھی نہیں تھا کہ نواب صاحب کو لباس بدلنا اور مجھے اپنی تفریح ترک کرنا پڑتی۔ یہ ان پہریداروں کے حل کا مسئلہ تھا جو اسی کام کے لئے یہاں رکھے گئے ہیں۔"

"قریشی صاحب، آپ مجھے دھمکی دے رہے ہیں۔ میں کوئی راہ چلتا بے نام

شخص نہیں ہوں۔ ایک بڑے اخبار کا صحافی ہوں۔ مجھے مار کر آپ بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالیں گے۔ اتنا ہنگامہ ہو گا کہ چھپنے کی جگہ نہیں ملے گی۔" جلالی کی آواز اونچی ہو گئی۔

"ایسی خوش فہمی میں کبھی مت رہئے گا۔" قریشی نے اسی طرح پرسکون لہجے میں کہا۔ "آپ ابھی اتنے بڑے صحافی نہیں ہوئے۔ ہو بھی جائیں تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ بڑے بڑے چیتھڑے ہو کر بکھر چکے ہیں۔ پہلے بھی کوئی طوفان نہیں آیا۔ اب بھی نہیں آئے گا۔" قریشی بہت اطمینان سے پائپ میں نیا تمباکو بھر رہا تھا۔ جلالی یہ سوچ کر کانپ گیا کہ کیا جہاز کا دھماکہ بھی انہی لوگوں نے...... غصہ ایک بار پھر اس کے سر پر چڑھنے لگا۔ اس نے کچھ بولنا چاہا لیکن قریشی نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔

"یہ بحث کا وقت نہیں ہے۔ ہم آپ کو ضائع نہیں کرنا چاہتے۔ ہمیں نواب ٹن کی بات سے پورا اتفاق ہے کہ آپ ہمارے لئے ایک قیمتی اثاثہ ہیں۔ آپ....."

"میں آپ کی جاگیر نہیں ہوں۔" جلالی نے قریشی کی بات کاٹتے ہوئے غصے سے کہا۔ "آپ مجھے بے خبری میں جتنا استعمال کر سکتے تھے کر چکے۔ میں اب آپ کا کھلونا نہیں بنوں گا۔ میں اپنا مالک خود ہوں۔ میں کسی کا اثاثہ نہیں ہوں۔"

"اس وقت تو آپ ہمارے لئے ایسا ٹائم بم بن گئے ہیں جو اگر پھٹ گیا تو ہمارے جسم پر بھی خراشیں آ سکتی ہیں۔ آپ کا ہم سے بہت فاصلے پر رہنا ضروری ہے۔" قریشی نے پائپ سلگانے کے لئے توقف کیا۔ شاید وہ فیصلہ سنانے سے پہلے کچھ سوچنا چاہتا تھا۔ ایک گہرا کش لے کر دھوئیں کا غبار باہر نکالتے ہوئے اس نے جلالی کی قسمت کا فیصلہ بھی اگل دیا۔

"آپ کو ملک سے باہر جانا ہو گا۔ کل صبح کی پرواز پر آپ کی نشست پکی ہو گئی ہے۔ چند مہینے تک آپ ملک واپس نہیں آ سکیں گے۔" جلالی یہ سنتے ہی جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔ غصے سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"آپ کون ہیں مجھے میرے ہی ملک سے نکالنے والے۔ میں کہیں نہیں صرف اپنے گھر جاؤں گا۔ آپ کو جو کرنا ہے کر لیجئے۔" جلالی نے یہ کہہ کر جانے کے لئے

قدم اٹھایا ہی تھا کہ نواب ٹن نے آگے بڑھ کر اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر دوبارہ بٹھا دیا۔ جلالی کوئی مزاحمت کئے بغیر بیٹھ گیا۔ لیکن آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں۔ قریشی پائپ کے کش لیتے ہوئے دوبارہ بولنے لگا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس نے کچھ سنا نہ ہو۔

"صبح سات بجے پی آئی اے کی پرواز سے آپ استنبول جائیں گے۔ جہاں سے ہنگیرین ایئر لائنز آپ کو بڈاپسٹ لے جائے گی۔ آپ کو ہنگری میں پاکستان کا کلچرل اتاشی مقرر کیا گیا ہے۔ کلچرل سیکرٹری اعوان نے آپ کے کاغذات تیار کرنے کے لئے دے دیئے ہیں۔ صبح وزیراعظم سے ان کی رسمی منظوری بھی لے لی جائے گی۔ آپ کے بڈاپسٹ پہنچنے تک ہر چیز تیار ہو جائے گی۔ آپ کا ڈپلومیٹک پاسپورٹ بھی آپ کو وہیں ملے گا۔ فی الحال آپ اپنا سفر اپنے پاسپورٹ پر کر سکتے ہیں۔ ہنگری میں ابھی دن کا وقت ہے۔ دفاتر کھلے ہوئے ہیں۔ وہاں ہمارا سفارتخانہ آپ کے پہنچنے سے پہلے تمام رسمی کارروائیاں مکمل کر لے گا۔ استنبول میں ایئر پورٹ پر ہمارا ایک افسر آپ کو بڈاپسٹ کی پرواز میں سوار کرائے گا۔ بڈاپسٹ میں سفارتخانے کے لوگ آپ کو لینے آئیں گے۔ یہاں سے نواب ٹن آپ کو اپنے فلیٹ لے جائیں گے۔ سامان باندھنے میں آپ کی مدد کریں گے اور ایئرپورٹ پر آپ کو جہاز میں سوار بھی کرائیں گے۔ آپ کو کہیں کوئی پریشانی نہیں ہو گی۔"

قریشی خاموش ہو کر دوبارہ اپنے پائپ کے کش لینے لگا۔ جلالی اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ قریشی کسی ٹریول ایجنٹ کی طرح اس کے سفر کا پروگرام سنا رہا تھا' جیسے جلالی نے خود اس سے پروگرام بنانے کی درخواست کی ہو۔

"میں آپ کی اس مہربانی کو قبول کرنے اور اس سفر پر جانے سے انکار کر دوں تو؟" جلالی نے تھوڑی دیر تک قریشی کو گھورنے کے بعد پوچھا۔

"تو پھر وہی کرنا پڑے گا جو آپ کی جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو ہم کرتے۔" قریشی پائپ اپنے ہاتھ سے رکھ کر آگے جھک آیا اور جلالی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بہت سنجیدہ لہجے میں کہنے لگا۔

"آپ کو پہریداروں کے حوالے کرنا پڑے گا۔ کل شہر میں بوری میں بندھی

ہوئی ایک اور لاش ملے گی۔ نواب ٹن تو آپ کے دوست ہیں۔ مجھے بھی بے حد دکھ ہو گا۔"

نڈر ہونے کا دعویٰ کرنے والے جلالی کے اندر ایک سرد سی لہر دوڑ گئی۔ قریشی کے لہجے سے لگ رہا تھا کہ وہ بلف نہیں کر رہا۔ جلالی نے نواب ٹن کی طرف دیکھا جو بہت امید بھری نظروں سے جلالی کو دیکھ رہا تھا۔ جلالی ڈبیا سے سگریٹ نکال کر سلگانے لگا۔ انگلیوں کو کپکپانے سے روکنے کے لئے بہت جدوجہد کرنی پڑی تھی۔ خاموشی کا وقفہ طویل ہو گیا تھا اور قریشی اب اپنی گھڑی کو دیکھنے لگا تھا۔ شاید اس کے حصے میں آئی ہوئی کوئی شوخ چنچل بوٹی اپنا کمال دکھانے کے لئے تڑپ رہی ہو گی۔

"میری ایک شرط ہے۔" جلالی نے تھوڑی دیر کے انتظار کے بعد کہا۔ "دلاور اور خانساماں کو بخش دیا جائے۔ انہیں کچھ نہ کہا جائے۔ وہ کسی سے کچھ کہہ بھی نہیں سکیں گے۔ انہیں کچھ پتہ ہی نہیں ہے۔" جلالی کے خاموش ہوتے ہی نواب ٹن نے پہلی بار کچھ بولنا چاہا لیکن قریشی نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔

"جلالی صاحب! آپ صورتحال کو سمجھ نہیں رہے ہیں۔ آپ کوئی شرط منوانے کی حالت میں نہیں ہیں۔ ہم پہلے ہی آپ کو سزا دینے کے بجائے سفارتکار بنانے کا انعام دے رہے ہیں۔ یورپ بھیج رہے ہیں۔ کتنے ہیں جو اس تمنا میں ہی مر جاتے ہیں۔ آپ قسمت کے دھنی ہیں کہ جنرل سعید ملک ہمیں نہیں مل سکے تھے۔ اجلاس ختم ہوتے ہی وہ عشاء کی نماز پڑھنے چلے گئے تھے۔ ان سے رابطے کی کوئی صورت ممکن نہیں تھی۔ نماز کے بعد وہ کسی ایسی جگہ چلے گئے تھے جہاں تک رسائی نہیں تھی۔ سیکورٹی کے معاملے میں وہ بہت سفاک آدمی ہیں۔ اس سلسلے میں ان کا فیصلہ آخری ہوتا ہے۔ وہ مل جاتے تو اس وقت گفتگو کی ضرورت نہ ہوتی۔ نہ کراچی اور اسلام آباد میں درجن بھر لوگوں کی رات کالی ہو رہی ہوتی۔ آپ کی جان بچانے کا فیصلہ میں اور نواب ٹن کر بھی نہیں سکتے تھے۔ جنرل سعید ہماری گردنیں کاٹ کر پھینک دیتا۔ مجھے اکبر خان کا بند دروازہ کھٹکھٹانے کی جرأت کرنی پڑی تھی۔ جو کچھ ہو رہا ہے وہ اکبر خان کی اجازت ملنے کے بعد ہی ممکن ہوا ہے۔ اکبر خان کے فیصلے کے

خلاف جنرل سعید کو بھی کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہو گی۔ آپ کیسے صحافی ہیں۔ حقیقتیں پہچاننے کے بعد بھی شرطوں کی باتیں کر رہے ہیں۔"

جلالی سانس روکے ہوئے قریشی کی باتیں سن رہا تھا۔ حقیقتیں جذب ہوئیں تو آنکھیں کھل گئی تھیں۔ کیا وہ سچ مچ کسی فلم کا کردار بن گیا ہے؟

"دلاور اور خانساماں کا کیا ہوا۔ کیا آپ نے انہیں واقعی بند بوریوں کی نذر کر دیا ہے۔" جلالی نے پھر بھی ہمت کر کے پوچھ ہی لیا۔ قریشی خاموش رہا اور نظریں اٹھا کر نواب ٹن کو دیکھنے لگا۔

"دلاور بہت دنوں سے گاؤں جانے کی چھٹی مانگ رہا تھا۔ وہاں اس کی شادی طے ہو گئی ہے۔ خانساماں بھی اسی کے گاؤں کا ہے۔ وہ بھی جانا چاہتا تھا۔ دونوں کو چھٹی پر بھیج دیا ہے۔" جلالی سمجھتا تھا کہ چھٹی کا مطلب کیا ہے۔ قریشی نے اس کی آنکھوں کی بے یقینی پڑھ لی تھی۔

"ہمارا گروپ قاتلوں کا ٹولہ نہیں ہے۔ ہمارا مسئلہ دلاور اور خانساماں نہیں ہیں۔ وہ معصوم لوگ ہیں۔ سیکورٹی رسک آپ ہیں۔ ہم اس ملک کے مفاد کے لئے جو کچھ کرنا چاہتے ہیں آپ کی ذرا سی بیوقوفی اسے بڑا نقصان پہنچا سکتی ہے۔" قریشی نے کہا اور گھڑی دیکھتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں اگر وعدہ کر لوں کہ خبر نہیں چھاپوں گا تو......" جلالی نے بھی کھڑے ہوتے ہوئے ایک اور کوشش کی۔

"آپ سمجھتے ہیں ہم آپ کو باہر بھیج کر خبر رکوانے کی کوشش کر رہے ہیں؟" قریشی نے پہلی بار مسکراتے ہوئے کہا۔ "خبر آپ چھپوا ہی نہیں سکتے۔ آزادئ صحافت کے بارے میں آپ شاید کوئی بہت گمراہ کن تصور لئے بیٹھے ہیں۔ خبر آپ چاہیں بھی تو نہیں چھپوا سکیں گے۔ اخباروں کے مالک' ایڈیٹر کوئی بھی ہماری پہنچ سے باہر نہیں ہے۔ ہمارے بارے میں کوئی بھی خبر ہو وہ پہلے ہم سے پوچھیں گے۔ ہمارا خوف یہ ہے کہ آپ کسی وقت جوا کھیلتے ہوئے' نشے میں آ کر یا نواب صاحب کے بقول آپ میں خودکشی کرنے کے جو جراثیم ہیں ان کے زور مارنے پر کسی کان میں سرگوشی کر سکتے

ہیں۔ سرگوشی بہت تیزی سے سفر کرتی ہے۔ وہ ہمارے دشمنوں تک پہنچ گئی تو وہ خبردار ہو جائیں گے۔ ہمارا کام اور مشکل ہو جائے گا۔"

"یہ سرگوشی تو میں باہر جا کر بھی کر سکتا ہوں۔"

"نہیں، آپ ایسا نہیں کریں گے۔" قریشی نے اسی طرح مسکراتے ہوئے کہا۔ "آپ کہیں بھی ہوں ہماری دسترس میں رہیں گے۔ یورپ کا سرد موسم دماغ کو ٹھنڈا رکھتا ہے۔ سرد مزاجی کو اپنائیں گے تو آپ سچ مچ خودکشی کرنے کی کوشش نہیں کریں گے۔" جلالی قریشی کی مسکراہٹ کے پیچھے چھپی ہوئی دھمکی کو محسوس کر رہا تھا۔

"سب کچھ بھول کر جائیے اور یورپ میں چند مہینے گزار کر آیئے۔ ہنگری کی سرخ شراب اور سفید چمڑی سے دل بھر جائے تو بتایئے گا، ہم آپ کا تبادلہ کسی اور ملک میں کر دیں گے۔" قریشی نے خدا حافظ کہتے ہوئے جلالی کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ اس نے جلالی کی رسمی رضامندی جاننے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ اسے پتہ تھا کہ جس طرح اس نے کہا ہے اسی طرح ہو گا۔

"میں اپنی جان بخشی پر کس کا شکریہ ادا کروں۔ آپ کا یا اپنے وفادار دوست نواب سُن کا۔" جلالی نے قریشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

"ہمارا نہیں۔ اکبر خان کا۔" قریشی نے کہا۔

"اکبر خان کا؟" جلالی حیرت سے چیخا۔ اس نے قریشی کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ قریشی کے چہرے پر ایک بار پھر سنجیدگی چھا گئی تھی۔

"ہاں، اکبر خان کا۔ انہوں نے تمہارا ایک احسان اتار دیا ہے۔ اکبر خان نے آج تک کسی کا احسان نہیں رکھا۔ آج انہوں نے تمہارا حساب برابر کر دیا ہے۔" قریشی اچانک ہی تم پر آ گیا تھا۔

"کیسا احسان۔ میرا اکبر خان سے کیا تعلق؟" جلالی ابھی تک حیران تھا۔

"بیس سال پرانی وہ رات یاد کرو جب ایک دعوت میں ہم دونوں موجود تھے۔" قریشی نے کسی بیتے ہوئے لمحے کی یاد میں کھوتے ہوئے کہا۔ "تم نے جب اس رات کی کہانی لکھی تھی تو اکبر خان کا نام نہیں لیا تھا۔ تم نے ہماری بات مان لی تھی۔ اکبر

خان تمہارا وہ احسان آج تک نہیں بھولے تھے۔"

جلالی کو اچانک سب کچھ یاد آ گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب وہ ایک عیاش صدر کی راتوں کا پردہ چاک کر رہا تھا اور ہر طرف اس کے نام کا ڈنکا بج رہا تھا۔ ایک صبح بڑی سی سیاہ کار میں قریشی اکبر خان کو لے کر اس کے دفتر میں آیا تھا۔ باتیں کار میں بیٹھ کر ہوئی تھیں۔ بولا قریشی تھا' اکبر خان کی صرف آنکھیں سوال کر رہی تھیں۔ جلالی کو وہ رات یاد آ گئی جس کی کہانی انہیں اس کے پاس لے کر آئی تھی۔ وہ واقعی ایک شرمناک رات تھی۔

صدر جنرل صہبا خان

جلالی کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ سچ مچ اس چہار دیواری کے اندر پہنچ گیا ہے جہاں اس وقت ملک کی تقدیر کا فیصلہ کرنے والے محفل نشاط سجائے بیٹھے تھے۔ کار جب میٹروپول ہوٹل سے سیدھے ہاتھ کو مڑ کر گورنر ہاؤس والی سڑک پر پہنچی تو جلالی کے اندر کی دھڑکنیں تیز ہو گئی تھیں۔ اونچی پتھریلی فصیل پر خاردار تار کی لکیریں کھنچی ہوئی تھیں' بڑا سا پھاٹک بند تھا۔ دروازے کے سامنے لکڑی کی بنی ہوئی چوکی میں سے پہریدار نے جھانک کر دیکھا اور گاڑی اور اس میں بیٹھے ہوئے چہرے پہچانتے ہی پھاٹک کھولنے کا اشارہ دے دیا تھا۔ گاڑی کی پچھلی نشست پر بیٹھے ہوئے جلالی نے اپنی سانس روک لی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ کسی بھی لمحے پہریدار اسے گاڑی سے اتار کر اندر جانے سے روک دیں گے۔ لیکن رنگین وردی اور اونچی کلاہ والے پہریدار نے اندر جاتی ہوئی گاڑی کو زوردار سلام مار کر اس کا خوف دور کر دیا تھا۔

"صفیہ شکایت کر کے ایک پہریدار کا تبادلہ کرا چکی ہے۔" میجر رحمانی جلالی کی حیرت دور کرتے ہوئے کہنے لگا۔ "اس روز ایران سے آیا ہوا صفیہ کا کزن ہمارے

ساتھ تھا۔ پہریدار نے اندر سے اجازت آنے تک گاڑی روک رکھی تھی۔ صفیہ کی شکایت پر صہبا خان نے اسی وقت پہریدار کی طلبی کر کے اسے بیرکوں میں واپس بھیج دیا تھا۔"

میجر رحمانی کے برابر میں بیٹھی ہوئی اس کی بیوی صفیہ شیرازی کی گردن اور اکڑ گئی۔ ماتھے کے بلوں کی تعداد بھی بڑھ گئی تھی۔ جلالی میجر رحمانی سے ایک دو بار پہلے مل چکا تھا۔ لیکن اس کی بیوی سے حال ہی میں ملا تھا۔ اسے حیرت تھی کہ دو بالکل متضاد طبیعتیں رکھنے والے بے اولاد جوڑے کی شادی ابھی تک کیسے قائم تھی۔

ایرانی نژاد صفیہ کئی رنگوں کا مرکب تھی۔ بال سرخ تھے۔ رنگے ہوئے نہیں تھے۔ اوپری ہونٹ پر اگا ہوا سرخی مائل روؤاں اور ہم رنگ بھنویں بتا رہی تھیں کہ بالوں کی سرخی قدرتی ہے۔ آنکھوں کا سبز رنگ پپوٹوں پر لگائے ہوئے ہرے رنگ سے میل کھاتا تھا۔ درمیان میں سیاہ پلکوں کی سرحد نہ ہوتی تو آنکھوں کے دائرے دور تک پھیلے ہوتے۔ ہونٹوں پر لگائی ہوئی سرخ لپ اسٹک نے بالوں کی سرخی کو پھیکا کر دیا تھا۔ سیاہ رنگ کی لمبی میکسی پہنے ہوئے تھی جس کے گہرے کھلے گلے سے جھانکتا ہوا سفید رنگ پیلاہٹ لئے ہوئے تھا۔ سب سے نمایاں رنگ اس کے چہرے پر چھائے ہوئے نخوت کے سائے کا تھا۔ اس کی پیشانی پر ایک لکیر کھنچی ہوئی تھی۔ یہ لکیر جلالی نے ایک لمحے کے لئے بھی غائب ہوتے ہوئے نہیں دیکھی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس نے ماتھے پر اپنے اہم ہونے کی تحریر لکھ کر لٹکا رکھی ہو۔ بیوی کی موجودگی میں میجر رحمانی بہت بجھا بجھا سا تھا۔

گورنر ہاؤس کے اندر جا کر دونوں میاں بیوی کا ایک دوسرے سے تعلق بالکل ہی ختم ہو گیا تھا۔ نشست کے کمرے میں دو عورتوں کے درمیان پھنسا ہوا جنرل صہبا خان بیٹھا تھا۔ دونوں عورتوں کے درمیان ہنستے ہوئے دوہرے ہو کر صہبا خان پر گرنے کا مقابلہ ہو رہا تھا۔ جلد ہی مقابلہ اس عورت نے جیت لیا جو نسبتاً" موٹی تھی۔ دوسری عورت صہبا خان کا جام بنانے اٹھی تو صہبا خان اور پھیل کر بیٹھ گیا۔ اس نے ساتھ بیٹھی ہوئی عورت کے شانوں پر ہاتھ ٹکا کر سامنے رکھے ہوئے ٹی وی پر نظریں جما دی

تھیں۔ دوسری عورت سمجھ گئی کہ وہ یہ مقابلہ ہار گئی ہے۔ اس نے صہبا خان کو اس کا جام دیا لیکن صوفے پر بیٹھنے کی کوشش نہیں کی بلکہ برابر کے صوفے پر بیٹھے ہوئے جنرل حبیب احمد خان کی گود میں بیٹھنے لگی۔ ساتھ بیٹھے ہوئے اکبر خان نے کھسک کر اسے جگہ دی تو وہ ان کے درمیان ٹھس کر بیٹھ گئی اور کوئی قصہ سناتے ہوئے جنرل حبیب احمد خان پر گرنے لگی۔

میجر رحمانی کی بیوی صفیہ شیرازی بھی اندر نشست کے کمرے میں چلی گئی تھی اور جنرل صہبا خان سے اپنے دونوں گالوں پر باری باری بوسہ لے کر کونے میں کھڑے ہوئے ریٹائرڈ ایڈمرل عبدالرب خان سے باتیں کر رہی تھی جو نیشنل شپنگ کارپوریشن کا چیئرمین اور صدر صہبا خان کے قریبی دوستوں میں سے تھا۔ میجر رحمانی باہر کے کشادہ لاؤنج میں بار کاؤنٹر کے پاس ایک کے بعد دوسرا جام خالی کرتا ہوا جلالی کو شیشے کے پھسلنے والے دروازے کے دوسری طرف صہبا خان کے ساتھ بیٹھے ہوئے لوگوں کے بارے میں بتا رہا تھا۔

"اکبر خان کو تم جانتے ہو۔ آج کل سیکریٹری دفاع ہے۔ اس کے برابر میں جنرل حبیب احمد خان ہے۔ اسے بھی تم جانتے ہو گے۔ صہبا خان کے بعد فوج کا سربراہ وہی بنے گا۔ جنرل صہبا کے ساتھ جو عورت بیٹھی ہے وہ نواب عالمگیر کی بیوی ہے۔ صہبا خان نے نواب کو نائیجریا میں سفیر بنایا ہے لیکن اسے افریقہ نہیں جانا' وہ کسی یورپی ملک کا سفیر بننا چاہتا ہے۔ مجھے یقین ہے آج رات نواب کو اس کے پسند کی جگہ سفارت مل جائے گی۔" میجر رحمانی خالی گلاس رکھ کر نیا جام بنوانے لگا۔

"لیکن خود نواب کہاں ہے؟" جلالی نے پوچھا۔

"جنرل کانی کی لائی ہوئی کسی لڑکی کو لئے ہوئے گورنر ہاؤس کے کمرے میں پڑا ہو گا۔ اسے کم عمر لڑکیاں پسند ہیں۔ صہبا خان کو موٹی عورتیں زیادہ پسند ہیں۔ دونوں کا حساب برابر ہے۔"

"یہ جنرل کانی کون ہے؟" جلالی اندر کے کمرے میں نظریں دوڑا کر اس نام کے حلئے سے مطابقت رکھنے والی عورت کو تلاش کرنے لگا۔

"وہ سرخ کپڑوں میں جو دلہن بنی موٹی سی عورت بیٹھی ہے، جس کے بال کٹے ہوئے ہیں وہ صدر صہبا خان اور اس کے ساتھی جنرلوں کی پرانی سپلائر ہے۔ اس کی ایک آنکھ پتھر کی ہے۔ کسی نے مذاق میں جنرل کانی کہہ دیا تھا' اس کے بعد اسی نام سے مشہور ہو گئی۔ اس کے برابر میں جو شخص بیٹھا ہوا انگلی میں ہیرے کی انگوٹھی کو گھما رہا ہے وہ چنو سیٹھ ہے۔ وہ بھی جنرل کانی کے ذریعے صدر صہبا خان تک پہنچا ہے۔ آج کل ہر سرکاری ٹھیکہ اسی کو ملتا ہے۔"

"کیا جنرل کانی واقعی عورتوں کی سپلائر ہے۔" جلالی کو جنرل کانی میں کہانی بننے کی صلاحیت نظر آ رہی تھی۔

"نہیں بابو! پیشہ ور نہیں ہے۔ لیکن اس کے رابطے اچھے ہیں۔ ضرورت پڑنے پر ہر نسل، رنگ اور عمر کی لڑکیاں منگوا سکتی ہے۔ میک اپ سے لدی ہوئی سہمی سہمی سی جو لڑکیاں کونوں میں رکھی کرسیوں پر بیٹھی دیکھ رہے ہو وہ جنرل کانی کی لائی ہوئی ہیں۔" جلالی اپنے اطراف میں کھڑے اور بیٹھے ہوئے مردوں اور عورتوں کو دیکھنے لگا۔ یہ نسبتاً" کم اہم لوگ تھے جن کی اندر کے اس کمرے تک رسائی نہیں تھی جہاں صدر صہبا خان اور اس کی "بیڈ روم کیبنٹ" بیٹھی ہوئی تھی۔

"پارٹی جب اپنے شباب پر پہنچے گی تو محفل کے شرفاء بھڑوں کی طرح جنرل کانی کی لڑکیوں پر ٹوٹ پڑیں گے۔ تم ان کی طرف رخ مت کرنا۔ ان میں سے کوئی تمہارے قابو میں نہیں آئے گی۔ ان کا نشانہ امیر نظر آنے والے بڈھے ہوں گے۔ تم ان بڈھوں میں سے کسی کی بیگم کو گھیر لینا۔ وہ اس وقت نشے میں اکیلی جھول رہی ہو گی اور تمہیں آج کی رات کا انعام سمجھ کر کسی اندھیرے کونے میں کھینچ لے جائے گی۔ ڈرنا اور شرمانا مت بابو!" میجر رحمانی نے نشے سے نیم کھلی آنکھوں میں سے ایک کو دباتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"آپ کو پتہ ہے میں یہاں لڑکیوں کا شکار کرنے یا بڈھی میموں کو گھیرنے نہیں آیا۔" جلالی نے مسکرائے بغیر کہا اور ایک بار پھر اندر جنرل صہبا کے ساتھ بیٹھے ہوئے لوگوں کو دیکھنے لگا۔

"اندر جو بیگمات ہیں وہ کس کے ذریعے آئی ہیں؟"

"بابو! یہ بھی جنرل کانی کا کام ہے۔ جانے کہاں کہاں سے ضرورت مندوں کو لے کر آتی ہے۔ وہ جو عورت پہلے صہبا خان کے پاس بیٹھی تھی اور اب جنرل حبیب پر لدی ہوئی ہے' اسے بھی جنرل کانی لے کر آئی تھی۔ اسے اپنے بھائی کو کسٹمز کا افسر بنوانا ہے۔"

"وہ جو کونے میں کھڑی ہے کیا وہ بھی؟" جلالی نے سانولی سی بڑی بڑی آنکھوں والی ہلکے نیلے رنگ کی ساڑھی میں ملبوس عورت کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا جو اکیلی کھڑی شیمپئن کی چسکیاں لے رہی تھی۔

"وہ بلیک بیوٹی ہے۔" جنرل کانی کا بس چلے تو اسے کچا چبا جائے۔ وہ اسے اپنے لئے سب سے بڑا خطرہ سمجھتی ہے۔ بلیک بیوٹی کو اس نے آج کل "لال کرسی والی" کے نام سے مشہور کیا ہوا ہے۔

"لال کرسی والی؟" جلالی نے حیرت سے کہا اور پھر اس عورت کو دیکھنے لگا جسے میجر رحمانی نے بلیک بیوٹی کہا تھا۔ اس کی شخصیت میں بہت کشش تھی۔ بڑا پروقار انداز تھا۔ لگتا تھا جیسے اسے اپنے اردگرد کے ماحول کی' کمرے میں بیٹھے اور کھڑے ہوئے لوگوں کی کوئی پرواہ نہ ہو۔

"صہبا خان اس سے بہت متاثر ہے' اس کی کوئی بات نہیں ٹالتا۔" میجر رحمانی نے تازہ بھرے ہوئے جام سے گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ "وہ راولپنڈی میں رہتی ہے۔ لیکن صہبا خان زیادہ دن شہر سے باہر رہے تو اسے بھی اپنے پاس بلوا لیتا ہے۔ خود کو کلکتہ کے کسی نواب خاندان کا بتاتی ہے۔ اس کا شوہر ایس پی تھا لیکن اب ڈی آئی جی ہے۔ بھائی کو سفیر بنوا کر رومانیہ بھجوایا ہے اور اب خود آسٹریا کی سفیر بن کر دیا نا جانے والی ہے۔"

"سفارتیں چنوں کی طرح بٹ رہی ہیں اور وزارت خارجہ والے کچھ نہیں کہتے۔ کوئی اعتراض نہیں کرتا؟" جلالی نے حیرت ظاہر کی۔

"کس دنیا میں رہتے ہو بابو؟ کس کی مجال جو اعتراض کر سکے۔ ملک کا مالک

ایوان صدر چھوڑ کر رات گئے ملنے جس کے گھر جاتا ہے' اس کے اشارے پر سب اٹھک بیٹھک کرتے ہیں۔ وزارت خارجہ والے احسان مانتے ہیں کہ اس نے وزیر خارجہ بننے کی فرمائش نہیں کی۔"

میجر غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ جلالی کو یوگنڈا کی وہ ماڈل یاد آ گئی جسے عیدی امین نے وزیر خارجہ بنا دیا تھا۔

"لیکن یہ لال کرسی کا کیا قصہ ہے؟" اس نے پوچھا۔

"صہبا خان کبھی کبھی اسلام آباد سے بور ہو کر تنہائی اور سکون کی تلاش میں بلیک بیوٹی کے گھر چلا جاتا ہے۔ بلیک بیوٹی نے خاص طور پر لال رنگ کی گدیلی اور آرام دہ کرسی منگوا کر رکھی ہے جس کی پشت بٹن دبانے سے آگے پیچھے ہو سکتی ہے۔ اس کا شوہر رات کی صفر درجے والی سردی میں کپکپاتے اور بارش میں بھیگتے ہوئے سپاہیوں کو چوکس رکھ کر صدر کی سلامتی اور تحفظ کا انتظام کرتا ہے اور اندر اس کی بیوی لال کرسی میں دھنسے ہوئے صدر کو ذہنی اور جسمانی آرام پہنچاتی ہے۔" میجر رحمانی اپنا جام بھروانے پلٹ گیا اور جلالی سوچنے لگا میجر رحمانی نے غلط نہیں کہا تھا۔ وہ یہ کہانیاں شاید کبھی نہ لکھ سکے۔ کل صہبا خان صدر نہیں ہو گا تو جنرل حبیب خان ہو گا۔ وہ نہیں تو کوئی دوسرا جنرل ہو گا۔ کہانیاں دل میں گھٹی رہیں تو سینہ پھٹ جائے گا۔ لیکن کب تک؟

میجر رحمانی جلالی کو سینٹرل ہوٹل کے باغیچے والے شراب خانے میں ملا تھا۔ جلالی اپنے دوستوں کے طفیل وہاں پیانو سننے اور بو کو دیکھنے جاتا تھا جو اس کا دیا ہوا جام پی کر راکٹ ہو جاتی اور جلالی کو اڑا کر ماضی کے کھنڈروں میں لے جاتی تھی۔ اس رات میجر رحمانی سینٹرل ہوٹل کے شراب خانے آیا تو پہلے سے نشے میں تھا۔ وہ بھی یہاں شراب پینے نہیں بو سے ملنے آتا تھا۔ اس نے پہلی بار سولہ سال کی عمر میں جو فلم دیکھی تھی' بو اس کی ہیروئن تھی۔ میجر رحمانی نے اسی وقت اپنا دل اسے دے دیا تھا۔ جوانی کے خوابوں میں سجا کر اسے کئی بار بانہوں میں بھینچا تھا' اس کے بے شمار

بوسے لئے تھے' اس کے لئے بہت سی آہیں بھری تھیں۔ رحمانی کی ادھ کھلی آنکھیں بو کے بوڑھے لیکن روشن چہرے پر جس طرح گڑی تھیں ان سے لگتا تھا چالیس سال پرانے عشق کی چنگاری ابھی بجھی نہیں تھی۔ بو میجر رحمانی کے آتے ہی صرف اس کی میز کی ہو گئی تھی۔ اس کا جام خالی ہونے سے پہلے ہی دوسرا جام میز پر موجود ہوتا۔ اس کی خدمت کرنے میں بیرے بھی بہت مستعدی دکھا رہے تھے۔

"یہ بہت اہم آدمی لگتا ہے۔" جلالی نے' جو اس رات بو کے ایک جام کے ساتھ سے محروم ہو گیا تھا' کہا۔

"اہم آدمی!" جلالی کا دوست ہنسنے لگا۔ "وہ صرف ٹھیکیداروں یا ان بیروں کے لئے اہم ہے جنہیں وہ بھاری بخششیں دیتا ہے۔" جلالی کا دوست سنجیدہ ہو کر بتانے لگا۔ "میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ لیکن اس وقت مدہوش ہے اس لئے ملنا بیکار ہے۔ این ایس سی میں پرچیزنگ منیجر ہے اس لئے ہر وقت پیسوں میں کھیلتا ہے۔ اس کی تنخواہ تو اس کی ایک دن کی شراب کا بوجھ بھی نہیں اٹھا سکتی۔"

بو میز میز گردش کرتی تھی پھر بھی بہت لئے دیئے رہتی تھی۔ جلالی نے اسے کبھی نشے میں نہیں دیکھا تھا۔ لیکن میجر رحمانی کی میز پر جس تواتر سے جام آ کر خالی ہو رہے تھے انہوں نے اپنا اثر دکھایا تھا۔ اس لئے جب پارکر نے پیانو پر کسی پرانے گانے کی مدھ بھری دھن چھیڑی تو بہکے ہوئے میجر رحمانی کے ساتھ وہ بھی بہکنے کے لئے تیار تھی۔ رحمانی اس کا ہاتھ پکڑ کر چمکدار پتھروں کے فرش پر لے آیا اور اسے بانہوں میں لے کر رقص کرنے لگا۔ بو کا سفید بالوں والا سر میجر رحمانی کے سینے پر ٹک گیا تھا اور گھیردار غرارے میں چھپے ہوئے قدم بہکے بغیر بہت نپے تلے انداز میں موسیقی کا ساتھ دینے لگے تھے۔ وہ شاید نصف صدی پہلے کی اس دنیا میں چلی گئی تھی جہاں سینما کی جادوئی اسکرین پر اسے دیکھ کر نوجوان اپنا دل تھام لیا کرتے تھے۔

"کمال کا آدمی ہے۔ اتنا نشے میں ہے پھر بھی ایک اسٹپ غلط نہیں لے رہا۔" جلالی نے تحسین اور حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

"حیدر آباد دکن کے کسی نواب خاندان کا ہے۔ بہت تعلیم یافتہ اور شائستہ

آدمی ہے۔ شراب اسے پی گئی ورنہ بہت کام کا آدمی ہوتا۔" جلالی کا دوست بتانے لگا۔
اس بے مثال جوڑے کو رقص کرتا دیکھ کر مختلف میزوں سے قہقہے اور مضحکہ اڑانے والے جملے ابھر رہے تھے۔ لیکن وہ دونوں کسی اور دنیا میں تھے' اس وقت تک رقص کرتے رہے جب تک پیانو پر بجتی ہوئی دھن نے آخری سانس نہیں لے لی۔ رقص ختم ہوا تو جلالی نے اور اس کی تقلید میں اس کے دونوں دوستوں نے کھڑے ہو کر تالیاں بجائیں۔ جلالی کا جو دوست رحمانی کو جانتا تھا وہ آگے بڑھ کر دونوں کو کھینچ کر اپنی میز پر لے آیا۔ اس نے رحمانی اور اپنے دوستوں کا تعارف کرایا لیکن رحمانی تو ابھی تک بو کے نشے میں تھا۔ اس کی ساری توجہ اسی پر تھی۔

"بو رانی! اس سال تمہیں پرائڈ آف پرفارمنس دلواؤں گا۔ جنرل صہبا خان دو ہفتے بعد کراچی آ رہا ہے۔ تمہیں ساتھ لے کر جاؤں گا۔ صدر تمہیں اپنے ہاتھوں سے ہار پہنائے گا۔" میجر رحمانی نے کہا تو جلالی اسے حیرت سے دیکھنے لگا۔

"صدر صہبا خان کو اب مجھ سے کیا ملے گا جو وہ مجھے کچھ دے گا۔" بو نے اس جام کا گھونٹ بھر کے کہا جو بیرا ابھی ابھی میز پر رکھ کر گیا تھا۔ "میرا تمغہ یہ جام ہے جو تم میرے لئے خرید کر مجھے دوبارہ زندہ کر دیتے ہو۔" وہ یہ کہہ کر کھڑی ہو گئی اور جام اٹھا کر ایک ہی گھونٹ میں خالی کر دیا۔

"میں اب جاؤں گی۔ تم نے آج مجھے تماشا بنا دیا ہے۔ مجھ میں اب کسی سے نظر ملانے کی ہمت نہیں ہے۔ میجر رحمانی اسے اس وقت تک دیکھتا رہا جب تک وہ اپنے پیچھے شیشے کا دروازہ ہلتا ہوا چھوڑ کر نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئی۔

"آپ جنرل صہبا خان کو ذاتی طور پر جانتے ہیں؟" لمحے بھر کے لئے اداسی بھرا جو سناٹا چھا گیا تھا جلالی نے اسے توڑتے ہوئے کہا؟

"جانتا ہوں؟" میجر رحمانی نے جو بو کے سحر سے باہر نکل آیا تھا چہکتے ہوئے کہا۔ "وہ میرا سالا ہے بابو سالا۔ کسی دور کے رشتے سے میری بیوی کا بھائی ہے۔ لیکن سالے کا حشر برا ہو گا۔" نشہ پھر بولنے لگا تھا۔ جلالی سمجھ گیا کہ وہ انہیں متاثر کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ کوئی جوابی حملہ کرنے والا تھا لیکن اس کے دوست نے اس

کا ہاتھ دبا کر اسے خاموش کر دیا۔

''نہیں بابو، بولنے دو۔'' نشے کے باوجود رحمانی کی نظروں سے یہ اشارہ چھپا نہ رہ سکا تھا۔ ''میری بیوی نے جب پہلی بار بتایا تھا اس وقت مجھے بھی یقین نہیں آیا تھا۔ لیکن ایک رات جب صدر نے اپنے ہاتھوں سے مجھے پیمانہ بھر کر دیا اور میری ملازمت کا حکم جاری کیا تو یقین آیا۔ گورنر ہاؤس اب ہمارا دوسرا گھر بن گیا ہے۔''

''یہ صحافی ہے، اسے بات کریدنے کی عادت ہے، اس کی بات کا برا مت مانئے۔'' جلالی کے دوست نے بات بنائی۔

''پہلے کیوں نہیں بتایا بابو!'' رحمانی نے کہا اور پھر تھوڑی دیر سوچنے کے بعد کہنے لگا۔ ''تم ہمارے ساتھ ایوان صدر چلو۔ میں تمہیں خبروں کا اصلی چہرہ دکھاؤں گا۔''

''آپ کو ڈر نہیں لگے گا۔ میں نے اگر کہانی چھاپ دی تو؟'' جلالی نے ذرا اکڑ کر کہا۔

''تم چھاپو گے.....؟'' رحمانی نے زور کا قہقہہ لگا کر کہا۔ ''تم تو بابو برخوردار ہو۔ تمہارے پیشے کے بزرگ بھی ہمت نہیں کر سکتے۔ صہبا خان الٹا لٹکا دے گا۔'' جلالی اپنی اہانت کو خاموشی سے پی کر رہ گیا۔ رحمانی غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ تھوڑی دیر خاموش رہ کر رحمانی پھر کہنے لگا۔ اس دفعہ لہجے میں بہت سنجیدگی تھی۔

''بابو برا مت ماننا۔ صحافت اب صحافت نہیں رہی، تم آج کی کہانی آج نہیں لکھ سکتے۔ کل بھی نہیں لکھو گے۔ اگر یاد رہی تو شاید پرسوں لکھو۔ تم اخبار نویس نہیں تاریخ نویس بن گئے ہو۔ تاریخ نویس!'' رحمانی یہ کہہ کر کھڑا ہو گیا اور سب سے ہاتھ ملا کر جانے لگا۔ لیکن پھر کچھ سوچ کر پلٹ آیا۔

''تم میرے ساتھ ضرور چلنا۔ صہبا خان کبھی نہ کبھی ضرور جائے گا۔ جب چلا جائے تو وہ لکھنا جو تم اپنی آنکھوں سے دیکھو گے۔ تاریخ نویسی بھی برا کام نہیں ہے۔'' یہ کہہ کر میجر رحمانی چلا گیا تھا۔

جلالی ہر رات سینٹرل ہوٹل جا کر جھانکتا کہ شاید میجر رحمانی نظر آ جائے۔

پورے ہفتے کی تانک جھانک کے باوجود میجر رحمانی نظر نہیں آیا۔ اگلے ہفتے کی رات کو جلالی صرف جھانکنے نہیں بلکہ دوستوں کے ساتھ شراب پینے سینٹرل ہوٹل آیا تو اس کی دعا قبول ہو گئی۔ انہیں بیٹھے ہوئے تھوڑی دیر گزری تھی کہ میجر رحمانی اندر آتا ہوا نظر آیا۔ وہ کوئی خالی میز اور ببو کو تلاش کر رہا تھا کہ جلالی نے زور زور سے ہاتھ ہلا کر اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ وہ ان کے ساتھ آکر بیٹھ گیا اس کی نگاہیں اب بھی ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں۔ پئے ہوئے تھا لیکن نشے میں نہیں تھا۔ بیرا اسے دیکھ کر بھاگا ہوا ان کی میز کی طرف آیا تھا۔

"ہماری ببو رانی نظر نہیں آ رہی؟" اس نے بیرے سے پوچھا۔

"وہ ایک ہفتے سے نہیں آئی۔ بیمار ہے صاحب!"

"اکیلی کھولی میں پڑی پڑی مر جائے گی۔ مجھے اس کا پتہ بتاؤ، میں اسے اپنے گھر لے جاؤں گا۔" رحمانی کے لہجے میں تشویش تھی۔

"اس کا کوئی رشتے دار اسے اپنے گھر لے گیا ہے۔ کسی کو اس کا پتہ نہیں معلوم۔ صاحب آپ کے لئے اسکاچ لاؤں پانی کے ساتھ یا......"

"نہیں بابو! اسکاچ نے اثر کرنا چھوڑ دیا ہے۔ جمخانہ کا پوا لے کر آؤ۔ دیسی ٹھرا پئے بغیر دماغ نہیں گھومے گا۔"

"نہیں، نہیں! میجر صاحب کے لئے ڈبل اسکاچ۔ ہمارے لئے ایک ایک بیئر اور لے آؤ۔" جلالی کے دوست نے جاتے ہوئے بیرے کو روک کر کہا۔ ان کی میز پر آئے ہوئے ایک اہم مہمان کا ٹھرا پینا میزبانی کی توہین تھا۔ بیرا میجر رحمانی کی طرف دیکھنے لگا۔

"ٹھیک ہے بابو! میرے دوست میرے نشے میں آنے سے ڈرتے ہیں۔" رحمانی نے سر ہلا کر کہا اور بیرے کے جانے کے بعد اپنی توجہ جلالی کی طرف کر دی۔ "کیا خبر ہے بابو؟ آج شہ سرخی میں کسے جما کر آئے ہو؟"

"آپ کے سالے کو شہ سرخی میں کسی اور کا سجنا پسند نہیں ہے۔" جلالی نے مسکرا کر کہا اور فوراً" ہی مطلب پر آگیا۔ "آپ کو اپنا وعدہ یاد ہے؟"

"وعدہ؟!"

"جنرل صہبا خان کی دعوت میں لے جانے کا وعدہ۔"

"اچھا وہ---- ہاں بالکل یاد ہے۔ اس کے لئے میری بیوی کو تیار کرنا پڑے گا۔ تم اسے آسانی سے منا سکتے ہو۔"

"میں؟!" جلالی نے حیرت سے کہا۔ لیکن رحمانی اس کے استعجاب کو نظرانداز کر کے کہنے لگا۔

"صفیہ شیرازی کا نام تم نے سنا ہو گا۔ وہ ریڈیو پر انگریزی میں خبریں پڑھتی ہے۔" جلالی نے نام سنا تھا۔ ریڈیو کے ایک پروڈیوسر دوست نے اس تک چڑھی اناؤنسر کا تذکرہ کیا تھا۔ لیکن جلالی کچھ بولا نہیں، بس خاموشی سے سر ہلا دیا۔

"میری بیوی کو آج کل اپنے اہم ہونے کا وہم ہو گیا ہے۔ اس کا خیال ہے انگریزی میں اس سے اچھا اناؤنسر پورے ملک میں نہیں ہے۔ تم اس کا انٹرویو لے کر چھاپ دو۔ باقی میں سنبھال لوں گا۔" میجر رحمانی نے جلالی کو اپنا کارڈ دیتے ہوئے کہا۔

"جلالی فون پر وقت لے کر دو دن بعد ہی فوٹو گرافر سمیت انٹرویو لینے پہنچ گیا۔ جلالی کے پروڈیوسر دوست نے غلط نہیں کہا تھا۔ وہ واقعی ایک مغرور عورت تھی۔ نوکر چائے کی ٹرالی کھینچتا ہوا لایا تھا۔ رحمانی نے چائے بنا کر دی تھی۔ صفیہ شیرازی نے پوچھا تک نہیں تھا۔ ماتھے کی لکیر صرف اس وقت غائب ہوئی تھی جب فوٹو گرافر نے اس کے مختلف پوز لینے کے لئے فلش چمکانی شروع کی تھی۔ ہونٹ بھی "چیز" کے انداز میں پھیل گئے تھے۔ جلالی کی قسمت اچھی تھی کہ میگزین ایڈیٹر کے پاس اس ہفتے کوئی بڑا فیچر نہیں تھا۔ تصویریں اچھی آئی تھیں۔ اتوار کا میگزین چھپا تو اس کے پہلے صفحے پر صفیہ شیرازی کی بڑی سی رنگین تصویر مسکرا رہی تھی۔ رحمانی نے فون کر کے جلالی کا شکریہ ادا کیا تھا اور شام کو کافی پر گھر بلایا تھا۔ اس شام صفیہ شیرازی نے جلالی کو اپنے ہاتھ سے کافی بنا کر دی تھی۔ کافی دیتے ہوئے مسکرائی تھی۔ ایک لمحے کے لئے ماتھے کا بل بھی غائب ہو گیا تھا۔

"ڈارلنگ، کل انہیں بھی ساتھ لے کر چلو۔ انہیں بھی پتہ چلے کہ صدر

صاحب کی پارٹیوں کی کیا شان ہوتی ہے۔" رحمانی نے موقع پا کر کہا۔
"کل نہیں لے جا سکتے۔" صفیہ شیرازی نے ماتھے پر بل ڈال کر کہا۔ "آغا نے کل مادام حور جہاں کو بلایا ہے۔ صرف قریبی دوست مدعو ہیں۔"
جلالی نے سوچا انٹرویو کی محنت بیکار گئی۔ لیکن صفیہ نے کافی کا گھونٹ لے کر جلالی کی مایوسی اچانک ہی دور کر دی۔ "یہ پرسوں ہمارے ساتھ چل سکتے ہیں۔ اس روز بڑی دعوت ہے۔ بہت لوگ آ رہے ہیں۔" انٹرویو کی قیمت وصول ہو گئی۔

"کتیا کہیں کی!" میجر رحمانی نے دانت بھینچ کر کہا اور جلالی خیالوں سے چونک کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ رحمانی نے یہ اعزاز خاص طور پر کسے دیا تھا۔ وہاں تو اس نسل سے تعلق رکھنے والوں کا ہجوم تھا۔ جلالی کی نظریں پھر اس کمرے پر مرکوز ہو گئیں جہاں صہبا خان اپنے خاص دوستوں اور محبوب نظر حسینوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اسی وقت سب لوگ ٹی وی کے اردگرد بیٹھے ہوئے بہت توجہ سے کوئی پروگرام دیکھ رہے تھے۔ جنہیں صوفوں اور کرسیوں پر جگہ نہیں ملی تھی وہ قالین پر بیٹھ گئے تھے۔ صرف لال کرسی والی نیچے نہیں بیٹھی تھی۔ وہ اس صوفے کے پیچھے جا کر کھڑی ہو گئی تھی جہاں جنرل صہبا خان بیٹھا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں شیمپئن کا گلاس تھا اور دوسرے ہاتھ کی انگلیاں صہبا خان کے سر میں کنگھی کر رہی تھیں۔ جلالی کو وہ بھی نظر آ گئی جسے میجر رحمانی نے کتیا کے لقب سے نوازا تھا۔ صفیہ شیرازی صدر صہبا خان کے قدموں میں بیٹھی تھی۔ اس کا سر صہبا خان کے گھٹنے پر اور صہبا خان کا سیدھا ہاتھ صفیہ کے نیم عریاں کندھے پر ٹکا ہوا تھا۔ صہبا خان نے اچانک بہت زور سے قہقہہ لگایا اور اس کے ساتھ ہی کمرے میں موجود تمام لوگوں میں قہقہہ لگانے کا مقابلہ شروع ہو گیا تھا۔ صفیہ شیرازی بھی پیچھے کی طرف بل کھا کر اپنا چہرہ صہبا خان کی طرف اٹھا کر ہنسنے لگی۔ ہنسی کے ساتھ اس کے سینے کے پھڑکتے ہوئے بالائی ابھار اور نمایاں ہو گئے تھے۔
"آج گھر جا کر اس کی کھال ادھیڑوں گا۔ میں کسی سالے سے نہیں ڈرتا۔"

میجر رحمانی نے کہا۔ وہ نشے کی معراج تک پہنچ کر شیر ہو گیا تھا اور ایک ہی گھونٹ میں اپنا گلاس خالی کر کے بار ٹنڈر کو گلاس بھرنے کا اشارہ کرنے لگا تھا۔

"میجر صاحب ذرا خیال کریں۔ آپ کو واپسی میں گاڑی بھی چلانی ہے۔" جلالی نے اسے خبردار کیا۔

"ڈر گئے بابو!" رحمانی نے ہونٹوں پر مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔ "تم ٹیکسی سے جاؤ گے۔ میں اپنی گاڑی آج بل پارک لے جا کر پہاڑی سے نیچے گرانے والا ہوں۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔ ہاہاہا۔" رحمانی نے زوردار قہقہہ لگایا اور جلالی سوچنے لگا یہ دیوانہ تو نہیں ہو گیا۔ اس کا نیا جام بن کر آ گیا تھا۔ رحمانی ایک گھونٹ لے کر بولا تو اس بار بہت سنجیدہ تھا۔

"صہبا خان کی دعوتوں میں مجھے نشہ نہیں ہوتا۔ جتنی بھی پی لوں نہیں ہوتا۔ نشے کو ترس جاتا ہوں۔ تم بھی دل کھول کر پیو بابو! ڈرو مت! ابھی اصلی پارٹی شروع نہیں ہوئی۔ شیر ابھی کچھار سے باہر نہیں آیا۔ جب آئے گا تو یہاں وہ کچھ ہو گا کہ دیکھ کر تمہارا سارا نشہ ہرن ہو جائے گا۔" جلالی سوچنے لگا کہ کیا ہو گا۔ کیا سب ننگے ہو کر ناچیں گے؟

اسی وقت پائپ منہ میں دبائے ہوئے ایک جامہ زیب شخص ان کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔

"میرا نام کرم قریشی ہے۔" اس نے اپنا تعارف کرایا اور رحمانی اور جلالی ہاتھ ملا کر اپنا تعارف کرانے لگے۔ اس کی عمر زیادہ نہیں لگتی تھی لیکن پیشانی کی حد سر کے نصف حصے تک پہنچ گئی تھی۔

"کیا آپ بھی پہلی بار آئے ہیں؟" اس نے جلالی سے پوچھا۔

"جی ہاں! مجھے میجر رحمانی لے کر آئے ہیں' یہ میرے دوست ہیں۔" جلالی نے کہا۔

"یہ دوست نہیں صحافی ہے بابو صحافی! صحافی کسی کا دوست نہیں ہوتا۔" رحمانی نے ہنستے ہوئے کہا تو قریشی اور جلالی بھی اس کے ساتھ ہنسی میں شامل ہو گئے۔

''تم کس کے ساتھ آئے ہو؟ شکل سے پروفیسر لگتے ہو اس لئے جنرل کانی کے رشتے دار تو نہیں ہو سکتے۔'' رحمانی بے تکلفی پر اترا ہوا تھا۔

''جی نہیں، میں پروفیسر نہیں ہوں۔'' قریشی ہنستے ہوئے کہنے لگا۔ ''میں وزارت داخلہ میں ایڈیشنل سیکرٹری ہوں۔''

''بیوی کو ساتھ لے کر آئے ہو تو سیکرٹری بھی ہو جاؤ گے۔'' رحمانی نے کہا اور جلالی شرمندہ ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ رحمانی نشے میں بے تکلف ہی نہیں بدتمیز بھی ہو گیا تھا۔

''جی نہیں، میری بیوی ساتھ نہیں آئی۔'' قریشی نے پائپ کا کش لے کر کہا۔ اس کے سکون میں فرق نہیں آیا تھا۔ ''میری بیوی اکبر خان کی بیٹی ہے۔ اکبر خان کو اپنی بیٹی کا اس دعوت میں آنا پسند نہیں ہے۔'' جلالی اندر کمرے میں بیٹھے ہوئے ڈیفنس سیکرٹری اکبر خان کو دیکھنے لگا جو اپنے اوپر لدی ہوئی ایک عورت کے کان میں سرگوشیاں کرتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔

''اوہ! تم اکبر خان کے داماد ہو۔ پھر کیا مسئلہ ہے۔ تم تو بیوی کے بغیر ہی سیکریٹری بن سکتے ہو۔'' رحمانی نے قریشی کے کندھے پر ہاتھ مار کر قہقہہ لگایا۔

''آپ کی بیگم ساتھ آئی ہیں؟'' قریشی نے پوچھا۔

''جی ہاں! اندر جو صہبا خان کی ٹانگوں سے لپٹی بیٹھی ہے وہ میری ہی بیوی ہے۔'' رحمانی نے زہریلے لہجے میں کہا۔

''آپ تو اب تک سیکریٹری بن چکے ہوں گے۔'' قریشی نے اسی اطمینان بھرے انداز میں پائپ کا دھواں اگلتے ہوئے چوٹ کی اور جلالی ایک بار پھر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ وہ ڈر رہا تھا کہ نشے اور غصے میں آیا ہوا رحمانی قریشی سے لڑ نہ پڑے۔ رحمانی تھوڑی دیر قریشی کو گھورتا رہا لیکن پھر اس نے ایک دم ہی اپنے اعصاب ڈھیلے چھوڑ دیئے۔

''اچھا کہا ہے بابو، بہت اچھا کہا ہے۔'' رحمانی نے ہنستے ہوئے قریشی کے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔ لیکن پھر سنجیدہ ہو کر آہستہ آواز میں جیسے خود سے مخاطب ہو، کہنے لگا۔

""آج کی رات میں طلاق اور استعفیٰ ایک ساتھ دینے والا ہوں۔" جلالی کو وہ اس وقت کسی ہاری ہوئی فوج کا تھکا ہوا سپاہی لگا۔

جلالی ایک بار پھر اندر کے کمرے کی طرف دیکھنے لگا جہاں ٹی وی کا وہ پروگرام ختم ہو گیا تھا جسے سب بہت دلچسپی کے ساتھ دیکھ رہے تھے۔ سب اپنا اپنا جام ہاتھ میں لئے دو دو تین تین کی ٹولیوں میں بٹ گئے تھے۔ صفیہ شیرازی بھی اٹھ گئی تھی۔ جنرل صہبا اسے روک کر اس سے کچھ کہہ رہا تھا۔ صفیہ بہت پرجوش ہو کر زور زور سے سر ہلانے لگی اور پھر کمرے سے نکل کر تیر کی طرح ان کی طرف آئی۔

"ڈارلنگ تم نے کتنا اچھا پروگرام مس (miss) کر دیا۔ بونی آپا' وہی جو ریڈیو پر بچوں کا پروگرام کرتی ہے' اس کا اور اس کے بونے بھائی جان کا انٹرویو آ رہا تھا۔ آغا کا ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا۔ تم سے کتنی بار کہا ہے اندر آ کر بیٹھا کرو۔ آغا کو سلام کرنے تک نہیں آئے۔ وہ پوچھ رہے تھے۔ آغا بونی آپا اور اس کے بھائی کو ابھی دعوت میں بلا کر سب کو حیران کر دینا چاہتے ہیں۔ میں اندر ان کے بیڈ روم سے فون کر کے ان کے آنے کا انتظام کرنے جا رہی ہوں۔ تم کسی کو بتاؤ گے نہیں۔"

صفیہ نے جلالی اور قریشی کو دیکھ کر اچانک اپنی تیزی سے دوڑتی ہوئی گاڑی کو بریک لگا دیا۔ ایک لمحے کے لئے کچھ سوچتی رہی پھر جلالی کو دیکھ کر کہنے لگی۔

"جلالی' آپ رپورٹر ہیں' بونی آپا کو ڈھونڈنے میں میری مدد کریں۔ پلیز۔"
جلالی تذبذب بھری نظروں سے رحمانی کی طرف دیکھنے لگا۔

"سوچتے کیا ہو بابو! آج ایک غریب فنکارہ سنڈریلا بننے والی ہے۔ جاؤ تم بھی تاریخ میں نام لکھوا کر آؤ۔" رحمانی نے کہا اور قریشی کی طرف متوجہ ہو گیا جو ذرا پیچھے کھسک گیا تھا۔ جلالی آہستہ قدموں سے تیز تیز چلتی ہوئی صفیہ شیرازی کا ساتھ دینے کی کوشش کرنے لگا۔

جلالی صفیہ کے پیچھے پیچھے جس کمرے میں داخل ہوا وہ کسی کی خوابگاہ تھی۔ بہت کشادہ جو قدیم طرز کے فرنیچر سے آراستہ تھی۔ دروازوں اور کھڑکیوں پر نیلے رنگ کے بھاری ریشمی پردے لٹک رہے تھے۔ صفیہ مسہری کے ساتھ کی میز پر رکھے

ہوئے فون کا نمبر گھما کر کسی کو ڈانٹنے لگی۔

"ظاہر شاہ کہیں بھی ہو اسے تلاش کرو۔ سو گیا ہو تو جگاؤ۔ اسے بتاؤ کہ آدھے گھنٹے کے اندر اندر بونی آپا اور منے بھائی جان کو خود گورنر ہاؤس پہنچا کر جائے ورنہ وہ کل صبح ریڈیو کا ڈائریکٹر جنرل نہیں رہے گا۔ جیسے ہی بات ہو گورنر ہاؤس فون کر کے میرا نام لینا۔ آپریٹر مجھے ملوا دے گا۔"

صفیہ نے بات ختم کر کے آپریٹر کو ہدایات دیں اور فون بند کر دیا۔ ماتھے کا بل، چہرے پر نخوت کا سایہ اور آنکھوں میں ناچتی ہوئی وحشت سب اپنی اپنی جگہ قائم تھے۔ جلالی کھڑا سوچ رہا تھا کہ اس کی مدد کی ضرورت نہیں تھی تو صفیہ اسے ساتھ لے کر کیوں آئی تھی۔

"تم کھڑے کیوں ہو۔ بیٹھ جاؤ۔" صفیہ نے کہا تو جلالی کو خوف آنے لگا۔ ایک خالی بیڈ روم میں آتے ہی وہ آپ سے تم ہو گیا تھا۔ وہ دوسری طرف کونے میں رکھی ہوئی ایک کرسی کی طرف بڑھنے لگا۔

"اسی مسہری پر بیٹھ جاؤ، ڈرو مت۔ یہ آغا کے سونے کا کمرہ ہے، یہاں کوئی نہیں آ سکتا۔" جلالی مسہری کی پائنتی پر سکڑ کر بیٹھ گیا۔ صفیہ سرہانے رکھے ہوئے بہت سے تکیوں پر دھنس کر نیم دراز ہو گئی۔ چہرے کے تاثرات بدلنے لگے۔ آنکھوں میں سوچ بھر گئی تھی۔

"تم اتنا سکڑ کر کیوں بیٹھے ہو۔ تم سے کہا نا کہ ڈرو مت۔ آغا کی پارٹیوں میں سب برابر ہوتے ہیں۔ آغا کہتے ہیں کہ ان کی دعوت میں محمود و ایاز کا کوئی امتیاز نہیں ہے۔ تم خود دیکھو گے وہ کتنے عوامی صدر ہیں۔" صفیہ نے ایک بار پھر جلالی کی ہمت بڑھائی۔

"میں ڈر نہیں رہا۔ نئی جگہ ہے اس لئے حیرت ہو رہی ہے۔" جلالی نے صفیہ کی طرف دیکھے بغیر کہا جس کی آنکھیں جلالی کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔ کمرے میں تھوڑی دیر اسی طرح خاموشی رہی۔

"پلیز ایک ڈرنک ہی بنا دو۔" صفیہ نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔ "جو بھی

بوتل کھلی ہو کچھ ملائے بغیر اس کا ایک جام دے دو۔ ایک ڈرنک چاہو تو اپنے لئے بھی بنا لاؤ۔''

جلالی خاموشی سے کونے میں رکھی ہوئی ٹرالی کی طرف چلا گیا۔ صفیہ اور اپنے لئے جام بنا کر صفیہ کو دینے اس کے پاس گیا تو وہ ایک بدلی ہوئی صفیہ تھی۔ جلالی کو لگا اس کے چہرے پر نخوت کی جگہ سپردگی کا سایہ پھیل گیا ہو۔ آنکھیں شراب پینے سے پہلے ہی مے چھلکانے لگی تھیں۔

''آؤ یہیں بیٹھ جاؤ۔'' صفیہ نے اس کے ہاتھ سے جام لیتے ہوئے کہا۔ جلالی مسہری پر نیم دراز صفیہ کی نظروں سے بچتے ہوئے سوچنے لگا کہاں بیٹھے۔ مسہری پر بچھے ہوئے جال میں کودا تو نکل نہیں پائے گا۔ سرہانے رکھے ہوئے اسٹول کو دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی۔ جلالی اسٹول کو مسہری سے ذرا اور پرے کھسکا کر اس پر بیٹھ کے دعا مانگنے لگا کہ جلدی سے فون آ جائے۔ صفیہ کی نگاہیں جلالی کے چہرے سے ہٹ کر کمرے کے خلاء میں کسی نامعلوم نقطے پر جم گئی تھیں۔ وہ اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''تم نے میرے ساتھ اس کمرے تک آ کر میری بہت مدد کی ہے۔'' صفیہ نے خاموشی توڑی۔

''کیا؟ میں نے..... میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔'' جلالی گڑبڑا گیا۔ اسے واقعی حیرت ہوئی تھی۔ اس نے کیا کیا تھا؟

''میں تمہیں بونی آپا کے لئے نہیں لائی تھی۔'' وہ اسی طرح جلالی کو دیکھے بغیر کہنے لگی۔ ''ایڈمرل عبدالرب میرے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ مجھے اکیلے آتا دیکھ کر کتے کی طرح پیچھا کرتا ہوا یہاں تک آ جاتا۔ میں اس سے ڈرتی نہیں۔ سب کے سامنے اس کے منہ پر تھوک سکتی ہوں۔ لیکن وہ میجر صاحب کی زندگی مشکل کر دے گا۔ نوکری سے نکالنے کی ہمت تو نہیں کرے گا لیکن پرچیزنگ سے نکال کر کسی بیکار جگہ تبادلہ کر دے گا۔'' جلالی دل میں شرمندہ ہونے لگا۔ وہ جانے کیا سمجھ رہا تھا۔ اسی وقت فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ ریسیور اٹھاتے ہی صفیہ کے چہرے پر نخوت کا سایہ اور ماتھے کا بل

واپس آ گیا۔

"شکریہ شاہ صاحب! بس آپ گورنر ہاؤس کے دروازے پر اتار دیجئے گا۔ میں پہریداروں سے کہہ دیتی ہوں...... نہیں نہیں، آپ کو رکنے کی ضرورت نہیں ہے...... نہیں، گاڑی بھی مت چھوڑیئے۔ وہ دونوں میری ذمہ داری ہیں۔ میں انہیں خود گھر چھوڑ کر آؤں گی...... جی۔ بہت بہت شکریہ۔" صفیہ فون رکھ کر بستر سے کود آئی۔

"آؤ چلیں۔" صفیہ نے ایک بڑی سی انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔ جلالی اسٹول سے اٹھ کر کھڑا ہوا تو صفیہ سے ایک بازو کے فاصلے پر تھا۔ لیکن اسے لگا یہ دعوت دینے والی نہیں سچ مچ تھکن کی کوکھ سے نکلی ہوئی انگڑائی تھی۔ صفیہ فوراً ہی دروازے کی طرف چل دی۔ جلالی بھی تیزی سے بڑھ کر اس کا ساتھ دینے لگا۔ دروازے سے باہر نکلتے ہوئے وہ ایک لمحے کے لئے ٹھٹکی۔

"تھینک یو۔ تم واقعی بہت اچھے ہو۔" صفیہ نے اس کا شانہ دبا کر کہا اور تیزی سے خوابگاہ کی چوکھٹ عبور کر کے باہر نکل گئی۔ اس کے پیچھے باہر آتا ہوا جلالی سوچنے لگا کہ یہ اظہار تشکر کس بات کا تھا۔ عبدالرب کی ممکنہ پیش دستی سے بچانے کا یا ایک کمزور لمحے کو بہکے بغیر گزار دینے کا۔

رہائشی حصے سے نکل کر وہ اس طرف بڑھے جہاں سب جمع تھے۔ اب وہاں کا منظر بدل گیا تھا۔ بڑی بڑی آوازوں سے بولتا اور شور مچاتا ہوا نوجوان لڑکیوں اور لڑکوں کا ایک غول داخل ہو رہا تھا۔ صہبا خان اور دوسرے لوگ بھی اندر کے کمرے سے نکل کر باہر آ گئے تھے۔

"میرے خدا! آج یہ لوگ بھی آ گئے۔ اب دیکھنا کیا بیہودگی پھیلے گی۔" صفیہ نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔

"یہ کون لوگ ہیں؟" جلالی نے حیرت سے پوچھا۔

"نو دولتیوں کی اولادیں ہیں۔ میٹروپول کا ڈسکو گروپ ہے۔ میں نے آغا کو سمجھایا تھا۔ کل وہ پورے شہر میں اس دعوت کا چرچا کریں گے۔ لیکن آغا کو پرواہ نہیں ہے۔ بچوں کے ساتھ بچہ بن کر انہیں بھی مزا آتا ہے۔" صفیہ نے آہستہ سے کہا۔

نئے آنے والے گروپ کی لڑکیاں ایک ایک کر کے "ہائے پریذیڈنٹ انکل" "ہیلو انکل جنرل" یا صرف انکل کہتی ہوئی صہبا خان سے باری باری لپٹ کر اس کے گالوں پر اپنے پیار کی مہر لگا رہی تھیں۔ لڑکے بیئر پینے کے لئے بار کے کاؤنٹر پر ٹوٹ پڑے تھے۔ ایک بھرے بدن کی لڑکی صہبا خان کی طرف بڑھی تو وہ پیچھے ہٹ کر کہنے لگا۔

"نو۔ نو مور انکل۔" ہر طرف قہقہے گونجنے لگے۔ لڑکی بھی ہنستی ہوئی "مائی بے بی" کہہ کر صہبا خان کے گلے میں جھول گئی۔ اس نے گالوں کے بجائے براہ راست ہونٹوں کا بوسہ لیا تھا۔ سب نے زوردار تالیاں بجائیں۔ اسی وقت رقص کے لئے موسیقی شروع ہو گئی۔

صہبا خان سب سے الگ تھلگ کھڑی ہوئی بلیک بیوٹی کا ہاتھ پکڑ کر ڈانس کے لئے لے کر آیا تو سب کسی نہ کسی کے ساتھ اپنا جوڑا بنا کے فلور پر آ گئے۔ جنرل حبیب اس عورت کے ساتھ رقص کرنے لگا تھا جو تھوڑی دیر پہلے اس پر لدی ہوئی تھی۔ دراز قد اکبر خان جنرل کانی کی لائی ہوئی ایک لڑکی کو اپنی ٹانگوں سے چپکائے ہوئے تھا۔ وہ کسی بے بس چڑیا کی طرح سہمی ہوئی اکبر خان کے ساتھ گھسٹ رہی تھی۔ چنوں سیٹھ نے نواب عالمگیر کی بیوی کا ہاتھ مانگ لیا تھا جو بہت کینہ توز نظروں سے صدر صہبا خان کے ساتھ تھرکتی ہوئی بلیک بیوٹی کو دیکھ رہی تھی۔ جنرل کانی کے پاس کینہ دکھانے کا وقت نہیں تھا۔ وہ ایک طرف اپنی لائی ہوئی لڑکیوں کو جو شرفاء کی نئی ٹولی کی جارحیت سے سہمی ہوئی تھیں، کچھ سمجھا رہی تھی۔ ایڈمرل عبدالرب بھیڑ سے بچتا ہوا سیدھا صفیہ شیرازی کی طرف آیا اور اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر ڈانس فلور پر لے گیا۔ صفیہ خاموشی سے اس کے ساتھ چلی گئی لیکن جاتے جاتے جلالی کو اس طرح دیکھتی گئی جیسے کہہ رہی ہو "تم نے پہل کیوں نہیں کی؟" قریشی ڈسکو گروپ کی ایک لڑکی کے ساتھ جو اپنی دوسری ساتھیوں کے مقابلے میں زیادہ سنجیدہ نظر آتی تھی، بہت نپے تلے انداز میں رقص کر رہا تھا۔ لیکن اس طرح کہ پائپ اس کے منہ میں دبا ہوا تھا۔ پائپ نے اس کے اور لڑکی کے درمیان ایک فاصلہ قائم کر رکھا تھا۔ جلالی

کنارے کنارے چلتا ہوا بار کاؤنٹر کی طرف بڑھ گیا جہاں شراب کے ساتھ میجر رحمانی کا رقص جاری تھا۔

''آؤ بابو آؤ۔'' میجر نے اسے دیکھتے ہی کہا۔ ''دعوت اس وقت اپنے تہذیبی مرحلے میں ہے۔ جلدی جلدی دو تین تیز ڈرنک لے لو ورنہ اس کے بعد جو کچھ ہو گا اسے دیکھ نہیں سکو گے۔''

''ابھی کچھ اور باقی ہے؟'' جلالی نے اپنی ڈرنک لے کر مسکراتے ہوئے کہا۔

''ابھی ہوا ہی کیا ہے۔'' میجر اسے حیرت سے دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ''تم آج صحیح دن آئے ہو۔ آج سوئمنگ پول کا دن ہے۔ تم دیکھنا سوئمنگ پول کے مقابلے میں کیا گھمسان کا رن پڑتا ہے۔''

''تیراکی کا مقابلہ؟'' جلالی نے پوچھا۔

''چڈی کھینچنے کا بابو چڈی کھینچنے کا۔'' رحمانی نے اپنا ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔ ''جس کے ہاتھ میں صہبا خان کی چڈی آئے گی وہی ٹرافی بن کر صہبا خان کے بیڈ روم میں جائے گی۔ چیمپئن ٹرافی۔ ہا ہا ہا۔''

جلالی نے سوچا میجر نشے میں آکر بالکل ہی اول فول بکنے لگا ہے۔ اسے تشویش ہوئی کہ وہ میجر کے بغیر واپس کیسے جائے گا۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر سکوں کو ٹٹولا کہ ٹیکسی کے پیسے ہیں یا نہیں۔ ایمپریس مارکیٹ پر ٹیکسیوں کا اڈا گورنر ہاؤس سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اسی وقت انہیں قریشی اپنی طرف آتا نظر آیا۔

''کیا ہوا بابو۔ چڑیا اڑ گئی؟'' رحمانی نے ہاتھ ہوا میں لہرا کر کہا۔

''اسے آہستہ موسیقی کے رقص پسند نہیں ہیں۔'' قریشی نے چہرے پر کوئی تاثر لائے بغیر کہا اور بجھے ہوئے پائپ کی راکھ جھاڑنے لگا۔ اس کے ساتھ رقص کرنے والی لڑکی اس طرف چلی گئی تھی جہاں اس کی ڈسکو گروپ کی ساتھی لڑکیاں اور لڑکے قہقہے اور چیخیں بکھیر رہے تھے۔ لڑکوں کے ایک ہاتھ میں بیئر کی بوتل اور دوسرے ہاتھ میں سگریٹ یا کسی ساتھی لڑکی کی کمر تھی۔ اکثر لڑکیاں انگوٹھے اور دوسری انگلی میں ہاتھ کے بنے ہوئے سگریٹ کا سرا دبا کر ہونٹوں سے دھواں کھینچ رہی تھیں۔ جلالی کو

ان کی طرف سے آتی ہوئی چرس کی بھینی بھینی مہک مزا دینے لگی۔

اسی وقت ایک باوردی بیرا ہاتھوں میں مشروبات کی تھالی لئے لڑکوں کے پاس سے گزرا۔ ایک لڑکی نے اچک کر اس کے سر سے پگڑی اتار لی۔ ایک اور لڑکی پگڑی کے بل کھولنے میں اس کی مدد کرنے لگی۔ پگڑی کھل گئی تو دونوں اس کا ایک ایک سرا پکڑ کر فرش پر بیٹھ گئیں۔ سنہری ٹوپی ایک تیسری لڑکی نے اپنے سر پر رکھ لی تھی۔ لکڑی کے فرش پر ایڑیاں بجا کر اسپینی رقص کا مظاہرہ کرنے والا ایک لڑکا ہاتھ لگائے اور سر جھکائے بغیر تنی ہوئی پگڑی کے نیچے سے گزرنے کا کرتب دکھانے لگا۔ سب نے اس کی کامیابی پر زوردار تالیاں بجائیں۔ اب وہ لڑکی جو صہبا خان کے گلے میں جھول چکی تھی اسی کرتب کو دہرانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کی ٹانگیں اور نصف دھڑ نکل گیا لیکن سینے کی محرابیں اٹک گئیں۔ اس نے فرش پر چت گر کے ہار مان لی۔ چیختی اور شور مچاتی لڑکیاں کلاہ اور صافہ پھینک کر ایک کے بعد ایک اس پر گرنے لگیں۔ بیرا جو پگڑی اترنے کے بعد اس طرح سمٹا کھڑا تھا جیسے ننگا ہو گیا ہو' توجہ سے محروم ہو جانے والے صافے اور کلاہ کو اٹھا کر تیزی سے ایک طرف دوڑ گیا۔

موسیقی بند ہوئی تو رقص کرتے ہوئے جوڑوں نے تھرکنا بند کر دیا۔ صہبا خان بلیک بیوٹی کا ہاتھ پکڑے باہر کی طرف چل دیا جہاں بڑے سے لان کے درمیان گردے کی شکل کے پیراکی کے تالاب میں نیلگوں پانی جھلمل کرتا چمک رہا تھا۔ چاروں طرف لگی ہوئی تیز سرچ لائٹوں کی دودھیا روشنی نے دن کیا ہوا تھا۔ سب صہبا خان کے پیچھے آہستہ آہستہ چلتے ہوئے سوئمنگ پول کی طرف جانے لگے۔ نوجوانوں کا گروپ بھی ایک دوسرے کو دھکیلتا ہوا کارواں میں شامل ہو گیا لیکن انہوں نے صہبا خان سے آگے نکلنے کی ہمت نہیں کی تھی۔ میجر رحمانی' قریشی اور جلالی سب سے آخر میں نکلے تھے۔

کھانے کا اہتمام سوئمنگ پول پر تھا۔ کوئلوں پر سکنے والے کبابوں کی خوشبو اشتہا بڑھا رہی تھی۔ ایک طرف بڑی بڑی گول میزیں اور ان کے گرد کرسیاں بچھی تھیں۔ صہبا خان ایک میز پر بیٹھ گیا۔ اس کے ساتھ ایک طرف بلیک بیوٹی دوسری

طرف اکبر خان بیٹھ گئے تھے۔ ایڈمرل عبدالرب اور صفیہ شیرازی بھی اسی میز پر تھے۔ صرف ایک کرسی خالی بچی تھی۔ اکبر خان نے اشارہ کر کے قریشی کو بلا لیا۔ نواب عالمگیر کی بیوی جو تیزی سے کرسی لینے کے لئے بڑھی تھی مایوس ہو کر برابر کی میز پر چلی گئی جہاں جنرل حبیب اپنے ساتھ چنوں سیٹھ' جنرل کانی اور اس کی دو لڑکیوں کو لئے بیٹھا تھا۔ جلالی رحمانی کے ساتھ چپکا ہوا ایک طرف کونے میں بنائے ہوئے بار کاؤنٹر پر آ کھڑا ہوا۔

"یہ آج واقعی سیکریٹری بن جائے گا۔" رحمانی نے صہبا خان کی میز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جہاں قریشی بہت ادب سے بیٹھا ہوا صہبا خان کو کچھ بتا رہا تھا۔ اس کا پائپ اس وقت کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ باوردی بیرے بھاپ اڑاتے ہوئے کباب اور پراٹھوں کی ڈشیں لئے گھوم رہے تھے۔ نوجوانوں نے براہ راست اس طرف حملہ کیا تھا جہاں کباب بن رہے تھے۔ دو نوجوانوں نے کباب کھانے کے بعد خالی سیخوں سے تلوار بازی کا مظاہرہ شروع کر دیا تھا۔ نیوی کی وردی میں ملبوس ایک نوجوان افسر نے آ کر صفیہ شیرازی کے کان میں کچھ کہا تو وہ اٹھ کر تیزی سے لان سے گزرتی ہوئی باہر کے دروازے کی طرف چلی گئی۔ نواب عالمگیر کی بیوی اپنی کرسی سے اٹھی۔ وہ شاید صفیہ کی خالی کی ہوئی کرسی کی طرف جانا چاہتی تھی لیکن جنرل کانی نے ہاتھ پکڑ کر اسے بٹھا لیا اور اس کے کان میں کچھ کہنے لگی۔

"نواب کی بیوی آج کی رات کا آخری آئٹم بن کر رہے گی بابو۔ میری بات لکھ کر رکھ لو۔" رحمانی نے جلالی سے کہا جو ایک بیرے کے ہاتھوں پر سجی ہوئی تھالی سے گوشت کے تکے اٹھا کر کھا رہا تھا۔ میجر رحمانی نے کھانے کی کسی چیز کو ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔ جلالی کو حیرت ہو رہی تھی کہ نشے کے باوجود میجر کی نگاہ کتنی تیز تھی۔ کسی کی کوئی غیر معمولی حرکت اس کی توجہ سے محروم نہیں تھی۔

صفیہ شیرازی تھوڑی ہی دیر بعد بونی آپا اور منے بھائی کے ساتھ آتی ہوئی نظر آئی۔ جلالی دونوں کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔ وہ ریڈیو' ٹی وی اور اسٹیج کے مشہور آرٹسٹ تھے لیکن ان کی شہرت کی بڑی وجہ ان کا گز بھر سے بھی چھوٹا قد تھا۔ صفیہ

دونوں بونوں کے ہاتھ پکڑے ہوئے اس طرح چل رہی تھی جیسے کوئی ماں اپنے بچوں کو باغ میں ٹہلانے کے لئے لے کر آ رہی ہو۔ تینوں سیدھے صہبا خان کی میز پر پہنچے تو سب کی توجہ ان کی طرف ہو گئی۔ صہبا خان نے تالیاں بجائیں تو سب نے اس کی تقلید کی اور کھڑے ہو کر دونوں فنکاروں کا استقبال کیا۔ صہبا خان زمین پر اکڑوں بیٹھ کر بونوں کی اس جوڑی سے مسکرا کر کچھ کہنے لگا تھا' بونی آپا شرما رہی تھی جبکہ اس کا بھائی گردن اکڑا کر بہت فخر سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ صہبا خان تھوڑی دیر بعد بونی آپا کے ننھے ننھے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لئے دیکھ کر سر ہلاتا رہا اور پھر اٹھ کر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ صہبا خان کے پاس آنے والے خصوصی مہمانوں کا یہ جوڑا اسی طرح حیرانی سے کھڑا ہوا سوچ رہا تھا کہ اب کیا کرے۔ دونوں کھڑے ہو کر بھی بیٹھے ہوئے لگ رہے تھے۔ دوسری میزوں سے اٹھ کر آئے ہوئے مہمانوں اور نوجوانوں کی ٹولی انہیں گھیرے ہوئے تھی اور بونی آپا کو چھو کر دیکھ رہی تھی کہ وہ سچ مچ گوشت پوست کی بنی ہوئی ہے یا محض بولتی گڑیا ہے۔ بونی آپا سمٹی جا رہی تھی لیکن اس کا توجہ سے محروم بھائی ''مجھے بھی چھیڑو نا'' کی تفسیر بنا ہوا تھا۔

ایڈمرل عبدالرب اچانک اٹھا اور اس نے بونی آپا اور اس کے منے بھائی جان کو باری باری اٹھا کر میز پر کھڑا کر دیا۔

''بونی آپا' ہمیں اپنا رقص دکھائیے۔'' اس نے فرمائش کی۔ بڑی سی گول میز کے درمیان میں کھڑی اور چاروں طرف سے پڑتی ہوئی نگاہوں کا مرکز بنی بونی آپا الجھن بھری نظروں سے اپنے بھائی کو دیکھنے لگی۔ تھوڑی دیر کے لئے خاموشی چھا گئی تھی۔

''بونی آپا شرماؤ مت۔ شروع ہو جاؤ۔'' صہبا خان نے صدارتی فرمان جاری کرتے ہوئے سناٹے کا طلسم توڑا تو لڑکے لڑکیوں نے فلمی گانے کی لے میں کورس میں گانا شروع کر دیا۔

''بونی آپا بونی آپا مان جاؤ۔''

کورس کی لے ختم ہونے سے پہلے ہی منے بھائی جان نے جیب سے ماؤتھ

آرگن نکال کر منہ سے لگا لیا اور Comes September کی ایک دھن چھیڑ دی۔ بونی آپا بھی آہستہ آہستہ تھرکنے لگی۔ دھن اور جنبشوں میں یکسانیت آئی تو زمین کی گردشیں بونی آپا کے رقص میں اور آوازیں ماؤتھ آرگن کی دھن میں سمانے لگیں۔ میز کے گرد بیٹھے اور کھڑے ہوئے لوگ خاموش اور ساکت تھے۔ ان کی آنکھوں میں پسندیدگی، حیرت اور کہیں کہیں تمسخر جھلک رہا تھا۔ جنرل صہبا خان کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں اور موٹا سا پیٹ دھونکنی کی طرح اوپر نیچے ہو رہا تھا۔ وہ شاید ہنسی روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ماحول پر یہ طلسم کافی دیر تک طاری رہا۔ صہبا خان کی خاموشی کو حکم سمجھ کر سب اپنی سانسوں کی آواز سے بھی ڈر رہے تھے۔ نوجوانوں کی ٹولی بھی کچھ دیر اسی طرح خاموش کھڑی حیرت سے بونی آپا کا رقص دیکھتی رہی لیکن پھر اس میں حرکت ہوئی اور وہ ماؤتھ آرگن کی لے سے لے ملا کر تالیاں بجانے لگے۔ سحر اچانک ہی ٹوٹ گیا، تماشائیوں میں حرکت پیدا ہونے لگی۔ کچھ تالیاں بجانے میں ساتھ دینے لگے اور جو ہنسنا چاہتے تھے انہوں نے اپنی ہنسی آزاد کر دی۔ صدر صہبا خان بھی بے ساختہ ہنسنے لگا تھا۔ لیکن بونی آپا اور اس کا بھائی آنکھیں بند کئے اردگرد کی دنیا سے بے خبر اپنے فن کی انتہا کو پہنچے ہوئے تھے۔ نوجوانوں نے تالیوں کے ساتھ ٹوئسٹ بھی شروع کر دیا جو آہستہ آہستہ ایک لڑکے اور لڑکی کے درمیان مقابلے کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں ایک ایک کر کے سب کی توجہ بونی آپا سے ہٹ کر والہانہ انداز میں ٹوئسٹ کرنے والے جوڑے کی طرف ہو گئی۔ بونی آپا بھی تھک گئی تھی۔ وہ اپنا رقص روک کر پیشانی سے پسینہ پوچھنے لگی۔ اس کا بھائی شاید آخری سانس تک ماؤتھ آرگن بجانے کا تہیہ کئے ہوئے تھا۔ اسے پتہ تھا کہ صدر اور ان کے دوستوں کے سامنے فن کے مظاہرے کا یہ پہلا اور آخری موقع ہے۔ لیکن کچھ دیر بعد ہی اس کا سانس بھی ٹوٹ گیا۔ دھن بند ہوئی تو اس کے ساتھ بجتی ہوئی تالیاں اور ان کی تال پر ہونے والا رقص بھی ختم ہو گیا۔ ٹوئسٹ کرنے والے جوڑے نے داد دینے کے لئے ایک دوسرے کو لپٹا لیا سب نے مل کر زوردار تالیاں بجائیں۔ میز پر کھڑا ہوا بونا

درباری مسخرے کی طرح جھک جھک کر سلام کرنے لگا۔ صفیہ شیرازی نے کھڑے ہو کر میز پر پریشان کھڑی ہوئی بونی آپا کو کھینچ کر گلے لگا لیا۔

"صفیہ' ان کے کھانے پینے اور انہیں انعام دینے کا انتظام کرو۔" صہبا خان نے کھڑے ہوتے ہوئے صفیہ کو اپنی توجہ کا خاص انعام دیا اور اس میز سے جس پر بونی آپا اور اس کا بھائی ابھی تک کھڑے تھے پیٹھ موڑ کر اپنا رخ سوئمنگ پول کی طرف کر لیا۔ صفیہ نے گلے سے لگی ہوئی بونی آپا کو میز سے اتار لیا۔ منا بھائی جان خود ہی میز سے کود گیا تھا۔ صفیہ دونوں کو کھانے کی میز پر چھوڑ کر میجر رحمانی کی طرف آئی جہاں اس کے ساتھ جلالی اور اب قریشی بھی آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

"ڈارلنگ! تم بالکل شراب میں ڈوب گئے ہو۔ تمہیں کچھ نہیں پتہ کیا ہو رہا ہے۔ بونی آپا کا رقص دیکھنے میز تک نہیں آئے۔ تمہاری وجہ سے جلالی بھی بندھ گئے ہیں' دعوت کا مزا نہیں لے سکے۔" رحمانی جواب دیئے بغیر مڑ کر نئی ڈرنک آرڈر کرنے لگا تو صفیہ جلالی کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"پلیز آپ بونی آپا اور اس کے بھائی کا خیال رکھئے' میں ان کے لئے کچھ انتظام کرنے اندر جا رہی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے اندر کی طرف چلی گئی۔ جلالی نے دور کھڑے ہوئے ایڈمرل عبدالرب کو دیکھا لیکن وہ شاید صفیہ شیرازی سے مایوس ہو گیا تھا اور جنرل کانی کی لائی ہوئی ایک لڑکی کو اپنے ساتھ چپکائے کھڑا تھا۔ جلالی اپنی میزبان کا حکم بجا لانے بونی آپا اور منے بھائی جان کی طرف بڑھ گیا جنہوں نے اپنا خیال خود رکھتے ہوئے کبابوں پر بھرپور حملہ کر دیا تھا۔

سوئمنگ پول میں جھماکے ہونے شروع ہو گئے تھے۔ ڈسکو گروپ کے لڑکے لڑکیوں نے سوئمنگ پول کے کنارے کھڑے کھڑے اپنے کپڑے اتار دیئے تھے۔ سب کو شاید پہلے سے پتہ تھا۔ وہ اپنا سوئمنگ کاسٹیوم نیچے پہن کر آئے تھے اور اب ایک ایک کر کے پانی میں چھلانگیں لگا رہے تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں نیلگوں پانی میں تیراکی کے سرخ' نیلے' پیلے' نارنجی اور شوخ رنگ کے پھولدار لباسوں میں کسے ہوئے جسم آگ لگانے لگے۔ صہبا خان سوئمنگ پول کے پاس کھڑا ہوا ایک دوسرے پر پانی کے

چھینٹے اڑاتے ہوئے نوجوانوں کی چیخیں سن کر مسکرا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی دوسرے اہم مہمان بھی پول کے کنارے پر آ کھڑے ہوئے تھے۔ صرف جنرل کانی کی لائی ہوئی لڑکیاں سہم کر اور پیچھے چلی گئی تھیں۔ انہیں شاید تیرنا نہیں آتا تھا۔

"کم آن انکل۔" پانی میں مچھلیوں کی طرح اچھلتی ہوئی لڑکیوں نے صہبا خان کو دیکھ کر شور مچایا۔ صہبا خان اپنے ساتھ کھڑی ہوئی بلیک بیوٹی کے کان میں کچھ کہنے لگا۔ وہ مسکراتی ہوئی زور زور سے نفی میں سر ہلا کر پیچھے ہٹنے لگی لیکن صہبا خان نے اس کا بازو پکڑ کر اسے واپس جانے سے روک لیا۔

"کم آن انکل" کا شور کورس بن گیا تو صہبا خان سفید رنگ کی پولو شرٹ اور کریم کلر کی ریشمی پتلون اتارنے لگا جو نیوی کی یونیفارم میں ملبوس نوجوان اے ڈی سی نے سنبھال لی تھی۔ صہبا خان بھی اپنے لباس کے نیچے گہرے نیلے رنگ کا نہانے کا جانگیہ پہن کر آیا تھا۔ وہ پول کے کنارے پانی میں ٹانگیں ڈال کر بیٹھ گیا۔ پانی میں غوطے لگاتی ہوئی لڑکیوں نے صہبا خان کی طرف پانی کے چھینٹے اڑانے شروع کئے تو وہ پانی میں ٹانگیں چلا کر جوابی کارروائی کرنے لگا۔ صہبا خان کے پیچھے کھڑی ہوئی بلیک بیوٹی نے اچانک اسے دھکا دے کر پانی میں گرا دیا۔ پانی میں صہبا خان کے بھاری بدن کے گرنے کا زوردار جھماکا ہوا اور پول میں اچھلتے اور تیرتے لوگوں نے تالیاں بجا کر "جنرل انکل" کا خیر مقدم کیا۔ صہبا خان قہقہے لگاتا ہوا مڑا اور پانی کے چھینٹے بلیک بیوٹی کی طرف پھینکنے لگا جو کنارے پر کھڑی ہنس رہی تھی۔

اس کے ساتھ ہی ایک دوسرے کو پانی میں دھکا دینے کا کھیل شروع ہو گیا۔ اکبر خان نے چنو سیٹھ کو دھکا دیا لیکن وہ گرتے گرتے اکبر خان کا ہاتھ پکڑ کر اسے بھی ساتھ لیتا گیا۔ دونوں کپڑوں سمیت پانی میں غوطے کھانے لگے۔ ان کا استقبال بھی ان پر پانی کے چھینٹے اڑا کر کیا گیا۔ چھینٹے اڑانے والوں میں قہقہے لگاتا ہوا صدر صہبا خان بھی شامل تھا۔ ایڈمرل عبدالرب جنرل کانی کو دھکیلنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن وہ گوشت کا پہاڑ تھی اور پرزور مزاحمت کر رہی تھی۔ وہ ایڈمرل کے دھکے کے زور میں پھسلتی ہوئی اسی طرف آ گئی جہاں بلیک بیوٹی کھڑی تھی اور اس طرح لڑکھڑا کر اس سے

ٹکرائی کہ بلیک بیوٹی توازن سنبھالنے کی کوشش کرتے کرتے سوئمنگ پول میں گر پڑی۔ جنرل کانی اور ایڈمرل عبدالرب نے زوردار قہقہے لگائے اور صدر صہبا خان بلیک بیوٹی کو پانی میں گرانے کی کامیاب سازش پر تالیاں بجا کر خوشی کا اظہار کرنے لگا۔

بلیک بیوٹی پانی میں غوطہ کھا کر سنبھلی تو اس کی باریک ساڑھی بدن سے چپک گئی تھی اور جسم کے خطوط پوری طرح نمایاں ہو گئے تھے۔ بلیک بیوٹی کے ہونٹوں سے مسکراہٹ غائب تھی اور چہرہ غصے سے سیاہ ہو گیا تھا۔ اس کی پھرتی حیرت انگیز تھی۔ وہ تیرتی ہوئی اس طرف آئی جہاں جنرل کانی کھڑی ابھی تک ہنس رہی تھی' اور اچھل کر اس کے پیر پکڑ کر اس زور سے کھینچے کہ جنرل کانی سر کے بل پانی میں گری۔ بلیک بیوٹی کسی ماہر جمناسٹک کی طرح کنارے پر ہاتھ ٹکا کر اچھلی اور سوئمنگ پول سے باہر آ گئی۔ اس نے ایک بیرے کے ہاتھ سے سفید تولیہ لے کر اپنے گیلے بدن پر لپیٹ لی لیکن جاتے جاتے اچانک واپس آ کر بے خبر کھڑے ہوئے ایڈمرل عبدالرب کو دھکا دے کر پانی میں گرا دیا اور تیزی سے رہائشی حصے کی طرف چلی گئی۔ اپنے پیچھے آتی ہوئی چیخوں اور قہقہوں کی آوازوں کو اس نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا تھا۔

جنرل کانی ہاتھ پاؤں مارتی ہوئی سطح آب پر آ گئی تھی لیکن اس طرح کہ اس کی پتھر والی آنکھ اپنی جگہ سے غائب ہو کر پول کی تہہ میں بیٹھی سب کو گھور رہی تھی۔

''کتو! شور مت مچاؤ' میری آنکھ ڈھونڈو۔'' جنرل کانی چیختے ہوئے لڑکوں پر غرائی۔ ''ایک لڑکا غوطہ لگا کر اس کی آنکھ نکال لایا لیکن جنرل کانی کو دینے کے بجائے اس نے دوسرے کنارے پر ایک لڑکی کی طرف اچھال دی جس نے خوبصورت کیچ لے کر دوسرے لڑکے کی طرف پھینک دی۔ جنرل کانی اپنی گیند بنی ہوئی آنکھ کو پکڑنے کے لئے اچھل اچھل کر ڈوبتی رہی اور پھر گالیاں بکتی ہوئی سیڑھیاں چڑھ کر سوئمنگ پول سے باہر نکل آئی۔ کنارے پر صرف جنرل حبیب احمد خان' نواب عالمگیر کی بیوی اور دوسری موٹی عورت باقی رہ گئے تھے۔ نواب عالمگیر کی بیوی نے جو بہت دیر سے دھکا کھانے کے انتظار میں کنارے پر ٹہل رہی تھی' غصے میں آ کر دوسری موٹی عورت کو دھکا دے کر سوئمنگ پول میں وہ جگہ بھر دی جو جنرل کانی کے نکلنے سے خالی ہو گئی

تھی۔ اب وہ بہت پرامید نظروں سے جنرل حبیب کو دیکھ رہی تھی جیسے کہہ رہی ہو "دھکا کیوں نہیں دیتے؟" لیکن جنرل حبیب سگار منہ میں دبائے ہوئے سوئمنگ پول کا نظارہ دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کوئی اسے دھکا دینے کی ہمت نہیں کرے گا اور نہ کوئی اس وقت تک پول سے باہر نکلے گا جب تک صہبا خان اندر موجود ہے۔"

کم اہم مہمان دور کھڑے اہم مہمانوں کے درمیان ایک دوسرے کو پانی میں گرانے کی کشتی دیکھ رہے تھے۔ میجر رحمانی بدستور بار کے سامنے ڈٹا ہوا جھونکے کھا رہا تھا۔ قریشی بھی اس کے ساتھ کھڑا ہوا پائپ کے کش لے رہا تھا۔ جلالی ابھی تک صفیہ شیرازی کا حکم بجا لا رہا تھا۔ لیکن بونی آپا اور اس کے بھائی کو اتنے غیر اہم آدمی کا ساتھ پسند نہیں آ رہا تھا۔ وہ صدر کے مہمان تھے اور اس کے آس پاس رہ کر توجہ کا مرکز بنا چاہتے تھے۔ کھانا ختم کرتے ہی منے بھائی جان نے بونی آپا کا ہاتھ پکڑا اور سوئمنگ پول کی طرف بڑھ گیا جہاں چھینٹے اڑانے کا کھیل اب جسمانی کھینچا تانی میں تبدیل ہو گیا تھا۔ سب سے آخر میں دھکا دی جانے والی عورت نے پانی میں آتے ہی اپنی میکسی اتار پھینکی تھی اور زیر جامہ میں تیراکی کا مظاہرہ کرتی ہوئی ایڈمرل عبدالرب کی قمیض کھینچ کر اتارنے کی کوشش کر رہی تھی۔ بونی آپا کو دیکھتے ہی سب کی توجہ ان کی طرف ہو گئی۔ سب چیخ چیخ کر بونی آپا کو سوئمنگ پول میں آنے کی دعوت دے رہے تھے۔ منے بھائی جان کو اسی توجہ کی ضرورت تھی۔ وہ ان لمحوں کا پورا مزا لے رہا تھا۔ وہ سوئمنگ پول کے کنارے کھڑے ہو کر کسی مجمع باز کی طرح لن ترانیاں کرنے لگا۔

"یہ سوئمنگ پول تو پانی کا بلبلہ ہے۔ بونی آپا سمندر کا سینہ چیر سکتی ہے۔ اس کے قد پر مت جاؤ۔ یہ دیو زادی ہے۔ ایک دشمن جادوگر نے پھونک مار کر اسے بونی بنا دیا تھا۔ لیکن اس میں اب بھی دیو کی طاقت باقی ہے۔ یہ ہاتھی کو پچھاڑ سکتی ہے' آپ کو اپنے ہاتھوں پر اٹھا کر پرواز کر سکتی ہے' اڑا کر کوہ قاف لے جا سکتی ہے۔ سمندر کی اونچی موجوں پر چل سکتی ہے یہ یہ......" منے بھائی جان کی زبان اچانک ہی

بند ہو گئی اور چہرہ خوف سے سفید ہو گیا۔ جنرل حبیب احمد خان نے آ کر بونی آپا کو ہاتھوں میں اٹھایا تھا اور سوئمنگ پول میں صہبا خان کی طرف اچھال دیا تھا۔ صہبا خان بونی آپا کو پانی میں غوطے دے کر اس کی چیخوں کا مزا لے رہا تھا۔ دو تین غوطوں کے بعد اس نے بونی آپا کو اکبر خان کی طرف اچھال دیا۔ اکبر خان نے اسے ہاتھوں پر لے کر اطمینان دلانے والی تھپکیاں دیں اور اپنے قریب موجود ایڈمرل عبدالرب کے کندھوں پر بٹھا دیا۔ ایڈمرل اسے کندھوں پر لئے لئے تیراکی کا مظاہرہ کرنے لگا۔ بونی آپا کی خوفزدہ چیخیں خوشیوں بھری سریلی چیخوں میں دب گئی تھیں۔ اس کا بھائی کنارے پر ایک سے دوسری طرف دوڑتا ہوا فریاد کر رہا تھا۔ آنکھوں سے بے بسی کے آنسو بہہ رہے تھے۔

''صدر صاحب' جنرل صاحب رحم کیجئے۔ میرے مالک میرے آقا رحم کیجئے۔ اس کا دل بہت کمزور ہے۔ یہ خوف سے مرجائے گی۔ اسے تیرنا نہیں آتا۔ یہ ڈوب جائے گی۔ اسے باہر نکال دیجئے۔ خدا کے لئے......''

اسی وقت موٹی عورت غوطہ لگا کر ایڈمرل کی ٹانگیں کھینچنے لگی۔ ایڈمرل اس سے بچنے کے لئے پلٹا تو بونی آپا پانی میں گر گئی۔ موٹی عورت اور عبدالرب میں پھر کشمکش ہونے لگی تھی اور سب دونوں کی حوصلہ افزائی کرنے کے لئے بڑھاوا دیتے ہوئے چیخ رہے تھے۔ پانی میں غوطے کھاتی ہوئی بونی آپا کو جیسے سب بھول گئے تھے۔ منے بھائی جان کی آواز چیختے چیختے پھٹ گئی تھی۔ اس نے پلٹ کر پیچھے کھڑے ہوئے لوگوں کو دیکھا۔ اسی وقت اسے صفیہ شیرازی آتی ہوئی نظر آئی۔ وہ تیزی سے بھاگتا ہوا اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔

''میری بہن کو بچاؤ۔ وہ ڈوب رہی ہے۔'' سوئمنگ پول کی طرف اشارہ کر کے وہ بس یہی کہہ سکا۔

''اوہ میرے خدا!'' سوئمنگ پول میں ڈوبتی ابھرتی بونی آپا کو دیکھ کر صفیہ شیرازی کا چہرہ بھی سفید ہو گیا۔ وہ بھاگتی ہوئی میجر رحمانی کی طرف گئی اور اس کے کوٹ کا کالر پکڑ کر اسے جھنجھوڑنے لگی۔

"خدا کے لئے جا کر بونی آپا کو بچاؤ۔ میری عزت کو بچاؤ۔ وہ سب پاگل ہیں۔ اسے مار ڈالیں گے۔" میجر رحمانی پلٹا تو جلالی کو لگا جیسے اس نے کبھی پی ہی نہیں تھی۔ اس نے اپنا کوٹ اتار کر پھینکا اور تیزی سے بھاگتا ہوا سوئمنگ پول میں کود گیا۔ قریشی اس کے پیچھے پیچھے گیا تھا۔ جلالی بے بسی سے ہاتھ ملتا سوچ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ رحمانی کے سوئمنگ پول میں کودنے پر سب نے زوردار تالیاں بجائیں۔ ان کا خیال تھا کہ بالآخر میجر بھی ان کے کھیل میں شریک ہو گیا ہے۔ لیکن رحمانی تیرتا ہوا بونی آپا کی طرف گیا وہ اسے لے کر کنارے پر آیا تو قریشی تولیہ لئے تیار کھڑا تھا۔ اس نے بونی آپا کو تولیہ میں لپیٹ دیا۔ اس دوران اس کا پائپ سوئمنگ پول میں گر گیا تھا لیکن اسے پرواہ نہیں تھی۔

"میں اسے اسپتال بھجوانے کا انتظام کرتا ہوں۔" قریشی تولیہ میں لپٹی ہوئی بونی آپا کو لے کر باہر کے دروازے کی طرف دوڑ گیا۔ آنسو بہاتا بونا اس کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ رحمانی سر ہلاتا ہوا پول سے باہر نکل آیا جہاں صفیہ شیرازی تولیہ سے اس کا سر خشک کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ رحمانی اس کا ہاتھ جھٹک کر بار کی طرف واپس آیا اور گیلے کپڑوں پر دوبارہ اپنا کوٹ پہن لیا۔ صفیہ رحمانی کے پیچھے پیچھے آئی اور اس کے سینے پر سر ٹکا کر کھڑی ہو گئی۔

"آؤ ڈارلنگ گھر چلیں۔ تم صحیح کہتے تھے۔ ہم اب ان دعوتوں میں نہیں آئیں گے۔" صفیہ نے سر اٹھا کر رحمانی کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ رحمانی نے خاموشی سے سر ہلایا اور اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر باہر کے گیٹ کی طرف چل دیا۔ جلالی کے قریب سے گزرتے ہوئے انہوں نے اس کی طرف دیکھا بھی نہیں تھا۔ جلالی نے سوچا وہ بھی ان کے پیچھے پیچھے نکل جائے لیکن پھر اس نے سوچا دونوں واپسی کے سفر پر تھے۔ اس وقت انہیں چھیڑنا ٹھیک نہیں تھا۔ وہ پلٹ کر سوئمنگ پول کی طرف دیکھنے لگا جہاں ایک لڑکی قریشی کا پائپ منہ میں لئے پانی کے بلبلے نکال رہی تھی۔ موٹی عورت اور ایڈمرل اب مل کر چنو سیٹھ کی قمیض کھینچ رہے تھے۔ صہبا خان سوئمنگ پول کے کم گہرے حصے میں کھڑا شراب پیتے ہوئے تماشا دیکھ رہا تھا۔

جلالی نے سوچا رحمانی نے غلط نہیں کہا تھا۔ اب تک جو کچھ پیا تھا ہوا ہو گیا تھا۔ وہ بار ٹنڈر کو ایک ڈبل پیگ بنانے کے لئے کہنے لگا۔ اسی وقت قریشی بھی آ کر اس کے پاس کھڑا ہو گیا اور جلالی جیسا ڈبل جام بنوانے لگا۔

"میجر اور ان کی بیوی گھر چلے گئے ہیں۔" جلالی نے اسے بتایا۔

"ہاں میں نے دیکھا تھا۔ شاید جو کچھ ہوا ان کے لئے اچھا ہی ہوا۔" قریشی سر ہلاتے ہوئے کہنے لگا۔ "میرا ڈرائیور اسپتال سے واپس آ جائے تو میری گاڑی تمہیں چھوڑ آئے گی۔"

"بونی آپا ٹھیک ہے؟" جلالی نے ممنونیت بھری نظروں سے قریشی کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"صدمے سے سکتہ ہو گیا ہے۔ لیکن ٹھیک ہو جائے گی۔ پیٹ میں پانی نہیں گیا تھا۔"

دونوں اپنے اپنے جام لے کر خاموشی سے سوئمنگ پول کی طرف دیکھنے لگے۔

سوئمنگ پول کے کھیل ابھی ختم نہیں ہوئے تھے۔ نواب عالمگیر کی بیوی جو دھکا کھانے سے محروم رہ گئی تھی جنرل کانی کے ساتھ میز پر بیٹھی ہوئی ایک کے بعد دوسرا جام چڑھا رہی تھی۔ جلالی کو میجر رحمانی کی ایک اور پیشگوئی صحیح ہوتی ہوئی لگی۔ وہ آج کی رات کا آخری آئٹم بننے کی تیاری کر رہی تھی اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ جنرل کانی نے اسے روکنے کی کوشش کی لیکن وہ اس کا ہاتھ جھٹک کر لڑکھڑاتی ہوئی سوئمنگ پول کی طرف چل دی۔ جنرل حبیب کو بھیگنا اور پانی کا کھیل پسند نہیں تھا۔ نواب عالمگیر کی بیوی سوئمنگ پول کے کنارے کھڑے تھوڑی دیر اسی طرح جھولتی رہی۔

"کم آن بے بی" کسی نے کسی کی اتاری ہوئی قمیض ہوا میں جھنڈے کی طرح لہرا کر آواز لگائی۔ نواب کی بیوی کو بس اتنے سے اشارے کی ضرورت تھی۔ اس نے اسی طرح کھڑے کھڑے اپنے کپڑے اتار کر پھینکے اور زوردار دھماکہ کرتی ہوئی پانی میں کود گئی۔ سوئمنگ پول میں نیا خون آتے ہی جیسے جان پڑ گئی۔ وہ تیرتی ہوئی جنرل صہبا

خان کی طرف بڑھی۔ جنزل نے اپنا جام ختم کر کے دور لان میں پھینک دیا اور پانی میں غوطہ لگا کر مقابلے کے لئے تیار ہو گیا۔ نواب کی بیوی کے پہنچنے سے پہلے ہی وہ تیرتا ہوا اس کے قریب سے گزرا اور اس کی انگیا کھینچ کر ہوا میں نچانے لگا۔ وہ غوطہ لگا کر نیچے گئی اور پانی کے نیچے ہونے والی جدوجہد کے بعد اوپر آئی تو اس کے ہاتھ میں صدر صہبا خان کا گہرے نیلے رنگ کا جانگیہ لہرا رہا تھا۔ صہبا خان تیزی سے اس کی طرف لپکا لیکن وہ سوئمنگ پول سے نکل کر لان پر دوڑنے لگی۔ صہبا خان بھی سوئمنگ پول سے نکل کر اس کے پیچھے بھاگا۔ وہ چیختی ہوئی گورنر ہاؤس کے پھاٹک میں کھلے ہوئے چھوٹے دروازے سے باہر نکل کر سڑک پر آ گئی۔ صدر صہبا خان بھی اس کے تعاقب میں دروازے سے باہر سڑک پر نکل آیا۔ سڑک بالکل سنسان تھی جس پر ایک موٹی ننگی عورت اور اس کے پیچھے بالکل ننگا جنزل صہبا خان دوڑا چلا جا رہا تھا۔ ان کے پیچھے دوڑتے ہوئے سپاہیوں کی سیٹیاں سناٹے کا سینہ چیرنے لگیں جس میں قریب سے گزرتے ہوئے آٹو رکشہ کی کرخت آواز بھی شامل ہو گئی تھی۔

بڈاپسٹ، ہنگری

جلالی نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو جہاز کے چاروں طرف گھرے سفید بادل تیر رہے تھے۔ بادلوں سے پرے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ خلاؤں میں جھولتا اور بادلوں میں گھرا ہوا یہ جہاز بھی اس کی زندگی کی مثال بن گیا تھا۔ کوئی نشان کوئی راہ گزر سامنے نہیں تھی۔ جس کے ہاتھ میں لگام تھی وہ نگاہوں سے اوجھل تھا۔ اسی وقت ایئرہوسٹس ہنگیرین اور اس کے بعد انگریزی زبان میں بڈاپسٹ ایئرپورٹ پہنچنے کا اعلان اور نشست کی پیٹی باندھنے کی ہدایت کرنے لگی۔ جلالی نے پیٹی باندھ کر ایک بار پھر کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ ابھی تک کچھ نظر نہیں آیا تھا کوئی راستہ، ایئرپورٹ کی کوئی جھلک۔ جلالی کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ اس نے سوچا کچھ دیکھے بغیر جہاز کیسے اترے گا۔ لیکن اسی وقت جہاز نے بادلوں کا سینہ چیر کر ہلکا سا جھٹکا لیا اور ٹھیک نشانے پر پہیئے ٹکا کر روشنیوں کی دو لکیروں کے درمیان دوڑتا ہوا اپنی رفتار کم کرنے لگا۔ جلالی کی سانس واپس آ گئی۔ اس نے سوچا کہ خلاؤں میں بھٹکتی ہوئی اس کی زندگی بھی اسی طرح کسی روشن یا چمکدار راہ گزر کو پا کر اپنی منزل تک پہنچ جائے گی۔

سب کچھ اسی طرح ہوا تھا جس طرح قریشی نے بتایا تھا۔ قریشی کے جانے کے بعد نواب ٹن جلالی کو اپنی گاڑی میں لے کر اس کے گھر گیا تھا اور سامان باندھنے میں مدد کی تھی۔ ایئرپورٹ آتے آتے صبح کے تین بج گئے تھے۔ ایئرپورٹ پر ایف آئی اے کا ایک باوردی افسر موجود تھا جو اسے سیاہ رنگ کی ایک گاڑی میں بٹھا کر استنبول کی پرواز پر جانے والے پی آئی اے کے جہاز تک لے کر آیا تھا۔ پی آئی اے کے عملے نے انہیں کھڑکی کے ساتھ والی جلالی کی نشست تک پہنچایا تھا۔ کچھ دیر بعد کسی نے جلالی کا پاسپورٹ، ٹکٹ اور بورڈنگ پاس لا کر اسے دیا تھا اور جلالی سوالیہ نظروں سے اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے ایف آئی اے کے افسر کو دیکھنے لگا تھا۔ کیا یہ آخر تک میرے ساتھ جائے گا؟ لیکن وہ صرف اس وقت تک ساتھ رہا جب تک جہاز کی روانگی کا اعلان نہیں ہو گیا۔ اس کے جہاز سے اترتے ہی سیڑھیاں ہٹا لی گئی تھیں۔

استنبول میں جہاز سے نکلا تو پی آئی اے اور ترکی کے شہری فضائیہ کے عملے کے ارکان کے ساتھ ایک شخص جلالی کے نام کا کارڈ لئے بھی کھڑا تھا۔ اس نے بہت گرم جوشی سے ہاتھ ملا کر اپنا تعارف کرایا تھا۔ وہ انقرہ کے پاکستانی سفارتخانے میں سیکنڈ سیکریٹری تھا اور جلالی کو وصول کرنے خاص طور پر انقرہ سے استنبول آیا تھا۔ اس نے اپنا نام میجر افتخار بتایا تھا۔ جسمانی ساخت اور بالوں کے اسٹائل سے بھی فوجی لگتا تھا۔ اس کے ساتھ ترکی کی وزارت خارجہ کا ایک افسر تھا جس نے جلالی سے اس کا پاسپورٹ لے کر اخراج کی مہر لگوائی تھی اور خصوصی لاؤنج کے ذریعے انہیں باہر لے آیا تھا۔

"سفارتکار اپنی سرکاری گاڑی اور ڈرائیور کے بارے میں بہت حساس ہوتے ہیں۔" میجر افتخار مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔ "پھر بھی کسی کا بازو موڑ کر استنبول کے قونصل جنرل کی گاڑی لے آیا ہوں۔ بڈاپسٹ کی پرواز میں ابھی آٹھ گھنٹے ہیں۔ آپ کے بہانے میں بھی استنبول کی سیر کر لوں گا۔"

اسی وقت سیاہ رنگ کی ایک مرسیڈیز کار ان کے قریب آ کر رک گئی اور ایک

بہت مستعد ڈرائیور ان کے لئے پچھلی نشست کا دروازہ کھول کر کھڑا ہو گیا۔ جلالی کچھ کہے بغیر کار میں سوار ہو گیا۔

ڈرائیور ترکی کا باشندہ تھا اور کسی تجربہ کار گائیڈ کی طرح اپنی زبان دانی کے کمالات دکھا رہا تھا۔ تکونے شہر کے چاروں طرف اٹھی ہوئی قدیم فصیلوں کے آثار اب بھی باقی تھے۔ وہ توپ دروازے سے شہر میں داخل ہو کر شاہراہ ملت سے ہوتے ہوئے شہر کے قلب میں آئے تھے اور پھر ساحلی سڑک کی گیلی ہوا کا مزا لیتے ہوئے توپ کاپی میوزیم کی طرف رواں تھے۔ ہوا میں خنکی تھی لیکن جلالی نے اپنی طرف کا شیشہ کھول لیا تھا۔ کبھی کبھی ہوا سمندر کی موجوں کا جھاگ سڑک پر پھینکتی اور جلالی کا چہرہ گیلا ہونے لگتا۔ لیکن اسے اچھا لگ رہا تھا۔ وہ میجر افتخار کو بھول کر دور سمندر کو گھورتا ہوا لہروں کی آنکھ مچولی دیکھ رہا تھا۔ ایشیا اور یورپ کو تقسیم کرنے والا باسفورس بحر سیاہ کا پانی اچھال کر بحر مرمر میں پھینک رہا تھا۔ جلالی ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تین سمندروں میں ان لکیروں کو تلاش کرنے لگا جو ایک خطے کو دوسرے خطے سے جدا کر کے پانیوں میں سرحدیں تعمیر کر رہی تھیں۔

گاڑی ساحلی سڑک کو چھوڑ کر بائیں ہاتھ کی سڑک پر مڑ کر رک گئی۔ جلالی اپنے خیالوں سے چونک پڑا۔ سامنے سلطان مسجد تھی۔ اسے لگا جیسے استنبول کا پوسٹ کارڈ پھیل کر بڑا ہو گیا ہو۔ مسجد کے رستے میں دس بارہ سال کے لڑکوں کا ایک گروپ پلاسٹک کی ایک بڑی سی پتنگ اڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسی وقت ظہر کی نماز ختم ہوئی تھی۔ مسجد کے صحن میں سفید داڑھی اور سرخ و سفید رنگ کے نورانی شکل والے امام نمازیوں کی معیت میں باہر آتے نظر آئے۔ ڈرائیور نے بھاگ کر امام کا ہاتھ پکڑ کر چوما اور میجر افتخار اور جلالی کی طرف اشارہ کر کے کچھ بتانے لگا۔

"برادر پاکستانی!" امام نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور آگے بڑھ کر ایک ایک کر کے دونوں کو گلے لگایا۔ پیشانی پر بوسہ پا کر جلالی کو لگا جیسے امام نے جسم کا کوئی دروازہ کھول کر بدن میں نور کی لہر دوڑا دی ہو۔ نور شاید خلوص کے کسی ایسے ہی لمس کا نام تھا۔ وہ نیلی مسجد کے نقش و نگار کو سراہتے ہوئے باہر آئے تو

گاڑی ایک بار پھر سڑکوں پر رینگنے لگی۔ ڈرائیور شاہراہوں کے اطراف میں پھیلی ہوئی ان عمارتوں، مسجدوں اور محلوں کا تعارف کراتا رہا جن کے ہر پتھر پر صدیوں کی تاریخ نقش تھی۔ سلطنت عثمانیہ کے سلطانوں کی عظمت کے یہ مظاہر اب صرف عجائب گھروں تک محدود تھے۔

''خریداری کے لئے بڑا بازار نزدیک ہے۔ یا پھر استنبول یونیورسٹی ہوتے ہوئے ہم بازار مصر جا سکتے ہیں۔'' ڈرائیور نے پیشکش کی۔

''ہم میں کوئی زلیخا ہے نہ ہمیں کسی یوسف کو خریدنا ہے۔'' میجر افتخار نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ''تم سیدھے ہاتھ کو گاڑی موڑو اور توپ کاپی لے چلو۔''

جلالی اور میجر افتخار کئی گھنٹوں تک عجائب گھر میں گھومتے ہوئے اسلامی تاریخ پڑھتے رہے۔ قرآن شریف کے صفحوں پر پھیلے ہوئے خون کے دھبوں، لعل و جواہر کے ڈھیروں اور سلطانوں کے قیمتی ملبوسات پر عروج و زوال کی داستانیں لکھی تھیں۔ اوپری برج میں واقع کافی ہاؤس میں قہوہ پینے کے دوران ایک طرف آبنائے باسفورس پر بنے ہوئے پل اور دوسری طرف بحر مرمر کی غصیلی موجوں کو دیکھتے ہوئے بھی جلالی کا ذہن ماضی کے دریچوں میں بھٹکتا رہا۔ تاریخ فتوحات سے مزین ہو یا شکستوں کا ٹوٹا ہوا آئینہ، اچھی ہو یا بری، اس کی جڑیں صدیوں گہری ہوں تو وہ اپنی زمین پر رہنے والوں کے قدم مضبوطی سے تھامے رہتی ہے۔ جن کی تاریخ مختصر ہو انہیں بہت بھٹکنا پڑتا ہے۔ جلالی نے سر کو جھٹکا دیا اور خیالوں کی اس دلدل سے نکل آیا جس میں وہ دھنسنے لگا تھا۔

ان کی گاڑی شاہراہوں اور میدانوں کے طول و عرض ناپنے لگی تو ان کا ڈرائیور ایک بار پھر پیشہ ور گائیڈ بن گیا۔

''پرانے شہر میں دیکھنے کے لئے ابھی بہت کچھ باقی ہے۔ لیکن اب ہم اتاترک پل سے باسفورس کو عبور کر کے نئے شہر میں داخل ہو کر سیدھے شاہراہ استقلال پر آئیں گے۔ یہ ہمیں تقسیم چوک تک لے جائے گی جہاں جنگ کی یادگار ہے اور پھر وہاں سے ہم شاہراہ جمہوریت پر پہنچ جائیں گے جو سیاحوں کی جان ہے۔ تمام بڑے

ہوٹل' جدید طرز کے فیشن ایبل ریستوران' نائٹ کلب' سب وہیں واقع ہیں۔"

"شاہراہ جمہوریت ہمیں راس نہیں آتی۔ اس پر جگہ جگہ مارشل لاء کے بمپ آئیں گے۔" میجر افتخار نے ایک بار پھر قہقہہ لگایا۔ لیکن پھر سنجیدہ ہو کر کہنے لگا۔ "ہمیں یورپ جانے والا پل عبور نہیں کرنا۔ ہم اپنے ایشیائی حصے میں خوش ہیں۔ تم شاہراہ انقرہ کی طرف چلو' وہاں سے ہم واپس ایئرپورٹ چلیں گے۔ پرواز کا وقت ہو رہا ہے۔"

"جناب! شاہراہ انقرہ پر ٹریفک بہت ہو گا۔ ہم پھنس جائیں گے۔" ڈرائیور نے بہت ادب سے کہا۔

"کوئی بات نہیں۔ ہمارا اس شاہراہ پر جانا ضروری ہے۔" میجر افتخار نے سخت لہجے میں کہا اور ڈرائیور سمت تبدیل کرنے کے لئے گاڑی موڑنے لگا۔

"کیا ہمیں کسی سے ملنا ہے؟" جلالی نے شاہراہ انقرہ جانے کی وجہ جاننا چاہی۔

"نہیں' نہیں۔" میجر افتخار نے قہقہہ لگایا۔ اسے شاید بات بات پر قہقہہ لگانے کی عادت تھی۔ "شاہراہ انقرہ لندن کی فلیٹ اسٹریٹ کی طرح ہے۔ تمام بڑے اخباروں کے دفاتر اسی سڑک پر ہیں۔ مجھے یقین ہے آپ کو ان میں ضرور دلچسپی ہو گی۔"

"آپ کو معلوم ہے میں کون ہوں؟" جلالی نے حیرت سے میجر افتخار کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"معلوم ہے؟ میں ہاتھ دیکھے بغیر آپ کا حال' ماضی اور مستقبل بتا سکتا ہوں۔" میجر افتخار نے پھر قہقہہ لگا کر کہا۔ "رات بھر میری فیکس مشین مصروف رہی ہے۔ صحافت کی دنیا میں سکندر اعظم کی فتوحات کا ہر ورق میری فائل میں محفوظ ہے۔" میجر افتخار کو اس کا پرانا نام تک معلوم تھا۔ جلالی خاموشی سے منہ موڑ کر باہر کے مناظر دیکھنے لگا۔

"آپ خوش قسمت ہیں کہ صحافی بننا چاہتے تھے اور بن گئے۔ مجھے آپ پر رشک آتا ہے۔" میجر افتخار نے خاموشی توڑی۔

"کیوں؟ کیا آپ کو بھی صحافی بننے کا شوق تھا۔"

"شوق نہیں عشق تھا۔" میجر افتخار کے لہجے میں اداسی آ گئی۔ قہقہے کہیں کھو گئے تھے۔

"کالج کے زمانے میں ہی اخباروں میں چھپنے لگا تھا۔ گھر والے بھی اخبار میں نام چھپا ہوا دیکھ کر خوش ہوتے اور فخر کرتے تھے۔ لیکن کالج ختم کر کے جب اخباروں کے دفتروں میں چکر لگانے لگا تو باپ نے گھر سے نکالنے اور عاق کرنے کی دھمکی دے دی۔ جس سے منگنی ہوئی تھی اس کے ماں باپ نے بھی صاف صاف بتا دیا کہ بیٹی کو عمر بھر گھر بٹھائیں گے لیکن ایک صحافی کو نہیں دیں گے۔ مجھے عاق ہونے کی پرواہ نہیں تھی لیکن منگیتر کا چہرہ نگاہوں میں گھوم گیا۔ دوسرے ہی دن فوج میں کمیشن لینے کے لئے درخواست دینے چلا گیا۔"

میجر افتخار نے آخر میں ایک کھوکھلا سا قہقہہ لگا کر بات ختم کر دی۔ جلالی کچھ نہیں بولا۔ وہ مسکرا کر سوچنے لگا کہ اپنی خوش قسمتی پر ناز کرے یا اپنی صورتحال کا نوحہ پڑھے۔ وہ کچھ کہے بغیر گاڑی کے باہر آتی جاتی عمارتوں کو دیکھتا رہا۔

"میں آپ کا کیس انچارج ہوں۔ قریشی صاحب نے آپ کا خیال رکھنے کی خصوصی ہدایت دی ہے۔" میجر افتخار کچھ سوچتا ہوا اسے بتانے لگا۔ "بڈاپسٹ میں آپ براہ راست فیاض منگی کی ماتحتی میں کام کریں گے۔ ہنگری کے سفارتخانے کے سیاہ و سفید کا وہی مالک ہے۔ وہ بہت مشکل ہے۔ وہ ایجنسی کا آدمی ہے اور اس کا عہدہ بھی بڑا ہے۔ اس سے نباہنے کی کوشش کیجئے گا۔ اگر زندگی بہت مشکل ہو جائے تو مجھے فون کر دیجئے گا۔" میجر افتخار نے جلالی کو اپنا کارڈ دیا۔ گاڑی اس وقت ترکی کے ایک بڑے اخبار کے دفتر کے سامنے سے گزر رہی تھی جسے دیکھ کر میجر افتخار کے چہرے پر بچوں کی سی خوشی دوڑ گئی۔

فیاض منگی اسے لینے خود نہیں آیا۔ استنبول کی طرح بڈاپسٹ ایئرپورٹ پر بھی جلالی کے نام کا کارڈ لہرا رہا تھا۔ لیکن جس کے ہاتھوں میں کارڈ تھا وہ سرخ و سفید رنگ کا ایک مقامی آدمی تھا۔ کالے رنگ کا سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ زردی مائل بالوں کی

گھنگریالی لٹیں شانوں پر لہرا رہی تھیں۔ جلالی اس کی طرف بڑھا تو اس نے آگے بڑھ کر بہت ادب سے اپنا تعارف کرایا۔

"یانوش سابو!" جلالی سوچنے لگا کیا بڈاپسٹ پہنچتے ہی اس پر لگا ہوا پہرا ختم کر دیا گیا ہے یا اسے ہنگری کی کسی ایجنسی کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ لیکن اسی وقت "یانوش" کے پیچھے سے ایک شخص برآمد ہوا جس کا ناک' نقشہ' کپڑے پہننے کا سلیقہ اور چھوٹی سی منکا جیسی توند اعلان کر رہی تھی کہ وہ پاکستان کا سرکاری ملازم ہے۔

"میرا نام عبدالستار ہے۔ میں سفارتخانے سے آپ کو لینے آیا ہوں۔" وہ گرمجوشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے گلے ملنے کے لئے آگے بڑھا۔ لیکن جلالی نے صرف مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔

"منگی صاحب نہیں آئے؟" جلالی نے سوچا بڈاپسٹ میں اس کا پہریدار بھی شاید کسی کے پیچھے سے برآمد ہو جائے۔

"کیوں مذاق کرتے ہیں جناب! منگی صاحب تو سفیر کو لینے بھی نہیں آتے۔" ستار نے ذرا فخر سے کہا۔

"وہ مجھے لینے ضرور آئیں گے۔" جلالی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ستار اسے حیرت سے دیکھنے لگا لیکن کچھ بولا نہیں۔ یانوش جلالی کا پاسپورٹ اور ٹکٹ لے کر چلا گیا تھا۔

"یانوش کون ہے؟"

"سفارتخانے میں ہمارا مقامی مددگار ہے۔ یہاں انگریزی بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ یانوش مقامی معاملات میں ہماری مدد کرتا ہے۔" ستار نے کہا اور پھر ذرا قریب آ کر سرگوشی کے انداز میں کہنے لگا۔ "منگی صاحب کو یقین ہے کہ اسے اردو آتی ہے لیکن ظاہر نہیں کرتا اور اپنی حکومت کے لئے ہماری جاسوسی کرتا ہے۔ اس کے سامنے ہم سب پنجابی میں بات کرتے ہیں۔ منگی صاحب کہتے ہیں پنجابی اس کی سمجھ میں نہیں آئے گی۔ آپ کو پنجابی آتی ہے؟"

"آتی ہے لیکن ہنگری کی حکومت کو ہماری جاسوسی کرنے کی کیا ضرورت

ہے؟"

"وہ اپنے لئے نہیں بھارت کے لئے جاسوسی کرتے ہیں۔ منگی صاحب کہتے ہیں کہ یہ لوگ ابھی تک بھارت کے وفادار ہیں۔ ان کا بہت خیال کرتے ہیں۔ منگی صاحب......" ستار یانوش کو آتا دیکھ کر اچانک خاموش ہو گیا۔ یانوش نے واپس آ کر جلالی کا پاسپورٹ اس کے بجائے ستار کو دیا تھا۔ جلالی سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔

"منگی صاحب نے کہا ہے کہ پاسپورٹ انہیں لا کر دیا جائے۔ انہیں کارروائی کے لئے وزارت خارجہ بھجوانا ہے۔" ستار نے پرانے فیشن کے بڑے کالروں اور چوڑے خانوں والے کوٹ کی جیب میں پاسپورٹ کو ٹھونستے ہوئے کہا۔

"میرا پاسپورٹ مجھے دے دیجئے۔ یہ میرا پاسپورٹ ہے' میرے پاس ہی رہے گا۔" جلالی نے سختی سے کہا۔

"لیکن منگی صاحب......"

"منگی صاحب کو میں خود دے سکتا ہوں۔ لائیے۔" جلالی کا ہاتھ ستار کی طرف بڑھا ہوا تھا۔ ستار نے یانوش کی طرف دیکھا۔ اس نے اپنے کندھے اچکا دیئے تو ستار نے ہچکچاتے ہوئے پاسپورٹ جیب سے نکال کر جلالی کو دے دیا۔ جلالی دل ہی دل میں مسکرایا۔ اسے معلوم تھا کہ پاسپورٹ لے کر منگی مطمئن ہو جاتا۔ جلالی پاسپورٹ کے بغیر کہیں جا نہیں سکتا تھا۔ کم از کم ایک رات کے لئے وہ منگی کو بے چین رکھ سکتا تھا۔ اس کے ذہن میں میجر افتخار کی دی ہوئی وارننگ گھنٹیاں بجا رہی تھی۔ جب سے بڈاپسٹ پہنچا تھا مستقل منگی کے نام کی گردان سن رہا تھا۔

ایئرپورٹ سے جلالی کی قیامگاہ تک کا راستہ روشنیوں کا سفر تھا۔ نیلے ڈینوب کی خاموش اور چمکدار سطح پر رنگین روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ گاڑی یانوش چلا رہا تھا لیکن استنبول کے ترکی ڈرائیور کی طرح اس نے گائیڈ بننے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ستار مستقل دماغ چاٹے جا رہا تھا۔ گاڑی دریائے ڈینوب کو عبور کرنے کے لئے ایک پل سے گزر رہی تھی۔ جلالی کے دائیں اور بائیں کئی دوسرے پل روشنی کی لکیروں کی

طرح چمک رہے تھے۔

"اب ہم "پسٹ" سے "بڈا" میں داخل ہوں گے۔ آپ کو معلوم ہے بڈا اور پسٹ دو الگ الگ شہر تھے۔ پچھلی صدی میں دونوں کو ایک کر کے بڈاپسٹ بنا دیا اور پلوں سے جوڑ دیا گیا تھا۔ پہلے نو پل تھے اب دس ہو گئے ہیں۔ بڑی جنگ میں جرمنی نے بمباری کر کے سارے پل توڑ دیئے تھے اور شہر کو درمیان سے کاٹ دیا تھا۔ سارے پل دوبارہ بنے ہیں۔" جلالی کو بڈاپسٹ شہر کی اس تاریخ کا علم تھا۔ وہ ستار کی باتیں ان سنی کر کے باہر کے مناظر میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کی سوچیں شاید دریا کی گہرائیاں ناپ رہی تھیں۔ پل ختم ہوا تو جلالی بھی سطح پر ابھر آیا۔

"ابھی کتنی دور اور جانا ہے؟" اس نے انگڑائی لے کر ستار سے پوچھا۔

"بس، اب ہم بڈا کی طرف پہنچ گئے ہیں۔ تھوڑی ہی دیر میں گیلرٹ ہل آئے گی۔ وہیں پہاڑی کی اترائی میں ہماری عمارت ہے۔ دیکھ کر آپ کی طبیعت خوش ہو جائے گی۔ میں بھی اسی عمارت کے فلیٹ میں رہتا ہوں۔"

"کیا فیاض منگی بھی یہیں رہتا ہے؟" جلالی نے پوچھا۔

"نہیں! وہ پسٹ کے علاقے میں سفارتخانے کے قریب رہتے ہیں۔ وہ رات کو دیر تک دفتر میں بیٹھتے ہیں اس لئے انہیں زیادہ دور رہنا پسند نہیں ہے۔" ستار نے جواب دیا اور پھر تھوڑے سے توقف کے بعد پنجابی میں کہنے لگا۔

"آپ کو منگی صاحب کا نام احترام سے لینے کی عادت ڈالنی پڑے گی اور ان سے بنا کر رکھنی ہو گی ورنہ وہ ایک ہفتے میں آپ کو واپس بھجوا دیں گے۔"

"مجھے بھی واپس ہی جانا ہے۔ مجھے یہاں رہنا پسند نہیں ہے۔" جلالی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"یہ مذاق کی بات نہیں ہے۔ وہ آپ کو سچ مچ واپس بھجوا سکتے ہیں۔ مجھے معلوم ہے آپ بہت بااثر ہوں گے۔ لیکن میں نے بہت سے بااثر لوگوں کو دیکھا ہے۔ وہ بھی منگی صاحب کے آگے نہیں ٹھہر سکے۔ چھ مہینے پہلے ایک ایم این اے کا سالا اسسٹنٹ ہو کر آیا تھا۔ بہت اونچا دماغ تھا۔ کسی کی بات نہیں سنتا تھا۔ منگی صاحب

نے اسے ہفتے بھر میں واپس بھجوا دیا۔"

"منگی کسی زیادہ بڑے آدمی کا سالا ہو گا۔" جلالی نے ہنستے ہوئے بدستور اردو میں کہا اور ستار تشویش بھری نظروں سے یانوش کی طرف دیکھنے لگا جس کی توجہ ڈرائیونگ پر تھی۔

"مجھے نہیں معلوم وہ کس کے سالے ہیں۔ لیکن وہ تین سال سے یہاں ہیں۔ تین دفعہ حکومت بدل چکی ہے اور ہر دفعہ ان کا گریڈ بڑھ جاتا ہے۔ وہ اٹھارہ گریڈ میں سیکنڈ سیکریٹری ہو کر آئے تھے' اب گریڈ بیس میں ہیں اور خبریں ہیں کہ وہ اکیس میں جانے والے ہیں۔" ستار پنجابی میں ہی بات کر رہا تھا اور بار بار نظریں اٹھا کر یانوش کو بھی دیکھ لیتا تھا۔ جلالی کچھ کہے بغیر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ مدہم روشنی میں پیڑوں کے سائے پراسرار لگنے لگے تھے۔ گاڑی ایک پتلی سڑک کی چڑھائی پر آکر آہستہ ہو گئی تھی۔ ستار نے ایک اور کوشش کی۔

"یہ ملک رہنے کے لئے بہت اچھا ہے۔ پیسے کمانے ہوں تو اس کے بھی کئی رستے ہیں۔ کرنے کو کام بھی کچھ نہیں ہے۔ منگی صاحب سے بنا کر رکھئے۔ پھر دیکھئے زندگی کتنی خوشگوار گزرتی ہے۔"

اسی وقت گاڑی نے موڑ کاٹا اور اس کے پہیئے اینٹوں کی بنی ہوئی راہ گزر پر بکھرے ہوئے خشک پتوں کو کچلتے ہوئے ایک اور چڑھائی طے کرنے لگے۔ دونوں طرف بڑے بڑے خزاں رسیدہ درخت کھڑے تھے۔ جہاں تک لیمپ کی زرد روشنی جا سکتی تھی سبزہ نظر آتا تھا جس کے بعد ہریالی رات کی سیاہی میں مدغم ہو رہی تھی۔ گاڑی الگ تھلگ بنی ہوئی ایک عمارت کے سامنے رک گئی۔ جلالی اترا تو اس کے جسم میں سرد لہر دوڑی تھی۔ انجانی دنیا میں قدم رکھنے کا خوف تھا یا سرد ہوا کا اثر۔ جلالی نے ایک پھریری لی اور گاڑی سے سامان اتارنے میں یانوش کی مدد کرنے لگا۔

جلالی کا اپارٹمنٹ اس کی ضرورت سے کہیں بڑا تھا۔ دو بیڈ رومز تھے۔ لاؤنج بھی بہت کشادہ تھا۔ بہت سادگی سے آراستہ کیا گیا تھا لیکن ضرورت کا تمام سامان اور فرنیچر موجود تھا۔ ستار ضد کر کے جلالی کو اپنے فلیٹ میں لے گیا جہاں اس کی بیوی نے

رات کا کھانا تیار کیا ہوا تھا۔ ستار کی بیوی بہت سیدھی اور خدمت گزار لگتی تھی۔ کم گو بھی تھی۔ سلام دعا کے علاوہ اس کے منہ سے کچھ نہیں نکلا تھا۔ ستار کی زبان البتہ رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

جلالی جب سونے کے لئے اپنے بستر پر لیٹا تو رات کے بارہ بج چکے تھے۔ جسم اور دماغ دونوں تھکے ہوئے تھے۔ پچھلی رات سوئے بغیر گزری تھی۔ ہوائی سفر کے دوران بھی صرف تھوڑی دیر کے لئے اونگھ سکا تھا۔ لیکن نیند اب آنکھوں سے غائب تھی۔ بہت مشکل سے سو پایا تھا۔ آنکھ گھنٹی کی آواز سے کھلی۔ کوئی بہت تواتر سے دروازہ کی گھنٹی بجا رہا تھا۔ گھڑی دیکھی تو صبح کے نو بجے تھے لیکن کمرے میں ابھی تک اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ شاید باہر بادل چھائے ہوئے تھے۔ باہر کا دروازہ کھولا تو وحشت زدہ ستار دروازہ کھلنے کے باوجود گھنٹی کا بٹن دبائے جا رہا تھا۔ وہ ابھی تک رات والے لباس میں تھا۔ شیو بھی نہیں کیا تھا۔ داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔

"لگتا ہے رات بھر کھڑے کھڑے میرے دروازے کے سامنے پہرہ دیتے رہے ہو۔" جلالی نے ستار کے اندر آنے کے بعد دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں! لیکن میں پریشان ہو گیا تھا۔" ستار ہنستے ہوئے کہنے لگا۔ "بہت دیر سے گھنٹیاں بجا رہا تھا۔ میں سمجھا تھا کہ آپ......"

"کہیں بھاگ گیا۔" جلالی نے بات کاٹ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"نہیں صاحب! اس اجنبی شہر میں بھاگ کر کہاں جائیں گے۔" ستار بھی ہنسنے لگا۔ لیکن تھوڑی دیر بعد سنجیدہ ہو گیا۔ "آپ جلدی سے ہاتھ منہ دھو لیجئے۔ میری بیوی آپ کے لئے گرم گرم پراٹھے پکا رہی ہے۔"

"میں اس وقت ناشتہ نہیں کروں گا۔ صرف کافی پیوں گا۔" جلالی نے کہا اور کچن کی طرف چلنے لگا جہاں چائے' کافی اور انڈے ڈبل روٹی کا اسٹاک موجود تھا۔

"لیکن میری بیوی نے سب کچھ تیار کر کے رکھا ہے۔"

"یہ روز روز کی میزبانی ٹھیک نہیں ہے۔ میں یہاں دو چار دن کا مہمان نہیں ہوں بلکہ کچھ عرصے کے لئے آیا ہوں۔ میں کراچی میں بھی اکیلا رہتا تھا۔ مجھے کسی

مداخلت کے بغیر ایک نجی زندگی گزارنے کی عادت ہے۔ اس لئے پلیز اب کھانے کا تکلف بالکل نہیں کرنا۔" جلالی نے دو ٹوک انداز میں ستار کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"اس مسئلے پر بعد میں بات کریں گے۔ ابھی تو آپ جلدی سے تیار ہو جائیں۔ منگی صاحب آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔"

"منگی صاحب؟" جلالی نے حیرت سے کہا۔ "لیکن آج تو ہفتہ ہے۔ چھٹی کا دن۔"

"جب سے منگی صاحب آئے ہیں جمعہ اور اتوار کی چھٹی ہوتی ہے۔ ہفتے کو کام ہوتا ہے۔ آپ کے لئے صبح ہی صبح فون آیا تھا۔ مجھ سے کہا ہے میں آپ کو ساتھ لے کر آؤں۔ آپ کا فون ابھی نہیں لگا ہے ورنہ وہ آپ کو براہ راست فون کرتے۔" ستار نے بتایا۔

"میرا آج دفتر جانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ میں آرام کروں گا اور باہر جا کر یہ علاقہ دیکھوں گا جہاں میں رہتا ہوں۔" جلالی نے کہا تو ستار اسے حیرت سے دیکھنے لگا۔

"لیکن منگی صاحب......"

"منگی صاحب کو مجھ سے ملنے کی جلدی ہے تو وہ مجھ سے آکر مل سکتے ہیں۔"

"آپ کو پتہ ہے منگی صاحب....."

"مجھے پتہ ہے منگی صاحب سفیر سے بھی ملنے نہیں جاتے۔" جلالی نے ایک بار پھر ستار کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "لیکن میں آپ کو پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ وہ مجھ سے ملنے آئیں گے۔"

"آپ کا یہ رویہ آپ کے حق میں اچھا نہیں ہو گا۔" ستار کے لہجے میں تشویش تھی۔

"تم میرے بارے میں فکر مت کرو۔" جلالی نے ستار کے شانے پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے کہا۔ "مجھے معلوم ہے میں کیا کر رہا ہوں۔" ستار نے خاموشی سے سر ہلایا اور خدا حافظ کہہ کر جلالی کے فلیٹ سے نکل گیا۔

جلالی تیار ہو کر باہر آیا تو دوپہر کے بارہ بج گئے تھے۔ سورج کا چہرہ بادلوں کے آنچل سے باہر نکل کر چمکنے لگا تھا۔ لیکن دھوپ میں حدت نہیں تھی۔ سرد ہوا جسم میں کپکپی پیدا کر رہی تھی۔ جلالی بھاری سویٹر اور چمڑے کی جیکٹ پہن کر نکلا تھا۔ اس نے سوچا یہ کپڑے ہنگری کی سردی کے لئے کافی نہیں ہوں گے۔ اسے بھاری اوورکوٹ خریدنا پڑے گا۔ جلالی کے پاس پیسوں کی کمی نہیں تھی۔ نواب ٹن نے ایئرپورٹ پر اس کی جیب میں سو سو ڈالر کے نوٹوں کی ایک گڈی ٹھونس دی تھی۔ جلالی نے بڈاپسٹ پہنچ کر یانوش کو پانچ سو ڈالر تبدیل کرنے کے لئے دیئے تو اس کی آنکھوں میں ناچتی حیرت کو دیکھ کر جلالی کو لگا تھا کہ ہنگری کے حساب سے یہ بہت زیادہ رقم تھی۔ جلالی کو یقین تھا کہ اس کی تنخواہ بھی کم نہیں ہو گی۔ اتنے بہت سے پیسوں کا وہ کیا کرے گا؟ جلالی سوچنے لگا کہ کوشش کے باوجود اسے دولت سے محبت کیوں نہیں ہوتی۔

اس نے سوچا تھا کہ باہر کسی ریسٹورنٹ میں ہنگری کے کھانوں کا مزا لے گا۔ لیکن پہلے اسے قرب و جوار کا جائزہ لینا تھا۔ عمارت کے پیچھے پہاڑی چڑھان تھی جس پر سبزے اور جھاڑیوں کا جال پھیلا ہوا تھا۔ وہ رستے میں پڑی ہوئی ایک خشک ٹہنی کو چھڑی کی طرح ہوا میں ہلاتا ہوا پتلی سی پگڈنڈی پر قدم جما کر پہاڑی پر چڑھنے لگا لیکن جلد ہی ہانپ گیا اور اپنی سگریٹ نوشی کو کوستا ہوا واپس اتر آیا۔ سانس قابو میں آتے ہی سگریٹ سلگا کر قرب و جوار کا جائزہ لیا تو تھوڑے فاصلے پر سبزے میں گھری ہوئی ایک عمارت کے پاس کافی رونق نظر آئی۔ جلالی ٹہلتا ہوا اسی طرف بڑھ گیا۔

عمارت کے باہر نوجوان لڑکے لڑکیاں چھوٹے بچوں کے ساتھ بھاگ دوڑ کا کھیل کھیل رہے تھے۔ آرام دہ کرسیوں پر لیٹا ہوا بوڑھوں کا ایک جوڑا دھوپ کھا رہا تھا۔ جلالی عمارت کے دروازے میں داخل ہوا تو بڑے سے ہال میں خوب رونق تھی۔ بلیرڈ جیسی لیکن بلیرڈ ٹیبل سے چھوٹے سائز کی کئی میزوں پر لوگ بلیرڈ ہی جیسا کوئی کھیل کھیل رہے تھے۔ ایک کونے میں بار تھا۔ جلالی اس طرف چلتا ہوا ایک اسٹول پر

بیٹھ گیا۔ کاؤنٹر کے پیچھے کام کرنے والی لڑکی تیزی سے جلالی کی طرف آئی۔ جلالی اسے دیکھتا رہ گیا۔ وہ اتنی ہی خوبصورت تھی۔ سر کی جنبشوں کے ساتھ اس کے سنہرے بال سمندری موجوں کی طرح لہرائے تھے۔ نیلی اور گہری آنکھیں ایسی تھیں جن میں ادیبوں کو کائنات رقص کرتی نظر آتی ہے۔ گالوں پر غازہ اور ہونٹوں پر سرخی نہیں تھی۔ اس کے حسن کو ان سہاروں کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ جلالی نے سوچا وہ اپنی انگلی سے اس کے گالوں پر کوئی تحریر لکھ سکتا تھا۔ لیکن جن نازک ہونٹوں کے بارے میں وہ کوئی نئی تشبیہ سوچ رہا تھا انہیں اچانک ایک نوجوان نے آکر اپنے ہونٹوں میں لے لیا تھا اور بیئر کی ایک بوتل اٹھا کر جس تیزی سے آیا تھا اسی تیزی سے واپس جا کر بلیرڈ کھیلنے والوں کے ہجوم میں شامل ہو گیا تھا۔ جلالی کو لگا جیسے سرخ افق پر سرمئی بادل کا سایہ آ کر گزر گیا ہو۔ لڑکی جلالی سے مخاطب ہو کر کچھ بولی تھی۔ جلالی کی سمجھ میں نہیں آیا تھا' اس کے کانوں میں تو بس گھنٹیاں سی بج اٹھی تھیں۔

"ایوا واقعی بہت خوبصورت ہے۔" ایک لڑکی جو کاؤنٹر پر اس سے تین اسٹول چھوڑ کر بیٹھی ہوئی چائے پی رہی تھی' جلالی کے پاس آ کر بہت صاف انگریزی میں کہنے لگی۔

"لیکن یہ خالی نہیں ہے۔ ابھی ابھی جو شخص اس کا بوسہ لے کر گیا ہے وہ اس کا شوہر ہے۔" جلالی جھینپ کر ہنسنے لگا۔ لیکن دل میں سوچنے لگا یہ دن تو قتل عاشقاں اور بجلیاں گرانے کے تھے۔ شادی کی عمر کہاں تھی۔

"میں آپ کے ملک میں اجنبی ہوں۔ کل رات ہی آیا ہوں۔ مجھے آپ کی زبان کا ایک لفظ بھی نہیں آتا۔ میں سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔" جلالی نے اسی طرح جھینپتے ہوئے انداز میں کہا۔

"ایوا پوچھ رہی ہے آپ کیا پئیں گے۔" لڑکی نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔

"بیئر!" جلالی نے کہا اور لڑکی کو ترجمہ کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ بار ٹنڈر کا کام کرنے والی حسینہ جس کا نام ایوا بتایا گیا تھا بوتل کھول کر گلاس میں بیئر انڈیلنے لگی۔

"ایوا کو بیئر کی حد تک انگریزی آتی ہے۔" لڑکی اپنی پیالی اور سگریٹ کا پیکٹ

لے کر جلالی کے قریب کے اسٹول پر بیٹھ گئی۔

"آپ کی انگریزی بہت اچھی ہے۔" جلالی نے تعریف کی۔

"اس علاقے میں صرف مقامی لوگ آتے ہیں اس لئے ایوا کو انگریزی جاننے کی ضرورت نہیں ہے۔ شہر میں آپ کو مجھ جیسے انگریزی جاننے والے بہت سے مل جائیں گے۔ ویسے آپ اس علاقے میں کیسے آ گئے۔ یہاں نزدیک میں تو کوئی ہوٹل بھی نہیں ہے۔"

"میں پاکستانی سفارتخانے میں پریس اتاشی ہوں۔ مجھے رہنے کے لئے سامنے والی عمارت میں ایک فلیٹ ملا ہے۔ میرا نام جلالی ہے۔"

لڑکی کی آنکھوں میں اچانک چمک آ گئی۔ لیکن وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی اور ایک اور سگریٹ سلگانے لگی۔ اسے شاید لگاتار سگریٹ پینے کی عادت تھی۔ وہ ایوا کی طرح حسین تو نہیں تھی لیکن قبول صورت تھی۔ اس کے بال زردی مائل تھے جن کی لٹیں بے ترتیبی سے اس کے ماتھے اور شانوں پر پھیلی ہوئی تھیں۔ چھوٹی اور پچی ہوئی آنکھیں سبز رنگ کی تھیں۔ رنگ گورا تھا لیکن گالوں پر سرخی نہیں تھی، میلی سی زردی چھائی ہوئی تھی۔ میک اپ سے بے نیاز لیکن بہت اچھی خوشبو لگائے ہوئے تھی۔

"میرا نام الزبتھ رڈوانسکی ہے۔" اس نے جلالی کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ جلالی نے اس کا ہاتھ ہاتھ میں لے کر بہت گرمجوشی سے ہلایا۔

"آپ کیا پئیں گی؟" جلالی فوراً ہی میزبان بن گیا۔

"مجھے صرف ایک اچھی چائے کی طلب ہے۔ ایوا کو اچھی چائے بنانا نہیں آتی۔ میں باہر نکلوں گی تو کسی کیفے میں جا کر پیوں گی۔"

"میں چائے بہت اچھی بناتا ہوں، آپ چاہیں تو میرے فلیٹ میں چلیں۔ یہاں سے صرف چند قدم کے فاصلے پر ہے۔" جلالی نے ذرا جھجکتے ہوئے پیشکش کی۔

"آپ کے گھر میں اور کون ہے؟" الزبتھ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"میں اکیلا ہوں۔ پاکستان میں بھی اکیلا تھا اور یہاں بھی، لیکن آپ ڈریئے

مت۔ میں بہت شائستہ آدمی ہوں۔" جلالی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ڈر اور میں۔" الزبتھ نے قہقہہ لگایا۔ "ڈرنا آپ کو چاہئے۔ آیئے چلیں۔" اس نے اٹھلا کر کہا اور کاؤنٹر سے اپنا سامان سمیٹتی ہوئی اسٹول سے اتر آئی۔

اپنی عمارت میں داخل ہوتے وقت جلالی سوچ رہا تھا کہ ستار کی بیوی سے سامنا نہ ہو جائے۔ وہ اسے ایک لڑکی کے ساتھ دیکھ کر غلط رائے قائم کر سکتی تھی۔ اپنے فلیٹ تک پہنچنے کے لئے ستار کے فلیٹ کے سامنے سے گزرا تو اس کا دروازہ بند تھا اور مکمل خاموشی تھی۔ جلالی نے اطمینان کا سانس لیا لیکن جب اپنے فلیٹ کا تالا کھول کر اندر داخل ہوا تو اطمینان اور سانس دونوں رخصت ہو گئے۔ وہ تھوڑی دیر اسی طرح کھڑا رہا۔ ایک کرسی پر بہت مؤدب انداز میں ستار بیٹھا ہوا تھا۔ ایک شخص صوفے پر ٹانگ پر ٹانگ رکھے بہت پھیل کر بیٹھا ہوا اپنا پیر ہلا رہا تھا۔ وہ جلالی کو دیکھ کر بھی صوفے سے نہیں اٹھا بلکہ تیز نظروں سے اسے گھورنے لگا۔ لیکن جلالی کے پیچھے الزبتھ کمرے میں داخل ہوئی تو اٹھ کھڑا ہوا۔

"جلالی صاحب! یہ منگی صاحب ہیں۔" ستار نے کہا جو پہلے ہی کھڑا ہو گیا تھا اور اب بے چینی سے اپنے ہاتھ مل رہا تھا۔ فیاض منگی نے جلالی سے ہاتھ ملایا اور پھر اس کے پیچھے پریشان کھڑی ہوئی الزبتھ سے ہاتھ ملا کر اپنا تعارف کرانے لگا۔

"میں فیاض منگی ہوں۔ پاکستانی سفارتخانے کا فرسٹ سیکریٹری۔ یہ میرے اسسٹنٹ ہیں' عبدالستار۔" ستار نے بھی تیزی سے آگے بڑھ کر ہاتھ ملایا۔

"الزبتھ رڈوانسکی۔" اس نے کہا اور پھر جلالی کی طرف دیکھ کر کہنے لگی۔ "میرا خیال ہے میں چلتی ہوں۔ آپ کی چائے پینے پھر کسی وقت آؤں گی۔" اس سے پہلے جلالی کچھ کہتا منگی کہنے لگا۔

"نہیں نہیں آپ بیٹھئے۔ میں صرف مسٹر جلالی کو ہنگری میں خوش آمدید کہنے آیا تھا۔ ہم پانچ منٹ میں یہاں سے چلے جائیں گے۔" جلالی کو اثبات میں سر ہلاتا دیکھ کر الزبتھ صوفے پر بیٹھ گئی اور سائڈ کی میز پر رکھے ہوئے پاکستان کے ایک انگریزی رسالے کے ورق پلٹنے لگی۔ منگی کا رخ جلالی کی طرف ہو گیا۔ جلالی اسی طرح کھڑا منگی

کو گھور رہا تھا۔ اس کی حیرانی اب غصے میں بدل گئی تھی۔

"مجھے معلوم نہیں تھا یہ میرا فلیٹ نہیں بلکہ سفارتخانے کا کامن روم ہے۔" جلالی نے تیز لہجے میں کہا۔

"مجھے آپ کے اس کمال کا اندازہ ہوتا کہ آپ پہلے ہی دن فر فر انگریزی بولتی ہوئی کوئی لڑکی گھر لے آئیں گے تو محتاط رہتا۔" منگی نے الزبتھ پر ایک اچٹتی سی نظر ڈال کر طنز کیا۔

"مجھے پتہ نہیں تھا کہ میرے بستر کی سلوٹیں گننا بھی آپ کے فرائض میں شامل ہے۔ ورنہ میں بھی محتاط رہتا۔" جلالی نے جوابی وار کیا۔ منگی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ستار آنکھوں ہی آنکھوں میں جلالی کو ضبط سے کام لینے کی تلقین کر رہا تھا۔

"سفارتخانے کے ہر ملازم کے فلیٹ کی ایک چابی میرے پاس رہتی ہے۔ یہ ضابطے کی کارروائی ہے جس کا مقصد عملے کے ارکان کو تحفظ فراہم کرنا ہے۔" منگی خود پر قابو پا کر کہنے لگا۔ "ہم نے بہت دیر آپ کے فلیٹ کی گھنٹی بجائی تھی۔ ہم یہ یقین کر کے اندر آئے تھے کہ آپ گھر میں نہیں ہیں۔ لیکن سفارتکار کی حیثیت سے آپ کی نجی زندگی کی بھی حدود متعین ہیں۔ آپ کو اپنے ہر غیر ملکی ملنے والے کی رپورٹ مجھے دینی ہو گی۔ آپ کو نہیں معلوم معصوم صورت والے آپ کا گلا بھی کاٹ سکتے ہیں۔" منگی نے ایک بار پھر الزبتھ پر نظر ڈالی۔

"میں موم کا گڈا نہیں ہوں۔ ویسے بھی یہاں کسی کو میرا گلا کاٹنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔" جلالی نے جواب دیا۔ اس نے بھی اپنا لہجہ دھیما رکھا تھا۔

"بڈاپسٹ کی گلیوں میں کے جی بی کے ایجنٹ کیڑوں کی طرح رینگتے ہیں۔ وہ آج بھی ہمیں اپنا دشمن سمجھتے ہیں۔ بھارتی را کے ایجنٹ ان کی کھال کے اندر چھپ کر ہمارا شکار کرتے ہیں۔ وہ آپ جیسے غیر تربیت یافتہ سفارتکار کو اپنا آلۂ کار بنانے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ ان کی ان کوششوں کو ناکام بنانا میری ذمہ داری ہے۔ نظم و ضبط کی پابندی آپ کو بھی کرنا ہو گی۔"

منگی نے وقت ضائع کئے بغیر اپنا ہتھیار دکھا دیا تھا۔ وہ اس پر بھارتی ایجنٹ کا

لیبل لگا کر اسے پاکستان میں ہمیشہ کے لئے مشکوک کرنے کی دھمکی دے رہا تھا۔ لیکن جلالی خاموش رہا۔ منگی بدستور بہت سرد لہجے میں اسے بتا رہا تھا۔

"میں جانتا ہوں آپ کو یہاں بھیجنے والے بہت طاقتور لوگ ہیں۔ آپ کے لئے مجھے دو فون آئے ہیں۔ ایک نے آپ کا خیال رکھنے اور دوسرے نے آپ پر نظر رکھنے کی ہدایت کی ہے۔ میں بہت مصروف آدمی ہوں۔ مجھے آپ کی بے بی سٹنگ کرنے اور روز آپ کے دروازے پر دستک دینے کا وقت نہیں ہو گا۔ براہ کرم دفتر باقاعدگی سے اور وقت پر آیئے اور اپنے دفتر سے باہر کی سرگرمیوں سے مجھے باخبر رکھئے۔" منگی کے نرم لہجے میں بھی حکم دینے کا انداز تھا۔

"میں بھی دودھ پیتا بچہ نہیں ہوں نہ آپ کے ہاتھوں پرورش پانے آیا ہوں۔ آپ کو جو کرنا ہے کیجئے۔ میں یہاں صرف سفیر کو جوابدہ ہوں اور اپنے کام کے سلسلے میں صرف انہی سے ہدایات لوں گا۔" جلالی نے دو ٹوک لہجے میں کہا۔ ستار سردی کے باوجود ماتھے پر آیا ہوا پسینہ پونچھنے لگا۔ لیکن منگی کے ہونٹوں پر خلاف توقع مسکراہٹ آ گئی تھی۔

"سفیر صاحب چند دنوں کے لئے ویانا گئے ہیں' ان کی غیر موجودگی میں قائم مقام سفیر میں ہوں۔ وہ واپس آ جائیں گے تو ان کی یہ ہدایات بھی آپ کو مل جائیں گی کہ آپ براہ راست مجھے جوابدہ ہوں گے۔" منگی تھوڑی دیر خاموش رہا جیسے اپنی فتح پر خوش ہو رہا ہو۔ پھر گھڑی دیکھ کر کہنے لگا۔

"بہت وقت ہو گیا' مجھے جانا ہے۔ آپ کی دوست بھی بور ہو رہی ہے۔ مجھے اپنا پاسپورٹ دے دیجئے۔ آپ کو کل ہی دینا چاہئے تھا۔ آپ اتنی جلدی میں آئے ہیں کہ رسمی کارروائیاں نہیں ہو سکی ہیں۔ یہ کام فوری طور پر ہونا ضروری ہے۔"

جلالی خاموشی سے اندر کمرے میں گیا اور پاسپورٹ لا کر منگی کو دے دیا۔ پاسپورٹ اسے دینا ہی تھا۔ پہلے ہی دن جھگڑا بڑھانے کی ضرورت نہیں تھی۔ الزبتھ کی موجودگی میں یہ بات اور بھی نامناسب تھی۔ وہ زبان نہ جانتے ہوئے بھی ان کی گفتگو کے انداز سے ماحول کے تناؤ کو محسوس کر سکتی تھی۔ منگی الزبتھ اور جلالی کو خدا حافظ

کہہ کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ ستار نے لپک کر دروازہ کھولا تھا۔ لیکن منگی جاتے جاتے رک گیا اور مڑ کر ایک بار پھر جلالی سے مخاطب ہوا۔ اس دفعہ لہجے میں اور زیادہ نرمی آ گئی تھی۔

"آپ کا سفارتی کارڈ بن کر آنے میں شاید ایک دو ہفتے لگ جائیں گے۔ آپ ستار کے ساتھ جا کر اس کے کارڈ پر ڈیوٹی فری دکان سے اپنے استعمال اور ضرورت کی چیزیں خرید سکتے ہیں۔ ستار کے پاس گاڑی نہیں ہے۔ میں بھٹی سے کہوں گا۔ کل وہ اپنی گاڑی لے کر آ جائے گا۔"

"بھٹی؟" جلالی نے ستار کی طرف دیکھ کر سوال کیا۔

"بھٹی صاحب ہمارے اکاؤنٹس آفیسر ہیں۔" ستار نے کہا اور منگی کے پیچھے وہ بھی فلیٹ سے باہر نکل گیا۔ باہر نکلتے ہوئے اس نے بہت احتیاط سے فلیٹ کا دروازہ بند کیا تھا۔ الزبتھ رسالہ میز پر رکھ کر جلالی کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں سوال تیر رہے تھے۔

"میں تمہارے لئے چائے بنا کر لاتا ہوں۔" جلالی نے کہا اور جواب کا انتظار کئے بغیر باورچی خانے کی طرف چلا گیا۔ اسے الزبتھ کو وضاحت دینے سے پہلے اپنے اعصاب کو سکون دینے کی ضرورت تھی۔ باورچی خانے کی کھڑکی عمارت کی پشت پر کھلتی تھی۔ دور تک کوئی اور عمارت نظر نہیں آتی تھی۔ درختوں کی جھومتی ہوئی ٹہنیاں بتا رہی تھیں کہ ہوا تیز ہے۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی لیکن بہت کمزور نظر آتی تھی۔ گھاس پر چند بچے فٹ بال کھیل رہے تھے۔ درخت سے ٹیک لگائے بیٹھا ایک نوجوان جوڑا ایک دوسرے کے بوسے کی لذت میں گم تھا۔ پانی ابلنے کی سیٹی سن کر جلالی چونک پڑا۔ چائے بنا کر لایا تو الزبتھ ایک بار پھر رسالے کے ورق پلٹ رہی تھی۔

"چائے واقعی بہت اچھی ہے۔" الزبتھ نے چائے کا ایک گھونٹ لے کر کہا۔

"میں دو سال کے لئے انگریزی پڑھنے لندن گئی تھی۔ وہاں سے چائے کی عادت لے کر واپس آئی۔ لیکن ہنگری کے ہوٹلوں میں چائے دودھ کے بجائے لیمو کے ساتھ پیش کی جاتی ہے۔ دودھ کے لئے خاص طور پر کہنا پڑتا ہے۔ دودھ آتا ہے تو ٹھنڈا۔ جب تک

دودھ گرم ہو کر آتا ہے چائے ٹھنڈی ہو جاتی ہے۔"

"چائے، ورجینیا تمباکو اور اسکاچ وہسکی اس زمانے کی یادگاریں ہیں جب ہم انگریزوں کی غلامی میں تھے۔ غلامی کی ان یادگاروں پر ہمیں آج بھی بہت فخر ہے۔" جلالی نے بینسن اینڈ ہیجز کے سنہری پیکٹ سے سگریٹ نکال کر الزبتھ کو دیا اور ایک خود سلگایا۔

"آپ کچھ نہیں پی رہے۔ اسکاچ لے آیئے، غلامی کی تکون مکمل ہو جائے گی۔" الزبتھ نے مسکرا کر کہا۔ جلالی ہنسنے لگا۔

"میرا شراب خانہ ابھی خالی ہے۔ کل کے بعد آپ کو اس گھر میں ہر تکون اور مربع مکمل ملے گا۔"

"چائے آپ کو مہنگی پڑ گئی۔ شاید میری وجہ سے آپ مشکل میں آ گئے ہیں۔" الزبتھ کی آنکھوں کا سوال اس کی زبان پر آ گیا۔

"نہیں نہیں! بالکل نہیں!" جلالی ہنستے ہوئے کہنے لگا۔ "مجھے سرکاری ملازمت کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ مجھے آج سفارتخانے جا کر اپنی آمد کی رپورٹ کرنی تھی لیکن میں سیر کرنے نکل گیا۔ میرے افسر پریشان ہو کر خیریت معلوم کرنے آ گئے تھے۔" جلالی کو الزبتھ کے تاثرات سے اندازہ ہو گیا تھا کہ اسے یقین نہیں آیا ہے۔

"آپ چائے ختم کر لیں تو باہر چلتے ہیں۔ آپ بتا رہی تھیں یہاں قریب ہی کوئی ریستوران ہے۔ کھانے کا وقت ہو رہا ہے۔ لنچ بھی کریں گے۔" جلالی نے تھوڑی دیر کے بعد کہا۔

"ٹھیک ہے۔" الزبتھ نے آخری گھونٹ لے کر اٹھتے ہوئے کہا۔ باہر آئے تو سردی ویسی ہی تھی۔ وہ دور تک جاتی ہوئی ڈھلان پر تیزی سے اترتے چلے گئے۔ دائیں ہاتھ کو مڑے تو کونے پر سپر مارکیٹ کی طرح ایک بڑا اسٹور تھا۔ کچھ دور آگے ایک چھوٹا سا ریسٹورنٹ تھا۔ اندر گئے تو زیادہ تر میزیں خالی تھیں۔ کونے میں بڑے بڑے الجھے بالوں والا ایک شخص بہت بیزاری سے بیٹھا آرگن پر کوئی دھن بجا رہا تھا۔ وہ جلالی اور الزبتھ کو دیکھتے ہی مستعد ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ میز پر ان کی منگوائی ہوئی

چیزیں پہنچتیں اس نے بہت جھوم جھوم کر ''یا مصطفیٰ یا مصطفیٰ'' کی دھن بجانی شروع کر دی۔

''وہ آپ کو عرب سمجھ رہا ہے۔ جب تک آپ اس کے لئے ایک جام نہیں خریدیں گے وہ یہ دھن بجاتا رہے گا۔'' الزبتھ نے اسے مسکرا کر بتایا۔ جلالی نے ویٹر کو اشارہ کر کے جام بھجوایا۔ الزبتھ نے غلط نہیں کہا تھا۔ جیسے ہی جام پہنچا اس نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک ساتھ کی بورڈ پر مار کر زور کی جھنکار پیدا کی اور جام اٹھا کر ان کی میز پر آیا۔ خم ہو کر ''آگاشا گنزے'' کا نعرہ لگایا اور ایک گھونٹ لے کر واپس اپنی نشست پر جانے کے بجائے کاؤنٹر کے ساتھ رکھے ہوئے اسٹول پر جا کر بیٹھ گیا۔

''اس نے کوئی منتر پڑھا ہے یا گالی دی ہے۔'' جلالی نے مصنوعی حیرت ظاہر کر کے کہا۔ الزبتھ ہنسنے لگی۔

''چیئرز کیا ہے۔ غیر ملکیوں کے لئے ہمارے دل بہت کشادہ ہیں۔ انہیں ہم گالی نہیں دیتے' دل سے لگا کر رکھتے ہیں۔''

''مجھے تو ایسا نہیں لگتا۔'' جلالی اس بار سچ مچ کی حیرت ظاہر کرتے ہوئے کہنے لگا۔ ''تمہیں میرے ساتھ جاتا دیکھ کر تمہارے ہم وطنوں کی آنکھوں میں بہت غصہ تھا۔''

''اس کی وجہ تمہارا غیر ملکی ہونا نہیں ہے۔'' الزبتھ مسکرا کر بولی۔ ''ان میں سے کئی مجھے دوست بنانے کی کوشش میں ناکام ہو کر مایوس ہو چکے ہیں۔ تمہارے ساتھ جاتا دیکھ کر ان کی مردوں والی انا کو چوٹ لگی ہو گی۔''

''یہ جگہ ہے کیا؟ ہوٹل ہے' ہوسٹل یا تمہاری مستقل رہائش گاہ۔'' جلالی نے پوچھا۔

''ہوسٹل سمجھ لو۔ یہ ہمارے پرولتاریہ دور کی یادگار ہے۔ پر فضا مقامات پر چھٹی گزارنے کے لئے ایسے کئی ہوسٹل ہیں۔ مجھے یہ جگہ اس لئے پسند ہے کہ یہ شہر سے دور نہیں ہے۔''

''لیکن تم تو لگتا ہے چھٹی نہیں قید تنہائی گزار رہی ہو۔'' جلالی کی جرأت گفتار

آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی۔

"مجھ پر کبھی کبھی یاسیت کے دورے پڑتے ہیں۔ میں اپنے خول کے اندر چلی جاتی ہوں۔ باہر کی دنیا سے تعلق ختم کر کے صرف اپنے اندر رہنے لگتی ہوں۔ میری ماں کو پتہ ہے کہ میرا ماحول بدل جائے تو میں جلدی ٹھیک ہو جاتی ہوں۔ اس لئے وہ مجھے چند دنوں کے لئے یہاں چھوڑ جاتی ہے۔ وہ کل آ کر مجھے لے جائے گی۔"

"یہ علامتیں تو عشق میں ناکامی کی ہیں۔" جلالی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"نہیں، ایسا نہیں ہے۔ میرا عشق ابھی تک سلامت ہے۔" الزبتھ ہنستے ہوئے کہنے لگی۔ "میری محبت آج کل ہنگری سے باہر گئی ہوئی ہے۔ جب تک وہ کسی اور لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر میرے سامنے نہیں آتا میں اسے شک کا فائدہ دیتی رہوں گی۔"

"کیا ایسا کوئی امکان ہے؟" جلالی کو عشق کی اس کہانی میں دلچسپی ہونے لگی تھی۔

"پتہ نہیں۔ شاید۔" الزبتھ کچھ سوچتے ہوئے کہنے لگی۔ "لیکن یہ کوئی اہم بات نہیں ہے۔ ہنگری میں عورتوں کو اپنی زندگی میں بے وفائیوں کے زخم کئی بار سہنے پڑتے ہیں۔ یہاں مردوں کی تعداد کم ہے۔ ہر ایک ہزار مردوں کے لئے ایک ہزار ۶۴ عورتیں ہیں۔ مردوں کی یہ کمی عورتیں باری باری پوری کرتی ہیں۔ میں خوش قسمت ہوں کہ میرے عشق کا رشتہ تین سال گزرنے کے بعد بھی قائم ہے۔"

"تو پھر تم نے شادی کیوں نہیں کی؟" جلالی نے پوچھا۔ اسے حیرت تھی کہ وہ قلبی معاملات کا تجزیہ کتنی سرد مزاجی سے کر رہی تھی۔

"میری ماں کا خیال ہے میں بے وقوف ہوں اس لئے۔ اسے ہمیشہ یہ خوف رہتا ہے کہ کوئی اور لڑکی پیٹر کو لے اڑے گی۔ اس کی ضد ہے کہ میں جلد اسے شادی کی زنجیر میں باندھ لوں۔ لیکن مجھے ابھی تک نہ خود پر یقین ہے اور نہ اس پر۔ ہمارا عشق ایک سال کی مدت اور گزار لے تو شاید یقین آ جائے۔ پھر شادی بھی کر لوں گی۔"

"میرا خیال غلط نہیں تھا۔" جلالی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تمہاری یاسیت کا

تعلق عشق سے ہے۔ محبوب کی جدائی کا غم۔ بیوفائی کا خوف!" جلالی نے لہجے کو ڈرامائی بنایا تو الزبتھ پھر ہنس پڑی۔

"نہیں، ایسا نہیں ہے۔ مجھ پر یاسیت کے دورے پیٹر کی موجودگی میں بھی پڑتے ہیں۔ میری یاسیت میرے دماغ کے کسی خلئے کی خراب کارکردگی کا نتیجہ ہے۔ پہلی علامت ظاہر ہوتے ہی میری ماں مجھے یہاں چھوڑ جاتی ہے۔ یہ فضا مجھے راس آتی ہے۔ یہاں نہ آؤں تو سچ مچ پاگل ہو جاؤں۔"

"علامت کیا ہوتی ہے؟ توڑ پھوڑ کرتی ہو یا مار دھاڑ؟"

"اس کے بالکل برعکس۔ میں خاموش ہو جاتی ہوں اور شاعری کرنے لگتی ہوں۔"

"تم شاعر بھی ہو؟" جلالی نے حیرت سے پوچھا۔

"نہیں، ہوش کی حالت میں کبھی شاعری نہیں کی۔ لیکن دورے کی ابتدا شاعری سے ہوتی ہے۔ میری نظم پڑھتے ہی ماں کا سکون رخصت ہو جاتا ہے۔"

"تمہاری شاعری تو غیب سے آئے ہوئے مضامین کی شاعری ہو گی۔ مجھے یقین ہے بہت کمال کی ہو گی۔ کچھ سناؤ۔"

"میں ٹھیک ہوتے ہی اپنی نظمیں پھاڑ کر پھینک دیتی ہوں۔ وہ اس قابل نہیں ہوتیں کہ انہیں یاد رکھوں۔"

"کوشش کرو۔ شاید کوئی یاد آ جائے۔" جلالی اصرار کرنے لگا۔

"اس دفعہ جو نظم کہی تھی وہ ابھی تک ذہن میں ہے۔ شاید تمہیں سنا کر بھول جاؤں۔" الزبتھ نے تھوڑی دیر خاموش رہنے اور چائے کا ایک گھونٹ لینے کے بعد نظم سنانی شروع کی تو لفظوں کے ساتھ اس کے لہجے میں بھی اداسی بھری تھی۔

"خزاں کا آخری پتہ
زندگی کی خشک ٹہنی سے
جدا ہو کر
آندھیوں میں جب بھٹکنے لگتا ہے

میں اس کی پیٹھ پر بیٹھی
ڈولتی اڑتی ہوئی
دور افق کی الگنی پر جا لٹکتی ہوں
شفق کی آنچ سے
تپتا ہوا میرا بدن
جب سرخ ہونے لگتا ہے
میں شعلوں کی لپک بن کر
ٹوٹتے تاروں کی دم پکڑتی ہوں
اور آسماں پر آگ کی لکیر سے
آتشی تحریر میں
اپنی شکستہ آرزو کا
نوحہ لکھنے لگتی ہوں۔"

نظم ختم ہوئی تو کچھ دیر کے لئے خاموشی چھا گئی۔ موسیقار ایک بار پھر "یا مصطفیٰ یا مصطفیٰ" کی دھن بجا رہا تھا۔ لیکن جلالی کی توجہ نہ پا کر اس نے جلد ہی دھن تبدیل کر دی اور کسی دوسرے گاہک کو خوش کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

"بہت اچھی نظم ہے۔ تم اپنی نظمیں چھپواتی کیوں نہیں۔"

"کیوں مذاق کرتے ہو۔" الزبتھ ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ لا کر کہنے لگی۔ "ہمیں اپنی یاسیت اور ناامیدی دوسروں تک منتقل کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔"

"لگتا ہے ہنگری کا ادب ابھی تک اپنے پرولتاری دور کی اساس پر قائم ہے۔" جلالی نے مسکرا کر طنز کیا۔

"ہنگری کے ادب کی بنیادیں صدیوں گہری ہیں۔ ہنگری کی نئی شاعری پر جس شاعر کی چھاپ ہے وہ بھی ہمارا پرولتاری دور شروع ہونے سے پچاس برس پہلے پیدا ہوا تھا۔ جوزف اٹیلا کی شاعری پوری کائنات پر محیط تھی لیکن اس کے استعارے اس زمین اور ماحول سے آئے تھے جس میں وہ رہتا تھا۔" الزبتھ تھوڑی دیر کے لئے

خاموش ہو گئی۔ شاید کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"میں تمہیں جوزف اٹیلا کی ایک نظم سناتی ہوں۔ چاہت۔"

"تم فقط تم مری جان
فقط تم مری چاہت ہو جیسے
کسی کسان کی زرخیز مٹی'
جسے بارشوں کی'
شفاف آسماں سے برستی ہوئی
دھوپ کی آرزو ہو
تم فقط تم مری جان'
فقط تم مری چاہت ہو جیسے
قیدیوں کو آزادی
اور بھوک کو
روٹیوں کی خواہش ہو
جیسے سسکتے ہوئے لاچار لوگوں کو
اک نرم مسکراہٹ'
پیار سے لبریز لفظوں کی
ضرورت ہو
تم فقط تم مری جان
فقط تم مری جان
فقط تم مری چاہت ہو جیسے......۔"

"بہت اچھی نظم ہے۔" جلالی داد دیتے ہوئے کہنے لگا۔ "لیکن ہمارے نقاد ادب برائے زندگی کو پروپیگنڈہ کہا کرتے ہیں۔" ادب اس کا میدان نہیں تھا پھر بھی الزبتھ سے گفتگو کر کے اسے مزا آ رہا تھا۔

"ہو سکتا ہے صحیح کہتے ہوں۔ لیکن ایک صحیح اور مثبت تحریک کا پروپیگنڈہ

کرنے میں کیا برائی ہے؟" الزبتھ نے جلالی کو حیرت سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ جلالی لاجواب ہو گیا۔ الزبتھ بھی تھوڑی دیر خاموش رہی۔ دوبارہ بولی تو لہجے میں اداسی آ گئی۔

"جوزف اٹیلا کی پوری زندگی غربت' ناامیدی' مایوسی اور ناکامیوں سے بھری ہوئی تھی۔ باپ بچپن میں بچھڑ گیا تھا۔ ماں کو بچے پالنے کے لئے گھریلو ملازمہ بننا پڑا۔ عشق بھی ناکام رہا۔ انقلابیوں نے یہ کہہ کر نکال دیا کہ وہ مارکس اور فرائڈ کو گڈ مڈ کرنے لگا ہے۔ پھر بھی اس نے اپنی شاعری پر کبھی یاس کا سایہ نہیں پڑنے دیا۔ لیکن ایک دن اپنی ذہنی کیفیت سے ہار گیا۔ وہ صرف ۳۷ سال کا تھا جب اس نے ٹرین کے نیچے آ کر خودکشی کر لی۔" ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ ریسٹورنٹ کا موسیقار آنکھیں بند کئے کسی اداس دھن میں گم تھا۔

"شاعر خودکشی کے لئے ٹرین کے نیچے آنا کیوں پسند کرتے ہیں؟" جلالی نے اس طرح کہا جیسے خود سے مخاطب ہو۔

"تن آسانی۔ سہل پسندی۔ مشکلات سے گزرنے کا راستہ شاید ریل کی پٹڑیوں سے ہو کر جاتا ہو۔ یا شاید پٹڑیاں زندگی کی تمثیل ہوں۔ خواہشات کی کبھی نہ ملنے والی پٹڑیاں جن پر وقفے وقفے سے حقیقتوں کی ریل گاڑی دندناتی ہوئی گزر جاتی ہے۔" وہ بھی شاید اپنے آپ سے بات کر رہی تھی۔ لیکن پھر نظر اٹھا کر پوچھنے لگی۔

"تمہارا جوزف اٹیلا کون تھا؟"

"مجھے نہیں پتہ وہ جوزف اٹیلا تھا یا نہیں۔ لیکن شاعر اچھا تھا۔ میں نے اپنا قلمی نام جلالی اسی سے ادھار لیا تھا۔ وہ بھی صرف ۳۸ سال کا تھا جب اس نے ٹرین کے نیچے آ کر جان دے دی تھی۔" جلالی نے ایک گہرا سانس لیا اور پھر کہنے لگا۔

"ایک نوجوان شاعرہ تھی۔ عجیب طرح کے شعر کہتی تھی۔ ایک ٹرین کی پٹڑی پر لیٹ کر کٹ گئی۔ یونیورسٹی کے زمانے میں میرا ایک شاعر دوست تھا۔ وہ اچھا شاعر ہی نہیں تھا' اس کے چہرے پر بھی فرشتوں جیسی معصومیت تھی۔ اسے بھی ٹرین سے کٹنے کا شوق تھا۔ ایک دفعہ صرف ٹانگیں کٹا کر آ گیا۔ ہمارا خیال تھا اسے قرار آ گیا ہو

گا۔ لیکن بیساکھی سے کھٹ کھٹ کرتا ہوا گیا اور ٹرین کے نیچے آ کر ہمیشہ کے لئے سو گیا۔" جلالی سچ مچ بہت اداس ہوگیا۔ الزبتھ کی آنکھوں کی اداسی بھی گہری ہو گئی۔

"اپنے دوست کا کوئی شعر سناؤ۔" الزبتھ نے فرمائش کی۔

"یونیورسٹی کے زمانے کا اس کا ایک شعر جو میں کبھی نہیں بھول سکا

پتوں کی طرح تم بھی بکھر جاؤ گے لوگو
گھر سے نہ نکلنا کہ بہت تیز ہوا ہے"

"کتنی شکست خوردگی ہے۔ باہر نکل کر مشکلات سے لڑنے کے بجائے گھر میں چھپ کر بیٹھے رہنے کی تلقین!"

الزبتھ زور زور سے نفی میں سر ہلا رہی تھی۔ جلالی حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ اس نے کبھی اس پہلو سے اس شعر کا تجزیہ نہیں کیا تھا۔ اس کی مشکل ویٹر نے آسان کر دی جو کھانے کا آرڈر لینے آ گیا تھا۔ آرڈر الزبتھ نے دیا۔ اس نے جلالی کے لئے ہنگری کا روایتی بیف گولاش منگوایا جو جلالی کو شکل سے اور کسی حد تک مزے میں بھی آلو گوشت کی طرح لگا۔ کھانے کے دوران خاموشی رہی۔ بل آیا تو الزبتھ نے اپنے حصے کے پیسے دینے کی کوشش کی لیکن جلالی نے اصرار کر کے پورا بل ادا کیا۔

"تم اس طرح سر راہ ملنے والی لڑکیوں کو کھانے کھلاتے رہے تو کنگال ہو جاؤ گے۔" الزبتھ نے مسکرا کر کہا۔

"میں اتنا غریب بھی نہیں ہوں کہ ایک دن میں کنگال ہو جاؤں۔" جلالی بھی جواباً" مسکرایا۔ الزبتھ کچھ سوچنے لگی تھی۔ شاید کچھ کہنے سے پہلے لفظوں کو تول رہی تھی۔

"پچھلا دور ہوتا تو میں تم سے اس طرح کھل کر نہ مل سکتی۔" الزبتھ نے جلالی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بہت سنجیدگی سے کہنا شروع کیا۔ "یہ آزاد معیشت کا فائدہ ہے کہ ملنے جلنے پر روک ٹوک ختم ہو گئی ہے۔ مگر تم ایک سفارتکار ہو۔ تمہیں بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ مجھے اپنے گھر لانے پر تمہارے افسر کی ناراضگی غلط نہیں تھی۔" جلالی کو پہلے ہی اندازہ تھا کہ منگی سے اس کے جو مکالمے ہوئے تھے

انہیں نہ سمجھنے کے باوجود الزبتھ نے اپنے طور پر ان کی توضیح کی ہو گی۔

"میں صرف ایک صحافی ہوں۔ سفارتکار کی نوکری صرف چند دنوں کی ہے۔ میں اپنی آزادی چند دنوں کی اس نوکری پر قربان نہیں کر سکتا۔" جلالی نے لاپرواہی سے کندھے اچکا کر کہا۔

"کیا تم واقعی صحافی ہو؟"

"کیوں؟ تمہیں حیرت ہوئی؟"

"حیرت نہیں خوشی؟" الزبتھ نے اپنی اونچی ہوتی ہوئی آواز دباتے ہوئے کہا۔ "میں بھی صحافی ہوں۔ بڈاپسٹ کے ایک اخبار میں فیچر ایڈیٹر ہوں۔"

"واقعی؟" اب جلالی کے حیران ہونے کی باری تھی۔ الزبتھ اثبات میں سر ہلانے لگی۔ "پھر تو خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔" جلالی نے بڑی مشکل سے اس محاوراتی مصرعے کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔

"تم سے ملنا؟" الزبتھ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "جس کے گھر کی چابی اس کے افسروں کے پاس رہتی ہے!" جلالی کا چہرہ سرخ ہوتا دیکھ کر الزبتھ اچانک سنجیدہ ہو گئی۔

"برا مت مانو۔ تم یہاں صحافی نہیں سفارتکار کی حیثیت سے آئے ہو۔ یہ ایک مختلف دنیا ہے۔ بڈاپسٹ رہنے کے لئے بہت آسان جگہ ہے۔ لیکن یہاں سفارتی دنیا کی بساط پر جو بازی کھیلی جا رہی ہے اسے سمجھنا آسان نہیں ہے۔ کسی کو نہیں معلوم کون کس بادشاہ کا وفادار ہے۔ سیاہ و سفید مہرے آپس میں گڈمڈ ہو گئے ہیں۔ حب الوطنی کے معیار بدل گئے ہیں۔ وطنیت مفادات کے تابع ہو گئی ہے۔ تمہیں سچ مچ محتاط رہنا ہو گا۔"

"شاید تم صحیح کہہ رہی ہو۔" جلالی نے ایک تھکی سی مسکراہٹ چہرے پر لا کر کہا۔ "لیکن میں پریس اتاشی ہوں۔ میرا کام ہی صحافیوں سے ملنا اور تعلقات بڑھانا ہے۔ تم سے ملنا بھی میری سرکاری مصروفیات کا حصہ ہو گا۔ تمہارے پاس بھاگنے کا کوئی بہانہ نہیں ہے۔" الزبتھ مسکرائی۔ لیکن اس کی آنکھوں سے تشویش جھانک رہی تھی۔

"بہت دیر ہو گئی' اب چلنا چاہئے۔" الزبتھ نے اٹھتے ہوئے کہا۔ الزبتھ کے منع کرنے کے باوجود جلالی اسے گھر تک چھوڑنے اس کے ساتھ چل دیا۔ واپسی کا یہ سفر تھکانے والا تھا۔ چڑھائی پر چلتے ہوئے جلالی ہانپنے لگا۔ لیکن اس ورزش سے سردی کی کاٹ ختم ہو گئی تھی۔

"میں کل صبح اپنے گھر چلی جاؤں گی۔" اپنی عمارت کے دروازے پر پہنچ کر الزبتھ کہنے لگی۔ "ایک فیچر کے لئے میں کچھ دن بڈاپسٹ سے باہر رہوں گی۔ تمہیں اگلے ہفتے فون کروں گی۔"

الزبتھ کو چھوڑ کر جلالی ایک بار پھر ڈھلان پر اتر رہا تھا۔ لیکن بائیں ہاتھ کو مڑنے کے بجائے سیدھا جا کر دائیں ہاتھ کو مڑ گیا اور کونے کی سپر مارکیٹ میں داخل ہو کر قطار در قطار سجی ہوئی اشیاء کا معائنہ کرنے لگا۔ عملے کی ایک عورت غیر ملکی کو دیکھ کر بہت پرجوش ہو گئی اور اشاراتی زبان میں جلالی کی مدد کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ جلالی نے بے ضرورت کئی چیزیں خرید لیں اور تھیلے لٹکائے سردی میں کانپتا ہوا اپنے فلیٹ میں لوٹ آیا۔ ابھی صرف چار بجے تھے۔ اس نے سوچا تھا رات کو الزبتھ والی عمارت میں پھر جائے گا۔ رات کا کھانا وہیں کھائے گا۔ الزبتھ اسے پسند آئی تھی۔ اس میں ایک اچھے صحافی والی ہر عادت تھی۔ معاملات سے خود کو الگ تھلگ رکھ کر پرکھنے اور غیر جذباتی انداز میں تجزیہ کرنے کی عادت۔ اپنی محبت کا تذکرہ اس طرح کر رہی تھی جیسے کسی اور کی نفسیاتی گتھیاں سلجھا رہی ہو۔ جلالی سوچنے لگا جذباتی وابستگی کسی صحافی کے لئے کتنا بڑا عیب ہے۔ اس سمیت پاکستان کے کتنے صحافی اس برائی میں مبتلا تھے۔ سوچ کے دائرے پھیلنے لگے تھے۔ لیکن اسی وقت اسے دروازے کی تیز گھنٹی نے چونکا دیا۔

"ستار ہو گا۔" جلالی نے سوچا۔ ستار اسے نیا اور اکیلا جان کر مدد کرنے کی کوشش کر رہا تھا یا اسے جلالی کی پہریداری کا کام سونپا گیا تھا۔ کچھ بھی تھا جلالی کو بار بار کی مداخلت پسند نہیں تھی۔ اس نے سوچا وہ ستار کو سمجھا دے گا کہ اسے کسی پہرے یا مدد کی ضرورت نہیں ہے۔ ضرورت ہوئی تو وہ خود اس کا دروازہ کھٹکھٹائے گا۔

جلالی نے دروازہ کھولا تو وہ ستار نہیں تھا۔ ایک شخص گہرے کتھئی رنگ کا موٹا سا اونی اوورکوٹ پہنے کھڑا تھا۔ شکل سے ہی پاکستانی نظر آتا تھا۔ چھوٹی سی گردن اوورکوٹ کے کالر میں بالکل چھپ گئی تھی۔ طوطے جیسی ناک اور پتلے پتلے ہونٹ تھے۔

''سر! میں خاور بھٹی ہوں۔ سفارتخانے کا اکاؤنٹنٹ۔ آپ کو سلام کرنے آیا تھا۔'' جلالی نے ایک طرف ہٹ کر اسے اندر آنے کا راستہ دیا لیکن وہ اس وقت تک نہیں بیٹھا جب تک جلالی نہیں بیٹھ گیا۔

''منگی صاحب نے کہا تھا آپ کل آئیں گے۔'' جلالی نے اس کی آمد کی وجہ جاننا چاہی۔

''جی ہاں۔ میں اور ستار کل آپ کو سفارتکاروں کی دکان پر لے جائیں گے۔ اس وقت تو میں آپ کو یہ دینے آیا تھا۔'' بھٹی نے کوٹ کے اندر کی جیب سے ایک لفافہ نکال کر جلالی کو دیتے ہوئے کہا۔ ''گن لیجئے پورے دو ہزار آٹھ سو ڈالر ہیں۔''

''لیکن یہ کس بات کے پیسے ہیں۔ میں نے تو کام بھی شروع نہیں کیا۔ ابھی تنخواہ لینے کا وقت بھی نہیں آیا پھر یہ.....'' جلالی کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

''نہیں' یہ تنخواہ نہیں ہے۔ آپ کی تنخواہ اٹھارہ سو ڈالر ہے۔ ٹیکس کٹنے کے بعد آپ کو تقریباً'' چودہ سو ڈالر ملیں گے۔ یہ پیسے تو آپ کی پاکستان سے یہاں منتقلی الاؤنس کے ہیں۔''

''اتنی جلدی کیا تھی۔ مجھے تو ابھی ضرورت بھی نہیں تھی۔'' جلالی نے نوٹوں کا لفافہ اسی طرح ہاتھ میں پکڑے پکڑے کہا۔

''نہیں سر! آج کا پیسہ کل پر نہ چھوڑیں۔ یہ لوگ بجٹ ختم ہونے کا بہانہ کر کے کھا جائیں گے۔ آپ کا واؤچر بنا کر منگی صاحب کو دستخط کرنے کے لئے دیا تھا تو مجھے غصے سے گھور کر دیکھتا تھا۔ آپ کا واؤچر تھا اس لئے کچھ کہے بغیر دستخط کر دیئے تھے۔ سر' یہ منگی بہت کمینہ آدمی ہے۔ آپ نے بہت اچھا کیا جو اسے گھر بلا کر جوتے مارے تھے۔''

"ایسی غلط بات آپ سے کس نے کہی۔" جلالی نے اسے حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"غلط بات؟" بھٹی نے مسکرا کر کہا۔ "سفارتخانے میں سب کو پتہ ہے۔ آپ نے آتے ہی کہا تھا کہ اس وقت تک سفارتخانے نہیں آئیں گے جب تک منگی آپ کو لینے نہیں آئے گا۔ ستار سفیر صاحب کے سیکریٹری کو بتا رہا تھا آپ نے کس طرح منگی کو ڈانٹ پلائی تھی۔ آپ کے لئے پاکستان سے دو بڑے آدمیوں کے فون بھی آئے تھے۔ لیکن ستار سے ہوشیار رہیے گا۔ وہ منگی کا خاص آدمی ہے۔"

"اور آپ کس کے آدمی ہیں؟" جلالی نے مسکرا کر پوچھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کچھ عرصے کی سفارتکاری ایک دلچسپ تجربہ ثابت ہو گی۔ پہلا ہی دن واقعات سے بھرپور گزر رہا تھا۔

"میں آپ کا آدمی ہوں۔" بھٹی نے جو جلالی کے سوال سے گڑبڑا گیا تھا سنبھل کر کہا۔ پلکیں جھک گئی تھیں۔ لہجے میں عقیدت آ گئی تھی۔

"اور میں کس کا آدمی ہوں؟" جلالی نے اپنے بارے میں بھی معلوم کرنا چاہا۔

"سفارتخانے میں سب جانتے ہیں آپ وزیراعظم کے خاص آدمی ہیں۔" اپنے بارے میں بھٹی کے اس انکشاف نے جلالی کو حیران کر دیا۔ بھٹی اسے مزید بتانے لگا۔

"میں بھی وزیراعظم کی پارٹی کا آدمی ہوں۔ پارٹی کی وجہ سے سفارتخانے تبادلہ ہوا۔ اور اب آپ کی مہربانی سے توسیع بھی ہو جائے گی۔"

"توسیع؟" جلالی نے حیرانی سے پوچھا۔

"دو مہینے بعد میرے تین سال پورے ہو جائیں گے۔ میں نے ایک سال کی توسیع کے لئے درخواست دی ہے۔ سفیر صاحب نے سفارش کی ہے۔ لیکن منگی روڑے اٹکا رہا ہے۔ وہ کہتا ہے حکومت نے توسیع پر پابندی لگا دی ہے۔ آپ وزیراعظم سے سفارش کر دیں گے تو میرا کام چٹکی بجاتے ہو جائے گا۔"

جلالی کو بھٹی کی خوشامد کی وجہ معلوم ہو گئی۔

"وزیراعظم سے میرا...." جلالی نے بھٹی کی غلط فہمی دور کرنا چاہی۔ لیکن بھٹی

نے اس کی بات کاٹ دی۔
''سر' آپ کچھ نہ کہیں۔ میں سمجھتا ہوں۔ میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گا۔ بس آپ میرا خیال رکھئے گا۔'' یہ کہہ کر بھٹی جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔
''آپ بیٹھئے میں چائے بناتا ہوں۔'' جلالی نے رسماً اٹھتے ہوئے کہا۔
''نہیں سر! ستار آنے والا ہو گا۔ میں نہیں چاہتا وہ مجھے اس وقت آپ کے ساتھ دیکھے۔''
''آپ مجھ سے ملنے آئے ہیں' اس میں کیا بری بات ہے۔'' جلالی نے حیرانی سے کہا۔
''ستار منگی کو بتائے گا اور منگی میری زندگی اور مشکل کر دے گا۔'' بھٹی نے باہر کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ لیکن پھر رک گیا اور پلٹ کر کہنے لگا۔
''ڈالر تبدیل کرانے ہوں تو یانوش کو مت دیجئے گا۔ آپ مجھے بتائیے گا۔ بلکہ ا۔یمکے ہوٹل میں چلے جائیے گا۔ ایمکے ہوٹل سفارتخانے کے بالکل نزدیک ہے۔ علی عراقی ہوٹل کی لابی میں کافی پیتا ہوا ملے گا۔ آپ اسے دیکھتے ہی پہچان جائیں گے۔ اس کے ہاتھ میں سیاہ دانوں کی ایک تسبیح اور ساتھ میں سرخ بالوں والی ایک عورت بیٹھی ہو گی۔ آپ صرف میرا نام لے لیجئے گا۔ ستار آپ سے ڈیوٹی فری دکان کا سامان بیچنے کی بات کرے گا۔ اس کی بات مت سنئے گا۔ میرا ذریعہ زیادہ معتبر ہے۔ آپ ہزاروں ڈالر مہینہ کما سکتے ہیں۔'' جلالی نے دل ہی دل میں ''یا مظہر العجائب'' کا نعرہ لگایا اور سوچنے لگا وہ کس جال میں آ پھنسا ہے۔
''میں چلتا ہوں سر۔ اب صبح آؤں گا۔'' بھٹی کے جانے کے بعد جلالی دیر تک خالی الذہنی کے عالم میں بیٹھا بند دروازے کو تکتا رہا۔
جلالی شام کو ٹھیک سات بجے ایوا کے بار میں پہنچ گیا۔ خوب رونق تھی' ہفتے کی رات کا پورا اہتمام تھا۔ پورے ہال میں میزیں لگی ہوئی تھیں۔ بینڈ موسیقی کی دھنیں بکھیر رہا تھا۔ جلالی کو الزبتھ کہیں نظر نہیں آئی۔ وہ مایوسی سے کھڑا ادھر ادھر دیکھ رہا تھا کہ ایوا نے آ کر ایک میز کی طرف اس کی رہنمائی کی۔ کئی میزوں پر تنہا عورتیں

بیٹھی تھیں۔ انہوں نے جلالی کی طرف ان نگاہوں سے دیکھا جیسے اس کا اشارہ ملتے ہی گود میں آ بیٹھیں گی۔ جلالی اپنی نگاہوں کے استعمال میں محتاط تھا۔ اسے یقین تھا الزبتھ ضرور آئے گی۔ لیکن جلالی کی احتیاط کام نہیں آئی۔ وہ عورت جس نے سپر مارکیٹ میں خریداری کرنے میں اس کی مدد کی تھی داخل ہوئی تھی۔ وہ اکیلی آئی تھی۔ جلالی کو دیکھا تو تیر کی طرح اس کی طرف آئی اور اس گرمجوشی سے ملی جیسے برسوں پرانی دوست ہو۔ خیر مقدمی بوسے کے لئے پیش کئے جانے والے گال کو چوم کر جلالی نے اسے رسماً" اپنے ساتھ بیٹھنے کی دعوت دی تھی۔ وہ بیٹھی تو وہیں جم کر رہ گئی۔

لکڑی کے چمکدار فرش پر کئی جوڑے تھرک رہے تھے۔ جلالی کے ساتھ بیٹھی ہوئی عورت نے کئی دفعہ اس کا ہاتھ پکڑ کر رقص کے لئے کہا لیکن جلالی نے انکار کر دیا۔ عورت بری نہیں تھی۔ ۳۵ یا ۴۰ سال کی ہو گی۔ بہت کسا ہوا جسم تھا۔ کالے رنگ کی اسکرٹ پر سرخ بلاؤز اور اسی رنگ کے جوتے پہنے ہوئے تھی۔ چاندی جیسے چمکدار بالوں میں بڑی سی لال رنگ کی پلاسٹک کی کلپ لگائی ہوئی تھی۔ لیکن جب غباروں والا رقص شروع ہوا تو جلالی منع نہیں کر سکا۔ یہ رقص کرتے ہوئے ایک دوسرے کے غبارے پھوڑنے کا مقابلہ تھا۔ ہر جوڑے کی ساتھی خاتون کے پاؤں میں ایک ایک غبارہ بندھا ہوا تھا۔ کھیل مزیدار تھا لیکن جلالی زیادہ دیر تک اس میں شریک نہ رہ سکا۔ اس کے اناڑی پن کی وجہ سے جلد ہی کسی نے پاؤں مار کر ان کا غبارہ پھوڑ دیا تھا۔ اس کی ساتھی عورت پھر بھی ہار ماننے پر تیار نہیں تھی۔ وہ مستقل کھڑی اصرار کر رہی تھی کہ کسی نے سگریٹ سلگا کر اس کا غبارہ پھوڑا ہے۔ جلالی اسے کھینچ کر اپنی میز پر واپس لے آیا۔ وہ اشاروں اور ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں اسے بتانے لگی کہ ان کے ساتھ بے ایمانی ہوئی ہے۔ جلالی کو پہلی بار اندازہ ہوا کہ وہ نشے میں تھی۔ جلالی نے سوچا یہی بہتر ہے کہ یہاں سے نکل جائے۔

رات بھر وہ سرخ رنگ کے نرم غباروں سے کھیلتا رہا۔ لیکن پھر اچانک ہی وہ غبارے پھٹنے لگے۔ ان کے ساتھ ہی فائر بریگیڈ کے انجن کی گھنٹیاں اور ایمبولنس کے تیز سائرن کی آواز کان پھاڑنے لگی۔ آنکھ کھلی تو دروازے کی گھنٹی تھی۔ اس دفعہ گھنٹی

بجانے والا ستار تھا اور ناشتے کی ٹرے ساتھ لے کر آیا تھا۔ صبح کے گیارہ بج گئے تھے۔ جلالی تیار ہو کر ناشتے پر ٹوٹ پڑا۔ بھوک نے یہ بھلا دیا تھا کہ وہ ستار کو کھانے کا تکلف کرنے سے منع کر چکا ہے۔

"یہ بھٹی کیسا آدمی ہے؟" جلالی نے ناشتہ ختم کر کے کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

"وہ اکاؤنٹ افسر ہے اس لئے سب اسے خوش رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔" ستار کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہنے لگا۔ "سفیر صاحب کا بہت منہ لگا ہے۔ ان کے لئے دعوتوں کے جعلی بل بناتا ہے اور ایک چوتھائی کمیشن کاٹ کر باقی انہیں دیتا ہے۔ لیکن اصل میں وہ منگی صاحب کا آدمی ہے۔" ستار نے کہا اور چائے پینے لگا جو جلالی اس کے لئے بنا کر لایا تھا۔

"منگی کے آدمی تو آپ بھی ہیں۔" جلالی نے مسکرا کر کہا۔

"ہم سب منگی صاحب کے آدمی ہیں۔" ستار سر جھکا کر دھیمے لہجے میں کہنے لگا۔ "ان سے بگاڑ کر یہاں رہنا بہت مشکل کام ہے۔ لیکن بھٹی منگی صاحب کے خلاف کھل کر باتیں کرتا ہے اور اسے کچھ نہیں ہوتا۔ پہلے کسی کو نہیں پتہ تھا لیکن اب سب کو معلوم ہو گیا ہے۔ وہ اس طرح لوگوں کا اعتماد حاصل کرتا ہے، منگی صاحب کے خلاف باتیں اگلواتا ہے اور پھر چغلی کرتا ہے۔ آپ اس سے محتاط رہئے گا۔" جلالی دل میں مسکرانے لگا۔ ہر آدمی ایک دوسرے سے محتاط رہنے کا مشورہ دے رہا تھا۔ اسی وقت دروازے کی گھنٹی پھر بج اٹھی۔ شاید بھٹی انہیں لینے آ گیا تھا۔

جلالی کے لئے سفارتخانہ ایک عجائب گھر تھا۔ لیکن وہ حیرتوں اور صدموں کو جذب کر کے جلد ہی اپنے کام میں ڈوب گیا۔ جلالی کے لئے یہ ملازمت ضمیر پر بوجھ بن گئی تھی۔ وہ سرکار سے ملنے والے ایک ایک ڈالر کی قیمت چکانا چاہتا تھا۔ اس لئے منگی نے جب اس کی میز پر فائلوں کا انبار لگایا تو وہ کوئی شکایت یا جھگڑا کئے بغیر ان سے نمٹنے میں مصروف ہو گیا۔

فیاض منگی نے غلط نہیں کہا تھا۔ جلالی کو سفارتخانے جاتے ہی براہ راست منگی سے ہدایات لینے کا حکم نامہ مل گیا تھا۔ جلالی کلرکوں کی طرح منگی کی دی ہوئی فائلوں پر کام کر رہا تھا لیکن وہ اپنا پریس اتاشی ہونا نہیں بھولا تھا۔ ذہن میں "پاکستان کو پہچانو" کی مہم کا ایک خاکہ بننے لگا تھا۔ رات کو دیر تک دفتر میں بیٹھا اس خاکے میں رنگ بھرتا رہتا۔ مہم کے آغاز کے لئے سفیر کی مدد چاہئے تھی۔ لیکن سفیر تھا کہاں؟ اس کے پاس تو ملنے کا بھی وقت نہیں تھا۔ ویک اینڈ گزارنے جمعہ کو ہی ویانا چلا جاتا۔ افواہ تھی کہ اس نے ویانا میں اپنی موسیقار محبوبہ کو ایک فلیٹ دے کر رکھا ہوا ہے۔ ویانا میں زیادہ وقت اسی کے ساتھ گزارتا ہے۔ دو ہفتوں کی کوشش کے بعد جلالی سفیر سے ملاقات کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ ملاقات بھی بھٹی کے ذریعے ممکن ہو سکی تھی۔

ولایت علی کی ولدیت بہت مرعوب کرنے والی تھی۔ کون تھا جو انگلی اٹھا سکتا تھا۔ وہ ایک چھوٹے قد کا دبلا پتلا شخص تھا۔ سر پر گھوڑے کی نال کی طرح بالوں کی جھالر بچی تھی اور سامنے سے سر بالکل شفاف تھا۔ کالی چمکدار داڑھی اور مونچھیں شاید خضاب سے سیاہ کی گئی تھیں۔ اس نے بہت شائستگی سے کھڑے ہو کر جلالی کا استقبال کیا۔ سفیر کو اردو بولنے میں مشکل پیش آتی تھی اس لئے گفتگو انگریزی میں ہوئی تھی۔

"مسٹر ذہین جلالی! یہی نام ہے نا آپ کا؟" سفیر نے سامنے رکھے ہوئے کاغذات کو دیکھ کر کہا اور پھر جلالی کو اثبات میں سر ہلاتا دیکھ کر پوچھنے لگا۔ "آپ اکبر خان کے دوست ہیں؟ انہوں نے آپ کے بارے میں مجھے فیکس کیا تھا۔ وہ شاید ابھی تک سیکریٹری دفاع ہیں؟"

"جی نہیں، وہ دو سال پہلے ریٹائر ہو گئے تھے۔ وزیراعظم کے مشیر تھے، آج کل صدر کے ایڈوائزر ہیں۔" جلالی نے سوچا اکبر خان سے دوستی ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں وضاحت کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

"پاکستان میں حکومتیں اور عہدے اتنی تیزی سے بدلتے ہیں کہ پتہ ہی نہیں چلتا۔ پچھلی بار جب حکومت بدلی تھی میں چھٹی پر سوئٹزر لینڈ گیا ہوا تھا۔ مجھے ایک مہینے تک پتہ نہیں چلا۔ میں اسکیٹنگ کے لئے جاتا ہوں تو اخبارات اور ٹی وی، ریڈیو

سے پرہیز کرتا ہوں۔ حد نگاہ تک پھیلی ہوئی سفید برف کی اترائیوں اور چڑھائیوں میں گم رہتا ہوں۔ آپ تو سوئٹزر لینڈ گئے ہوں گے۔" ولایت علی نے سگریٹ سلگا کر سوالیہ نظروں سے جلالی کو دیکھا۔

"جی نہیں! لیکن حکومت کی تبدیلی کا آپ پر اثر نہیں ہوتا؟" جلالی کو واقعی حیرت تھی۔

"مجھ پر اثر؟" سفیر ہنسنے لگا۔ "میں نے اپنا سیاسی اثر کسی پلڑے میں نہیں ڈالا۔ ایک دفعہ اپنے ایک دوست کے کہنے پر غلطی کی تھی، لیکن پھر توبہ کر لی۔ وزارت خارجہ والوں سے میں نے کہہ دیا ہے مجھے خاموشی سے یہیں پڑا رہنے دیں اور یہیں سے ریٹائر کر دیں۔ وہ اب مجھے یہاں ڈال کر بھول گئے ہیں۔" سفیر نے ایک اور قہقہہ لگایا۔ لیکن پھر سنجیدہ ہو کر کہنے لگا۔ "سنا ہے آپ صحافی ہیں۔"

"جی ہاں! میں ایک مہم شروع کر رہا ہوں۔ "پاکستان کو پہچانو"۔ میری کوشش ہے اخباروں میں آپ کے انٹرویو شائع ہوں۔ ریڈیو ٹی وی پر وقت لینے کے لئے بھی کوشش کروں گا۔ آپ کا کچھ وقت درکار ہو گا۔ مجھے یقین ہے اس سے ہماری تجارت اور سیاحت کو فائدہ ہو گا۔" جلالی نے فوراً" کام کی بات شروع کر دی۔

"دیکھئے، مجھے پتہ ہے آپ پریس اتاشی ہو کر آئے ہیں۔ لیکن اس عہدے کو اتنی سنجیدگی سے مت لیجئے۔ آپ جوان آدمی ہیں، کنوئیں سے باہر نکل آئے ہیں تو دنیا کو آنکھیں کھول کر دیکھئے۔ یورپ کا شہر شہر گھومئے۔ یہاں کے ذرے ذرے میں اتنی خوبصورتی چھپی ہے کہ آپ حیران رہ جائیں گے۔ آپ ویانا دیکھ آئے؟" سفیر کو کام کی بات میں دلچسپی نہیں تھی۔

"جی نہیں! مجھے آئے ہوئے ابھی صرف دو ہفتے ہوئے ہیں۔" جلالی نے اس طرح کہا جیسے ویانا نہ جانے پر شرمندہ ہو۔

"دو ہفتے ہو گئے اور آپ ویانا نہیں گئے؟" سفیر اچھل پڑا۔ "یہاں سے صرف چار گھنٹے کی ڈرائیو ہے۔ آپ ضرور جائیے۔ اس شہر کے آرکیٹیکچر کو دیکھ کر آپ کی آنکھیں روشن ہو جائیں گی۔ سینٹ اسٹیفن کے کیتھڈرل نے ویانا کی اسکائی لائن کو

بہت شاہانہ بنا دیا ہے۔ مجھے مین ہٹن کی اسکائی لائن بالکل پسند نہیں۔ دن میں تو وہ کنکریٹ کے ڈبوں کا قبرستان لگتی ہے۔ آپ کافی پئیں گے؟" ولایت علی کو اپنی بات ایک غیر متعلقہ سوال پر ختم کرنے کی عادت تھی۔

"جی نہیں میں......" جلالی کا جملہ مکمل نہیں ہو سکا تھا۔ اسی وقت سفیر کا سیکریٹری دوا کا چھوٹا گلاس، جس میں رنگ برنگی گولیاں چمک رہی تھیں اور دوسرے ہاتھ میں کافی کا کپ لئے داخل ہوا۔

"دراصل یہ میری دوا کا وقت ہے۔ میں اس وقت کسی سے نہیں ملتا۔" سفیر نے کہا اور جلالی کو جو کرسی سے اٹھنے لگا تھا' ہاتھ کے اشارے سے دوبارہ بیٹھنے کے لئے کہہ کر کافی کے گھونٹ سے دوا کی گولیاں نگلنے لگا۔ "میری مراد آپ سے نہیں باہر والوں سے تھی۔" وہ نیا سگریٹ سلگا کر دھواں اڑاتے ہوئے ایک بار پھر ویانا پہنچ گیا۔

"کمال کا شہر ہے۔ جدید عہد سے کندھا ملائے کھڑا ہے لیکن اپنے چہرے پر سیمنٹ کا بھدا میک اپ نہیں تھوپا۔ نہ سرسبز باغوں اور جھلملاتے تالابوں کا فطری حسن قربان کیا ہے۔ اس کی ہوا میں سو سال پرانی مہک آج بھی تازہ ہے۔ چھوٹے چھوٹے کافی خانوں کی ایک بستی آباد ہے جن کی کافی میں صدیوں پرانی خوشبو ابھی تک زندہ ہے۔ قدم قدم پر بینڈ اب بھی موسیقی کی سو سال پرانی دھنیں بجا کر مسحور کر دیتے ہیں۔ ان کا تو ویلفیئر سسٹم تک وہی ہے جو اٹھارویں صدی میں ان کی ملکہ تھریسا اور شاہ جوزف دوئم دے گیا تھا۔" ولایت علی نے سانس لینے کا وقفہ لیا اور پھر ایک غیر متعلق سوال کا چھکا مارا۔ "آپ انگوری شراب کا ذوق رکھتے ہیں یا عام پاکستانیوں کی طرح وہسکی پی کر شور مچاتے ہیں؟"

"جی میں....." جلالی نے گڑبڑا کر کچھ کہنا چاہا لیکن سفیر نے توجہ دیئے بغیر بات دوبارہ شروع کر دی۔

"پاکستان میں اچھی شراب کو ترس جاتا ہوں۔ چھ سال پہلے ایک ہفتے کے لئے گیا تھا لیکن چار روز میں واپس بھاگ آیا۔ ہر آدمی بلیک لیبل اور شی واز سر پر اٹھائے اپنا قد بڑھانے کی کوشش کرتا ہے۔ اچھے اچھے لوگوں کو بھی وائن کی پہچان اور تمیز

نہیں ہے۔ ملک کیسے ترقی کرے گا۔" ولایت علی نے برا سا منہ بنا کر کڑوی کافی کا گھونٹ لیا اور گفتگو کا سلسلہ دوبارہ ویانا سے جوڑ دیا۔

"ویانا جاتے ہوئے شہر کے باہر جو چھوٹی چھوٹی سرائے ہیں ان میں بیٹھ کر دیسی شراب پینے کا مزا ہی کچھ اور ہے۔ پہلا ہی گھونٹ ایک صدی پرانی دنیا میں لے جاتا ہے۔ ہنگری والے اپنی "بیلاٹن" جھیل اور وہاں بننے والی شراب پر بہت فخر کرتے ہیں۔ جھیل اچھی ہے لیکن شراب۔" سفیر نے ایک بار پھر برا سا منہ بنایا اور جلالی سوچنے لگا ویانا بہت ہو گیا۔ کام کی بات کرنی چاہئے۔

"اخبارات کے لئے آپ کے انٹرویو......"

"دیکھئے' مجھے اپنا نام اور تصویر چھپوانے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ مجھے گمنام رہنا پسند ہے۔" ولایت علی جلالی کی بات کاٹ کر کہنے لگا۔ "میرے پاس وقت بھی نہیں ہے۔ میں اگلے پورے ہفتے ویانا میں مصروف رہوں گا۔ اس کے بعد مجھے سفاری کے لئے تنزانیہ جانا ہے۔ واپس آؤں گا تو ویانا میں آپیرا کا سیزن شروع ہو جائے گا' کرسمس اور نئے سال کی چھٹیاں وہیں گزاروں گا۔ آپ کو موسیقی کا شوق ہے؟" سفیر نے پھر ایک سوال داغ دیا۔

"جی ہاں' میں نصرت فتح علی خان کو...." جلالی نے کہنا چاہا لیکن سفیر نے ایک بار پھر اس کی بات کاٹ دی۔

"میں آپ کے دیسی قوالوں کی نہیں سچ مچ کی موسیقی کی بات کر رہا ہوں۔" سفیر نے اس طرح ہاتھ ہلا کر کہا جیسے مکھی کو بھگا رہا ہو۔ "نئے سال پر ویانا میں جو ہن اسٹراز کی سمفونی سنئے گا۔ آپ کو لگے گا جیسے دوبارہ پیدا ہو گئے ہوں۔ لیکن آپ دیر میں آئے ہیں۔ آپ کو سیٹ ملنی مشکل ہو گی۔ آسٹریا کی وزارت خارجہ سے رابطہ کیجئے شاید وہ کچھ کر سکیں۔ میں بھی کوشش کروں گا۔"

جلالی اجازت لینے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے دوبارہ پیدا ہونے کا شوق نہیں تھا۔ لیکن سفیر نے اسے ایک بار پھر بیٹھنے کے لئے کہا۔ جلالی ایک گھنٹے تک سفیر سے جرمن موسیقاروں کی زندگی کے حالات اور کارنامے سننے کے بعد کمرے سے نکلا تو

سوچ رہا تھا وہ کس ملک کے سفیر سے مل کر آیا ہے؟

پاکستان پہچانو کی مہم شروع کرنے کی پہلی کوشش ہی ناکام ہو گئی تھی۔ جلالی نے سوچا فیاض منگی سے مدد مانگے۔ لیکن منگی سے بات کرنا بھی آسان نہیں تھا۔ وہ صبح سویرے دفتر آتا اور سب سے آخر میں جاتا تھا۔ اس کے کمرے کے باہر ایک سرخ بلب لگا ہوا تھا۔ اس سے ملنے کے لئے طرح طرح کے لوگ آتے اور سیدھا منگی کے کمرے کا رخ کرتے۔ ان کے کمرے میں جاتے ہی سرخ بلب جلنے لگتا۔ بلب روشن ہو تو کسی کو اندر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ اکثر منگی کمرے میں اکیلا ہوتا لیکن بلب روشن ہوتا اور جلالی سوچتا اس بیکار سفارتخانے میں جہاں کسی کے پاس کرنے کے لئے کچھ نہیں تھا منگی کی اتنی مصروفیات کا راز کیا ہے۔ کچھ بھی ہو خود اسے منگی کے پاس جانا پسند نہیں تھا۔ منگی کے سامنے آتے ہی جلالی کے جسم میں سرخ رنگ کے بے شمار بلب جل اٹھتے' عضلات تن جاتے اور لگتا جیسے کوئی دشمن مقابل آ گیا ہو۔ جلالی کو یقین تھا اسے دیکھتے ہی منگی کی بھی یہی کیفیت ہوتی ہو گی۔

جلالی نے سفارتخانے کی تیسری ریاست پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا۔ تجارت کا فروغ ٹریڈ کمشنر افتخار خان کی عملداری میں تھا۔ لیکن اس سے ملنا بھی آسان نہیں تھا۔ وہ دیر سے دفتر آتا اور ایک جلوہ دکھا کر غائب ہو جاتا۔ اس کا سیکریٹری پوچھنے پر بتاتا کہ وہ کہیں میٹنگ کرنے گیا ہے۔ بھٹی نے بتایا کہ وہ اپنا کاروبار کرتا ہے۔ پہلے قالین منگاتا تھا لیکن ہنگری میں مہنگی قیمت کے قالین بیچنا مشکل ثابت ہوا تھا اس لئے اب پاکستان سے کھڈی پر بنی ہوئی رنگین دریاں اور چمڑے کی بھاری جیکٹیں منگوا کر بڈاپسٹ اور ویانا میں بیچتا تھا۔

"تجارت کو فروغ تو ہو رہا ہے۔" جلالی نے مسکرا کر ٹریڈ کمشنر کی حمایت کی لیکن بھٹی زور زور سے نفی میں سر ہلانے لگا۔

جلالی ایک روز افتخار خان کو پکڑنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ اس کا وزن سو ڈیڑھ سو کلو سے کم نہیں تھا۔ اسی وقت آیا تھا اور بیٹھا ہوا اپنی سانسیں درست کر رہا تھا۔ اس نے جلالی سے بہت گرمجوشی سے ہاتھ ملایا اور بیٹھے بیٹھے ہی کافی کے لئے

آواز لگائی۔ اس کی آواز دہاڑ بن کر پورے دفتر میں گونجی تھی۔ وہ ابھی ابتدائی رسمیات کا تبادلہ کر رہے تھے کہ کافی آ گئی۔ کافی لے کر آنے والی وہ مقامی لڑکی تھی جس کی ڈیوٹی استقبالیہ پر تھی۔

افتخار خان کو پیالی دیتے ہوئے بہت ادا سے مسکرائی اور اٹھلاتی ہوئی واپس مڑ گئی۔ افتخار خان اسے اس وقت تک دیکھتا رہا جب تک وہ کمرے سے نہیں نکل گئی۔ جلالی کو اس کے ایک ایک روئیں سے "یا قربان" کی صدائیں آتی سنائی دے رہی تھیں۔ افتخار خان کافی کا گھونٹ لے کر سنبھلا اور براہ راست مطلب کی بات پر آ گیا۔

"آپ وزیراعظم کے آدمی ہیں، اسے بتائیں کہ میرے ساتھ بہت زیادتی ہوئی ہے۔ میرا کام تجارت کو بڑھانا ہے لیکن میری سہولتیں سب سے کم ہیں۔ سفیر کوئی کام نہیں کرتا، اس کے پاس مرسڈیز ہے۔ منگی کے پاس نئے ماڈل کی بی ایم ڈبلیو ہے۔ میری دس سالہ پرانی فاکس ویگن اب ہچکیاں لینے لگی ہے۔ نئی کار کی منظوری کے لئے روز فیکس بھیجتا ہوں۔ اب تک جواب نہیں آیا۔ سب حرام کی کھا رہے ہیں۔ کوئی کام نہیں کرتا۔ آپ وزیراعظم کو لکھو ورنہ میں جنرل صاحب سے شکایت کروں گا۔" افتخار خان نے دھمکی دی۔ جلالی کو بھٹی نے بتایا تھا کہ افتخار خان کی بیوی کسی بڑے جنرل کی رشتہ دار ہے۔ جلالی نے سوچا اس سے بھی وقت ضائع کئے بغیر کام کی بات کر لینا چاہئے۔

"پاکستان کی تجارت پر یہاں کے اخباروں میں آپ کے انٹرویو چھپوانے ہیں۔ آپ کو اعتراض تو نہیں ہے۔"

"اوہ نہیں یارا۔ میرا انٹرویو نہیں چھپواؤ۔ میری تصویر اچھی نہیں آتی۔"

"تصویر کے بغیر....."

"چھوڑو یارا! کس چکر میں پڑے ہو۔" ٹریڈ کمشنر نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "یہاں کسی کو پاکستان سے تجارت کا شوق نہیں ہے۔ میں آپ کو اعداد و شمار دیتا ہوں۔ آپ پریس اتاشی ہو۔ اخبار والوں سے آپ خود بات کر لو۔" افتخار خان نے میز کی دراز سے کاغذوں کا ایک پلندہ نکال کر جلالی کی طرف بڑھایا اور کھڑا ہو گیا۔

”لیکن پاکستان کی برآمدات تو مستقل کم ہو رہی ہیں؟“ جلالی نے کاغذوں پر ایک نظر دوڑا کر کھڑے ہوتے ہوئے حیرت سے کہا۔

”دو سال سے کاٹن کی فصل خراب ہے۔ اس سال فصل اچھی ہوئی ہے تو ایکسپورٹ بھی بڑھے گا۔“ افتخار خان بیزاری سے کہنے لگا۔ ”معاف کرنا مجھے جانا ہے۔ چیمبر میں میری میٹنگ ہے۔“

جلالی کمرے سے نکل کر سوچ رہا تھا کہ تجارت صرف فصل اچھی یا خراب ہونے سے گھٹتی بڑھتی ہے تو پھر ٹریڈ کمشنر یہاں کیا کر رہا ہے۔ وہ فصلوں پر دوا چھڑکنے کا کام کیوں نہیں کرتا۔ جلالی نے اندازہ لگایا تھا کہ سفارتخانہ بند کر کے اس پر ہونے والے اخراجات سے پاکستان میں کم از کم تین سو افراد کو باعزت روزگار دیا جا سکتا تھا۔

جلالی کو الزبتھ کئی دفعہ یاد آئی تھی۔ وہ صحافی لڑکی جو اسے بڈاپسٹ میں پہلے ہی روز ملی تھی اور اپنی نظم اور گفتگو سے متاثر کر کے چلی گئی تھی۔ اس نے فون کرنے کا وعدہ پورا نہیں کیا تھا۔ جلالی نے سوچا تھا یانوش سے اس کا فون نمبر تلاش کرنے کے لئے کہے گا لیکن پھر کچھ سوچ کر اپنے ارادے سے باز رہا۔ سفارتخانے میں ایک یانوش ہی کام کا آدمی تھا۔ وہ بھی جلالی کی عزت کرتا تھا۔ عزت کرنے کی ایک وجہ شاید یہ بھی تھی کہ جلالی نے کسی وجہ کے بغیر اسے سگریٹ کا ایک کارٹن اور برانڈی کی بوتل کا تحفہ دے کر حیران کر دیا تھا۔ یانوش پاکستانی افسروں کی ان نوازشات کا عادی نہیں تھا۔

ایک دن یانوش جلالی کے لئے ایک پریس ریلیز کا ہنگرین زبان میں ترجمہ کر رہا تھا کہ اس نے ایک کاغذ پر کچھ لکھ کر جلالی کی طرف کھسکا دیا۔ جلالی نے کاغذ لے کر حیرانی سے یانوش کو دیکھا۔ لیکن وہ اسی طرح خاموشی سے سر جھکائے ترجمہ کرنے میں مصروف تھا۔ جلالی نے ایک بار پھر کاغذ پر لکھی تحریر کو دیکھا۔ یانوش نے اسی وقت کاغذ اس کے ہاتھ سے لے کر اس کے پرزے پرزے کئے اور ساتھ رکھی ہوئی ردی کی ٹوکری میں ڈال دیئے۔

"یوسف سعید۔ ۶ بجے آنا بار۔" جلالی کے ذہن میں پیغام جم گیا تھا۔ لیکن یہ یوسف سعید کون تھا۔ اگر یہ وہی یوسف سعید تھا جسے جلالی جانتا تھا تو وہ یہاں کیا کر رہا تھا۔ اور پھر اتنے خفیہ انداز میں پیغام دینے کا کیا مطلب تھا۔ الزبتھ نے اسے پہلے دن ہی خبردار کیا تھا۔ وہ صحافی اور ایک ذہین عورت تھی۔ سفارتی دنیا کی پیچیدگیوں کو سمجھتی ہوگی۔ جلالی نے سوچا اسے واقعی محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ لیکن پھر اس نے اپنے کندھے اچکا دیئے۔ اس کے پاس کھونے کے لئے تھا بھی کیا۔

واتسی اسٹریٹ پر واقع آنا بار جلالی کا دیکھا ہوا تھا۔ کبھی اندر نہیں گیا تھا لیکن باہر نیون سائن کی رنگ برنگی بتیاں یہ بتانے کے لئے کافی تھیں کہ اندر کیا ہے۔ واتسی اسٹریٹ بڈاپسٹ کی سب سے بارونق سڑک تھی۔ تمام مشہور فیشن اسٹورز اسی سڑک پر تھے۔ جلالی صبح جس بس سے آتا تھا وہ الزبتھ برج کے ذریعے دریائے ڈینوب کو عبور کر کے سیدھی واتسی اسٹریٹ پر آکر رکتی تھی۔ جلالی کا دفتر واتسی اسٹریٹ سے زیادہ دور نہیں تھا۔ آنا بار کی طرف جاتے ہوئے وہ ایک بار پھر یوسف سعید کے بارے میں سوچنے لگا۔ جلالی جس یوسف سعید کو جانتا تھا اس سے کبھی ملا نہیں تھا۔ وہ وزیراعظم عامر نذیر کے باپ کا دوست تھا۔ بیس برس پہلے عامر نذیر کے باپ نے برسراقتدار آکر یوسف سعید کو ایک اخباری ادارے کا سربراہ بنا دیا تھا۔ پھر اچانک کسی کم اہم ادارے میں اس کا تبادلہ ہو گیا۔ جلالی نے اس کے بعد یوسف سعید کا نام نہیں سنا۔ ایک دو بار دعوتوں میں دیکھا ضرور تھا۔ بے حد جاذب نظر اور جامہ زیب شخصیت تھی۔ خوش قامت۔ کشمیریوں جیسا سرخ و سفید رنگ۔ کہیں کہیں سے سفید ہوتے ہوئے گھنگھریالے سیاہ بال۔ بڑی بڑی روشن اور چمکیلی آنکھیں۔

جلالی ذہن میں یوسف سعید کا سراپا بناتا ہوا داخل ہوا تو سامنے ہی ریسٹورنٹ کا وسیع ڈائننگ ہال تھا جس میں سجی ہوئی اکثر میزیں خالی تھیں۔ ایک طرف بڑا سا بار کاؤنٹر تھا جس کے پیچھے ہنستی اور مسکراتی ہوئی دو لڑکیاں خالی جام بھرنے اور سمیٹنے میں مصروف تھیں۔ کاؤنٹر کے اسٹولوں پر بیٹھے ہوئے لوگوں میں کوئی ایسا نہیں تھا جس پر جلالی کو کسی یوسف سعید کا گمان ہو سکتا۔ اوپر سے میوزک کی آواز آ رہی تھی۔ الٹے

ہاتھ کی طرف ایک زینہ تھا جس کی کشادہ سیڑھیوں پر سرخ قالین بچھا تھا۔ آنا بار میں داخل ہونے والے سیدھے اسی زینے کا رخ کر رہے تھے۔ جلالی بھی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ اوپر کی منزل ایک دوسری دنیا تھی۔ اونچی آواز کی موسیقی کے باوجود چیخوں اور سسکیوں کا شور نمایاں تھا۔ روشنیوں کے ساتھ ننگے مرمریں جسموں کے جھماکے ہو رہے تھے۔ بڑے سے ہارس شو کے گرد بیٹھے ہوئے تماشائی اپنے اپنے جام، سگریٹ اور اپنے ساتھ چپک کر بیٹھی ہوئی نیم عریاں لڑکیوں کے ساتھ مصروف تھے۔ درمیان میں اسٹیج پر چار پانچ لڑکیاں لکڑی کے پتلے پتلے ستونوں پر بندروں کی طرح چڑھ اور اتر رہی تھیں۔ لباس کے طور پر انہوں نے اپنی ران پر الاسٹک کی ایک کالی دھجی باندھی ہوئی تھی۔ چاروں طرف بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے کوئی نوٹ لہراتا تو ان میں سے ایک آگے بڑھ کر اپنا پاؤں اس کی میز پر رکھ دیتی۔ توجہ کا یہ اعزاز پا کر تماشائی اس کی ٹانگ کو بہت عقیدت سے سہلاتا ہوا اپنا نوٹ ران میں بندھی ہوئی الاسٹک کی سیاہ پٹی میں ٹھونس دیتا۔ تھوڑی دیر بعد ہی موسیقی تبدیل ہو گئی اور اسٹیج پر سرخ اور سنہرے بالوں والی لڑکیوں کا ایک جوڑا آ کر ایک دوسرے کے بدن کو چومتا اور پیار کرتا ہوا محبتوں کے کمال دکھانے لگا۔

جلالی کو تنہا کھڑا دیکھ کر "صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں" جیسے بدن اور مہین لباس والی ایک لڑکی ہاتھ پکڑ کر اسے اندھیرے کونے میں رکھی ہوئی ایک میز کی طرف کھینچنے لگی۔ جلالی نے بڑی مشکل سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور اسٹیج سے ذرا فاصلے پر بنے ہوئے بار کاؤنٹر کی طرف بڑھ گیا۔ کاؤنٹر پر کافی رش تھا۔ دوسری طرف سے آتی ہوئی روشنی کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے شرابیوں کے چہروں پر پڑ رہی تھی۔ جلالی نے لوگوں کے چہرے دیکھنا شروع کئے۔ آخری سرے پر جو شخص بیٹھا تھا وہ یقیناً" یوسف سعید تھا۔ وہ بیس سال پہلے والے یوسف سعید کا ایک ہلکا سا سایہ تھا۔ سر کے سفید بالوں میں بس کہیں کہیں سے سیاہی جھانکتی تھی۔ چہرے پر جھریوں کی کالی لکیریں پھیلی ہوئی تھیں۔ جسم لاغر اور گردن کی کھال ڈھیلی ہو گئی تھی۔ روشنی اور چمک سے محروم آنکھوں کو گزرے ہوئے وقت کی دھول نے میلا کر دیا تھا۔ وہ اسٹیج کی طرف نظر

کئے ہوئے ان لڑکیوں کو دیکھ رہا تھا جو ایک دوسرے سے لپٹی ہوئی اپنے فن کا مظاہرہ کر رہی تھیں اور اب فرش پر لیٹ کر ایک دوسرے میں گم ہو گئی تھیں۔ جلالی اسی طرح کھڑا ہوا یوسف سعید کی توجہ حاصل کرنے کے لئے شو ختم ہونے کا انتظار کرتا رہا۔ شو اپنے کلا ئمکس پر پہنچ کر ختم ہوا اور موسیقی تبدیل ہوئی تو اسٹیج پر لڑکیوں کا نیا غول آ کر اپنے بدن سے ایک ایک کر کے کپڑے اتار کر پھینکنے اور بدن کے مختلف حصوں کی جنبشوں کے کمال دکھانے لگا۔ یوسف سعید کی توجہ اسٹیج سے ہٹی تو نگاہیں نزدیک ہی کھڑے ہوئے جلالی پر پڑیں۔ وہ چونک کر کھڑا ہو گیا۔

"ذہین جلالی؟" جلالی نے اثبات میں سر ہلایا تو یوسف سعید نے بہت پرجوش انداز میں آگے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا۔ "آؤ نیچے چلتے ہیں۔" یوسف سعید اپنی خاکی رنگ کی بھاری جیکٹ سمیٹتا ہوا جلالی کا ہاتھ پکڑ کر نیچے اترنے لگا۔ دونوں نیچے آ کر کونے میں پڑی ہوئی ایک میز پر بیٹھ گئے۔ یوسف سعید بہت جوشیلے انداز میں اپنے پاکستانی دوستوں کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ وہ سب پاکستان کی صحافت' سیاست اور ثقافت کے سرکردہ لوگ تھے۔ جلالی کو حیرت ہوئی ایسے دوست رکھنے والا یہاں کیا کر رہا تھا؟ یوسف سعید کے جوش و خروش اور چہرے کی ہر جھری سے وطن سے دوری کا دکھ عیاں تھا۔ اچانک جلالی کو بھی بہت شدت سے پاکستان یاد آنے لگا۔ اسے آئے ہوئے چند ہفتے ہوئے تھے لیکن ایسا لگ رہا تھا جیسے ایک زمانہ ہو گیا ہو۔ دفتر کا شور' گندی سی میز' بدن کو گیلا کر دینے والی گرم ہوا' دھوئیں کا غبار' ٹریفک کا ہجوم' پریس کلب کا لنچ' تاش کی بازی' نواب ٹن کی رزم گاہ' بشیر پان والا' صدیقی صاحب------ سب کچھ یاد آیا تو جلالی کے جوابوں میں بھی جوش اور آنکھوں میں چمک بڑھ گئی۔

"یانوش نے مجھے آپ کا پیغام دیا تو میں سمجھا تھا کسی غیر ملکی جاسوس سے ملنے جا رہا ہوں۔" جلالی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اسے بھی اپنے سوالوں کے جواب چاہئیں تھے۔

"ہو سکتا ہے تم صحیح سمجھے ہو؟" یوسف سعید نے قہقہہ لگایا۔ لیکن پھر سنجیدہ ہو کر کہنے لگا۔ "تمہارے سفارتخانے میں دیواروں کے بھی کان ہیں۔ فیاض منگی مجھے سچ

مجھ بھارتی جاسوس سمجھتا ہے۔ یانوش نے تمہارے بارے میں بتایا تو میں ملنے کے لئے بے تاب ہو گیا۔"

"آپ پاکستانی ہیں۔ اتنے سینئر صحافی رہے ہیں' آپ سفارتخانے کیوں نہیں آتے۔ آپ کو کون روک سکتا ہے۔" جلالی کو واقعی حیرت ہو رہی تھی۔

"بھارتی سفارتخانے کا فرسٹ سیکریٹری میرا دوست ہے۔ وہ بھی سابق صحافی ہے۔ ہم ذوق بھی ہے۔ میرے لئے اس کا وجود بہت غنیمت ہے۔ فیاض منگی کا خیال ہے کہ پرکاش اس علاقے میں بھارت کی خفیہ ایجنسی کا سربراہ ہے اور میں اس کا ایجنٹ ہو گیا ہوں۔"

"کیا وہ واقعی "را" کا ایجنٹ ہے؟"

"پتہ نہیں۔ اور مجھے پرواہ بھی نہیں ہے۔ یہ میرا میدان ہی نہیں ہے۔ وہ اگر ایجنٹ ہے بھی تو اس نے مجھ سے فائدہ اٹھانے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ میرے لئے وہ ایک اچھی شام ہے۔ میں فیض کا حافظ ہوں اور وہ فراز کا عاشق ہے۔ اسے احمد فراز کے اتنے شعر یاد ہیں کہ خود فراز کو بھی نہیں ہوں گے۔" تھوڑی دیر کے لئے خاموشی چھا گئی۔ جلالی اٹھ کر کاؤنٹر سے ڈرنک لے آیا۔ یوسف نے میزبانی کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کی خستگی دیکھ کر جلالی کو یقین ہو گیا تھا کہ اس کی مالی حالت اچھی نہیں ہو گی۔

"منگی نے پاکستان میں بھی میری بھارتی ایجنٹ والی فائل کھلوا دی ہے۔" یوسف نے گھونٹ لے کر کہا۔ "میرا پاسپورٹ تک ضبط کر لیا گیا ہے۔ میں نے تجدید کے لئے بھیجا تھا' اس کے بعد سے آج تک واپس نہیں ملا۔ میرے سفارتخانے جانے پر پابندی ہے۔ میں اپنے دوست سے ملنے بھی نہیں جا سکتا۔"

"یانوش سے؟"

"نہیں یانوش سے نہیں۔ وہ تو میرا اس لئے خیال کرتا ہے کہ اسے سفارتخانے میں ملازمت میں نے دی تھی۔"

"آپ نے؟" جلالی کی حیرتوں میں اضافہ ہو رہا تھا۔

"میں ہنگری میں پاکستان کا پہلا سفیر تھا۔ مجھ سے پہلے یہاں صرف ٹریڈ کمیشن تھا۔ جب دوستوں نے ناراض ہو کر مجھے پاکستان بدر کیا تو سفارتخانہ کھلنے کا فیصلہ ہو گیا تھا۔ وزیراعظم نے مجھے یہاں بھیج دیا۔ حکومت ختم ہوئی تو میں نے نکالے جانے سے پہلے خود استعفیٰ دے دیا۔ اکثر دوست جلاوطن ہو گئے تھے۔ جو پاکستان میں تھے وہ مشکل میں تھے۔ مجھ میں لڑنے کی توانائی نہیں تھی اس لئے میں پاکستان یا لندن جانے کے بجائے یہیں رہ گیا۔"

"تو پھر اب سفارتخانے میں آپ کا دوست کون ہے؟"

"ولایت علی۔"

"سفیر صاحب؟" جلالی کو جانے کیوں حیرت ہوئی۔

"وہ میرا پرانا دوست ہے۔ اس زمانے کا جب ہماری شامیں سندھ کلب میں گزرتی تھیں۔ مرحوم وزیراعظم سے میری دوستی اسی زمانے کی تھی۔ ولایت علی ٹینس میں میرا ڈبل کا پارٹنر تھا۔ وہ موسیقی کا بہت اچھا ذوق رکھتا تھا۔ وزیراعظم اسی لئے اسے پسند کرتے تھے۔ لیکن ولایت علی کی زیادہ دوستی وزیراعظم کے چھوٹے بھائی سے تھی۔"

"سفیر صاحب نے آپ سے اپنی دوستی کیوں نہیں نباہی۔ ان کے ہوتے ہوئے بھی سفارتخانے میں آپ کا داخلہ بند ہے۔" جلالی نے اپنی حیرت پھر ظاہر کی۔

"نہیں ایسا نہیں ہے۔ اس نے میرے لئے بہت کچھ کیا۔ دوستوں کے لئے وہ بہت فراخدل ہے۔ سب سے عزیز دوست کو اس نے اپنی بیوی تک بخش دی تھی۔"

"کیا؟" جلالی کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ لیکن یوسف سعید نے چونکے بغیر اپنا گلاس اٹھا کر منہ سے لگا لیا۔ ماضی اسے تسکین دے رہا تھا۔ آنکھوں میں چمک آ گئی تھی۔ یادوں کی راکھ تلے جو چنگاریاں دبی ہوئی تھیں وہ باہر نکل کر آنکھوں کا میل دھونے لگی تھیں۔

"ولایت علی بہت بڑی سیاسی شخصیت کا بیٹا ہونے کے باوجود سیاست کا آدمی نہیں تھا۔ لیکن جب دوستوں نے اس کے باپ کے نام کا فائدہ اٹھانے کے لئے اسے

قومی اسمبلی کا امیدوار بنانا چاہا تو وہ منع نہیں کر سکا۔ اس کے لئے یہ آسان کام نہیں تھا۔ چھوٹی چھوٹی گندی گلیوں میں ووٹ لینے کے لئے جاتا تو بدبو سے اس کا دماغ پھٹنے لگتا۔ اس کی زندگی یورپ اور امریکہ میں گزری تھی۔ اس نے سچ مچ کا پاکستان نہیں دیکھا تھا۔ انتخابی دوروں پر جاتا تو ناک پر خوشبو بھرا رومال اور پیشانی پر بڑے بڑے بل پڑے ہوتے۔ جلسوں میں اس کے نام کا نعرہ لگاتے ہوئے جوشیلے کارکنوں کا ہجوم اپنی محبت ظاہر کرنے' اسے چھونے اور اس سے ہاتھ ملانے قریب جاتا تو انہیں ہاتھ سے دھکیل کر دور رکھنے کی کوشش کرتا۔ سب کا متفقہ فیصلہ تھا کہ وہ جہاں بھی جاتا ہے ووٹ بنا کر نہیں گنوا کر آتا ہے۔ اس کے بعد اس کی مہم اس کی بیوی اور وزیراعظم کے بھائی نے اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اس کی بیوی کا تعلق بھی اعلیٰ طبقے سے تھا لیکن وہ ایک مہم جو عورت تھی۔ اسے آتشدان کے سامنے بیٹھ کر موسیقی سننے کا شوق نہیں تھا۔ وہ تیز دھنوں پر رقص کرنا چاہتی تھی۔ انتخابات اس کے لئے ایک چیلنج بن گئے۔ ولایت علی گھر بیٹھ گیا اور اس کی جگہ اس کی بیوی انتخابی جلسوں میں تقریریں کرنے لگی۔" یوسف سعید نے خاموش ہو کر ایک اور لمبا گھونٹ لیا۔

"لیکن ولایت علی تو انتخاب ہار گیا تھا۔" جلالی نے ہاتھ کے اشارے سے بیرے کو متوجہ کر کے کہا۔

"ہاں اور انتخاب کے ساتھ اپنی بیوی بھی۔" یوسف سعید نے بیرے کو جو ان کی میز پر آگیا تھا اپنی ڈرنک آرڈر کر کے کہا۔ "اس کے دوست اور اس کی بیوی نے اس کی انتخابی مہم چلانے کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے میں دلچسپیاں بھی تلاش کر لی تھیں۔ ولایت علی کو معلوم ہوا تو اس نے اپنے دوست کو ایک رات خاص طور پر کھانے کے لئے گھر بلایا۔ وائن کی سب سے قیمتی بوتل کھول کر دونوں کا جام صحت تجویز کیا۔ بہت سکون کے ساتھ بیٹھ کر ایک سمفونی سنی اور پھر بیوی کا ہاتھ اپنے دوست کے ہاتھ میں دے کر خود اپنا گھر چھوڑ کر چلا گیا۔"

"لیکن کہاں؟"

"ہانگ کانگ! وہاں اس کے بھائی کا بزنس تھا۔"

"سفیر صاحب کی دوستی آپ کے کام کیوں نہیں آئی؟" جلالی نے اپنا سوال دہرایا۔

"میں اسے مشکل میں ڈالنا نہیں چاہتا۔ شروع میں اس نے بہت مدد کی۔ وہ مجھ سے ترجمے اور ترجمانی کا کام لیتا تھا۔ اچھے پیسے مل جاتے تھے۔ ڈیوٹی فری شاپ کی سہولت بھی حاصل تھی۔ لیکن فیاض منگی نے آکر سب کچھ خراب کر دیا۔"

"منگی کو آپ سے کوئی پرانی دشمنی ہے؟" جلالی نے پوچھا۔

"میں اسے جانتا تک نہیں تھا۔ پاکستان میں اٹھارہ انیس گریڈ کے لوگ میرے لئے کلرکوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے تھے۔ لیکن منگی کو اپنے نئے آقاؤں کو خوش کرنا آتا تھا۔ اس کے سر پر ہر وقت بھارتی جاسوسوں کا بھوت سوار رہتا ہے۔ ولایت علی نے میری مدد بند نہیں کی تو منگی بلیک میلنگ پر اتر آیا۔"

"بلیک میلنگ پر؟" جلالی نے ایک بار پھر حیرت کا اظہار کیا۔

"ولایت علی وائلن بجانے والی ایک مقامی خانہ بدوش لڑکی کے عشق میں گرفتار ہو گیا تھا اور لڑکی کے ماں باپ کو پیسے دے کر اسے اپنے گھر لے آیا تھا۔ لڑکی بالغ نہیں تھی۔ سولہ سال سے بھی کم عمر کی تھی۔ منگی نے ایک رات کسی فوٹو گرافر کو بھیج کر خفیہ طریقے سے ان کی تصویریں کھنچوا لیں۔ یہ تصویریں کسی اخبار میں چھپ جاتیں تو ایک سفارتی اسکینڈل کھڑا ہو جاتا۔ ولایت علی دنیا بھر میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتا۔ سفارت الگ چلی جاتی۔" جلالی بے یقینی کے عالم میں سر ہلانے لگا۔

اسی وقت رقص گاہ کی سیڑھیوں سے اتر کر ایک عورت تیزی سے ان کی میز کی طرف آئی۔ اسے پہچان کر جلالی کو کچھ تعجب ہوا۔ یہ سرخ بالوں والی وہ عورت تھی جو تھوڑی دیر پہلے اوپر سنہرے بالوں والی ایک لڑکی سے چمٹی ہوئی محبتوں کا کمال دکھا رہی تھی۔ اس نے پورے کپڑے پہنے ہوئے تھے اور جلالی کو دیکھے بغیر مقامی زبان میں بہت غصے سے کچھ کہہ رہی تھی۔ یوسف سعید کا انداز بہت مدافعانہ تھا۔ لیکن عورت کا غصہ مسلسل بڑھتا جا رہا تھا۔ یوسف سعید نے جلالی کی طرف اشارہ کر کے کچھ کہا۔

یوسف سعید بھی بہت روانی سے مقامی زبان بول رہا تھا۔ سرخ بالوں والی نے خاموش ہو کر چند لمحوں کے لئے جلالی کو دیکھا اور پھر کچھ کہے بغیر غصے سے واپس سیڑھیوں کی طرف چلی گئی۔ یوسف سعید اسے اس وقت تک دیکھتا رہا جب تک وہ رقص گاہ کے اندر نہیں چلی گئی۔

"آپ کی دوست بہت غصے میں ہے۔ لگتا ہے آپ نے اس کے رقص کے دوران اس کی ران میں نوٹ نہیں پروئے تھے۔" جلالی نے ہنستے ہوئے کہا۔ یوسف سعید نے خاموشی سے گلاس منہ سے لگا لیا اور نظریں جھکا کر بہت دھیمے لہجے میں کہنے لگا۔

"وہ میری بیوی ہے۔" جلالی شرمندہ ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ تھوڑی دیر کے لئے خاموشی چھا گئی۔

"اس نے میری بہت خدمت کی ہے۔" یوسف سعید چہرے سے پشیمانی جھٹک کر کہنے لگا۔ "پچھلے سال مجھے دل کا دورہ پڑا تھا جس کے بعد ڈاکٹروں نے شراب نوشی پر پابندی لگا دی ہے۔ مجھے پیتا ہوا دیکھ کر غصے میں آ گئی تھی۔ کہتی ہے اسے اتنی جلدی بیوہ ہونا پسند نہیں ہے۔" یوسف سعید نے ہونٹوں پر ایک اداس سی مسکراہٹ لا کر جام دوبارہ ہاتھ میں اٹھا لیا۔ "ٹوٹے ہوئے دل کے نام۔" ایک بڑا سا گھونٹ لے کر اس نے گلاس آدھا کر دیا۔

"آپ کو پاکستان کیوں چھوڑنا پڑا تھا؟" جلالی بات بدلنے کے لئے پوچھنے لگا۔

"مجھے وزیراعظم کی پارٹی کے ایک بے وقوف لیڈر کی ذہین اور خوبصورت بیوی سے عشق ہو گیا تھا۔" یوسف سعید کے چہرے کی مسکراہٹ خوشیوں کی قندیل بن گئی۔ اسے پرانے قصے سنانے میں مزا آ رہا تھا۔

"اس کے شوہر نے سفارش کر کے اپنی بیوی کو خود میرے ادارے میں رکھوایا تھا۔ وہ بہت باصلاحیت عورت تھی۔ بے حد رکھ رکھاؤ والی۔ بے حد خوبصورت۔ ہم دونوں بہت جلد ایک دوسرے کے قریب آ گئے تھے۔ ہم نے ایک دوسرے کے لئے اپنی پسندیدگی کسی سے چھپانے کی کبھی کوشش بھی نہیں کی۔ اس کے شوہر میں اتنی

ہمت نہیں ہوئی کہ اپنی بیوی کو منع کر سکے۔ لیکن وزیراعظم سے شکایتیں کر کے ان کی جھڑکیاں کھاتا رہا۔ مجھے پتہ تھا کہ وزیراعظم نے اسے ڈانٹ دیا تھا اس لئے میری خود اعتمادی ضرورت سے زیادہ بڑھ گئی تھی۔ ایک دن نشے میں، میں نے ایسی حرکت کی جو وزیراعظم کو بھی پسند نہیں آئی۔" یوسف سعید کی نگاہوں میں اس شام کا منظر گھومنے لگا۔

چین کے قومی دن کی تقریب تھی۔ یوسف سعید جب چینی سفارتخانے کے استقبالئے میں آیا تو پہلے سے نشے میں تھا۔ وہ یورپی ملکوں کے سفارتکاروں کے ایک گروپ کو چین کی قومی شراب "موتائی" کی خوبیوں پر لیکچر دیتا ہوا سخت کڑوا سیال بڑے تسلسل سے حلق کے نیچے اتار رہا تھا۔ اسی وقت وہ اپنے شوہر کے ساتھ داخل ہوئی۔ وہ دراز قد ہی نہیں تھی جسم کے نشیب و فراز بھی بہت متناسب تھے جنہیں لباس کی تراش خراش نے اور نمایاں کر دیا تھا۔ اس نے آتے ہی سب کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی تھی۔ اس کے شوہر کا قد اس سے دبتا ہوا تھا۔ گنجا سر اور چہرہ بھی ایسا جسے ذہانت سے کوئی واسطہ نہ رہا ہو۔ دونوں سیدھے اسی طرف آئے تھے۔

"ہیلو! کیسے ہو یوسف؟" اس نے بہت مترنم آواز میں کہا۔

"بہت اچھا۔ تم بھی بہت خوبصورت لگ رہی ہو۔ لیکن اپنے بٹلر کو ساتھ لے کر کیوں آئی ہو؟"

یوسف سعید نے بھی جوابی جملہ انگریزی میں کہا تھا۔ آس پاس کھڑے ہوئے مہمان سفارتی آداب سے مجبور تھے اس لئے ہنسی دبا کر رہ گئے۔

"ڈونٹ بی سلی!" اس نے مسکرا کر کہا اور غصے سے سرخ ہوتے ہوئے شوہر کے ساتھ دوسری طرف مڑ گئی۔

وزیراعظم دوسرے دن شہر آئے تو یوسف سعید کی طلبی ہو گئی۔ اسے کئی گھنٹوں تک باہر انتظار کرنا پڑا۔ یہ وزیراعظم کی ناراضی کے اظہار کا سب سے موثر طریقہ تھا۔ یوسف سعید کو جب بلایا گیا تو وزیراعظم کے چہرے پر دوستانہ مسکراہٹ

نہیں تھی۔ لہجہ بھی سخت تھا۔
"میرا مسئلہ یہ نہیں ہے کہ تم کس کی بیوی کے ساتھ سوتے ہو۔ لیکن تم نے غیرملکی سفارتکاروں کے سامنے میری پارٹی کے ایک رہنما کا مذاق اڑا کر میری اور میری پارٹی کی توہین کی ہے۔" یوسف سعید کوئی وضاحت دیئے بغیر استعفیٰ دے کر چلا آیا۔ اس کا استعفیٰ اسی وقت منظور کر لیا گیا تھا۔ بعد میں وزیراعظم نے اس کی خطا معاف کر دی تھی اور سفیر بنا کر ہنگری بھیج دیا تھا۔

"آپ کے عشق کا کیا ہوا؟" جلالی کے سوال نے یوسف سعید کو چونکا دیا۔
"وہ بھی اس قبیلے کی حسینہ تھی جو عشق مجاز سے کرتی ہے لیکن رہتی ڈپٹی کمشنر کے ساتھ ہے۔" یوسف سعید نے ہنستے ہوئے مجاز کا پرانا فقرہ استعمال کیا۔
"آپ کہاں کے مجاز تھے۔ آپ کا تعلق بھی سندھ کلب کے قبیلے سے تھا۔" جلالی نے چوٹ کی۔
"ہاں، لیکن اس نے جس سے شادی کی اس کی حویلی کی چھت زیادہ اونچی اور غسل خانے کے ٹائلز زیادہ چمکدار تھے۔ اس کا مستقبل میری طرح غیر یقینی نہیں تھا۔ کئی حکومتیں آئی گئیں لیکن وہ آج بھی اپنے سر پر بیٹھی ہوئی اقتدار کے ہما کو پکڑے بیٹھا ہے۔"
یوسف سعید نے اوپر جانے والی سیڑھیوں کو دیکھا اور پھر ایک ہی گھونٹ میں گلاس خالی کر دیا۔ جلالی نے سوچا بیرے کو آواز دے لیکن پھر رک گیا۔ اس نے خود ہی بتایا تھا کہ ڈاکٹروں نے اسے شراب پینے سے منع کیا ہے۔ لیکن جلالی کی احتیاط کام نہیں آئی۔ یوسف سعید نے نزدیک سے گزرنے والے بیرے کو روک کر نئے جام لانے کے لئے کہا تھا۔ جلالی کو تشویش ہوئی لیکن وہ خاموش رہا۔
"تم ولایت علی سے مل چکے ہو؟" یوسف سعید نے نیا سگریٹ سلگا کر پوچھا۔
"جی ہاں!" جلالی نے مسکرا کر جواب دیا۔ "صرف ایک بار۔ بہت مشکل سے وقت ملا تھا۔ وہ بہت ناراض تھے کہ میں اب تک ویانا کیوں نہیں گیا۔"

"یہ کب کی بات ہے؟"
"دو ہفتے پہلے کی۔ کیوں؟"
"وہ اب تم سے ویانا جانے کے لئے نہیں کہے گا۔ ویانا کا نام تک نہیں لے گا۔" یوسف سعید نے تجسس پیدا کرتے ہوئے کہا۔
"کیوں؟؟" جلالی کو واقعی سخت حیرت ہوئی تھی۔
"ولایت علی جنسی جنونی نہیں ہے۔ اسے بس موسیقی کا خبط ہے۔ وہ خانہ بدوش لڑکی پر نہیں اس کے وائلن بجانے پر عاشق ہوا تھا۔ اس کے لئے ویانا میں فلیٹ لیا تھا' موسیقی سکھانے والے سب سے بڑے اسکول میں داخلہ دلوایا تھا۔ تمام خرچ خود برداشت کر رہا تھا لیکن پچھلے ہفتے وہ لڑکی بھاگ گئی۔"
"بھاگ گئی؟" جلالی حیرت سے بولا۔
"وہ اپنے عاشق کے ساتھ واپس ہنگری بھاگ آئی ہے۔" یوسف سعید اپنی داستان گوئی کا پورا مزا لے رہا تھا۔ "ولایت جب ویانا میں نہیں ہوتا تھا وہ اپنے ایک ہم قبیلہ نوجوان کے ساتھ رنگ رلیاں مناتی تھی۔ وہ اسے کسی فلم میں کام دلانے کا لالچ دے کر ہنگری لے آیا ہے۔ دونوں مل کر ولایت علی کو بلیک میل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"
"کیا آپ کو یہ سب کچھ سفیر صاحب نے خود بتایا ہے؟" جلالی کو یوسف سعید کی معلومات پر حیرت ہو رہی تھی۔
"نہیں! میں ولایت علی کو فون تک نہیں کرتا۔ مجھے پرکاش نے بتایا تھا۔ وہ بہت باخبر آدمی ہے۔ تم اس سے مل کر بہت خوش ہو گے۔ اسے بھی تم سے ملنے کا اشتیاق ہے۔ میں نے اس سے تمہارا تذکرہ کیا تھا۔ وہ آج کل ماسکو گیا ہوا ہے۔ اگلے ہفتے واپس آئے گا تو ملاقات کا دن طے کر کے تمہیں یانوش کے ذریعے پیغام بھجواؤں گا۔" اسی وقت یوسف سعید کی بیوی سیڑھیوں سے اترتی ہوئی نظر آئی۔ یوسف سعید فوراً" ہی اٹھ کھڑا ہوا۔
"میں اب چلتا ہوں۔ تم سے آئندہ ہفتے پرکاش کے ساتھ ملاقات ہو گی۔"

یوسف سعید اپنی بیوی کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ جلالی دروازے کو گھورتا ہوا سوچنے لگا کیا پرکاش واقعی بھارتی جاسوس ہو گا؟ کیا یوسف سعید سچ مچ اس کا ایجنٹ ہے؟ ملاقات ہو گی تو دیکھے گا۔ جلالی نے سوچا اور وہ بھی اٹھ کر آہستہ قدموں سے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

دوسرے دن دفتر آتے ہی منگی کے پاس طلبی ہوئی تھی۔ جلالی منگی کے دروازے کے باہر جلتے ہوئے سرخ بلب کو دیکھتا ہوا اندر داخل ہوا تو منگی اپنی بڑی سی میز کے پیچھے بیٹھا ہوا کاغذات الٹ پلٹ کر رہا تھا۔ جلالی کے بیٹھنے کے بعد وہ پڑھنے کا چشمہ اتار کر تھوڑی دیر جلالی کو گھورتا رہا۔ جلالی کو لگا جیسے فائرنگ شروع کرنے سے پہلے نشانہ پکا کر رہا ہو۔

"آپ کل یوسف سعید سے ملے تھے؟" منگی نے بالکل صحیح نشانہ لیا تھا۔

"آپ کو کیسے معلوم؟" جلالی کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ اسے واقعی حیرت ہوئی تھی۔ ملاقات کا اہتمام کرنے میں یوسف سعید نے جو احتیاط برتی تھی وہ کام نہیں آئی تھی۔ منگی کے چہرے پر فخریہ مسکراہٹ ابھر آئی۔

"میں رشتوں اور تعلقات کی لفٹ میں سوار ہو کر اس مقام تک نہیں پہنچا ہوں۔" منگی بولا تو مسکراہٹ غائب تھی۔ "میں کسی ہونے والے وزیراعظم کا شرابی دوست نہیں تھا۔ میرا باپ اس ملک کا بڑا آدمی نہیں ایک معمولی کلرک تھا۔ میں صحافی بھی نہیں تھا جس سے حکومت کے بڑوں کی رگ دبتی ہو۔" منگی براہ راست حملہ کرتے ہوئے میز پر آگے جھک آیا۔

"جلالی صاحب! میں ایک ایک سیڑھی چڑھ کر اوپر آیا ہوں۔ پاکستان میں سیڑھیاں چڑھنا آسان نہیں ہے۔ بہت بھیڑ ہوتی ہے، بہت دھکے دینے پڑتے ہیں، بہت زور لگانا پڑتا ہے، تب ایک سے دوسری سیڑھی کا سفر طے ہوتا ہے۔ میں نے یہ سیڑھیاں اپنے زور بازو سے صرف اپنی طاقت استعمال کر کے طے کی ہیں۔ میرے سر کے چاروں طرف آنکھیں ہی آنکھیں ہیں۔ یہی آنکھیں میری طاقت ہیں۔ میری یہ

آنکھیں ۲۴ گھنٹے کھلی رہتی ہیں۔"
"یوسف سعید پاکستان کے بہت سینئر صحافی رہے ہیں۔ وہ میرے لئے بہت محترم ہیں۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ یہاں ہیں۔ کل آنا بار میں اتفاقاً" ملاقات ہو گئی تھی۔" جلالی نے منگی کو مزید ڈینگیں مارنے کا موقع دیئے بغیر وضاحت پیش کر دی۔
"میں اتفاقات پر یقین نہیں رکھتا۔ اور یوسف سعید نہ تو اب صحافی ہے اور نہ سفیر۔ وہ احترام کے قابل بھی نہیں ہے۔ وہ صرف ایک خودغرض آدمی ہے۔ اس کی بیوی اسے پالنے کے لئے کلبوں میں ننگی ہو کر ناچتی ہے۔ ایک بوتل شراب کے لئے وہ بھارتی جاسوس کے تلوے چاٹتا ہے۔ وہ ایک بری خبر ہے۔ بے حد بری خبر!" منگی کے لہجے میں بہت تحقیر تھی۔ جلالی نے سوچا بحث کرنا بیکار ہے۔ یوسف سعید کی پچ پر کھیلنا آسان بھی نہیں تھا۔ ہر گیند سیدھی وکٹوں پر آ رہی تھی۔
"اس نے آپ کو پرکاش کے پاس لے جانے کی کوشش کی ہو گی۔" منگی نے تھوڑی دیر توقف کرنے کے بعد کہا۔ اس بار اس نے پھر صحیح نشانہ لیا تھا۔
"پرکاش؟ کون پرکاش؟؟" جلالی نے انجان بن کر سوال کیا۔ اسے ایک بار پھر حیرت ہوئی تھی۔
"بھارتی سفارتخانے کا فرسٹ سیکریٹری۔ آپ کی زمین اس کے لئے بہت زرخیز ہے۔ وہ صحافت' شاعری اور شراب کا جال پھیلا کر شکار پھانستا ہے۔ یوسف سعید آپ کو اس سے ملوانے کی کوشش کرے تو آپ منع کر دیجئے گا اور مجھے بتایئے گا۔" منگی نے اٹھتے ہوئے کہا۔ جلالی بھی جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ لیکن اس کے قدم اٹھانے سے پہلے منگی نے اس کی طرف کاغذ کا ایک ٹکڑا بڑھا دیا۔ اس پر کسی کا فون نمبر لکھا تھا۔ جلالی منگی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔
"آپ کی صحافی دوست الزبتھ آپ کے لئے دو تین بار فون کر چکی ہے۔ یہ اس کا نمبر ہے۔"
"آپ کو کیسے معلوم کہ وہ صحافی ہے؟" جلالی نے حیران ہو کر پوچھا۔
"آپ جن لوگوں سے تعلقات رکھیں گے ان کے بارے میں معلومات حاصل

کرنا میری ذمہ داری ہے۔" منگی کا جواب سن کر جلالی کا خون کھولنے لگا۔ اس نے پوری کوشش کی تھی کہ منگی سے الجھنے کی کوشش نہ کرے۔ لیکن وہ ناقابل برداشت ہوتا جا رہا تھا۔

"آپ حد سے بڑھ رہے ہیں۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ مجھے اپنے نجی معاملات میں کسی کی مداخلت پسند نہیں ہے۔" جلالی غصے میں بس یہی کہہ سکا۔

"میں بھی آپ کو بتا چکا ہوں کہ آپ کے نجی معاملات کی کچھ حدود متعین ہیں۔ اپنی نجی زندگی کا بستر آپ پاکستان میں چھوڑ آئے ہیں۔ مجھے آپ کے سلسلے میں خصوصی ہدایات ملی ہیں۔ آپ کو پتہ ہے آپ سینے میں ایک ٹائم بم لئے گھوم رہے ہیں۔ ہمیں اسے پھٹنے سے روکنا ہے۔ مجھے امید ہے آپ نے یوسف سعید کے سامنے اپنی زبان بند رکھی ہو گی۔" منگی کھل کر سامنے آ گیا تھا۔ اس کی وفاداریاں بھی اقتدار مافیا کے ساتھ تھیں۔ جلالی کچھ کہے بغیر پاؤں پٹختا ہوا اس کے کمرے سے باہر نکل آیا۔

جلالی کو غصے پر قابو پانے میں کافی وقت لگا۔ ٹھنڈے پانی کے دو گلاس اور ایک گرم کافی پینے کے بعد اعصاب بحال ہوئے تو اس نے الزبتھ کا فون نمبر گھمایا۔ یہ اس کے دفتر کا نمبر تھا۔ جلالی کی آواز سنتے ہی وہ ابتدائی رسمیات کا تبادلہ کئے بغیر بہت پرجوش ہو کر بتانے لگی۔

"میں نے ایڈیٹر کو تمہارے انٹرویو کے لئے تیار کر لیا ہے۔ یہ رسمی انٹرویو نہیں ہو گا۔ ایک مکمل فیچر ہو گا جس میں......"

"میرا انٹرویو؟" جلالی نے بات کاٹتے ہوئے تعجب ظاہر کیا۔ "انٹرویو میرے سفیر کا کیجئے یا کسی اور افسر کا! میں تو......"

"ہمیں سرکاری انٹرویو نہیں چاہئے۔" الزبتھ نے اس کی بات کاٹ دی۔ "سرکاری حیثیت میں بھی نہیں چاہئے۔ تمہارے ذریعے ہم پاکستان کا صحافتی اور تہذیبی چہرہ دکھائیں گے۔ تمہارے وہ شاعر جو ٹرین کے نیچے آ کر کٹ گئے' ان سے جوزف اٹیلا کا موازنہ کریں گے۔ ہم تمہاری سفارتی حیثیت کو مشکل میں نہیں ڈالیں گے۔ تم شام کو ملو تو پھر تفصیل سے بتاؤں گی۔"

"کہاں؟" جلالی نے پوچھا۔

"کیفے ہنگیریا میں۔ تم نے اوکٹے چوک دیکھا ہو گا۔ وہیں شاہراہ عظیم کے کونے پر دن رات کھلی رہنے والی سپرمارکیٹ ہے' اس کے برابر ہنگیریا ہے۔ تمہیں آسانی سے مل جائے گا۔ شام کو پانچ بجے میں تمہارا انتظار کروں گی۔"

جلالی کو کیفے ہنگیریا آسانی سے نہیں ملا۔ بلکہ ملا ہی نہیں۔ وہ بتائے ہوئے پتے پر پہنچا۔ ایک ریسٹورنٹ تھا لیکن اس پر کیفے نیویارک کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ جلالی کیفے کے سامنے کھڑا یہ معمہ حل کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اسے دیکھ کر الزبتھ باہر نکل آئی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے گئی۔ کیفے کی عمارت اندر سے بہت شاندار تھی۔ لگتا تھا کسی محل کا استقبالیہ ہے۔ ستونوں پر کھڑی ہوئی اونچی چھتوں سے بڑے بڑے سنہرے فانوس لٹکے ہوئے تھے۔ اوپر گیلری تھی۔ دونوں طرف قالین سے ڈھکی ہوئی کشادہ سیڑھیاں تھیں۔ سیڑھیوں کے ساتھ دیواروں پر فریم کئے ہوئے پورٹریٹ ٹنگے ہوئے تھے۔

"میں نے تمہیں اس جگہ کا پرانا نام بلکہ پرانا ہو جانے والا نیا نام بتا دیا تھا۔" الزبتھ اپنی طرف حیرت سے دیکھتے ہوئے جلالی کو وضاحت دینے لگی۔ "اس جگہ کا پرانا نام کیفے نیویارک ہی تھا۔ یہ انقلابی ادیبوں اور دانشوروں کا اڈہ تھا۔ انقلاب آگیا تو چند سال بعد اس کا نام ہنگیریا ہو گیا۔ اب سرمایہ دارانہ دور واپس آگیا ہے تو اس کیفے کو بھی اس کا امریکی نام واپس مل گیا ہے۔ میں ان لوگوں میں شامل ہوں جو اسے آج بھی ہنگیریا کہنے پر اصرار کرتے ہیں۔ وہ جو تصویریں لٹکی دیکھ رہے ہو وہ اس صدی کے ان بڑے ادیبوں اور شاعروں کی ہیں جو یہاں بیٹھ کر انقلاب کے خواب دیکھا کرتے تھے۔"

"تمہاری تصویر کے لئے جگہ کہاں ہے؟" جلالی نے مسکرا کر کہا۔ الزبتھ بھی ہنسنے لگی۔

"میں انقلابی نہیں ہوں۔ میں یہاں دانشوری کا مظاہرہ کرنے بھی نہیں آتی۔ اس عمارت کی چوتھی منزل پر میرا دفتر ہے۔ ماحول بدلنے کے لئے یا کبھی دوستوں کے

ساتھ یہاں آ بیٹھتی تھی۔ اب تو عادت ہو گئی ہے۔ میرا ایڈیٹر بھی تم سے ملنا چاہتا ہے۔ وہ آ جائے تو ہم تمہارے انٹرویو کی تفصیلات طے کریں گے۔"

انٹرویو کی تفصیلات طے کرنے اور اس کے بعد انٹرویو کرنے کا سلسلہ کئی دن تک چلتا رہا۔ اس عرصے میں جلالی اور الزبتھ ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے۔ وہ ہر شام ہنگیریا میں ملتے۔ پاکستان کا چہرہ دکھاتے دکھاتے جلالی کی اپنی زندگی کے گوشے بھی بے نقاب ہو رہے تھے۔ اس کی زندگی کے اتار چڑھاؤ نے الزبتھ کی آنکھوں میں حیرت کدے تعمیر کر دیئے تھے۔ کیا زندگی اتنے دکھ بھی دے سکتی ہے؟ الزبتھ کے پاس خود اس کے اپنے دکھ نہیں تھے۔ وہ دوسروں کے دکھ دیکھ دیکھ کر دکھی ہوتی تو لگتا دماغ میں ناسور ہو گئے ہیں۔ اس کی ماں پہلی عورت تھی جو ہنگری کی انقلابی کابینہ میں وزیر بنی تھی۔ اس کا باپ پیٹرولیم کمیشن کا چیئرمین ہو کر ریٹائر ہوا تھا اور اب بھی حکومت کبھی کبھی مشاورت کے لئے بلا لیتی تھی۔ خود الزبتھ کی اپنی صحافیانہ زندگی بھی کامیاب تھی۔ بچپن، جوانی سب کچھ اچھا گزرا تھا۔ بس کبھی کبھی نظریاتی قلابازیاں دماغ کو غیر متوازن کر دیتیں۔ پیٹر سے تعلق کی ڈور بھی مضبوط تھی۔ پھر بھی ایک عجیب بے کلی تھی۔ دماغ میں اچانک اندھیرے چھا جاتے۔ رونے کو بھی دل نہیں چاہتا۔ آنکھیں بالکل خشک ہو جاتیں۔ لیکن جب جلالی نے اپنی ماں کے مرنے کا قصہ سنایا تو جانے کیوں رو پڑی۔ جلالی نے اسے بہت حیرت سے دیکھا تھا۔ اپنی ماں کی موت پر اتنے آنسو تو خود اس نے بھی نہیں بہائے تھے۔

انٹرویو کے سیشن ختم ہو گئے تو الزبتھ بہت خاموش ہو گئی۔ اتوار کے دن فوٹو گرافر کو لے کر آئی تھی۔ تصویریں اتارتے ہوئے وہ پورے بڈاپسٹ میں چکرائے۔ فوٹو گرافر کو جلالی کی تصویر کھینچنے کے لئے اچھے پس منظر کی تلاش تھی۔ اس تلاش کے دوران باتیں کرتے ہوئے اس کی زبان تھکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ لیکن الزبتھ خاموش تھی۔ جلالی ڈرنے لگا کہ کہیں دورے کی کیفیت واپس نہ آ گئی ہو۔ اس نے اس کا اظہار بھی کر دیا۔

"تم شاعری مت شروع کرنا۔ میرا انٹرویو بیچ میں رہ جائے گا۔" الزبتھ ہنس

پڑی۔ جلالی کو لگا جیسے برف پگھل گئی ہو۔
انٹرویو چھپا تو سب حیرت زدہ رہ گئے۔ انٹرویو اندر کے پورے دو صفحات پر پھیلا ہوا تھا۔ بہت سی تصویریں چھپی تھیں۔ جلالی نے پاکستان کی بہت اچھی تصویریں منگوا کر دی تھیں۔ خود جلالی کی بڑی سی تصویر چھپی تھی' وہ بھی بہت اچھی آئی تھی۔ سفارتخانے میں سب نے دل کھول کر مبارکباد دی۔ سفیر صاحب نے بلا کر اپنے ہاتھوں سے کافی بنا کر پلائی۔ یوسف سعید نے غلط نہیں کہا تھا۔ سفیر نے ایک بار بھی ویانا جانے کے بارے میں نہیں پوچھا۔ منگی بھی اپنے کمرے سے باہر نکل آیا اور جلالی کو مبارکباد دیتا ہوا اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے کمرے میں لے گیا۔
"آپ نے کمال کر دیا۔ میں بہت خوش ہوں۔ پرکاش آج کانٹوں پر لوٹے گا۔ زندہ باد۔"
"شکریہ!" جلالی صرف یہی کہہ سکا۔ لیکن وہ انتظار کر رہا تھا کہ منگی کب پینترا بدلے گا۔
"یہ آپ کی دوست کا کارنامہ ہے۔ مجھے بتایئے ہم اس کے لئے کیا کر سکتے ہیں۔ میرے پاس فنڈز ہیں۔ آپ کہیں تو اسے....."
"وہ پیسے لے کر انٹرویو چھاپنے والی صحافی نہیں ہے۔" جلالی نے بات کاٹتے ہوئے غصے سے کہا۔
"ہم اسے رشوت نہیں دے رہے۔ آپ پاکستان پر جو کتابچہ تیار کر رہے ہیں آپ کی دوست ہنگیرین زبان میں اس کا خوبصورت ترجمہ کر سکتی ہے۔"
"لیکن یانوش......"
"یانوش صرف مکھی پر مکھی بٹھا سکتا ہے۔ وہ پیشہ ور صحافی یا ادیب نہیں ہے۔ آپ الزبتھ کو دو ہزار ڈالر ایڈوانس دیجئے' وہ تیار ہو جائے گی۔ کام ختم ہونے پر دو ہزار ڈالر مزید۔" منگی نے جلالی کی طرف ایک لفافہ بڑھایا۔ اس نے سب کچھ پہلے ہی سے طے کیا ہوا تھا۔ جلالی نے ہچکچاتے ہوئے چیک لیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔
"یوسف سعید نے پھر آپ سے رابطہ کیا؟"

"نہیں!"

"وہ ضرور آپ کو پرکاش سے ملوانے کی کوشش کرے گا۔ خاص طور پر آپ کا انٹرویو چھپنے کے بعد۔ میری بات لکھ لیجئے۔"

"دیکھا جائے گا۔" جلالی نے لاپرواہی سے کندھے اچکائے اور باہر کے دروازے کی طرف مڑنے لگا۔

"دیکھا نہیں جائے گا۔ یوسف سعید کی طرف سے رابطہ قائم ہوتے ہی آپ مجھے بتائیں گے۔" جلالی ٹھٹک کر کچھ دیر اسی طرح کھڑا رہا لیکن پھر خاموشی سے باہر نکل گیا۔ بحث کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

جلالی الزبتھ سے ملنے کی امید میں ہر شام کیفے نیویارک جانے لگا تھا۔ اسے کیفے نیویارک کی عادت سی ہو گئی تھی۔ وہ میز پر اکیلا بیٹھا چائے کی چسکیاں لیتا' سگریٹ کے چھلے بنا کر ہوا میں اڑاتا یا میزوں کے درمیان گردش کرتی ہوئی ویٹرس کی مسکراہٹ پر قربان ہونے لگتا جس کے جسم پر اولمپک کے نشان کی طرح آگے پیچھے دائرے ہی دائرے تھے۔ بالکل گول' یکساں اور ایک دوسرے سے ٹکراتے ہوئے' اس کے پاس سے گزر کر جاتی تو جلالی کو بہت پہلے پڑھی ہوئی کسی کتاب کی مثال یاد آ جاتی۔ جیسے دو تربوز ایک دوسرے سے لڑتے ہوئے چلے جا رہے ہوں۔

سفارتخانے سے کیفے نیویارک تک کا فاصلہ کم نہیں تھا۔ لیکن جلالی کو پیدل جانا پسند تھا۔ حسن کا سیلاب اس کے ساتھ چلتا۔ اس کے پورے جسم میں خوشبوئیں بھر جاتیں۔ روح تک جھوم اٹھتی۔ روشنیاں آنکھوں کے راستے اتر کر بدن کے تاریک گوشوں میں اجالا کر دیتیں۔ ہوا کے سرد جھونکوں سے کپکپی محسوس ہونے لگتی تو ایک دوسرے میں مدغم اور بوس و کنار کرتا ہوا کوئی جوڑا گرم گرم سانسیں چھوڑ کر گزر جاتا اور جلالی کا سکڑا ہوا جسم کسی گرم غبارے کی طرح پھیل کر فضا میں اٹھنے لگتا۔ ہونٹوں پر خود بخود مسکراہٹ آ جاتی۔ وہ ادھر ادھر دیکھتا کہ کوئی اسے اپنے آپ ہنستا اور مسکراتا دیکھ کر دیوانہ تو نہیں سمجھ رہا۔ لیکن وہاں تو ہر طرف مسکراہٹوں کا میلہ

لگا تھا۔ ہر شخص جانے کیوں خوش ہونے کی دیوانگی میں مبتلا تھا۔ گلیوں کے چھوٹے رستے ڈھونڈنے کے بجائے وہ واشی اسٹریٹ پر آہستہ آہستہ چلتا اور پھر آنسوریا اور ایمکے کے چوراہوں کو عبور کر کے کیفے نیویارک کے لئے بائیں ہاتھ کو مڑ جاتا۔

واشی اسٹریٹ پر آنا بار کا دروازہ آتا تو اس کے قدم بخود بخود ست ہو جاتے۔ اس نے کئی بار سوچا جھانک کر دیکھے۔ شاید یوسف سعید اور اس کی بیوی نظر آ جائیں۔ لیکن اس نے کبھی اپنے ارادے پر عمل نہیں کیا۔ ایک روز یانوش نے اسے پہلے کی طرح یوسف سعید کا پیغام دیا تھا۔ "آنا بار۔ چھ بجے شام۔" مقررہ وقت پر وہ آنا بار کے دروازے پر پہنچ بھی گیا تھا۔ لیکن پھر کچھ سوچ کر تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ اسے یوسف سعید' پر کاش اور منگی کی تکون میں الجھ کر نئی پیچیدگیوں کا شکار نہیں ہونا تھا۔ اسے جلد از جلد پاکستان واپس جانا تھا۔ پاکستانی اخبارات میں چھپنے والی خبروں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اقتدار مافیا عامر نذیر پر آخری ضرب لگانے ہی والا ہے۔ جلالی کی جلاوطنی بھی عامر نذیر کی حکومت کے ساتھ ہی ختم ہو سکتی تھی۔

جس روز جلالی کو آنا بار میں یوسف سعید سے ملنا تھا اس کے دو روز بعد جلالی بہت کپکپاتا ہوا کیفے نیویارک پہنچا۔ یانوش نے بتایا تھا چند دنوں میں برف باری شروع ہونے والی ہے۔ جلالی ایک خالی کرسی پر اپنا اوورکوٹ' مفلر اور اونی دستانے رکھ کر واش روم کی طرف چلا گیا۔ وہاں سے نکل کر آیا تو اپنی میز کے گرد ایک کرسی پر کسی کو بیٹھے دیکھ کر حیرت زدہ ہوگیا۔ میز ذرا فاصلے پر تھی اور کرسی کی پشت جلالی کی طرف۔ وہ الزبتھ تو نہیں ہو سکتی تھی۔ عورت تھی لیکن پیچھے سے پہچاننا مشکل تھا کہ کون ہے۔ اس نے اوورکوٹ نہیں اتارا تھا۔ بالوں پر بھی نیلے رنگ کی اون کی بنی ہوئی ٹوپی منڈھی ہوئی تھی۔ ٹوپی سے نکل کر شانوں تک لٹکے ہوئے بالوں کی سرخی دور سے نظر آ رہی تھی۔ جلالی میز کے پاس آ کر اس کے سامنے پہنچا تو دیکھ کر اس کی حیرت اور بڑھ گئی۔ وہ یوسف سعید کی بیوی تھی۔ سرخ بالوں والی وہ عورت جو آنابار کی رقص گاہ میں اپنے جسم کا کمال دکھاتی تھی۔ جلالی کے آتے ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں کلارا سعید ہوں۔ تمہارے دوست یوسف سعید کی بیوی۔" اس نے اپنا

تعارف کرایا۔ وہ اسی سے ملنے آئی تھی۔

''آپ کیا پئیں گی؟'' جلالی نے ویٹرس کو قریب آتے دیکھ کر پوچھا۔

''کافی۔ بلیک' اسٹرانگ اینڈ ہاٹ۔'' جلالی نے اپنے لئے بھی کافی منگوائی۔ جلالی پر مسکراہٹیں نچھاور کرنے والی یہ ویٹرس بڑی مستعدی سے اس کا آرڈر وصول کیا کرتی تھی۔ لیکن اس وقت اس نے بے اعتنائی کا مظاہرہ کیا تھا۔

''تم یوسف کو کیوں مارنا چاہتے ہو؟'' کلارا نے فوراً'' حملہ کیا۔

''میں؟..... میں نے کیا کیا؟؟''

''تم وعدے کے مطابق بدھ کے روز اس سے ملنے کیوں نہیں آئے تھے؟''

''میں..... میں نے کب وعدہ کیا تھا؟ میں تو......''

''وہ آٹھ بجے تک تمہارا انتظار کرتا رہا اور غصے میں کھولتا رہا۔ وہ غصے میں بہت چڑچڑا ہو جاتا ہے۔ شراب نہ پئے تو ناقابل برداشت ہونے لگتا ہے۔ میں منع نہیں کر سکی اور وہ بارہ بجے تک جب تک میری ڈیوٹی ختم نہیں ہوئی پیتا رہا۔ اسی طرح پیتے پیتے ایک دن وہ مرجائے گا۔''

''مجھے صرف پیغام ملا تھا۔ میں نے وعدہ نہیں کیا تھا۔ وہ میری مصروفیت کا دن تھا۔ اس لئے نہیں آ سکا۔ مجھے افسوس ہے۔''

''اس نے دوسرے دن بھی تمہارا انتظار کیا۔ اس روز بھی بارہ بجے تک......''
وہ بھاپ اڑاتی اس کافی کا گھونٹ لینے لگی جو ویٹرس میز پر پٹخ کر گئی تھی۔

''آج میری چھٹی ہے۔'' اس بار اس کے لہجے میں ہلکی سی نرمی آ گئی۔ شاید گرم کافی کا اثر تھا۔ ''یوسف نے مجھے' تمہیں دیکھنے کے لئے بھیجا ہے۔ اس نے بتایا تھا تم شام کو یہیں ملتے ہو۔'' جلالی حیران ہو رہا تھا کہ یوسف سعید کو کیسے معلوم تھا۔ کلارا کافی کا آخری گھونٹ لے کر کھڑی ہو گئی۔

''میں اسے فون کر کے بتاتی ہوں۔ اسے یہاں پہنچنے میں آدھا گھنٹہ لگے گا۔ تمہیں جانے کی جلدی تو نہیں ہے؟''

''نہیں، لیکن......''

وہ فون کر کے واپس آئی تو بیٹھنے سے پہلے اس نے اپنا اوورکوٹ اور دستانے اتار کر ساتھ والی کرسی پر رکھ دیئے اور بالوں کو ٹوپی سے آزاد کر کے سر کو جھٹکتی ہوئی اپنے گھنگھریالے سرخ بالوں کو ہوا دینے لگی۔ بالوں کی سرخی اس کے رخساروں پر شعلوں کی طرح لو دے رہی تھی۔ اوورکوٹ کے نیچے اس نے اونچے گلے کا موٹا اونی سویٹر پہنا ہوا تھا۔ لیکن جلالی کی آنکھوں میں آنابار کے اسٹیج پر لہراتا ہوا اس کا ننگا بدن جھماکے کرنے لگا۔ جلالی نے جلدی سے سر کو جھٹکا دیا اور اسے کپڑے پہنانے لگا۔ بولنے کے لئے کلارا کے ہونٹ کھلے تو کپڑے ایک بار پھر اتر گئے۔ ہونٹوں کی جنبش کچھ ایسی تھی جیسے کسی نے بدن کی زپ کھول دی ہو۔ جلالی نظریں چرا کر ایک اور کافی منگوانے کے لئے ویٹر کو تلاش کرنے لگا۔

''تم بہت دقیانوسی ہو؟ روایت پسند ہو یا محض شرمیلے؟''

''میں؟ کیوں؟......'' جلالی نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ ادھ کھلے ہونٹ ایک بار پھر اسٹیج شو دیکھانے لگے۔ ''یا خدا!'' جلالی کے ذہن میں نعرہً گونجا۔ اسی وقت ویٹرس ان کے قریب سے گزری۔ جلالی اسے متوجہ کر کے اپنی توجہ بھٹکانے لگا۔ ویٹرس نے بہت بے دلی سے آرڈر لیا تھا۔ جلالی سوچنے لگا آخر آج اس ویٹرس کو کیا ہو گیا ہے۔

''یوسف بتا رہا تھا ڈپلومیٹ کی تنخواہ اچھی ہوتی ہے۔ تم کنجوس بھی نہیں لگتے۔ میں یقین سے کہہ سکتی ہوں ''گے'' بھی نہیں ہو۔ پھر آخر کیوں......؟''

''کیوں کیا؟''

''تم اکیلے نظر آ رہے ہو۔ اس روز آنابار میں بھی اکیلے آئے تھے۔'' کیوں کا دائرہ بنے ہوئے ہونٹ پھیل کر اپنی جگہ چلے گئے تو جلالی سینے میں دبی ہوئی سانس آزاد ہو گئی۔

''میں بہت کم عرصے کے لئے آیا ہوں۔ جلد واپس چلا جاؤں گا۔ میرے پاس رشتے قائم کرنے کا وقت نہیں ہے؟''

''ہشت! تم سے شادی کرنے کے لئے کون کہہ رہا ہے؟''

''مجھے کوٹھے پر جانا بھی پسند نہیں ہے۔''

"بیوقوف! میں آنابار کی پبلسٹی نہیں کر رہی۔ وہاں جانا بھی نہیں۔ وہ تمہاری کھال کھینچ لیں گے۔ تمہارا کیا خیال ہے میں یوسف کو آنا بار سے ملی تھی؟"

"پھر؟"

"میں اور یوسف ایک شراب خانے میں غم غلط کرتے ہوئے ایک دوسرے کو ملے تھے۔ میں نے جس کی خاطر اپنی دس سالہ شادی ختم کی تھی وہ چھ مہینے میں بھاگ کر کسی اور کے دروازے پر منہ مارنے لگا۔ مجھے سر رکھنے کے لئے ایک شانے کی اور یوسف کو ایک چھت کی ضرورت تھی۔ دو دن کے اندر اندر ہم ایک ہو گئے تھے۔" وہ خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگی۔ سوچوں کے بھنور سے باہر نکلی تو گفتگو کا سلسلہ پھر جلالی کی تنہائی سے جڑ گیا۔

"اتنی اچھی شامیں تم خالی کیسے گزار سکتے ہو' راتیں تمہارے کانوں میں کوئی سرگوشی نہیں کرتیں؟ کسی کا نازک لمس' کوئی حسین ہاتھ' کوئی خوبصورت دوست' کوئی خواہش نہیں جاگتی؟" سوالوں کے دائرے بناتے ہوئے ہونٹ ایک بار پھر قیامت مچانے لگے۔

"میرے شانے کو کسی کے سر نے توجہ کے قابل نہیں سمجھا۔" جلالی نے ہنستے ہوئے کہا۔

"بکواس! تم یوسف سعید نہیں ہو۔ تمہارے پاس دینے کے لئے بہت کچھ ہے۔ تمہاری توجہ کے لئے کتنی بانہیں تڑپ رہی ہوں گی۔ تم پہلے کہاں تھے؟" کلارا نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ جلالی بھی جھینپے انداز میں ہنسنے لگا۔ دونوں کو ہنستا دیکھ کر قریب سے گزرتی ہوئی ویٹرس کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

"یہ لڑکی کیسی ہے؟" کلارا سنجیدہ ہوتے ہوئے کہنے لگی۔

"کون سی؟"

"یہ ویٹرس جو ہمیں سرو کر رہی ہے۔"

"اچھی ہے!"

"اچھی ہے؟" کلارا غصے سے چیخی اور جلالی اسے حیرت سے دیکھنے لگا۔ وہ اس

کی بے حجابانہ گفتگو سے پہلے ہی خوفزدہ تھا' اب اور ڈر گیا۔ کلارا کی زبان بھی برہنگی کی عادی تھی۔

"آنا بار میں اس جیسی ایک نہ ہو گی۔ یہاں ایک ہفتے میں جتنے پیسے کماتی ہے آنابار میں ایک گھنٹے میں کما سکتی ہے۔" اسی وقت وہ ویٹرس ان کے لئے کافی لے آئی۔ اس نے اس بار بھی کافی کی پیالیاں میز پر اتنے زور سے رکھیں کہ کافی چھلک کر طشتریوں میں گر گئی۔ جلالی نے اس بار اسے اور غور سے دیکھا۔ کلارا نے غلط نہیں کہا تھا۔ وہ واقعی خوبصورت تھی۔ صوفیہ لورین کی طرح بڑا سا دہانہ۔ جینا لولو بر جیڈا جیسے بھرے بھرے ابھرے ہوئے ہونٹ۔ بدن کے نشیب و فراز میریلین منرو کا مقابلہ کر رہے تھے۔ ایک دوسرے سے لڑتے ہوئے تربوزوں کی طرح۔ شاید گرمیوں کا پورا موسم اس نے ساحل پر گزارا تھا۔ اس لئے جلد پر ابھی تک تانبا چڑھا ہوا تھا۔ بالوں کی رنگت زیادہ قیمتی دھات کی تھی۔ سونے جیسی چمکدار۔ سب کچھ اٹلی' فرانس اور امریکہ کا تھا لیکن مسکراہٹ مادھوری ڈکشٹ جیسی تھی۔ بہت اداس سی' معصومیت بھری۔ جلالی کو کسی پاکستانی اداکارہ کا نام یاد نہیں آیا۔ یاد آتا بھی تو موازنہ مشکل تھا۔ اس کے جسم پر ایک اونس گوشت زائد نہیں تھا۔ جلالی ویٹرس کی حمایت پر آمادہ ہو گیا۔

"وہ شریف لڑکی لگتی ہے۔ آنابار میں تو......"

"طوائفیں کام کرتی ہیں---- کیوں؟"

"نہیں..... میرا مطلب ہے....."

"میں جسم دکھاتی ہوں جسم بیچتی نہیں۔" کلارا جلالی کی بات کاٹ کر غرائی۔

جلالی سوچنے لگا وہ خواہ مخواہ اس عورت سے ڈر رہا ہے۔ وہ بھی اپنے مورچے پر ڈٹ گیا۔

"برا مت مانئے۔ کپڑے اتار کر ناچنا سماجی طور پر اچھا فعل نہیں ہے۔"

"کس سماج میں؟ تمہارے منافقوں کے سماج میں؟"

"نہیں کسی بھی سماج میں۔" جلالی نے اس کا طنز پیتے ہوئے کہا۔

''اس میں بری کیا بات ہے؟''

''کوئی بری بات نہیں؟''

''یہ بتاؤ میرے ہونٹوں کو دیکھ کر تمہارے جسم میں سنسنی سی نہیں دوڑ جاتی؟''
کلارا نے میز پر آگے کی طرف جھک کر کہا اور جلالی کو لگا جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو۔ وہ آنکھیں چرانے لگا۔ کلارا اس کے چہرے پر آنکھیں جمائے اسی طرح غصے کے سرخ پھول برساتی رہی۔

''ہونٹوں کو ننگا رکھنے کی آزادی کیوں ہے؟ پیار سب سے پہلے ہونٹوں ہی سے شروع ہوتا ہے۔ جنسی عمل میں سب سے زیادہ ہونٹ استعمال ہوتے ہیں۔ ہونٹوں کو کپڑے کیوں نہیں پہناتے۔ انہیں رنگین کر کے نمایاں کرنا فیشن ہے تو جسم کے دوسرے حصوں کا کیا قصور ہے؟''

''کمال ہے! عجیب منطق ہے۔ ہونٹ بنیادی طور پر کھانے پینے اور بولنے کے کام آتے ہیں۔ انہیں کوئی کیسے باندھ کر رکھ سکتا ہے!''

''جیسے ان اعضاء کو جو دودھ پلانے اور موتنے کے کام آتے ہیں۔''

جلالی کو ہنسی آ گئی۔

''کیا آپ اس وقت یہاں اس ہوٹل میں کپڑے اتار سکتی ہیں؟''

''کیوں نہیں؟'' کلارا نے اپنے کپڑوں کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

''ارے نہیں۔ نہیں۔'' جلالی نے اسے روکنے کے لئے ایک دم اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ کلارا تھوڑی دیر اسی طرح چیلنج کرنے والے انداز میں جلالی کو دیکھتی رہی۔ لیکن پھر اس نے اپنے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔

''ڈر گئے!'' وہ بے ساختہ ہنسنے لگی۔ ''سماج کا خوف؟''

''نہیں! سردی کا ڈر ہے۔ تمہیں نمونیہ ہو جائے گا۔'' جلالی نے کہا اور کلارا کے ساتھ خود بھی ہنسنے لگا۔

''لاؤ ایک سگریٹ پلاؤ۔'' کلارا نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ جلالی اس کا سگریٹ سلگانے لگا۔

"میں کبھی کبھی یوسف کو جلانے کے لئے اس سے بھی ایسی ہی بحث کیا کرتی ہوں۔ تم برا مت ماننا۔" وہ سنجیدہ ہو گئی۔ "معاشرہ کوئی بھی ہو' پیسوں کے لئے ننگی ہونے والی عورت بری عورت ہے۔ بحث اس لئے کرتی ہوں کہ اخلاق کا درس دینے والے ننگا بدن دیکھتے ہی کتے بن جاتے ہیں۔ میں تو صرف کپڑے اتارتی ہوں' رال ٹپکاتے ہوئے گندے سور اپنی نظروں سے میرے بدن کی کھال تک اتار لیتے ہیں۔ جب تک اسٹیج پر رہتی ہوں مجھے لگتا ہے قصائی کی دکان پر لٹکی ہوئی ہوں۔"

"یہ کام چھوڑ کیوں نہیں دیتیں؟ کوئی باعزت کام کیوں نہیں کرتیں؟ دیکھو یہ ویٹرس بھی تو ہے۔"

"چھوڑ دوں گی۔ لیکن ابھی نہیں۔ ابھی قصائی کی دکان پر میرا گوشت ایک سال اور لٹکا رہے گا۔"

"ایک سال کیوں؟"

"مجھے دس ہزار ڈالر جمع کرنے ہیں۔ باعزت کاموں میں کچھ نہیں بچتا۔ یوسف سعید جیسا شوہر ہو تو گھر بھی بک جاتا ہے۔"

"دس ہزار ڈالر سے کیا ہو گا؟"

"میری بہن فیشن ڈیزائنر ہے۔ لیکن وہ بھی نوکری کرتی ہے۔ اس کے ساتھ مل کر بوتیک کھولوں گی۔ کپڑے اتارنے کا کام بہت ہو گیا۔ اب کپڑے پہنانے کا کام کروں گی۔" اس کی ہنسی بے جان تھی لیکن آنکھوں میں خواب منڈلا رہے تھے۔ تھوڑی دیر خاموش رہ کر وہ جلالی سے پوچھنے لگی۔

"تمہارے پاس دس ہزار ڈالر ہیں؟"

"میرے پاس؟ کیوں؟"

"مجھے دے دو' میں کل سے باعزت ہو جاؤں گی۔ صرف پرائیویٹ شو کروں گی' وہ بھی تمہارے لئے۔ جب تک تم بڈاپسٹ میں ہو روز تمہارے گھر آ کر آنا بار والا رقص کروں گی۔ لیکن ہاتھ نہیں لگانے دوں گی۔ میں تمہارے دوست کی بیوی ہوں۔ بولو منظور۔" اس نے ہاتھ ملانے کے لئے اپنی ہتھیلی کھول دی۔

"میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں۔ ہوتے تو ضرور دے دیتا اور کسی شرط کے بغیر دے دیتا۔" جلالی کے لہجے میں خلوص تھا۔ کلارا ہنس پڑی۔

"تم سنجیدہ ہو گئے۔ میں تو مذاق کر رہی تھی۔ تمہارے پاس ہوتے بھی تو نہیں لیتی۔ اور میرا شو۔ وہ تم جب چاہو پیسے دیئے بغیر دیکھ سکتے ہو۔" وہ شوخ نظروں سے مسکرائی اور جلالی بھی ہنس پڑا۔

جلالی نے قریب سے گزرتی ہوئی ویٹرس کو متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ میز پر کئی پیالیاں اور گلاس جمع ہو گئے تھے جو اس نے ابھی تک اٹھائے نہیں تھے۔ لیکن وہ جلالی کے اشارے کو نظر انداز کر کے گزر گئی۔

"اس ویٹرس کو آج کیا ہو گیا ہے؟" جلالی نے حیرت ظاہر کی۔

"تمہیں نہیں معلوم؟"

"نہیں! تمہیں معلوم ہے؟"

"تم ان معاملوں میں واقعی بدھو ہو۔ وہ مجھے تمہاری محبوبہ سمجھ رہی ہے۔ تم نے شاید اس کی مسکراہٹوں کا مطلب سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ آج مجھے تمہارے ساتھ دیکھ کر اس کی امیدیں ٹوٹ گئی ہیں۔"

"کیوں خواہ مخواہ کی کہانی بناتی ہو۔" جلالی نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اتنی خوبصورت لڑکی کو عاشقوں کی کیا کمی ہو گی۔" کلارا کی بات غلط نہیں تھی۔ وہ ہمیشہ جلالی پر خصوصی توجہ دیتی تھی لیکن آج بالکل اکھڑی ہوئی تھی۔

"تم مایوس نہ ہو۔ یہاں کی حسینائیں کالے پیلے غیرملکیوں کی بھی ہو جاتی ہیں۔ تم تو بہت ٹھیک ٹھاک ہو۔ دیکھنے میں باعزت بھی لگتے ہو۔" وہ تھوڑی دیر کچھ سوچ کر کہنے لگی۔ "میں اس کی غلط فہمی دور کر دیتی ہوں۔"

جلالی کے منع کرنے سے پہلے ہی کلارا نے نزدیک سے گزرتی ہوئی ویٹرس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا۔ وہ بہت غصے سے مڑی لیکن تھوڑی ہی دیر میں دونوں دوستوں کی طرح باتیں کر رہے تھے۔ جلالی کچھ سمجھے بغیر انہیں حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

"جلالی یہ میگی ہے۔" کلارا جلالی کی طرف مڑ کر تعارف کرانے لگی۔ جلالی

نے میگی کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔ کتنا ملائم ہاتھ تھا۔ اسے ویٹرس کی نوکری شروع کئے ہوئے شاید زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ کلارا بولی تو جلالی کی محویت ختم ہو گئی۔

"میں نے میگی کو بتا دیا ہے کہ تم میرے شوہر کے دوست ہو اور نئے نئے بڈاپسٹ آئے ہو۔ وہ تم سے دوستی کر کے بہت خوش ہو گی۔ دو ہفتے کی چھٹی پر اپنے ماں باپ سے ملنے کسی دوسرے شہر جا رہی ہے۔ کہتی ہے واپس آتے ہی تمہیں فون کرے گی۔ اپنی چھٹی کے دن تمہیں شہر گھمائے گی۔ یہاں کی رقص گاہیں دکھائے گی۔ تم اسے اپنا فون نمبر دے دو۔" جلالی نے سعادت مندی سے کاغذ کے ایک پرزے پر اپنا نام اور گھر کا نمبر دے دیا۔

"آٹھ بجے میگی کی چھٹی ہو جائے گی۔ میں نے اسے بتایا ہے کہ تم ہمیں ڈنر پر لے جا رہے ہو۔ میں نے اسے دعوت دی ہے کہ وہ بھی ساتھ چلے۔" جلالی سوچنے لگا اس نے ڈنر کی دعوت کب دی تھی؟ لیکن اس نے کندھے اچکا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔ اسے یہ پرواہ نہیں تھی کہ بل اسے ادا کرنا پڑے گا۔ بس شام اچھی گزر جائے۔ اسے شک تھا کہ یوسف سعید اور کلارا کے ساتھ اس کی شام اچھی گزر سکے گی کہ نہیں۔

جلالی کا خیال غلط نہیں تھا۔ میگی کی موجودگی نے شام میں جو خوبصورتی پیدا کی تھی اسے یوسف سعید اور کلارا نے نشے میں آ کر برباد کر دیا تھا۔ وہ بات بات پر جھگڑا کرتے اور پھر ایک دوسرے کو منانے لگتے۔ کبھی یوسف سعید کسی مرے ہوئے دوست کو یاد کر کے روتا کبھی کلارا کپڑے اتارنے کی دھمکی دینے لگتی۔ جلالی اور میگی ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا دیتے یا کندھے اچکا دیتے۔ پہلے وہ آسٹوریا کے ایک بار میں آ بیٹھے تھے جہاں کام ختم کرنے کے بعد میگی بھی آ کر ان کے ساتھ شامل ہو گئی تھی۔ اس کے بعد کسی دوسری جگہ جا کر کھانا کھایا تھا۔ کلارا اپنی چھٹی کا پورا مزا لے رہی تھی۔ خود بھی پی رہی تھی اس لئے یوسف سعید کے پینے پر پابندی ختم ہو گئی تھی۔ تیسرے جام کے بعد کلارا نے جلالی کو عشق کرنے کے گر سکھانے شروع کر دیئے۔

"پہلی ہی ملاقات میں اسے بستر میں لے جانے کی کوشش مت کرنا۔ فلمیں دیکھو، شہر گھومو، ڈنر پر لے جاؤ۔ وہ تمہیں فون کرتی ہے اور نہ آنے کے بہانے نہیں کرتی تو سمجھو کیمسٹری کام کر رہی ہے۔ جس رات رقص کرتے یا شب بخیر کہتے ہوئے ہونٹوں پر بوسہ دے دے تو بنگو! سمجھو تمہارا کام ہو گیا۔ تمہارے لئے دل اور بدن کا تالا کھولنے کے لئے تیار ہے۔"

جلالی جواب میں صرف ہنستا رہا۔ بہکی ہوئی کلارا کو بتانا بیکار تھا کہ اس کے ایجنڈے میں جسموں کے تالے کھولنے کی گنجائش نہیں تھی۔ میگی اس کے لئے ایک حسین شام تھی جس کے ساتھ بیٹھ کر وہ اچھی گفتگو کر سکتا تھا۔ لیکن یہ امکان خود میگی نے ختم کر دیا تھا۔ اسے انگریزی نہیں آتی تھی۔ بس ٹوٹے پھوٹے کچھ لفظ بول سکتی تھی۔ اس نے ہنگری انگلش بول چال کی پاکٹ سائز ڈکشنری کے ذریعے گفتگو کی ڈور باندھنے کی کوشش کی تھی لیکن جلالی کو ایسا لگا جیسے آنابار کی رقص گاہ میں کوئی لڑکی کپڑے پہن کر ناچ رہی ہو۔ وہ اس مثال پر دل ہی دل میں ہنستا ہوا کلارا کے ننگے ہونٹوں کو دیکھنے لگا۔ میگی کے ہونٹوں کو دیکھنے کی ہمت نہیں تھی۔ ایک وقت میں ایک شو کافی تھا۔

یوسف سعید نے نہ ملنے کے بارے میں شکایت کا ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ شاید اسے پتہ تھا کہ یہ کام کلارا کر چکی ہو گی۔ لیکن اس نے ملتے ہی کام کی بات شروع کر دی۔

"پرکاش نے اتوار کی رات کو کھانے پر بلایا ہے۔ تمہارے گھر کے پاس سپر مارکیٹ کے برابر میں جو ریسٹورنٹ ہے میں تمہیں وہاں سے سات بجے اٹھا لوں گا۔"

"لیکن......"

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔ میں نے پرکاش کو بتا دیا ہے تم آؤ گے۔ میں نے تمہاری طرف سے ہاں کر دی ہے۔" یوسف سعید دوستی کا ناجائز فائدہ اٹھا رہا تھا۔ جلالی نے سوچا اسے بھی صاف صاف بتا دینا چاہئے۔

"میرا خیال ہے مجھے پرکاش سے نہیں ملنا چاہئے۔ میں پاکستانی سفارتخانے کا

ملازم ہوں۔ اس حیثیت میں مجھے......۔"

"تمہاری حیثیت مجھے پتہ ہے۔ تم سفارتکار نہیں صرف صحافی ہو۔ اول تا آخر صرف صحافی۔"

"مجھے فیاض منگی سے پوچھنا ہو گا۔ پرکاش اور منگی ایک دوسرے کے خلاف کسی جنگ میں مصروف ہیں۔ ہمیں منگی کا ساتھ دینا ہو گا۔ میں اپنے ملک کے مفاد کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا۔"

"اور میں کر سکتا ہوں؟" یوسف سعید نے غصے سے کہا۔ "تم بھی عام پاکستانیوں کی طرح عدم تحفظ کا شکار ہو۔ تمہارا خیال ہے ہم اتنے کچے ذہن کے ہیں کہ دشمن ایک ہی ملاقات میں ہم سے ہمارے راز اگلوا لے گا!؟ اور پھر ہمارے پاس اگلنے کے لئے ہے بھی کیا؟ تم کون سا راز سینے میں چھپائے بیٹھے ہو؟" جلالی دل ہی دل میں ہنسا۔ یوسف سعید کو کیا معلوم۔ بقول منگی کے وہ سینے میں ایک ٹائم بم لئے بیٹھا تھا جو مستقل ٹک ٹک کر رہا تھا۔

"مان جاؤ مان جاؤ۔" کلارا بھی اس پر دباؤ ڈالنے میں اپنے شوہر کا ساتھ دینے لگی۔ "تم ڈرتے کیوں ہو۔ پرکاش کوئی ہوا نہیں ہے جو تمہیں کھا جائے گا۔" جلالی سوچنے لگا واقعی آخر ڈرنے کی بات بھی کیا ہے۔

جلالی اتوار کے روز پونے سات بجے اسی ریسٹورنٹ میں پہنچ گیا جہاں سے یوسف سعید اسے پرکاش کے پاس لے جانے والا تھا۔ گھر سے ریسٹورنٹ تک پیدل آیا تھا۔ ٹھنڈی ہوا ہڈیوں میں گھسی جا رہی تھی۔ تمام دن موسم اسی طرح رہا تھا۔ ابر آلود اور بہت سوگوار سا۔ بادل چھائے تھے لیکن بارش نہیں ہوئی تھی۔ سنسان سڑک اور زرد پتوں کا موسم۔ ذہن پر عجیب سی کاہلی سوار ہو گئی تھی۔ راستے بھر خشک پتے اڑ اڑ کر اس سے ٹکراتے رہے۔ ریسٹورنٹ میں آ کر بیٹھا تو دیر تک جسم کے اندر کپکپی مچی رہی۔ گرم کافی کی لگاتار دو پیالیاں خالی کیں تو حالت معمول پر آئی۔ لیکن یوسف سعید کہاں تھا؟ گھڑی کی سوئیاں بہت پہلے سات بجا چکی تھیں۔ کہیں بیمار تو نہیں ہو گیا؟

جمعہ کی رات وہ اور کلارا دونوں بہت پی گئے تھے۔ چلتے ہوئے بری طرح لڑکھڑا بھی رہے تھے۔ جلالی اور میگی نے مل کر دونوں کو سہارا دیا تھا اور ٹیکسی تک لے کر آئے تھے۔ پھر گھر کے دروازے تک بھی سہارا دے کر پہنچایا تھا۔ جلالی نے اس کے بعد میگی کو اس کے گھر چھوڑا تھا۔ میگی کا خیال آیا تو اس کے جسم میں ایک بار پھر کپکپی دوڑ گئی۔ جلالی ویٹر کو ایک اور کافی لانے کا اشارہ کرنے لگا۔

جلالی آٹھ بجے تک انتظار کر کے ریسٹورنٹ سے اٹھ آیا۔ یوسف سعید یقیناً بیمار ہو گیا تھا۔ اسے یہ وہم تھا کہ منگی جلالی کے گھر کا فون ٹیپ کرتا ہے۔ اس لئے فون نہیں کیا ہو گا۔ کلارا کام پر گئی ہو گی ورنہ اسے بھیج دیتا۔ جلالی اوورکوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے کپکپاتا ہوا واپس گھر پہنچا تو سردی کے ساتھ ساتھ بھوک بھی لگ رہی تھی۔ ہنگیرین کھانے کا موڈ نہیں تھا اس لئے ریسٹورنٹ میں نہیں کھایا۔ سوچا تھا گھر میں کچھ نہ کچھ بچا ہوا رکھا ہو گا۔ لیکن فرج خالی پڑا تھا۔ وہ انڈے نکال کر آملیٹ بنانے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ دروازے کی گھنٹی بجنے لگی۔ ستار کی بیوی تھی۔ اس نے بریانی پکائی تھی اور جلالی کے لئے لے کر آئی تھی۔ جلالی کبھی کبھی سوچتا ستار کے گھر میں کوئی ایسا آلہ ہے جو جلالی کے معدے کی آواز سن کر ستار کے باورچی خانے میں گھنٹیاں بجانے لگتا ہے۔ ویسے اسے حیرت ہوئی۔ کھانا لے کر عموماً ستار خود آتا تھا۔

"کیا ستار گھر پر نہیں ہیں؟"

"کسی کی میت پاکستان جا رہی ہے۔ اسے بھجوانے ایئرپورٹ گئے ہیں۔"

"میت؟ کس کی میت؟ کس کا انتقال ہوا ہے؟ کیا سفارتخانے کا کوئی شخص؟"
جلالی ایک دم پریشان ہو گیا۔

"معلوم نہیں! لیکن سفارتخانے کا آدمی نہیں ہے۔ ہوتا تو مجھے پتہ ہوتا۔ کوئی باہر کا آدمی ہے۔" ستار کی بیوی یہ کہہ کر دروازے ہی سے باہر چلی گئی۔ جانے کون بدنصیب تھا جو بے وطنی میں مارا گیا۔ کھانے کے دوران جلالی کا افسوس بریانی کے مزے میں تحلیل ہو گیا۔ گزشتہ رات خواب میں کلارا کے ہونٹ بھنور بن کر چکراتے

رہے تھے۔ وہ بہت لذت آمیز خواب تھے۔ وہ آج کھانا کھاتے ہی سو گیا تھا اس لئے ہونٹوں کے خواب آئے لیکن بہت مضطرب کرنے والے۔ جیسے ہونٹوں کا جنازہ جا رہا ہو۔ بالکل کلارا جیسے ہونٹوں کا جنازہ اٹھانے والوں کی شکلیں میگی کی طرح تھیں۔ سب نے اپنے اپنے ہونٹوں پر کالی پٹیاں باندھی ہوئی تھیں۔ باقی سارا جسم ننگا تھا۔ منگی ننگے جسموں پر کوڑے برساتا ہوا جنازے کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ کچھ دیر بعد خواب کی ساری شبیہیں نیند کے بے خواب غاروں میں فنا ہو گئیں۔

جلالی دوسرے روز دیر سے دفتر پہنچا۔ آنکھ دیر سے کھلی تھی اور کھلی بھی تو دیر تک بستر سے نہیں اٹھا گیا۔ سفارتخانے پہنچا تو گیارہ بج چکے تھے۔ سفارتخانے کا ہر وقت کھلا رہنے والا دروازہ اس وقت بند تھا۔ بند دروازے پر بڑا سا نوٹس لگا تھا۔ "سفارتخانہ آج پبلک کے لئے بند رہے گا۔" جلالی دروازہ کھول کر تیزی سے اندر پہنچا تو ہر طرف ایک سناٹا تھا۔ کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ استقبالیہ پر رکھے ہوئے فون کی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی۔ اسی وقت کافی کا کپ ہاتھ میں لے کر کچن سے نکلتی ہوئی وہ لڑکی نظر آئی جو استقبالیہ پر بیٹھتی تھی۔ اس نے شور مچاتے ہوئے فون پر کوئی توجہ نہیں دی بلکہ جلالی کو سفیر کے کمرے کی طرف جانے کا اشارہ کر کے خود بھی تیزی سے اسی طرف بڑھ گئی۔

سب سفیر کے کمرے میں جمع تھے۔ اجلاس کا سا سماں تھا۔ سفیر کی میز اسٹیج کا کام کر رہی تھی جس کے پیچھے دو لوگوں کے درمیان ولایت علی بیٹھا تھا۔ اس نے آنکھوں پر کالے رنگ کا چشمہ لگایا ہوا تھا۔ چہرہ سوجا سوجا سا لگ رہا تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ پر منگی اور بائیں ہاتھ پر سیاہ لباس پہنے ایک عورت بیٹھی تھی۔ وہ سیاہ ہیٹ پہنے ہوئے تھی جس سے لٹکی ہوئی سیاہ جالی نقاب کی طرح چہرے پر سایہ کئے ہوئے تھی۔ جالی کے پیچھے اس کے ادھ کھلے نصف دائرہ بناتے ہوئے ہونٹ صاف نظر آ رہے تھے۔ ستار کھڑا ہوا تلاوت کر رہا تھا۔ جلالی کے دماغ میں آندھیاں چلنے لگیں۔ کیا یوسف سعید.....؟ تلاوت ختم ہوئی تو منگی کھڑا ہو گیا۔ اس کے الفاظ جلالی کے سر پر ہتھوڑے برسا رہے تھے۔

"یوسف سعید ہمارے بزرگ ساتھی تھے۔ وہ دل کے مریض تھے لیکن ڈاکٹروں کی ہدایت کے برعکس مسلسل محنت کرتے رہے۔ ہفتے کی صبح دل کا دوسرا دورہ پڑا جس نے ان کی جان لے لی۔ ہم نے ان کی وصیت کے مطابق ان کی میت پاکستان بھیج دی ہے۔ وہ ہنگری میں پاکستان کے پہلے سفیر ہی نہیں ایک جراُتمند صحافی بھی تھے' وہ ایک عظیم محب وطن تھے۔ قوم کے لئے ان کی بہت خدمات ہیں......"

جلالی کا دل چاہا کہ سب کے سامنے جا کر منگی کا گریبان پکڑ لے۔ چند دن پہلے یہی منگی یوسف سعید کو بے غیرت' وطن فروش اور ناکارہ قرار دے رہا تھا۔ منگی خواب میں آنے والا وہ جلاد بن گیا جو یوسف سعید کی لاش پر کوڑے برسا رہا تھا۔

منگی اپنا بیان ختم کر کے ولایت علی کی طرف دیکھنے لگا۔ شاید اسے کچھ بولنے کے لئے کہہ رہا تھا۔ سفیر نے نفی میں سر ہلا کر بھٹی کی طرف چہرہ گھما دیا جو منگی کے دائیں طرف دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ بھٹی آگے آ کر سفیر کی ترجمانی کرنے لگا۔

"سفیر صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ وہ اس موقع پر صرف سابق سفیر یوسف سعید کی پسندیدہ موسیقی کا ایک کیسٹ سنوانا چاہتے ہیں۔ اسلم.....!" بھٹی نے سفیر کے سیکریٹری کو مخاطب کیا تو اس نے ایک ٹیپ ریکارڈر میز پر رکھ کر آن کر دیا۔ وائلن پر بجتی ہوئی نرم اور اداس دھن کمرے کو بھرنے لگی۔ سب اپنی نگاہیں نیچی کئے ہوئے خاموشی سے سن رہے تھے۔ موسیقی نے جلالی کا غصہ بھی دھیما کر دیا۔ ذہن پر اداسی کا کہر چھانے لگا۔ ایک اچھے آدمی کا کیا برا انجام ہوا۔ موسیقی ختم ہوئی تو منگی ایک بار پھر اٹھ کھڑا ہوا۔

"سفارتخانے کی جانب سے سفیر صاحب سابق سفیر کی بیوہ کلارا سعید کو ان کے اور ان کے خاندان کے لئے دس ہزار ڈالر کا ایک چیک پیش کریں گے۔" منگی نے کوٹ کے اندر کی جیب سے ایک لفافہ نکال کر سفیر کو دیا۔ سفیر کے ساتھ کلارا بھی کھڑی ہو گئی اور چیک لے کر خم ہوتے ہوئے شکریہ کہنے لگی۔ جلالی کے دماغ میں بہت اونچی آواز سے غصے کا بم پھٹا۔

"تو یہ بھی! پیسے کی ہوس نے اسے قاتل بھی بنا دیا۔"

وہ کمرے سے نکل آیا اور کچن میں جا کر کافی بنانے لگا۔ دفتر میں اپنی میز پر بیٹھ کر کافی پیتے ہوئے اس نے یوسف سعید کی اچانک موت کی گتھی سلجھائی تو دماغ میں قاتل قاتل کی گردان ہونے لگی۔ اس نے اپنا سر پکڑ لیا۔ یوسف سعید خود اس کی وجہ سے مارا گیا تھا۔ اسے اب فیاض منگی کی واپسی کا انتظار تھا۔ سب کے سامنے گریبان نہیں پکڑ سکا تھا لیکن اکیلے میں بات کرے گا۔ وہ اسے چھوڑے گا نہیں۔

سب ایک ایک کر کے سفیر کے کمرے سے نکلنے لگے۔ سفیر کلارا کو بازو سے پکڑے باہر کے دروازے تک چھوڑنے گیا۔ منگی اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ اس کے دروازے پر لگا ہوا سرخ بلب جلتا جلالی تیزی سے اس کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ منگی جو ابھی اپنی کرسی پر پوری طرح بیٹھ بھی نہیں پایا تھا حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

"میں یہ معلوم کرنے آیا تھا کہ غدار یوسف سعید مرتے ہی عظیم محب وطن کیسے ہو گیا؟"

"مرنے والے کی برائیاں نہیں خوبیاں بیان کی جاتی ہیں۔ یہ ہماری روایت ہے۔ وہ غدار تھا یا محب وطن اس کا فیصلہ اب آسمانوں پر ہو گا۔"

"آپ کی یہ تقریریں اب کام نہیں آئیں گی۔ میں پاکستان جا کر آپ کو بے نقاب کئے بغیر نہیں چھوڑوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔" غصے میں جلالی کی آواز اونچی ہو گئی۔

"کمزور آدمیوں کی طرح دھمکیاں مت دو۔ بیٹھ جاؤ اور پہلے خود پر قابو پانے کی کوشش کرو۔"

"میں بیٹھنے نہیں یہ بتانے آیا ہوں کہ مجھے معلوم ہے یوسف سعید کو آپ نے قتل کروایا ہے۔"

"تم نے شاید جاسوسی ناولیں بہت پڑھی ہیں۔ تمہارا خیال ہے یہاں جیمز بانڈ کی کوئی فلم چل رہی ہے۔ جیمز بانڈ جیسے کردار صرف کتابی اور فلمی ہوتے ہیں، حقیقی دنیا سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔"

"میں ایک پیشہ ور صحافی ہوں۔ فلموں اور کتابوں کو نہیں حقائق کو سامنے رکھ کر تجزیہ کرتا ہوں۔"

"اور حقائق کیا ہیں؟ لیکن بتانے سے پہلے بیٹھ جاؤ۔ تجزیہ کرنے والے تمہاری طرح گرم دماغ نہیں ہوتے۔ بہت سرد مزاجی سے یہ کام کرتے ہیں۔ سگریٹ پی کر پہلے اپنے حواس درست کرو۔" منگی نے دراز سے سگریٹ کی ڈبیا اور ماچس نکال کر جلالی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ جلالی اپنے سگریٹ میز پر چھوڑ آیا تھا۔ اس نے سگریٹ نکال کر سلگائی۔ انگلیوں میں ہلکی سی لرزش تھی۔ اس نے سوچا اسے واقعی اپنے اعصاب پر قابو پانے کی ضرورت تھی۔ وہ کرسی پر بیٹھ کر سگریٹ کے گہرے کش لینے لگا۔ منگی کے سکون میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

"جی ہاں۔ تو اب بتائیے حقائق کیا ہیں؟"

"کیا یوسف سعید کی بیوی آپ کی تنخواہ دار ایجنٹ نہیں ہے؟" جلالی نے میز پر آگے کی طرف جھکتے ہوئے منگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بہت سرد لہجے میں کہا۔ لیکن منگی پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ اسی طرح سوالیہ نظروں سے جلالی کو گھورتا رہا۔

"میں جب پہلی بار آنابار میں یوسف سعید سے ملا تھا اس کی اطلاع بھی آپ کو کلارا نے دی ہوگی۔ کسی اور کو اس ملاقات کا علم نہیں تھا۔ اسی نے آپ کو یہ بھی بتایا ہوگا کہ میں پرکاش سے ملنے کے لئے تیار ہو گیا تھا اور یوسف سعید کے ساتھ اتوار کو اس کے گھر جانے والا تھا۔ آپ نے کلارا کے ذریعے یوسف سعید کا صفایا کرا دیا۔ کلارا لالچی عورت ہے۔ اسے دس ہزار ڈالر چاہئیں تھے جن کے لئے وہ کچھ بھی کر سکتی تھی۔ وہ ہر روز میرے گھر آکر ننگا ناچ دکھانے کے لئے تیار تھی۔ یوسف سعید کی قربانی دینے پر تیار ہو گئی ہو گی۔ کسی کو شبہ نہ ہو' اسی لئے آپ نے اس کی لاش بھی فوراً" پاکستان بھجوا دی۔" جلالی خاموش ہو کر دوسرا سگریٹ سلگانے لگا۔

"پرکاش سے ملاقات طے کرنے سے پہلے تمہیں مجھ سے پوچھنا چاہئے تھا۔" منگی اس کے الزامات کو نظر انداز کر کے تیز لہجے میں بولا۔ "میں نے تمہیں پہلے بھی

بتایا تھا۔ یہ ملاقات ہو جاتی تو تمہارے حق میں بہتر نہ ہوتا۔ اچھا ہوا یوسف سعید مر گیا۔ تم پرکاش کی دستبرد اور میرے غضب سے بچ گئے۔"

"آپ کو اپنے ہاتھ خون سے رنگنے کی ضرورت نہیں تھی۔" جلالی کا خون کھولنے لگا۔ "مجھے اپنے محب وطن ہونے کی تنخواہ نہیں ملتی۔ پھر بھی میں کسی قیمت پر اپنا کوئی راز دشمن کو نہیں دیتا۔ اپنے وطن سے مجھے بھی محبت ہے۔ لیکن یہ بات آپ جیسے حب الوطنی کے ٹھیکیداروں کی سمجھ میں نہیں آئے گی۔"

"میں حب الوطنی کا ٹھیکیدار نہیں چوکیدار ہوں۔ ہاں مجھے اس کام کی تنخواہ بھی ملتی ہے اور اسی لئے اس کام کو سنجیدگی سے لیتا ہوں۔ میں تم جیسے محب وطن لوگوں سے بھی واقف ہوں۔ تم پرکاش کو نہیں جانتے۔ اس نے تمہاری دعوت میں ریکھا کو بھی بلوایا ہو گا۔ وہ کلچراتاشی ہے۔ بہت حسین لیکن زہریلی ناگن ہے۔ پرکاش نے اس کے ذریعے بہت لوگوں کو ڈسا ہے۔ تم بھی حسن اور شراب میں ڈوب کر اپنی حب الوطنی نچوڑ آتے۔ انہیں مرعوب کرنے کے لئے اپنے اہم ہونے کی داستان سنانے لگتے۔"

"آپ جیسے لوگ جو شراب نہیں پیتے وہ شراب اور شراب پینے والوں کے بارے میں بہت فلمی قسم کا تصور رکھتے ہیں۔ آپ کے اس تصور کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔" جلالی نے منگی کا جملہ دہرایا۔

"تم نے یہ کیسے فرض کر لیا کہ میں شراب نہیں پیتا؟ مجھ میں اور تم میں فرق یہ ہے کہ میں تماشا بننے کے لئے نہیں سکون حاصل کرنے کے لئے پیتا ہوں۔ تمہارا یہ خیال بھی غلط ہے کہ یوسف سعید کو میں نے قتل کروایا ہے۔ جو لوگ خودکشی پر تلے ہوں انہیں مارنے کے لئے کسی قاتل کی ضرورت نہیں ہوتی۔ تم اگر جاننا چاہتے ہو کہ یوسف سعید کو کس نے قتل کیا تو اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھو۔ اسے تم نے قتل کیا ہے تم نے۔"

"میں نے؟"

"ہاں تم نے اور تم جیسے لوگوں نے۔ اس کی بیوی کو پتہ تھا کہ وہ پیتا رہا تو مر

جائے گا پھر بھی اس نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ سفیر صاحب بھی سب سے چھپا کر اسے شراب کے کریٹ بھیجتے رہے اور اب بیٹھے رات سے رو رہے ہیں۔ قاتل تم سب ہو اور وہ پرکاش ہے جو یوسف سعید کا بہی خواہ بن کر اس کی شراب نوشی کا خرچ برداشت کر رہا تھا۔"

"آپ کی یہ باتیں میرا شک دور نہیں کر سکتیں۔"

"مجھے پرواہ نہیں اور میرے پاس اب وقت بھی نہیں ہے۔ مجھے ایک سرکاری میٹنگ میں جانا ہے۔" منگی گھڑی دیکھتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ "تم یقین سے شک تک آ گئے ہو۔ آج سفارتخانہ باقی دن کے لئے بند ہے۔ گھر جا کر آرام کرو۔ دماغ ٹھنڈا ہو گا تو شک بھی جاتا رہے گا۔" جلالی کچھ نہیں بولا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ سوچ رہا تھا شاید منگی صحیح کہہ رہا ہو۔ وہ آگ برساتا ہوا آیا تھا سر جھکائے واپس جا رہا تھا۔

"آپ نے دو ہزار ڈالر کے چیک کا کیا کیا؟" جلالی واپس جاتے ہوئے رک کر مڑ گیا۔

"الزبتھ بڈاپسٹ سے باہر گئی ہوئی ہے۔ میری اب تک ملاقات نہیں ہو سکی۔"

"جلدی کیجئے۔ اگر وہ نہیں ملتی تو چیک واپس کر دیجئے گا۔ دس ہزار ڈالر دینے سے میرا بجٹ خراب ہو گیا ہے۔"

"آپ چاہیں تو ابھی واپس لے لیں۔"

"نہیں' وہ کام بھی ضروری ہے۔ اسی ہفتے میں کسی طرح اپنی دوست سے مل کر کتابچہ تیار کرا لیجئے۔" جلالی سر ہلاتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

جلالی اپنی میز پر دیر تک سر جھکائے بیٹھا صورتحال سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ کیا یہ محض اس کا وہم تھا کہ یوسف سعید کا قتل ہوا ہے؟ کیا منگی صحیح کہہ رہا تھا؟ یوسف سعید نے خود بتایا تھا کہ ڈاکٹروں نے اسے شراب پینے سے منع کیا تھا۔ پھر بھی کئی دن سے مسلسل اور بری طرح پی رہا تھا۔ جمعہ کی رات کو جب جلالی اسے گھر چھوڑنے گیا تھا تو اس کی حالت بہت خراب تھی۔ شاید اسی رات دل کی دھڑکن رک

گئی ہو گی۔ لیکن دس ہزار ڈالر؟ منگی اتنا نیک اور فراخدل تو نہیں تھا۔ شاید سفیر نے مجبور کیا ہو! کچھ دیر سوچوں میں بھٹکتا رہا پھر سر کو جھٹک کر ہنگری کے اخباروں کے لئے یوسف سعید کے انتقال کی خبر تیار کرنے لگا۔

اسے دفتر سے اٹھتے اٹھتے چھ بج گئے۔ منگی بھی واپس آ کر اپنے دفتر میں بند ہو گیا تھا۔ اس کے کمرے کے باہر سرخ بلب اب تک جل رہا تھا۔ بھٹی بھی ابھی تک دفتر میں تھا اور اکاؤنٹ کی کتابوں میں گھسا ہوا تھا۔ جلالی خاموشی سے نیچے اتر آیا۔ اس کا کسی سے باتیں کرنے یا نئی بحث چھیڑنے کا موڈ نہیں تھا۔ الزبتھ سے ملنے کی امید میں کیفے نیویارک کی طرح آہستہ آہستہ قدم اٹھا کر چلنے لگا۔ اس وقت صرف الزبتھ سے گفتگو کر کے ذہنی سکون مل سکتا تھا۔ لیکن وہ تھی کہاں؟ واسی اسٹریٹ پر آنابار آیا تو قدم خود بخود رک گئے۔ شاید یوسف سعید کو خراج عقیدت پیش کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی تھا۔ جلالی کو خود بھی ایک تیز ڈرنک کی ضرورت تھی۔ وہ مزید کچھ سوچے بغیر آنابار کے دروازے میں داخل ہو گیا۔

نچلی منزل پر میزیں ابھی تک بھری نہیں تھیں۔ کاؤنٹر بھی خالی تھا اور اس کے پیچھے کام کرنے والا بار ٹینڈر شاید گاہک نہ ہونے کی وجہ سے وقفہ لینے چلا گیا تھا۔ جلالی اوپر کی منزل پر واقع نائٹ کلب جانے کے لئے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ وہی اندھیرا' اسٹیج پر روشنیوں کے لہراتے ہوئے دائروں میں رقص کرتے ہوئے مرمریں جسم اور ہارس شو کی شکل کی میز کے گرد بیٹھے ہوئے لوگوں کی سسکیاں۔ جلالی زیادہ توجہ دیئے بغیر کاؤنٹر کی طرف بڑھ گیا۔ گلاس ہاتھ میں لے کر پلٹا تو اسٹیج پر رقص کرنے والے جسموں کو دیکھ کر اسے کچھ دیر کے لئے یقین نہیں آیا۔ کپڑوں سے آزاد جو چار لڑکیاں اپنے بدن کی جنبشوں کا کمال دکھا رہی تھیں ان میں ایک میگی بھی تھی۔ کیفے نیویارک میں ویٹرس کا کام کرنے والی میرلین منرو جس کے ساتھ کلارا نے جلالی کا جوڑا بنایا تھا۔ کلارا نے غلط نہیں کہا تھا۔ آنابار میں اس وقت کوئی بھی بے لباس یا بالباس لڑکی میگی کے مقابلے کی نہیں تھی۔ سب سے زیادہ نوٹ بھی اسی کی ران میں بندھی ہوئی کالی الاسٹک کی پٹی میں ٹھنسے ہوئے تھے۔

جلالی نے ایک ہی گھونٹ میں گلاس خالی کر کے کاؤنٹر پر پٹخ دیا۔ اسی وقت موسیقی تبدیل ہو گئی اور میگی سمیت رقص کرنے والی چاروں لڑکیاں پردے کے پیچھے غائب ہو گئیں۔ کسی نے بہت سرعت سے فرش صاف کیا اور نئے شو کی تیاری ہونے لگی۔ چند لمحوں بعد اسٹیج پر دودھیا رنگ کا گہرا غبار چھا گیا۔ غبار ہلکا ہوا تو اس سے لڑکیوں کا جوڑا برآمد ہوا تھا۔ جلالی کے قدم ایک بار پھر زمین پر گڑ گئے۔ سرخ اور سنہرے بالوں والی لڑکیوں کا جوڑا ایک دوسرے کے جسم سے ایک ایک کر کے کپڑے اتار رہا تھا۔ کپڑوں سے آزاد ہو کر لال بالوں والی کلارا نے اپنی بانہیں سنہری بالوں والی لڑکی کے گلے میں ڈال دیں۔ ادھ کھلے ہونٹ نصف دائرہ بنائے ہوئے تھے۔ وہی دائرہ جسے دیکھ کر جلالی کے جسم میں سنسنی دوڑنے لگتی تھی۔ لیکن اس وقت اس کے جسم میں کوئی چیونٹی نہیں رینگی۔ کلارا کے ہونٹ کیچڑ میں لتھڑے ہوئے تھے۔ پورا جسم گندگی میں ڈوبا ہوا تھا۔ جلالی کو متلی ہونے لگی۔ وہ دروازے کی طرف بڑھا اور تیزی سے سیڑھیاں اتر کر نچلی منزل کے بار کے پیچھے کھڑے ہوئے بار ٹینڈر سے نیبو کا شربت مانگنے لگا۔

ٹھنڈے مشروب نے غصہ کم کیا تو اسے اپنا وہ منظر نامہ یاد آیا جو اس نے یوسف سعید کی موت کے بارے میں تیار کیا تھا۔ منگی ایک گھاگ آدمی تھا۔ اس نے جلالی کے یقین کو شک میں بدل دیا تھا۔ لیکن وہ سب بکواس تھی۔ جلالی کا خیال غلط نہیں تھا۔ کلارا نے منگی سے یوسف سعید کی لاش کا سودا کیا تھا اور وہ سوگوار بیوی کی اداکاری کر کے اپنی قیمت بھی وصول کر آئی تھی۔ بوتیک کھولنے کی بات بھی جھوٹ تھی۔ وہ ایک لالچی عورت تھی۔ اول درجے کی فاحشہ! اس نے میگی جیسی سیدھی سادھی لڑکی کو بھی بہکا دیا تھا۔ شربت ختم کر کے جلالی سگریٹ کے کش لے رہا تھا کہ اچانک بہت زور سے اچھل پڑا۔ کسی نے پیچھے سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے گہری سوچوں سے چونکا دیا تھا۔

"ایک سگریٹ پلاؤ۔" سرخ بالوں والی کلارا اس کے برابر والے اسٹول پر بیٹھی ہوئی اس سے مخاطب تھی۔ جلالی نے سگریٹ اور لائٹر اس کی طرف بڑھا دیا۔

خود اس کا سگریٹ نہیں سلگایا تھا۔ جلالی کو وہ اب بھی ننگی نظر آ رہی تھی۔ لیکن آج اس کا بدن سر سے پیر تک کیچڑ میں لتھڑا ہوا تھا۔

"تم میرا شو دیکھنے کے لئے نہیں رکے؟ میں نے تمہیں دروازے کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا۔" اس نے سگریٹ کا دھواں چھوڑتے ہوئے کہا۔

"کون سا شو؟ شوہروں کی لاش پر بیویوں کا رقص؟" کلارا کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ لیکن کچھ بولی نہیں۔ صرف نظریں اٹھا کر جلالی کو دیکھا اور بار ٹینڈر کو ڈرنک لانے کا اشارہ کر کے سگریٹ کے کش لینے لگی۔ بار ٹینڈر نے جام بنانے میں بہت تیزی دکھائی تھی۔

"دس ہزار ڈالر شاید کافی نہیں تھے!" جلالی نے ایک اور حملہ کیا۔

"دس ہزار ڈالر؟"

"وہ جو تمہیں بوتیک کھولنے کے لئے چاہئیں تھے۔ وہ دس ہزار ڈالر جو تم صبح منگی سے لے کر آئی ہو۔" جلالی اس سے صرف زبانی ہی زبانی انتقام لے سکتا تھا۔ کلارا نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ صرف اپنے گلاس کو گھورتی رہی۔ کچھ دیر بعد بولی تو آواز میں کوئی تاثر نہیں تھا۔

"وہ دس ہزار ڈالر میں نے یوسف سعید کے بیوی بچوں کو پاکستان بھیج دیئے۔"

"بیوی بچوں کو؟"

"یوسف سعید کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔ تینوں یونیورسٹی میں پڑھتے ہیں۔ اس کی بیوی گھریلو عورت ہے۔ ان کا کوئی اور ذریعہ آمدنی نہیں ہے۔ یوسف سعید جو کچھ کماتا انہیں بھیج دیتا تھا۔ مرنے سے اسی لئے ڈرتا تھا کہ اس کے بعد پاکستان میں اس کے بیوی بچوں کا کیا ہو گا۔"

"تم نے اپنے لئے کچھ نہیں رکھا؟"

"مجھے ضرورت نہیں تھی۔" وہ سگریٹ کا دھواں اڑاتے ہوئے بولی۔ "تمہارے ملک کی عورت کو کپڑے اتار کر پیٹ پالنے کی آزادی نہیں ہے۔ مجھے ہے۔ اور پھر ایک سال کی ہی تو بات ہے۔ میرا جسم ابھی بوڑھا نہیں ہوا۔"

وہ اتنی دیر میں پہلی بار مسکرائی۔ وہی نصف دائرہ بناتے ہوئے ادھ کھلے ہونٹ۔ کیچڑ اب صاف ہو گئی تھی۔ پورا بدن دھل کر سفید لباس میں لپٹ گیا تھا۔ جلالی کو اپنے اوپر غصہ آنے لگا۔ وہ کون ہوتا تھا ظاہری شواہد دیکھ کر نتائج اخذ کرنے اور فیصلہ دینے والا۔ وہ کیوں اخلاقیات کا خود ساختہ پیغمبر بن گیا تھا۔ کلارا نے اس کے چہرے کے بدلتے ہوئے رنگ دیکھے تو اسے شرمندگی سے بچانے کے لئے موضوع بدل دیا۔

"تم میگی سے ملے؟"

"تم نے اسے ایک ہی ملاقات میں اپنی لائن میں کھڑا کر لیا۔"

"اپنی اپنی قطار میں جا کر سب خود کھڑے ہو گئے ہیں۔ سب کے اپنے اپنے خواب ہیں۔ خوابوں کو سچا کرنے کے لئے کچھ کھونا پڑتا ہے۔ کچھ لینے کے لئے کچھ دینا بھی پڑتا ہے۔"

"میگی کو بھی کیا بوتیک کھولنی ہے؟"

"اسے ماڈل بننا ہے۔" کلارا اس کا طنز نظرانداز کر کے بولی۔

"وہ خوبصورت ہے' اس کا بدن بھی اچھا ہے۔ لیکن ماڈلنگ کا کورس کرنے کے لئے پیسے نہیں ہیں۔ اب چند ہفتوں بعد ہی پیسوں میں کھیلنے لگے گی۔ سال بھر کے اندر اندر ایک نمبر کی ماڈل بن جائے گی۔" جلالی بے یقینی کے انداز میں سر ہلاتے ہوئے سوچنے لگا۔ پیسے کمانے کے لئے کپڑے اتارنا کیوں ضروری ہے؟ کپڑے ایک دفعہ اتر جائیں تو انہیں دوبارہ پہننا آسان نہیں ہوتا۔ خوابوں کا یہ سفر سالوں کے سنگ میل پھلانگتا رہے گا اور پھر کسی سنگ میل پر کپڑوں کے ساتھ خواب بھی لٹکے رہ جائیں گے۔ لیکن کچھ کہنا بیکار تھا۔ اسے فکرمند دیکھ کر کلارا تسلی دینے لگی۔

"تم فکر مت کرو' وہ اب بھی تمہاری ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تمہیں پسند کرتی ہے۔ چھٹی کے دن تمہیں فون کرے گی۔ میں اسے یاد دلا دوں گی۔ وہ تمہیں شہر گھمائے گی' اپنے گھر لے جائے گی جہاں وہ اکیلی رہتی ہے۔ یا خود تمہارے گھر چلی آئے گی۔ بس تم شرمانا چھوڑ دو۔" کلارا نے اسے شوخ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں بی بلی، میں لنڈورا ہی بھلا۔" جلالی نے دل میں سوچا کہ چوہا بننے میں ہی عافیت ہے۔

"ویسے میں بھی اب فارغ ہوں۔" کلارا اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ "میں بھی تمہیں شہر گھما سکتی ہوں۔ کہو گے تو گھر آ کر تمہیں اپنا شو بھی دکھاؤں گی۔ ایک پیسہ بھی نہیں لوں گی۔ اب تو تم مجھے ہاتھ بھی لگا سکوگے۔ میں اب کسی کی بیوی نہیں ہوں۔" اس نے اپنے کپڑے ایک بار پھر اتار دیئے۔ مسکراتے اور نصف دائرہ بناتے ہوئے ادھ کھلے ہونٹ جلالی کے بدن میں سنسنی مچانے لگے۔ وہ اسٹول سے اتر کر کھڑا ہو گیا۔ کلارا بار ٹینڈر سے قلم لے کر کاغذ کے ایک پرزے پر کچھ لکھ رہی تھی۔ اسٹول سے اتر کر اس کے سامنے آ گئی۔ اتنی نزدیک کہ جلالی اسے سونگھ سکتا تھا۔

"مجھے واپس اوپر جانا ہے۔ یہ میرا فون نمبر ہے۔" اس نے کاغذ کا ٹکڑا جلالی کی جیب میں ٹھونستے ہوئے کہا۔ "جمعہ کو مجھے فون کرنا۔ وہ میری چھٹی کا دن ہے۔ میں پوری شام تمہارے لئے خالی رکھوں گی۔ صرف تمہارے لئے۔" کلارا نے اچک کر براہ راست اس کے ہونٹوں کا بوسہ لیا اور پیچھے دیکھے بغیر سیڑھیاں چڑھتی ہوئی اوپر چلی گئی۔ جلالی نے ذہن میں گونجنے والی "بنگو" کی آواز کو چپت مار کر چپ کرا دیا۔

ہونٹوں کے انگاروں نے کافی دیر اس کے چہرے کو دہکائے رکھا۔ وہ تھوڑی دیر اپنے ہونٹوں کو رگڑتا رہا اور پھر گلاس خالی کر کے اور بل چکا کر تیزی سے باہر کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ باہر نکلتے ہوئے کلارا کا دیا ہوا فون نمبر والا کاغذ پھاڑ کر اس نے میز پر رکھی ہوئی ایش ٹرے میں ڈال دیا۔ اسے اب اس گلی سے گزرنا بھی نہیں تھا۔

اسی ہفتے کیفے نیویارک میں جلالی کی امید بر آئی۔ آنابار سے بچنے کے لئے اس نے کیفے نیویارک کا نیا راستہ دریافت کر لیا تھا۔ وانسی اسٹریٹ کی بجائے عقبی گلیوں سے ہوتا ہوا اسمال بلیوارڈ اور وہاں سے آسٹوریا اور پھرا یکے چوک۔ اس راستے کی

رونقیں بھی واشی اسٹریٹ سے کم نہیں تھیں۔ وقت بھی وہ جب کندھے سے کندھا رگڑ کھاتا اور بجلی چنگاریاں چھوڑتیں۔ لیکن کیفے نیویارک کی اپنی بجلی کھو گئی تھی۔ میگی کی جگہ ایک ادھیڑ عمر چڑچڑی ویٹرس سرو کرنے لگی تھی۔ جلالی باقاعدگی سے حاضری دے رہا تھا۔ چائے پر چائے پیتا یا بڈاپسٹ سے انگریزی میں نکلنے والا اخبار چاٹا کرتا۔ جمعہ کو وقت سے ذرا پہلے آگیا تھا۔ وہ چائے منگوانے کے لئے ویٹرس کی توجہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ الزبتھ ریسٹورنٹ میں داخل ہوتی ہوئی نظر آئی۔ وہ اس کی میز کی طرف آ رہی تھی۔ جلالی اس کے پہنچنے سے پہلے کھڑا ہو گیا اور اس کے آتے ہی کھڑے کھڑے شکایت کا دفتر کھول دیا۔ کہاں تھیں؟ کیسی تھیں؟ شعر تو نہیں کہہ رہی تھیں؟ جلالی کو پتہ تھا کہ اس پر ڈپریشن کے دورے پڑتے ہیں تو وہ شاعری کرنے لگتی ہے۔ اس کا منگیتر پیٹر آنے والا تھا۔ وہ تو واپس نہیں آگیا؟ بڈاپسٹ سے باہر تو نہیں گئی ہوئی تھی؟

”مجھے سانس تو لینے دو۔“ الزبتھ نے مسکراتے ہوئے کہا اور اپنا اوورکوٹ اتارنے لگی۔ اسی وقت ویٹرس آرڈر لینے آ گئی۔ الزبتھ ویٹرس کو آرڈر دیتی رہی۔ جلالی اسے سوالیہ نظروں سے دیکھتا رہا۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں۔ میں نے کوئی شعر نہیں کہا۔ مجھ پر کوئی دورہ نہیں پڑا۔ میں بڈاپسٹ سے بھی باہر نہیں گئی۔ پیٹر ابھی تک پیرس میں ہے۔ اور کچھ؟“

”تو پھر کہاں غائب تھیں؟“

”میں اپنی ماں کے مشورے پر عمل کر رہی تھی۔“ الزبتھ یہ کہتے ہوئے ہنس پڑی۔

”تمہاری ماں نے تمہیں مجھ سے ملنے سے منع کیا ہے؟“

”ہاں!“

”کیوں؟“

”وہ روز روز تمہارا ذکر سن کر خوفزدہ ہو گئی تھی۔“

”مجھ سے؟“

”نہیں، مجھ سے۔ وہ خود کو میری نفسیات کا ماہر سمجھتی ہے۔ اس کا خیال تھا کہ میں تم سے ملتی رہی تو تمہاری محبت میں مبتلا ہو جاؤں گی۔ تم پردیسی ہو مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ گے۔ میں جدائی کا دکھ برداشت نہ کر سکوں گی اور شعر کہتے کہتے ڈپریشن کا شکار ہو کر مر جاؤں گی۔ کہو کیسا فلمی منظر ہے۔“ وہ بات ختم کرتے کرتے پھر ہنس پڑی۔ جلالی بھی ہنسنے لگا۔

”تو اپنی ماں کی طرح تم بھی مجھ سے ڈر گئیں؟“

”نہیں، تم ڈرانے والی چیز نہیں ہو۔ میں اپنے آپ سے ڈر گئی تھی۔ واقعی اگر بہک گئی تو؟“

”تو پھر آج کیوں آ گئیں؟“

”خود پر غصہ آ گیا تھا۔ میں آخر اتنی ڈرپوک کیوں ہو گئی ہوں۔ خود اعتمادی لوٹ آئی تو میں بھی واپس آ گئی۔ تم ڈرا کر دیکھو بالکل نہیں ڈروں گی۔“

”بھوں!“ جلالی نے ڈرانے کی کوشش کی اور دونوں زور زور سے ہنسنے لگے۔ اسی وقت ویٹرس چائے بھی لے آئی۔ چائے بناتے ہوئے دونوں سنجیدہ ہو گئے۔

”مجھے تمہارا اس لئے بھی انتظار تھا۔“ جلالی نے جیب سے دو ہزار ڈالر کا وہ چیک نکالتے ہوئے کہا جو دو ہفتوں سے جیب میں لئے گھوم رہا تھا اور الزبتھ کو اس کتابچے کے بارے میں بتانے لگا جو ان پیسوں کے عوض اسے لکھنا تھا۔ الزبتھ نے احتجاجاً کچھ کہنا چاہا لیکن جلالی نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روک دیا۔

”یہ انٹرویو چھاپنے کی قیمت نہیں ہے۔ میں نے اپنے افسر کو پہلے ہی بتا دیا تھا کہ تم نہیں مانو گی۔ لیکن یہ کتابچہ ہمارے لئے بہت اہم ہے۔ کسی نہ کسی کو اس کام کا معاوضہ دینا ہے تو پھر تمہیں کیوں نہیں؟“

چیک والا لفافہ بدستور جلالی کے ہاتھ میں تھا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد الزبتھ نے جلالی سے لفافہ لے لیا۔ جلالی کو مایوسی ہوئی۔ اس کا خیال تھا الزبتھ یہ چیک نہیں لے گی۔

”میں یہ اپنے لئے نہیں لے رہی۔“ الزبتھ نے شاید اس کی سوچوں کو پڑھ لیا

تھا۔ ''میں یہ پیسے اپنے ایڈیٹر کو دوں گی۔ اس جیسا کاپی رائٹر تمہیں ہنگری بھر میں نہیں ملے گا۔''

''وہ تیار ہو جائے گا۔''

''تیار؟ وہ مجھے کندھوں پر اٹھائے پھرے گا۔ اسے ہر وقت پیسوں کی ضرورت رہتی ہے۔ اس ہفتے بھی وہ اپنی تنخواہ ریس کورس میں ہار آیا ہے اور اب شراب کا خرچ ادھار مانگ مانگ کر پورا کر رہا ہے۔'' الزبتھ کھڑی ہو کر اوور کوٹ پہننے لگی۔

''ابھی سے؟ میں نے سوچا تھا ہم ڈنر ساتھ کریں گے۔''

''آج نہیں۔ آج میں ماں کے ساتھ تھیٹر جا رہی ہوں۔''

''تو پھر کل؟''

''ٹھیک ہے۔ کل شام کو۔'' الزبتھ کچھ دیر سوچنے کے بعد کہنے لگی۔ ''لیکن کسی ہوٹل میں نہیں جائیں گے۔ تمہارے گھر آ کر تمہارے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھاؤں گی۔ منظور؟''

دوسرے دن وہ شام سے ہی آ گئی تھی لیکن جلالی کے فلیٹ کی طرف جاتے ہوئے ستار کے فلیٹ کے سامنے سے گزری تو اسی وقت ستار باہر نکل رہا تھا۔ اس کے اصرار پر الزبتھ گھر کے اندر گئی تو ستار کی بیوی کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ وہ کتنی مختلف تھی۔ اس نے پہلے کبھی اتنے قریب سے کسی پاکستانی عورت کو نہیں دیکھا تھا۔ ستار کی بیوی لال رنگ کے بڑے پھولوں والا شلوار قمیض کا جوڑا پہنے ہوئے تھی۔ الزبتھ کو دیکھتے ہی اس نے سر پر اسی سے ملتا جلتا لال رنگ کا دوپٹہ بھی اوڑھ لیا۔ جیسے کسی نامحرم سے پردہ کر رہی ہو۔ ناک میں سونے کی چھوٹے سے پھول جیسی لونگ تھی جس کے بیچ میں چھوٹا لال روبی لگا ہوا تھا۔ الزبتھ نے اسے چھو کر دیکھا تو روبی کے رنگ ستار کی بیوی کے سانولے چہرے پر پھیل گئے۔ وہ انگریزی نہیں بول سکتی تھی۔ لیکن الزبتھ کی تعریفیں سن سن کر شرما رہی تھی۔ الزبتھ کبھی اس کے کپڑوں کو چھو کر دیکھتی، کبھی کس کر بندھی ہوئی بالوں کی لمبی چوٹی کو ہاتھ میں لے کر اس کے بل گننے لگتی۔ خوشی سے ستار کی باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔ ستار کی بیوی شرما چکی تو اس کے چہرے پر

وہ اداسی چھا گئی جو اس کے چہرے پر ہمیشہ طاری رہتی تھی۔ ستار الزبتھ کو بتانے لگا۔

"یہ یہاں خوش نہیں ہے۔"

"کیوں؟ کیا بڈاپسٹ پسند نہیں آیا؟"

"بہت پسند آیا ہے' لیکن اسے ہر وقت بچوں کی یاد ستاتی ہے۔"

"بچے ہیں کہاں؟"

"میری دو بیٹیاں ہیں۔ دونوں ملتان میں اپنی دادی کے پاس رہتی ہیں۔ وہیں اسکول میں پڑھتی ہیں۔"

"لیکن کیوں؟ کیا وہاں کے اسکول یہاں سے اچھے ہیں؟"

"میری ماں پرانے زمانے کی عورت ہے۔ کہتی ہے بچیاں یہاں کے آزاد ماحول میں خراب ہو جائیں گی۔"

"کیا یہاں کا ماحول واقعی اتنا خراب ہے؟"

"میری ماں کو دنیا کا کچھ پتہ نہیں۔ وہ یہی سمجھتی ہے۔"

"لیکن وہ تمہارے بچے ہیں۔ تم نے ماں کی بات کیوں سنی۔ دیکھو تمہاری بیوی کتنی دکھی لگتی ہے۔" الزبتھ نے ستار کی بیوی کو اپنے قریب کھینچ لیا۔ وہ اور سکڑ گئی۔ چہرے کی اداسی بھی گہری ہو گئی۔

"ماں کی بات کوئی کیسے ٹال سکتا ہے۔" ستار نے حیرت سے کہا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ اس گفتگو سے فرار چاہتا تھا۔ "میں جلالی صاحب کو بھی بلا کر لاتا ہوں۔ وہ آپ کا انتظار کر رہے ہوں گے۔"

"جلالی ستار کے گھر آیا تو الزبتھ ستار کی بیوی سے چٹیا بنوا کر بچوں کی طرح خوش ہو رہی تھی۔ بال چھوٹے تھے اس لئے چھوٹی سی چوٹی بنی تھی۔ بالوں کے کس جانے کی وجہ سے چہرے کے نقوش زیادہ نمایاں ہو گئے تھے جیسے کوئی فش لینس لگا کر تصویر لے رہا ہو۔ کھانا پکنے کے دوران الزبتھ زیادہ تر ستار کی بیوی کے ساتھ کچن میں رہی۔ روٹی پکانے میں مدد کرنے کی کوشش کی تو انگلی جل گئی۔ دیر تک انگلی کو ہونٹوں میں لئے چوستی رہی۔

الزبتھ نے ستار کی بیوی کے پاکستانی لباس کی اتنی تعریف کی تھی کہ واپس جاتے ہوئے انہوں نے اسے بہت اصرار کر کے شلوار قمیض کا ایک جوڑا تحفے میں دے دیا۔ الزبتھ نے بہت جذباتی ہو کر کہا تھا کہ اسے یہ ڈنر ہمیشہ یاد رہے گا۔ نیچے تک چھوڑنے صرف جلالی اس کے ساتھ آیا تھا۔ ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے الزبتھ نے اس کے گال پر الوداعی بوسہ دیا تو جلالی کو کلارا کا دیا ہوا سبق یاد آ گیا۔ "جس رات شب بخیر کہتے ہوئے ہونٹوں پر بوسہ دے دے تو......" جلالی واپس جانے والی ٹیکسی کی سرخ عقبی بتیوں کو دیکھ کر مسکرایا اور "بنگو" کہہ کر سیٹی بجاتا ہوا اوپر جانے کے لئے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

الزبتھ اب اس سے ملنے باقاعدگی سے کیفے نیویارک آنے لگی تھی۔ پیر کو اس کے ساتھ اس کا ایڈیٹر بھی آیا تھا۔ جلالی نے اسے کتابچے کا سارا مواد دیا تھا۔ ایک ایک چیز اچھی طرح سمجھائی تھی۔ ایڈیٹر بہت خوش تھا۔ ایک ہفتے بعد جب اس نے کتابچہ دیا تو اس نے صرف ترجمہ ہی نہیں کیا تھا بلکہ پورا کتابچہ ڈیزائن کر کے دیا تھا۔ جلالی نے یانوش کو دکھایا تو وہ حیران ہو گیا۔

"ڈیزائننگ پر کم از کم دو ہزار ڈالر خرچ ہوتے' وہ بچ گئے۔ اس سے اچھا ترجمہ بھی ممکن نہیں تھا۔" یانوش سے سند مل گئی تو جلالی نے لے جا کر سارا کام منگی کی میز پر رکھ دیا۔ چھپوانے کا کام اسی کو کرنا تھا۔ شام کو بھٹی نے اسے دو ہزار ڈالر کا چیک لا کر دے دیا۔ یہ چیک بھی الزبتھ کے نام تھا۔

اب ان کا زیادہ وقت کیفے نیویارک میں گزرتا تھا۔ اکثر الزبتھ کا کوئی جاننے والا آ کر گفتگو میں شامل ہو جاتا ورنہ وہ گھنٹوں بیٹھے ایک دوسرے کی سنتے اور جب تھک جاتے تو اوور کوٹوں کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر کندھے سے کندھا ملائے نئے نئے مقامات کے سفر پر نکل پڑتے۔ رخصت ہوتے ہوئے الزبتھ الوداعی بوسہ دیتی تو برفانی ہواؤں کے باوجود جلالی کے گال پر انگارے دہک اٹھتے۔ الزبتھ نے جلالی کو عجائب گھروں کی سیر کرانے کا بیڑہ اٹھایا تھا۔ لیکن جلالی کو وہ خود ایک مجموعۂ عجائب لگنے لگی

تھی۔ ایسی ایسی باتوں پر اداس ہو جاتی جن سے اس کا تعلق یا جن پر اس کا اختیار نہیں تھا اور کبھی چھوٹی چھوٹی باتوں پر بچوں کی طرح خوش ہونے لگتی۔ اسے سمجھنا آسان نہیں تھا۔ جلالی کو یقین تھا کہ پیٹر بھی اس کی طرح حساس اور سمجھدار ہو گا۔ اسی لئے ان کا تعلق الگ الگ رہ کر بھی قائم تھا۔ وہ کبھی پیٹر کے بارے میں بات نہیں کرتی۔ جلالی نے ایک بار چھیڑا تھا تو ٹال گئی۔

"پیٹر مجھ سے زیادہ میری ماں کا شوق ہے۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا اور پھر بات بدل دی۔

ایک دن وہ اسے آرٹ گیلری میں لے گئی۔ محلوں جیسا اونچی چھتوں اور پتھر کے ستونوں والا میوزیم جس کی دیواروں پر لگی ہوئی تصویریں مصوری کا کمال اور تاریخ کا آئینہ تھیں۔

"تم کو پتہ ہے ہم پر ڈیڑھ سو سال ترکی کے مسلمان بادشاہوں کی حکومت رہی تھی؟"

وہ اس وقت آرٹ گیلری کے اس حصے میں تھے جہاں ہاتھوں میں چاند تارے کا جھنڈا لئے ہوئے سپاہی یا لمبے ہاتھوں اور بڑے قد والے نیزہ بردار جن کے گنجے سر سے ایک بڑی سی چوٹی لٹک رہی تھی آزادی کی لڑائی لڑنے والوں کو تہہ تیغ کر رہے تھے۔ جلالی نے صرف سر ہلا دیا۔ وہ چار سو سال پرانی جنگ میں شامل ہو کر الزبتھ سے تعلقات خراب نہیں کرنا چاہتا تھا۔ الزبتھ کی تاریخ کے ولن جلالی کی تاریخ کے مردان مجاہد تھے۔ لیکن کیا یہ واقعی اس کی تاریخ تھی؟ شاید! اپنی تاریخ میں کچھ نہ ہو تو دوسروں کی تاریخ ادھار لے کر پیوند لگانے پڑتے ہیں۔ لیکن ترکوں کی تاریخ ترکی کی تاریخ تھی۔ عربوں کی تاریخ شام، عراق اور عرب جزائر کی تاریخ تھی۔ مغلوں کی تاریخ ہندوستان کی تاریخ تھی۔ جس زمین پر وہ رہتا تھا اس کی کیا تاریخ تھی؟ وہ کس سن اور صدی کو اپنی تاریخ کا پہلا باب شمار کرے۔ ہڑپہ، ٹیکسلا، موہنجوداڑو؟ لیکن وہ تو بت پرستی کا دور تھا۔ فاتح سندھ کو؟ لیکن اس زمین پر رہنے والے اسے لٹیرا کہتے تھے، خود اس کے حاکم نے اسے معزول کر کے بوری میں بندھوا دیا تھا۔ پھر ۱۹۴۷ء کو؟ وہ

فسادات کا سال تھا' خونریزی' لوٹ مار' ہجرتیں اور اس کے بعد کے سال.....؟ وہ بھی سب ٹوٹ پھوٹ کے سال تھے جن کے بطن سے شخصی حکمرانی کے شرمناک دور نکلے تھے۔ ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء......؟ اس دن تو ایک عظیم المیے نے جنم لیا تھا' وہ سر جھکانے کا دن تھا۔ اپنی تاریخ کے کس موڑ پر وہ سربلند کرے۔ جلالی جھنجلا گیا۔

"ترک گئے تو ہم آسٹریا کے غلام ہو گئے۔" الزبتھ کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ کچھ دیر تک تو اس کی سمجھ میں نہیں آیا وہ کیا کہہ رہی تھی۔ وہ بھی شاید اپنی تاریخ کے عذابوں کو برداشت کر رہی تھی۔

"ان کے بعد سفید فاشسٹ بھیڑیئے ہماری چیر پھاڑ کرنے آ گئے۔"

"ہٹلر؟" جلالی نے الزبتھ کی تاریخ میں واپس آتے ہوئے کہا۔

"نہیں' وہ تو بہت بعد میں آیا تھا۔ فاشسٹوں کے معاملے میں ہم خود کفیل تھے۔ ہمارے اپنے فاشسٹ تھے۔" وہ جانے کیوں ہنس پڑی۔ "ہٹلر جنگ عظیم شروع ہونے کے بعد آیا۔ وہ گیا تو انقلاب آ گیا اور روس ہمارا آقا بن گیا۔ روس گیا تو آزادی کے نام پر ہم امریکہ کے غلام ہو گئے۔" وہ ایک بار پھر ہنس پڑی۔

آرٹ گیلری سے نکل کر وہ دیر تک ہیروز اسکوائر میں گھومتے رہے۔ روم کی طرح کے پتھروں کے بڑے بڑے ستونوں والے در تھے جن پر بنے ہوئے گھوڑوں کے بت اور ان پر بیٹھے ہوئے جنگجو شہسواروں کے مجسمے انہیں دو ہزار سال پرانے دور میں لے گئے۔ شور مچاتی ہوئی ایک بس آ کر رکی تو وہ واپس بیسویں صدی میں آ گئے۔ وہ چند لمحوں میں صدیوں کا سفر طے کر آئے تھے۔ سردی زیادہ لگنے لگی تو وہ ایک کیفے میں گھس گئے۔ الزبتھ کا موڈ ابھی تک بحال نہیں ہوا تھا۔

"تمہیں اپنا گزرا ہوا کل اداس نہیں کرتا؟" الزبتھ نے دونوں ہاتھوں سے کافی کے کپ کو منہ تک لے جا کر کہا۔

"ہم بہت ہوشیار لوگ ہیں۔ آج میں زندہ رہتے ہیں۔ کل کو پلٹ کر نہیں دیکھتے؟" جلالی نے مسکرا کر کہا۔

"تاریخ سے کوئی سبق نہیں سیکھتے؟"

"ہماری تاریخ میں سیکھنے کے لئے کوئی اچھا سبق ہے ہی نہیں۔ اس لئے ہم ہر سال نئی تاریخ لکھتے ہیں۔"

"تمہارا آنے والا کل اچھا نہیں ہو گا۔" الزبتھ نے مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے فیصلہ سنایا۔ جلالی نے سوچا اس سے جو تاریخ کا گہرا شعور رکھتی ہے پوچھے کیا اس کا کل اچھا ہو گا۔ لیکن وہ خاموش رہا۔ بلکہ دل ہی دل میں اس کی حمایت پر آمادہ ہو گیا۔ الزبتھ کی تاریخ میں ایک تسلسل تو تھا۔ کچھ لوگ ہاتھوں میں مشعل لئے چل رہے تھے۔ اچھا نہ سہی اچھا ہونے کی امید تو تھی۔ وہ اپنے شہسواروں کو شمار کرنے لگا۔ کسی کے ہاتھ میں مشعل نہیں تھی۔ سب کے ہاتھ خون سے تر تھے۔ امیدوں کا سوداگر کوئی نہیں تھا۔

"میں کل تمہارے گھر آ رہی ہوں۔" الزبتھ نے اسے ایک بار پھر چونکا دیا۔

"میرے گھر؟"

"تمہاری عمارت میں۔ میں نے ستار کی بیوی سے اسے انگریزی پڑھانے کا وعدہ کیا ہے۔"

"تم نے ستار سے پوچھ لیا تھا؟" جلالی نے اسے حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے ضرورت نہیں تھی لیکن پھر بھی پوچھ لیا تھا۔ تم لوگ اپنی عورتوں کو غلام بنا کر کیوں رکھتے ہو۔ کھانا پکانے کے سوا ان کا کوئی مصرف نہیں ہے۔" جلالی ہنسنے لگا۔ وہ اپنی تاریخ کا غصہ نکال رہی تھی۔

"یہ ہنسنے کی بات نہیں ہے۔ ایک دفعہ اس کا اعتماد بحال ہو گیا تو اپنے پاؤں پر کھڑی ہو جائے گی۔" یہ کسی اور دنیا کے خواب تھے جنہیں وہ اپنا سمجھ کر دیکھ رہی تھی۔

"تمہاری محنت بیکار جائے گی۔ ساس کے سامنے جا کر انگریزی کیا وہ پنجابی بھی بھول جائے گی۔" الزبتھ اسے غصے سے دیکھنے لگی۔ رخصت ہوتے ہوئے آج اس نے اس کے گالوں پر انگارہ بھی نہیں دہکایا۔

دوسرے دن جلالی دفتر نہیں گیا۔ الزبتھ ستار کے گھر سے فارغ ہو کر اس کے

فلیٹ میں آئی تو بہت خوش تھی۔

"انگریزی پڑھا دی؟" جلالی نے ہنس کر پوچھا۔

"ہاں۔ تم کو پتہ ہے وہ بی اے پاس ہے۔ انگریزی پڑھنا جانتی ہے۔ صرف بول نہیں سکتی۔ تم دیکھنا مہینے بھر میں وہ فرفر انگریزی بولنے لگے گی۔"

"ملتان میں اس کی ساس....."

"وہ کہتی ہے ساس کو بھی انگریزی سکھا دے گی۔" دونوں ہنسنے لگے۔ جلالی سوچنے لگا ایک ہی دن کے سبق نے ستار کی نہ بولنے والی بیوی کو زبان دے دی تھی۔

"آؤ کہیں باہر چلیں۔"

"کہاں؟"

"شہر سے باہر ڈینوب کو آزادی سے بہتا دیکھیں گے۔ وہاں سیمنٹ کے کنارے نہیں ہیں۔ دریا کا قدرتی کٹاؤ ہے۔ تم دیکھنا ڈینوب کو نیلا دریا کیوں کہتے ہیں؟"

"اس موسم میں؟ کتنی سردی ہے۔ شاید برفباری بھی ہونے والی ہے۔"

"مزا آ جائے گا۔ کھلی فضا میں موسم کی پہلی برفباری دیکھو گے تو پچھلے موسم کی ساری تھکن دھل جائے گی۔"

جلالی نے اپنا اوورکوٹ سنبھال لیا۔ الزبتھ کے منع کرنے کے باوجود وہ ریلوے اسٹیشن تک ٹیکسی سے آئے تھے۔ ٹرین کے ایک گھنٹے کے سفر کے بعد وہ ایک چھوٹے سے قصباتی اسٹیشن پر اترے تو بہت زمانے بعد جلالی کو کچی مٹی کی خوشبو آئی۔ تھوڑے فاصلے پر ایک چھوٹا سا بازار تھا۔ لیکن وہ کہیں رکنے کے بجائے ٹہلتے ہوئے دریا کے کنارے کی طرف بڑھ گئے۔ راستے میں کئی ریسٹورنٹ تھے جن کی چمنیوں سے نکلتا ہوا دودھیا دھواں اچھا لگ رہا تھا۔ آسمانوں پر گہرے سفید بادل چھائے ہوئے تھے' لیکن اندھیرا نہیں تھا۔ ہوا رکی ہوئی تھی اس لئے سردی بھی کم تھی۔ الزبتھ نے غلط نہیں کہا تھا۔ دریا اپنے قدرتی موڑ لے رہا تھا۔ مصنوعی سہارے دے کر اس کی کمر سیدھی کرنے کی کوشش نہیں کی گئی تھی۔ نہ سینہ چیر کر پانی میں راستے بنائے گئے تھے۔ پانی جس میں ہلکی سی نیلاہٹ گھلی ہوئی تھی' سردی سے ٹھٹھر کر سکڑا ہوا خاموش

کھڑا تھا۔

وہ دریا کے کنارے پتھروں پر بیٹھ گئے۔ جلالی نے دو سگریٹ اپنے ہونٹوں میں لگا کر سلگائے اور پھر ایک سگریٹ نکال کر الزبتھ کے ہونٹوں میں ٹوم دیا۔ وہ اپنے دونوں ہاتھ پیچھے پتھر پر لٹکائے ہوئے گہرے گہرے کش لینے لگی۔ اس کے اوورکوٹ کے سارے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ اس پر سردی کا کوئی اثر نہیں تھا۔ جلالی نے گردن تک بٹن لگائے ہوئے تھے پھر بھی اندر ہی اندر کپکپا رہا تھا۔ الزبتھ کے سینے کے زیرو بم دیکھ کر کپکپی اور بڑھنے لگی۔ اس نے اپنی نظریں دریا پر جما دیں۔ دریا کی سطح خاموش تھی لیکن جلالی کو لگا جیسے اس کی تہہ میں چاندنی رات میں پاگل ہو جانے والے سمندر کی موجوں کا جوار بھاٹا زور دکھا رہا ہو۔ جلالی نے آخری کش لے کر سگریٹ کا جلتا ہوا ٹوٹا دریا کی طرف پھینک دیا۔ وہ پانی میں آگ لگانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن نشانہ چوک گیا۔ الزبتھ اپنا سگریٹ پہلے ہی ختم کر چکی تھی اور اب وہ بھی دو سگریٹ ہونٹوں میں دبائے انہیں ماچس دکھا رہی تھی۔ دونوں کے درمیان سگریٹ پینے کے معاملے میں یہ ایک ان کہا معاہدہ تھا۔ جو بھی سگریٹ پینا چاہتا وہ دو سگریٹ ایک ساتھ جلاتا تھا۔

"مجھے سردیاں اچھی لگتی ہیں۔ طبیعت میں بہت توازن اور ٹھہراؤ آ جاتا ہے۔" الزبتھ نے خاموشی توڑی۔ "لیکن اس دفعہ جانے کیوں بہت بے چینی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جسم کے اندر بہت سے سورج چمک رہے ہوں۔" اس نے سگریٹ کا ایک اور کش لیا اور نظریں جلالی کی طرف کر دیں۔ وہ اب اپنے آپ سے نہیں جلالی سے مخاطب تھی۔ "تمہیں بہار کا موسم پسند آئے گا۔ پھولوں کے اتنے رنگ کھلتے ہیں کہ قوس قزح آنکھوں میں گھر کر لیتی ہے۔ دل میں ہر وقت جلترنگ بجنے لگتے ہیں۔"

"تمہیں پسند نہیں ہے۔"

"کیا؟"

"بہار کا موسم۔ قوس قزح۔ جلترنگ۔"

"کیوں نہیں، بہت پسند ہے۔" وہ ایک دم ہنس پڑی۔ جلالی سوچنے لگا جلترنگ

تو کسی بھی موسم میں بج سکتی ہے۔

"لیکن بہار کا موسم پاگلوں پر بہت بھاری گزرتا ہے۔" وہ ہنستے ہنستے سنجیدہ ہو گئی۔

"تین چار مہینے بعد بہار آئے گی تو میں تمہیں ہنگری کا اصلی چہرہ دکھاؤں گی۔ ہم ٹرین سے سفر کریں گے اور دیہات کا لینڈ اسکیپ دیکھتے ہوئے سلوو کیہ کی سرحد پر ان غاروں میں جائیں گے جن میں میلوں اندر تک جھیلیں چلی گئی ہیں۔ چھوٹی سی کشتی میں ایک سے دوسرے غار کا سفر کریں گے اور پانی نے پتھروں کو پگھلا کر جو شکلیں بنائی ہیں ان میں اپنے چہرے تلاش کریں گے۔" جلالی سوچنے لگا لڑکیاں کسی ماحول' کسی بھی سماج کی ہوں' خواب ضرور دیکھتی ہیں۔

"میں شاید تمہارے ملک کی بہاریں نہ دیکھ سکوں۔"

"کیوں؟"

"میں جلد ہی واپس جانے والا ہوں۔"

"واپس؟ اتنی جلدی؟ کب؟؟" الزبتھ کی آنکھوں کے خواب جیسے چور چور ہو گئے۔

"میں اتنی ہی مدت کے لئے آیا تھا۔"

"لیکن کیوں؟ کیا کرنے؟"

"یہ میرے ملک کا راز ہے' تمہیں نہیں بتاؤں گا۔" جلالی نے ہنستے ہوئے کہا۔ اور دو سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں لے لئے۔

"راز!" الزبتھ بھی اپنے اعصاب ڈھیلے چھوڑ کر اس کی آنکھوں کے سامنے انگلی نچاتے ہوئے چیلنج کرنے لگی۔ "ایک منٹ میں اگلوا سکتی ہوں۔ ایک منٹ میں۔ لیکن مجھے تمہارے ملک کے رازوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

"اتنی باکمال ہو؟"

"یہ میرا کمال نہیں ہے۔ تم کچھ چھپا ہی نہیں سکتے۔ تمہاری آنکھیں سب کچھ کہہ دیتی ہیں۔ تم کبھی اچھے جواری نہیں بن سکتے۔ تمہارے پتے سب کو نظر آ جائیں

گے۔"

"تو بتاؤ میری آنکھیں اس وقت کیا کہہ رہی ہیں؟"

"یہی کہ میں بالکل بدھو ہوں۔" الزبتھ نے کہا اور ہنستے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"چلو سامنے چل کر بیٹھیں گے۔" جلالی جھینپتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ تھوڑے فاصلے پر پارک تھا۔ ایک طرف گھنے درختوں نے مل کر چھت سی بنا دی تھی جس کے نیچے لکڑی کی بنچیں پڑی تھیں۔ ان کا رخ انہی بنچوں کی طرف تھا لیکن وہ ابھی راستے ہی میں تھے کہ برفباری شروع ہو گئی۔ جلالی کا خیال تھا برف اولوں کی طرح پڑتی ہو گی یا بارش بن کر گرتی ہو گی۔ کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ بس فضا میں سفید ذرے تیرنے لگے تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں ہر چیز پر سفیدی کی تہہ بیٹھ گئی۔ پیڑوں پر' پتوں پر' کھپریل کی لال چھتوں پر اور زمین پر بچھی ہوئی گھاس پر' ان کے اوور کوٹوں اور ٹوپیوں پر' پلکوں اور بھنوؤں پر' جلالی کی مونچھوں پر۔ جلالی تیزی سے کنج عافیت کی طرف بڑھنے لگا لیکن الزبتھ وہیں رک گئی۔ وہ چہرہ اٹھا کر اوپر کی طرف دیکھ رہی تھی جیسے آسمان میں کوئی سوراخ ڈھونڈ رہی ہو۔ چہرہ نیچے کیا تو دونوں ہاتھ پروں کی طرح کھول دیئے۔

"آؤ تم بھی آؤ۔ دیکھو آسمان سے سفید پوش پریاں اتر رہی ہیں۔" اس نے جلالی کی طرف رخ کر کے کہا جو تھوڑے فاصلے پر تذبذب کے عالم میں کھڑا تھا۔ الزبتھ نے اسی طرح ہاتھ پھیلائے پھیلائے گھومنا شروع کر دیا۔ سردیوں نے جو توازن دیا تھا وہ شاید اس نے کھو دیا تھا۔ یا پھر یہ موسم کی پہلی برفباری کو خوش آمدید کہنے کا روایتی انداز تھا۔ جلالی نے سوچا برفباری کا مزا لینا ہے تو کسی کنج عافیت میں چھپ کر بیٹھنے کا کیا فائدہ۔ وہ بھی الزبتھ کی طرف بڑھ گیا۔ الزبتھ اسی طرح دونوں بازو پھیلائے گھومتی ہوئی آسمان کی طرف منہ کئے زور زور سے کوئی نظم پڑھ رہی تھی۔

آسماں کی سفید پریو آؤ
دیکھو تو
خواہش کے کیسے الاؤ بھڑک رہے ہیں

افق تا افق

ہوس کے تاریک سورج
بدن میں میرے چمک رہے ہیں
تم اپنے ہونٹوں کی برف رکھ کر
ٹھنڈے سفید بادل کی
چادر اوڑھا کر
مرنے والوں کو
جینا سکھاؤ
آسماں کی سفید پریو آؤ
خانۂ دل میں میرے
سفیدی اگاؤ
آسماں کی سفید پریو آؤ

جلالی اس کے قریب کھڑا اسے ناچتے اور گاتے دیکھتا رہا۔ جیسے سچ مچ چاروں طرف سفید پریاں ناچ رہی ہوں۔ الزبتھ نے اس کے ہاتھ پکڑ لئے اور اسے بھی گھمانے لگی۔ جلالی بے اختیار ہو کر ہنس رہا تھا۔ وہ تھک کر رکی تو اس نے دونوں ہاتھوں میں زمین پر پڑی ہوئی برف جمع کی اور جلالی کے چہرے پر مل دی۔ جلالی نے اپنے ہاتھوں میں برف سمیٹی تو وہ ہنستی ہوئی بھاگ گئی۔ جلالی نے برف کا گولا بنا کر اسے دے مارا۔ الزبتھ نے بھی جواب میں برف کا ایک گولا پوری قوت سے اس کی طرف پھینکا جو جلالی کے سینے پر آ کر پھٹ گیا۔ وہ دیر تک برف سے گولہ باری کرتے رہے۔ برفباری تیز ہو گئی تھی۔ سفید سایوں جیسے برف کے دو بھوت ایک دوسرے کو پکڑنے کی کوشش کرتے ہوئے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ ایک بار ایک درخت کے گرد چکر لگاتے ہوئے جلالی نے الزبتھ کو جا لیا۔ وہ بھی پکڑے جانے کے خوف سے سکڑ کر کھڑی ہو گئی۔ آنکھیں کہہ رہی تھیں ”پکڑو نا“ لیکن جلالی قریب پہنچ کر کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ سمجھ میں نہیں آیا کیا کرے۔ وہ تھوڑی دیر اسی طرح کھڑے

رہے اور پھر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اس کنج کی طرف آ گئے جہاں برف کی پہنچ نہیں تھی۔ دونوں نے اپنے اپنے اوورکوٹ اور ٹوپیاں اتار کر ان سے برف جھاڑی اور سگریٹ سلگا کر بنچ پر بیٹھ گئے۔

"موسم کی پہلی برف کنواری لڑکی کے چہرے پر ملنا نیک شگون ہے۔" وہ جلالی کی طرف دیکھتی ہوئی مسکرا کر کہنے لگی۔

"میں ابھی شگون پورا کرتا ہوں۔" جلالی نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"شگون پورا ہو چکا۔" اس نے جلالی کا ہاتھ پکڑ کر بٹھا دیا۔ "میں غیر شادی شدہ ہوں لیکن کنواری نہیں ہوں' میں نے اسی لئے برف تمہارے چہرے پر مل دی تھی۔"

"لیکن میں لڑکی نہیں ہوں۔"

"کنوارے تو ہو۔"

"تمہیں کیسے معلوم؟"

"تمہارے چہرے کے بدلتے ہوئے رنگ سے۔" وہ کھل کھلا کر ہنس دی۔ جلالی کا چہرہ واقعی سرخ ہو گیا۔ ہونٹ بھی پھڑپھڑا کر رہ گئے۔

"تمہیں معلوم ہے جن لوگوں کا اوپر کا ہونٹ نچلے ہونٹ کے مقابلے میں بھاری ہو وہ جنسی طور پر بہت بھوکے ہوتے ہیں۔" الزبتھ نے آخری کش لے کر سگریٹ پھینکتے ہوئے کہا۔

"اور جن کا نچلا ہونٹ؟"

"وہ بہت پیاسے ہوتے ہیں۔"

"دونوں ہونٹ ایک دوسرے کے برابر ہوں' تمہارے جیسے تو؟"

"وہ بہت متوازن ہوتے ہیں۔ بالکل تمہارے جیسے۔" الزبتھ نے کہا اور دونوں ہاتھ جلالی کے گلے میں ڈال کر اپنے ہونٹ اس کے ہونٹوں پر رکھ دیئے۔ جلالی جو اس اچانک حملے کے لئے تیار نہیں تھا ایک لمحے کے لئے سکتے میں رہ گیا۔ الزبتھ شرمندہ ہو کر ایک دم الگ ہو گئی۔ جلالی کو اپنے اوپر سخت غصہ آیا۔ وہ اتنا بیوقوف کیوں ہو جاتا

ہے۔ اس نے الزبتھ کی طرف کھسک کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لینا چاہا لیکن اس نے وقت کھو دیا تھا۔ الزبتھ ہاتھ چھڑا کر کھڑی ہو گئی اور سگریٹ سلگانے لگی۔ اس بار اس نے صرف ایک سگریٹ سلگایا تھا۔ جلالی ایک بار پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھانے کی کوشش کرنے لگا۔

"دیر ہو گئی ہے اب چلتے ہیں۔ پانچ بجے کی ٹرین نکل گئی تو اگلی ٹرین دو گھنٹوں بعد آئے گی۔" اس نے اپنی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ جلالی بھی کچھ کہے بغیر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ واپسی کا سفر بہت خاموشی سے طے ہوا تھا۔ ٹرین میں بھی خاموشی رہی۔ وہ دروازے کے پاس کھڑے ہوئے سگریٹ پیتے اور تیزی سے گزرتے ہوئے مناظر کو دیکھتے رہے۔ ہر طرف سفیدی پھیلی ہوئی تھی جو آہستہ آہستہ اندھیرے میں گم ہو رہی تھی۔ الزبتھ نے جو اچانک پیش رفت کی تھی وہ اس پر اب تک شرمندہ تھی۔ اور جلالی سوچ رہا تھا کہ اس کی بیوقوفی شاید اس کی سب سے بڑی عقلمندی تھی۔ اس کے پاس رومیو جیولٹ کھیلنے کا وقت کہاں تھا۔ ویسے غلطی اس کی ہی تھی۔ وہ بہت تیزی سے الزبتھ کے قریب گیا تھا۔ وہ قریب آ گئی تو ڈر گیا تھا۔ اسے چاہئے تھا خواہشوں کو لگام دینے کے لئے اوپر کے بھاری ہونٹ والی کلارا یا نیچے کے بھاری ہونٹ والی میگی میں سے کسی ایک کو اپنا لیتا۔ الزبتھ تو دل میں جڑ کر کے پھیل جانے والی بیل تھی۔ منگیتر کی ڈور میں بھی بندھی ہوئی تھی۔ اور پھر اس کی ماں۔ وہ کن پیچیدگیوں میں الجھنے جا رہا تھا۔

وہ بڈاپسٹ پہنچ گئے تو جلالی نے دو سگریٹ سلگائے اور ایک الزبتھ کے ہونٹوں میں لگا کر پوچھنے لگا۔

"کل اتوار ہے۔ ملو گی؟" وہ تھوڑی دیر اسے خالی نظروں سے دیکھتی رہی اور پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔

"شام چار بجے کیفے نیویارک میں؟" اس نے ایک بار پھر ہاں کے انداز میں سر ہلایا اور ہاتھ ہلا کر خدا حافظ کہتی ہوئی ٹیکسی روکنے لگی۔

دوسرے دن کیفے نیویارک میں جلالی بہت دیر تک اس کا انتظار کرتا رہا۔ پانچ

بج چکے تھے' شاید کسی وجہ سے وہ آ نہیں سکی تھی۔ پورا اخبار چاٹ چکا تھا۔ ایک کونے میں چھوٹی سی خبر پاکستان کی بھی تھی۔ نامعلوم مسلح افراد نے اندھا دھند فائرنگ کر کے پندرہ لوگوں کو ہلاک کر دیا تھا۔

جلالی سوچنے لگا عامر نذیر کو ہٹانے کے لئے ابھی کتنے اور بے گناہوں کا خون بہے گا۔ جلالی اٹھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ الزبتھ آتی ہوئی نظر آ گئی۔ دیر سے آنے کی کوئی معذرت نہیں۔ بس خاموشی سے اپنے اوورکوٹ' دستانے اور ٹوپی اتار کر ویٹرس کو متوجہ کرنے لگی۔ جلالی اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ چہرہ کل سے زیادہ سوجا ہوا تھا۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔ وہ ہمیشہ ترو تازہ اور خوشگوار موڈ میں آتی تھی۔ شاید اس پر کل کا اثر ابھی تک باقی تھا۔

"تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟" جلالی نے اسے ایک سگریٹ سلگا کر دیتے ہوئے پوچھا۔ اس نے صرف سر ہلا دیا اور دونوں ہاتھوں سے چائے کی پیالی اٹھا کر منہ سے لگا لی۔ تھوڑی دیر تک وہ اسی طرح خاموش رہی۔ جلالی بھی خاموش بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔

"تم کب جا رہے ہو؟" الزبتھ نے خاموشی توڑی۔

"کل۔ پرسوں۔ اگلے ہفتے یا ممکن ہے ایک مہینے بعد۔"

"رک نہیں سکتے؟"

"کیوں؟" جلالی نے اسے حیرت سے دیکھا۔

"تم نے خود ہی تو بتایا تھا کہ کتنے مایوس ہو۔ ایسی تاریک سرنگ میں رہ رہے ہو جس کے دونوں دہانے اندھیرے میں ہیں۔ امید کا کوئی دیا نظر نہیں آتا۔ روشنی میں آ کر کیوں نہیں رہتے؟"

"وہ اندھیری سرنگ میری اپنی ہے۔ مجھے تمہارے زیر زمین راستوں میں جلتے ہوئے بلب کی روشنی پسند نہیں ہے۔" جلالی نے غصے سے کہا۔ اس کی آنکھوں میں اچانک آسٹوریا کے ریلوے اسٹیشن پر زیر زمین راستے میں بیٹھا ہوا وہ ٹنڈا فقیر گھوم گیا جس کے دونوں ہاتھ کہنیوں تک کٹے ہوئے تھے اور جن سے وہ ماؤتھ آرگن پکڑے

ہوئے اس طرح بجا رہا تھا جیسے ُبھٹہ منہ میں لئے اس کے دانے چبا رہا ہو۔ آرگن سے بے تکی سی کوئی دھن نکل رہی تھی۔ سامنے رومال بچھا ہوا تھا جس پر را ہگیر کچھ سکے ڈال گئے تھے۔ جلالی بھی جیب میں سکے تلاش کرنے لگا تھا۔ اسی وقت نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کی ہنستی گاتی ہوئی ایک ٹولی وہاں سے گزری۔ وہ شاید کسی رقص گاہ سے واپس آ رہے تھے۔ وہ رک کر ماؤتھ آرگن کی دھن پر تھرکنے لگے تو ٹنڈا بھی اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ لڑکے لڑکیوں نے دائرہ بنا کر اسے اپنے گھیرے میں لے لیا تھا اور کورس کی شکل میں گاتے ہوئے ناچ رہے تھے۔ ماؤتھ آرگن کی لے میں جوش آ گیا تھا اور اسے بجانے والا اچھلنے اور جھومنے لگا تھا۔ ناچ ختم ہوا تو لڑکیوں نے اس کے جسم پر جھولتے ہوئے گندے کپڑوں اور چہرے کی بڑھی ہوئی داڑھی سے بے نیاز ہو کر اسے گلے لگا لگا کر اس کے گالوں پر بوسے دیئے۔ لڑکوں نے اپنی اپنی بوتل سے اسے ایک ایک گھونٹ پلایا اور جس طرح آئے تھے اسی طرح چہکتے ہوئے چلے گئے تھے۔ ان کے جانے کے بعد جلالی نے آگے بڑھ کر اس کے رومال پر اپنی جیب کی ساری ریزگاری اگل دی لیکن اس نے دیکھا تک نہیں۔ وہ ماؤتھ آرگن منہ میں لگا کر دوبارہ اچھلنے کودنے لگا تھا۔

جلالی کو مانگے کی خوشیاں اور ہمدردی میں بھیگا ہوا پیار نہیں چاہئے تھا۔ اس کا خون ابلنے لگا۔ الزبتھ کو اس کی سرنگ کے اندھیرے ٹٹولنے کا کیا حق تھا۔ لیکن پھر اس نے شرمندہ ہو کر سوچا کہ اپنے گھر کے اندھیرے خود اسی نے تو دکھائے تھے۔ کچھ بھی ہو اب اجالا ڈھونڈنا ہی ہو گا۔ کوئی ہاتھ جس پر امید کا دیا رکھا جائے۔ کوئی ایسا ہاتھ جو منزل پر پہنچ کر دیا نہ بجھا دے۔ اندھیری سرنگ میں اب تلاش کا سفر شروع ہو گا۔ وہ تو معذور بھی نہیں تھا۔ اس کے پاس دو مضبوط ہاتھ تھے۔ بڈا کے پرانے کیسل کی راہداریوں، چوباروں اور فصیلوں پر ٹہلتے ہوئے الزبتھ نے دور تک پھیلا ہوا ایک سبزہ زار دکھایا تھا اور بڑے فخر سے بتایا تھا کہ آزادی کی ایک سالگرہ پر نوجوانوں نے یہ پارک بنا کر شہر کو تحفے میں دیا تھا۔ ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر بڑی سی زنجیر بنائی تھی اور اپنی ساری چھٹیاں قربان کر دی تھیں۔ جلالی نے اپنے بازو تھپ تھپائے۔ بازو کم نہیں

تھے، بس ایک زنجیر بنانے کی ضرورت تھی۔ اس کا ذہن اچانک بالکل صاف ہو گیا۔

ہنگری آنے کے بعد وہ بہت الجھن میں رہا تھا۔ آنے سے پہلے زندگی خودکار طریقے سے ایک معمول کے مطابق گزر رہی تھی۔ کچھ ادھورے رہ جانے والے، کچھ ٹوٹے ہوئے خوابوں کے ساتھ۔ زندگی پھر اچانک ایک نئے موڑ پر آ گئی۔ پاکستان بدر ہونے کے بعد اس پر ایک ایک لمحہ بھاری گزرا تھا۔ پاکستان واپس جانے کی بے تابی تھی۔ یہ پتہ نہ تھا کہ وہ پاکستان جا کر کیا کرے گا۔ کیا اقتدار مافیا سے ٹکرا جائے گا؟ عامر نذیر اپنی حکومت اور پارٹی کی پوری طاقت کے باوجود اقتدار مافیا کا مقابلہ کرنے سے قاصر تھا۔ جلالی تو ایک چھوٹا سا تنکا تھا جو اتفاق سے اقتدار مافیا کی آنکھ میں پڑ گیا تھا۔

"میں امید ڈھونڈنے والوں کو ڈھونڈوں گا۔ میں بھی اب امید ڈھونڈوں گا۔" اس نے جیسے دل ہی دل میں حلف اٹھایا۔ الزبتھ کو نظر اٹھا کر دیکھا تو وہ بھی جلالی کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے شاید جلالی کی آنکھ سے پردے ہٹتے ہوئے دیکھ لئے اور سارے خواب پڑھ لئے تھے۔ شاید وہی جلالی کی خضر تھی۔ لیکن اس کا اپنا راستہ کھو گیا تھا۔ ویسے چہرہ پڑھنا جلالی کو بھی آتا تھا۔

وہ یکلخت اٹھ کھڑی ہوئی۔ جلالی نے اسے تشویش بھری نظروں سے دیکھا۔ جلالی کو اندر بیٹھنا پسند تھا۔ باہر کے مناظر اندر سے زیادہ اچھے لگتے تھے۔ باہر تو اس وقت طوفان کا بھی خطرہ تھا۔

"طوفانوں سے ڈر گئے تو امید کو کیسے ڈھونڈو گے۔" وہ پھر اسے پڑھ رہی تھی۔

وہ جلالی کا انتظار کئے بغیر باہر کی طرف چل دی۔ سردی اپنے شباب پر تھی اور سڑکوں پر رونق بہت کم تھی۔ کل جو برف گری تھی وہ پگھل چکی تھی۔ پھر بھی کسی کونے میں سفیدی نظر آ رہی تھی یا کہیں کہیں شیشہ بنی چمک رہی تھی۔ بجلی اچانک بہت زور سے چمکی۔ ساتھ ہی بادل بھی گڑگڑائے۔ الزبتھ نے ڈر کر جلالی کا بازو تھام لیا۔ "آج کیا ہو گیا تھا۔ کیوں اتنی خوفزدہ تھی۔" جلالی نے حیران ہو کر سوچا۔ کچھ دیر

وہ سڑکوں پر اسی طرح ٹہلتے رہے۔

"مارگریٹ آئی لینڈ چلتے ہیں۔ پتھریلی سڑک اور فٹ پاتھوں پر دم گھٹنے لگا ہے۔" الزبتھ نے ایک جگہ ٹھہرتے ہوئے کہا۔ شہر کے وسط میں یہ جزیرہ سیاحوں کی جنت تھا۔ لیکن جلالی سوچنے لگا اس وقت تو یہ جنت وہاں کے ہوٹلوں' کیفوں اور شراب خانوں میں بند ہو گی۔ اگر کسی کیفے یا بار میں بیٹھنا ہے تو اتنی دور جانے کی کیا ہے۔ یہیں کہیں.......

وہ ۲۶ نمبر کی بس لے کر مارگریٹ برج کے عین درمیان میں مارگریٹ آئی لینڈ کے دہانے پر اتر گئے اور روشنیوں کی طرف جانے کے بجائے دور تک پھیلے ہوئے پارک میں درختوں کے درمیان بنے ہوئے راستوں پر چلنے لگے۔

"کمزور تنے والے پیڑوں کو دیکھو کس طرح طوفانوں کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ وہ تمہارے دوست کے شعر کی طرح تیز ہوا سے نہیں ڈرتے۔" جلالی نے سوچا اسے بکھرے ہوئے پتے دکھائے لیکن وہ خاموش رہا۔ وہ جانے کیوں بہت تلخ ہو رہی تھی۔

"پارک کا آخری کونا ڈھائی کلومیٹر دور ہے۔ چلو گے؟"

"ڈھائی کیا۔ ڈھائی سو کلومیٹر ہو تب بھی چلوں گا۔ اگر تم ساتھ میں ہو۔" جلالی نے اس کا تناؤ ختم کرنا چاہا۔

"ڈائیلاگ مت بولو۔ بھگوڑے!" الزبتھ کا تناؤ اتنی آسانی سے ختم ہونے والا نہیں تھا۔ وہ کچھ دور ہی گئے تھے کہ بارش شروع ہو گئی۔ دور تک کوئی جائے پناہ نہیں تھی۔ جلالی اس طرف مڑنے لگا جہاں ہوٹل کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ لیکن الزبتھ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر روک لیا۔

"بارش سے بھی ڈرتے ہو؟"

"نہیں۔ بس آسمان کا رونا اچھا نہیں لگتا۔"

"مجھے اچھا لگتا ہے۔" وہ یہ کہہ کر آگے بڑھنے لگی۔ الزبتھ کے خراب موڈ نے جلالی کو ایک خاموش مفعول بنا دیا تھا۔ بارش بہت تیز تھی اور گھن گرج کے ساتھ برس رہی تھی۔ جلالی کے برساتی جیسے اوورکوٹ کے اندر بہت موٹی اونی لائننگ تھی

لیکن الزبتھ موٹے سویٹر کے اوپر عام سی برساتی پہنے ہوئے تھی اور سردی سے کپکپا رہی تھی۔ جلالی اسے اپنے جسم سے قریب لا کر گرمی پہنچانے لگا۔ اس کی کپکپی کم نہیں ہوئی تو جلالی نے اوورکوٹ کے بٹن کھول کر اسے اپنے اوورکوٹ کے اندر سمیٹ لیا۔ بھیگی چڑیا بنی ہوئی الزبتھ اس کے سینے میں چھپ گئی۔ کپکپی تھم گئی تھی۔ لیکن کچھ دیر بعد اس کے جسم پر پھر ارتعاش پیدا ہو گیا۔ وہ سسکیاں لے کر رونے لگی۔

جلالی نے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر اس کا چہرہ اوپر اٹھایا تو چہرے پر بارش کی بوندوں کا جال پھیلا ہوا تھا۔ لیکن آنسوؤں کے قطرے الگ سے نظر آ رہے تھے۔ موتیوں جیسے۔ روشنی دیتے ہوئے۔ الزبتھ نے کچھ کہے بغیر چہرہ پھر اس کے سینے میں چھپا دیا۔ وہ کچھ دیر اسی طرح سسکتی رہی اور جب طوفان کا زور ٹوٹا تو وہ جلالی کے کوٹ سے باہر نکل آئی۔

''آؤ چلیں۔'' اس نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ اب اس کے چہرے پر صرف بارش کا پانی رہ گیا تھا۔ وہ اس طرف چل دیئے جہاں پہلے جلالی جانا چاہتا تھا۔

کیفے کیسینو بھی کیفے نیویارک جیسا ہی تھا۔ بہت وسیع اور کشادہ۔ اونچے دروں' ستونوں اور فانوسوں والا۔ پہلے یہ جواخانہ تھا لیکن اب جواخانہ شہر کے دوسرے حصے میں منتقل ہو گیا تھا اور کیسینو صرف کیفے ہو کر رہ گیا تھا۔ ریسٹورنٹ کے گرم ماحول نے انہیں جلد ہی خشک کر دیا۔ دونوں خاموشی سے کافی پیتے رہے۔ الزبتھ اب بالکل نارمل لگ رہی تھی۔

''پیٹر فرانس سے واپس آ گیا ہے۔'' اتنی اہم خبر اس طرح بتائی جیسے موسم کا حال سنا رہی ہو۔

''اوہ!'' جلالی کے منہ سے نکلا اور وہ اسے مبارکباد دینے لگا۔ الزبتھ نے جیسے کچھ سنا ہی نہیں۔ وہ اسی طرح کافی کی پیالی پر نظریں جمائے ہوئے تھی۔ جلالی کو اب اس کے رونے کا سبب' اس کی تلخی' اس کا تناؤ سب کچھ سمجھ میں آ گیا۔ وہ محبت کی تکون میں الجھ گئی تھی۔ پیٹر کی غیر موجودگی میں جلالی کے اتنے قریب آ گئی تھی کہ اس نے اس کے ہونٹوں پر ہونٹ تک رکھ دیئے تھے۔ وہ اگر ذرا سی بھی حوصلہ افزائی کرتا

تو...... بات اور مشکل ہو جاتی۔

"وہ صرف کرسمس منانے آیا ہے' نیا سال وہ پیرس میں منائے گا۔ وہ اب مستقل فرانس میں رہے گا۔"

"مبارک ہو۔ تم شادی یہیں کرو گی یا پیرس جا کر۔"

"اس نے شادی کر لی ہے۔ کسی فرانسیسی لڑکی سے۔ اسے ساتھ لے کر آیا ہے۔" الزبتھ نے آہستہ سے کہا اور کافی کا گھونٹ لینے لگی۔ چہرے پر کوئی جذبہ نہیں ابھرا۔ آج کل جلالی کے سب تجزیئے غلط ہو رہے تھے۔ وہ تکون میں کہاں الجھی تھی۔ وہ تو ایک نقطہ بن کر رہ گئی تھی۔

"آئی ایم سوری۔"

"تم کیوں معذرت کر رہے ہو۔ تم نے کیا کیا ہے؟"

"مجھے اگر تمہارے جذباتی صدمے کا پہلے سے علم ہوتا تو......"

"بیوقوفی کی باتیں مت کرو۔ مجھے کوئی جذباتی صدمہ نہیں ہوا۔ بس سینے پر ایک بوجھ تھا وہ میں نے رو کر اتار دیا۔"

"بوجھ؟"

"میں پیٹر سے بے وفائی کر رہی تھی۔ لیکن اب مطمئن ہو گئی ہوں۔ دھوکہ پہلے اس نے دیا ہے۔ بیوفائی اس نے کی ہے۔"

"بیوفائی؟ ہم نے کیا کیا؟؟ صرف ساتھ بیٹھ کر چائے پی۔ بازار میں ٹہلے۔ تاریخ کی سیر کی۔ ایک بار برف سے کھیلے یا بارش میں بھیگ لئے۔"

"تم ان جذبوں میں شریک ہو گئے جو صرف پیٹر کے لئے مخصوص تھے۔" اس نے جلالی کو دیکھے بغیر کہا۔ "ساتھ سو لیتے تو ابال نکل جاتا۔ پیٹر کب سے فرانس گیا ہوا تھا۔ وہاں کتنی لڑکیوں کے ساتھ سویا ہو گا۔ ایک رات کا ساتھ کوئی بڑا گناہ نہیں ہے۔ لیکن دل کے دروازے کھلے رکھنا' کسی اور کو محبت میں شریک کر لینا بڑا گناہ ہے جو پیٹر نے بھی کیا اور میں نے بھی۔ ہمارا حساب برابر ہے۔"

اس نے خود ہی فیصلہ سنا کر خود کو مقدمے سے بری کر لیا تھا۔ منہ کھول کر

جلالی سے اپنی محبت کا اظہار بھی کر دیا تھا۔ یہ صرف ہونٹوں پر ہونٹ رکھنے والی بات نہیں تھی۔ کسی ایک کمزور لمحے کا جذباتی ابال نہیں تھا۔ جلالی صرف اسے بیوقوفوں کی طرح دیکھتا رہ گیا۔ اس کی سوچوں میں حیرت کدے تعمیر ہو رہے تھے۔ کراچی میں کتنی لڑکیاں اس کی دوست تھیں۔ دل اور بدن کا کوئی رشتہ قائم کئے بغیر۔ یا وہ بھی اس کی بزدلی تھی؟ کم از کم نواب ٹن تو یہی کہتا تھا۔ "ہاتھ پکڑنے کی ہمت کرو۔ ایک بار ہلکا سا جھٹکا دو، پوری کی پوری جھولی میں آ گرے گی۔ نہ گرے تو نواب ٹن کو غلام ٹن کہنا۔" نواب ٹن تو خیر بیہودہ آدمی تھا۔ یہ یورپ والوں کو کیا ہو گیا۔ یہ اتنے دقیانوسی کیوں ہو گئے ہیں۔ یا اس کے مقدر میں کلارا اور الزبتھ جیسی دیوانی عورتیں ہی لکھی ہیں۔

"پیٹر میرے دیوانے پن پر بھی پاگل تھا۔" وہ اس کی سوچیں پھر پڑھ رہی تھی۔ "مجھ پر جب ڈپریشن کے دورے پڑتے تو میں شاعری کرتی اور وہ میرے کیری کیچر بنا بنا کر میرے کمرے کی دیواروں کو بھر دیتا۔ ہم دونوں خواب دیکھتے ہوئے بڑے ہوئے تھے۔ کیفے نیویارک میں بیٹھ کر میری طرح وہ بھی اسے کیفے ہنگریا سمجھتا اور پکارتا۔ ہمارے اردگرد بہت کچھ بدل گیا تھا لیکن میرا خیال تھا ہم وہی ہیں۔ خواب دیکھنے والے۔ مجھے پتہ ہی نہیں چلا اس نے کب اپنے خواب بدل لئے۔ اسے پیرس بہت پسند تھا۔ ہم نے شادی کر کے فرانس میں ہنی مون منانے اور بہت دنوں تک وہیں رہنے کا پروگرام بنایا تھا۔ اب وہ مستقل وہیں رہے گا اس کی پوری زندگی ہنی مون بن کر گزرے گی۔" الزبتھ خاموش ہو کر خالی پیالی کو طشتری میں گھماتی رہی اور پھر اچانک کھڑی ہو گئی۔ جلالی باہر آتے ہوئے سوچ رہا تھا اسے اپنے ساتھ چلنے کو کہے یا نہیں۔ الزبتھ کو اس وقت جذباتی سہارے کی ضرورت تھی۔ لیکن شاید یہ ٹھیک نہ ہو۔ وہ اسی الجھن میں تھا کہ الزبتھ ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر چلی گئی۔ وہ اسی طرح کھڑا دور ہوتی ہوئی ٹیکسی کی سرخ عقبی بتیوں کو چھوٹا ہوتے ہوئے دیکھتا رہا۔

الزبتھ اس کے بعد کئی دنوں تک اس سے نہیں ملی۔ جلالی معمول کے مطابق

سفارتخانے سے اٹھ کر کیفے نیویارک جاتا رہا لیکن الزبتھ ایک بار بھی نظر نہیں آئی۔ جلالی سمجھ سکتا تھا۔ الزبتھ کی تکون کے دونوں نقطے غائب ہو گئے تھے۔ اپنے نقطے پر کھڑی توازن درست کرنے کی کوشش کر رہی ہو گی۔ ایک دن صبح ہی صبح اس کا فون آیا۔ جلالی ابھی سو رہا تھا۔ اس نے خوابیدہ آواز میں ہیلو کہا لیکن الزبتھ کی آواز میں بہت جوش تھا۔

"تمہارے ملک کی حکومت اور اسمبلی ٹوٹ گئی ہے۔ میں نے ابھی ابھی ریڈیو پر خبروں میں سنا ہے۔" جلالی بستر پر اچھل کر بیٹھ گیا۔ یکلخت اس کے سارے حواس بیدار ہو گئے۔

"تمہیں یقین ہے؟ کیا تم صحیح کہہ رہی ہو؟ تم نے اچھی طرح سنا تھا؟"

"ایک نہیں کئی بار۔ ٹھہرو۔ بی بی سی کا انگریزی بلیٹن آ رہا ہو گا۔ میں تمہیں سناتی ہوں۔" الزبتھ نے ریسیور ریڈیو کے سامنے رکھ دیا۔ کچھ دیر ملی جلی آوازیں آتی رہیں اس کے بعد جب بی بی کا اسٹیشن لگ گیا تو اس پر یہی خبر آ رہی تھی۔ وہ بی بی سی کے انٹر نیشنل بلیٹن کی پہلی خبر تھی۔

"آئی لو یو الزبتھ۔" الزبتھ نے کانوں سے دوبارہ ریسیور لگایا تو جلالی بہت پرجوش لہجے میں چیخا۔

"سچ مچ؟" وہ ہنس پڑی۔

جلالی کی خوشی کو جیسے بریک لگ گئے۔ وہ جوش میں الزبتھ سے اپنے تعلقات کی نزاکت کو بھول گیا تھا۔

"تمہیں پتہ نہیں یہ میرے لئے کتنی بڑی خبر ہے۔ یہ میری آزادی کا پروانہ ہے۔ تم شام میں ملو میں تمہیں بتاؤں گا میں یہاں کیوں آیا تھا۔ میرا واپس جانا کیوں ضروری ہے۔ کیفے نیویارک میں چھ بجے۔" فون رکھنے کے بعد جلالی خبر کو اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ جوش ٹھنڈا ہوا تو سوچنے لگا اب واپس پاکستان جا کر کیا کرے گا۔ بغیر اطلاع کے غائب ہوا تھا اس لئے نوکری تو ختم ہو گئی ہو گی۔ نوکری دوبارہ بھی مل سکتی تھی۔ نہیں بھی ملی تو وہ بھوکا نہیں مرے گا۔ بینک میں پیسے جمع

تھے۔ اس کے بھائی بھی فصلوں کی آمدنی میں سے اس کے حصے کی رقم باقاعدگی سے بھیجتے تھے۔ اسے تو اقتدار مافیا سے نمٹنا تھا۔ کوئی امید ڈھونڈنی تھی۔ ''امید!'' اس نے اپنے دل میں دہرایا۔ اسی وقت دروازے کی گھنٹی بجنے لگی۔ دروازہ کھولا تو ستار سر جھکائے اور چہرے پر اداسی سجائے کھڑا تھا۔ اس نے بھی حکومت جانے کی خبر سنائی۔ اس طرح جیسے تعزیت کر رہا ہو۔

''اس میں اداس ہونے کی کیا بات ہے۔''

''وزیراعظم آپ کے دوست تھے۔ انہوں نے آپ کو یہاں بھجوایا تھا۔ آپ کو افسوس نہیں ہوا۔'' حیرت نے اداسی کا مصنوعی خول اس کے چہرے سے اتار دیا۔ جلالی بے ساختہ ہنس پڑا۔

''میں کسی کا آدمی نہیں ہوں۔ تم میری پرواہ مت کرو۔ بھابی سے کہنا میری الوداعی دعوت کا انتظام کریں۔ مجھے پیکنگ کرنی ہے اس لئے دفتر نہیں آؤں گا۔ اپنے منگی صاحب کو بتا دینا۔ یانوش سے کہنا میرے لئے کراچی جانے والی پہلی فلائٹ میں نشست مخصوص کرا دے۔'' ستار کچھ کہے بغیر سرہلاتا ہوا چلا گیا۔

جلالی دو روز بعد سفارتخانے پہنچا تھا۔ بہت مطمئن، مسکراتا اور سیٹی بجاتا ہوا۔ اس نے ایک دن سامان پیک کرنے میں گزارا تھا۔ دوسرے دن جمعہ تھا۔ سفارتخانہ بند تھا۔ جلالی تمام دن آوارہ بھٹکتا رہا تھا۔ قریبی عمارت کے اس بار میں گیا تھا جہاں اسے الزبتھ پہلی بار ملی تھی، ہنگرین زبان کے جو لفظ سیکھے تھے ان کا ٹانکا لگا کر سنہرے بالوں اور گلابی ہونٹوں والی خوبصورت ایوا سے گفتگو کا سلسلہ جوڑنے کی کوشش کی تھی۔ قریب کے ریسٹورنٹ میں جا کر وہاں کے موسیقار سے یا مصطفیٰ کی دھن سنی اور ''آگاشا گنرے'' کا منتر پڑھا تھا۔ شہر میں گھومتے ہوئے ایک دفعہ آنابار کے دروازے کے سامنے بھی رکا تھا۔ یہ بھی ایک یادگار مقام تھا، دل میں میگی اور کلارا سے رخصتی ملاقات کی خواہش جاگی تھی۔ لیکن وہ نفی میں سرہلاتا ہوا آگے بڑھ گیا تھا۔ الزبتھ اس روز اپنے وعدے کے مطابق کیفے نیویارک نہیں آئی تھی۔ جلالی کافی دیر تک انتظار کر

کے واپس آ گیا تھا۔ شاید اچھا ہی ہوا تھا۔ اس سے الوداعی ملاقات کئے بغیر چلے جانا ہی بہتر تھا۔ جلالی کو رخصتی کے جذباتی منظر کا کردار بننا پسند نہیں تھا۔

سفارتخانے میں سب نے اسے مبارکباد دی۔ جلالی نے سوچا ستار نے سب کو بتا دیا ہو گا کہ وہ اپنی واپسی سے کتنا خوش ہے۔

"میری فلائٹ کس دن ہے؟" یانوش کو دیکھتے ہی جلالی نے پوچھا۔

"میں نے ابھی بکنگ نہیں کرائی۔ منگی صاحب نے منع کر دیا تھا۔"

"کیوں؟" جواب میں یانوش نے کندھے اچکا دیئے۔ جلالی غصے میں اٹھ کر منگی کے کمرے کی طرف بڑھا۔ باہر لال بتی روشن تھی۔ لیکن جلالی کو پرواہ نہیں تھی۔ اس سے پہلے کہ منگی کا سیکریٹری اسے روکنے کی کوشش کرتا وہ منگی کے کمرے میں داخل ہو چکا تھا۔ منگی کسی سے فون پر بات کر رہا تھا۔

"آپ نے دروازے پر لال بتی جلتی ہوئی نہیں دیکھی؟" اس نے فون رکھ کر غصے سے کہا۔

"آج مجھے ہر لال بتی سبز نظر آ رہی ہے۔" جلالی مضحکہ اڑانے والے انداز میں بولا۔ "میں آپ کا صرف ایک منٹ لوں گا۔ میں اپنا پاسپورٹ لینے آیا ہوں۔ آج کے بعد آپ میری شکل نہیں دیکھیں گے۔"

"جانے کی بہت جلدی ہے؟"

"میرے سینے میں جو ٹائم بم ٹک ٹک کر رہا تھا وہ فیوز ہو گیا ہے۔ مجھ میں آپ کے سرپرستوں کی دلچسپی اب ختم ہو گئی ہو گی۔"

"آپ کا خیال غلط ہے۔ آپ میں ہماری دلچسپی اور بڑھ گئی ہے۔" جلالی نے کچھ کہنا چاہا لیکن منگی نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا اور انٹرکام پر اپنے پی اے کو کافی بھجوانے کے لئے کہنے لگا۔

"تشریف رکھئے۔" اس نے ہونٹوں پر بہت نرم مسکراہٹ لا کر کہا۔ جلالی کچھ دیر اسی طرح کھڑا رہا لیکن پھر بیٹھ گیا۔ منگی نے میز کی دراز سے سگریٹ کا پیکٹ اور ماچس نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ جلالی سگریٹ کے کش لے کر انتظار کرنے لگا

کہ منگی اپنی پٹاری میں سے اب کیا برآمد کرتا ہے۔

"عامر نذیر کی حکومت میں جو براہ راست تقرریاں ہوئی تھیں وہ سب ختم کر دی گئی ہیں۔" منگی نے کافی کا گھونٹ لے کر کہا۔ "آپ کے برخواست ہونے کا نوٹیفکیشن بھی جاری ہو گیا تھا۔ بہت مشکل سے آپ کی دوبارہ تقرری کے احکامات جاری ہو سکے ہیں۔"

"دوبارہ تقرری؟" جلالی احتجاج کرتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ اسے جو مبارکبادیں ملی تھیں اس کی وجہ اسے اب سمجھ میں آئی تھی۔ منگی ہاتھ کے اشارے سے اسے پھر بیٹھنے کے لئے کہنے لگا۔

"آپ کو بہت ملال ہے کہ ایک غریب ملک کا سرمایہ سفارتکاروں کی بڑی تنخواہوں، عالیشان مکانوں اور لگژری کاروں پر خرچ ہو رہا ہے۔ میں اس بارے میں آپ کی کئی تقریریں سن چکا ہوں۔"

"کہئے تو اعداد و شمار بھی پیش کروں۔" جلالی بیٹھ گیا۔ غصے کے اظہار کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

"اعداد و شمار مجھے پتہ ہیں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ایک غریب ملک نے آپ کی آمد، تنخواہ، کرائے اور الاؤنسوں پر کیا خرچ کیا ہے۔ کل رقم بتاؤں گا تو وہ آپ کے ضمیر پر بوجھ بن جائے گی۔"

"میرے ضمیر پر کوئی بوجھ نہیں ہے۔ میں نے ایک ایک، پیسہ حلال کیا ہے۔ اعتراف آپ بھی کر چکے ہیں۔"

"وہ کام کوئی بھی اشتہاری کمپنی ٹھیکے پر کر سکتی تھی۔ آپ کے پیسے اسی وقت حلال ہوں گے جب آپ وہ کام کریں گے جو صرف آپ کر سکتے ہیں؟"

"کون سا کام؟"

منگی کچھ دیر خاموش بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔ پھر میز پر آگے کی طرف جھک آیا۔

"پرکاش!" اس نے بہت پراسرار انداز میں کہا۔

"پرکاش؟"

"تم پرکاش سے مل کر اس سے تعلقات بناؤ گے۔" منگی اچانک آپ سے تم پر آ گیا۔

"میں اس کے رابطے جاننا چاہتا ہوں۔ وہ تم سے جلد کھل جائے گا۔ اسے پتہ ہے کہ تم بھی اس کے قبیلے شین عین کے آدمی ہو۔"

"شین عین؟"

"شراب اور عورت۔" منگی مسکرایا۔ "اس کے اندرونی حلقے میں شامل ہونا تمہارے لئے مشکل نہیں ہو گا۔ بس آنکھیں کھلی رکھنا۔ اس کے پاس کون آتا ہے۔ وہ تمہیں کس کے پاس لے کر جاتا ہے۔ پاکستان کے کن دوستوں کا تذکرہ کرتا ہے۔ روس جانے میں دلچسپی ظاہر کرنا۔ دیکھنا وہ کس روسی سفارتکار کا حوالہ دیتا ہے۔ وہی اس کا روسی رابطہ ہو گا۔"

"پرکاش اتنا بیوقوف ہے کہ میرے فریب میں آ جائے گا۔"

"وہ بہت ہوشیار آدمی ہے۔ لیکن میں اس کا جوتا اسی کے منہ پر مار رہا ہوں۔ یوسف سعید نے اسے تمہارے بارے میں تفصیل سے بتایا ہو گا۔ سارے خواص گنائے ہوں گے۔ سیکولر، پروگریسو، اینٹی اسٹیبلشمنٹ۔ تم پرکاش کو بہت کام کے آدمی لگے ہو گے۔ وہ تم سے ملنے کے لئے بہت بے تاب تھا۔"

"آپ نے یہ کام یوسف سعید سے کیوں نہیں لیا۔ وہ اس کام کے لئے سب سے زیادہ موزوں آدمی تھا۔"

"کوشش کی تھی۔ لیکن وہ بہت ناقابل بھروسہ ثابت ہوا۔ بہت جلدی بہک جاتا تھا۔ ایک دن نشے میں اس نے پرکاش کو سب کچھ بتا دیا تھا۔"

"میں بھی بقول آپ کے لامذہب، ترقی پسند، سسٹم کا باغی، شین عین قبیلے کا اور یوسف سعید کی ہی طرح صحافی ہوں۔ میں بھی اگر پورس کا ہاتھی بن گیا تو؟"

"تمہارے کچھ خواص اور بھی ہیں جنہیں پرکاش نہیں، میں جانتا ہوں۔" منگی نے مسکرانے کا وقفہ لیا۔ "تمہیں اپنی حب الوطنی پر گھمنڈ ہے۔ تم لالچی اور ضرورتمند نہیں اس لئے بکو گے نہیں۔ تم پی کر بہکنے والوں میں سے بھی نہیں ہو۔ اور اگر بہک

بھی گئے تو تمہارے پاس الٹنے کے لئے کچھ نہیں ہے۔ آج کل ڈرائنگ روم افیلکچولز کے سیاسی تجزیئے ٹکے سیر بھی نہیں بکتے۔" یوسف سعید نے بھی ایک بار یہی کہا تھا۔ وہ کن رازوں کے امین تھے۔ لیکن جلالی کے پاس ترپ کا ایک پتہ تھا۔

"اقتدار مافیا!"

"مجھ کو نہیں معلوم یہ کس چڑیا کا نام ہے۔" منگی بہت سنجیدگی سے کہنے لگا۔

"میں ایک سسٹم کا حصہ ہوں۔ میرے لئے چہرے اہم نہیں ہیں۔ ناموں کے شو کیس سجانا صحافیوں کا کام ہے۔ کس نے کب ڈکار لی۔ کون کب چھینکا۔ کس کی مونچھ نیچی ہوئی۔ کس نے ہاتھ اٹھا دیئے۔ میں چہروں کا تاجر نہیں ہوں۔ اس نظام کا محافظ ہوں جس کے لئے کام کرتا ہوں۔"

جلالی اس کی تقریر سے متاثر ہوئے بغیر اسے اسی طرح سوالیہ نظروں سے دیکھتا رہا تو منگی نے اپنی تقریر دوبارہ شروع کر دی۔

"اقتدار مافیا سے آپ کی مراد وہ لوگ ہیں جو اس نظام کو چلانے کے ذمہ دار ہیں اور آپ شاید ان کے نام جانتے اور چہرے پہچانتے ہیں۔ میں نہیں جانتا اور نہ جاننا چاہتا ہوں۔ آپ دشمن کو یہ نام بتا بھی دیں تو ملک کی سلامتی پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ بلکہ یہ اچھا ہو گا۔ بھارت کو معلوم ہو جائے گا کہ اسے معاملات کس سے طے کرنے چاہئیں۔ حکومت کے شو کیس میں سجے ہوئے چہروں سے یا ان سے جو نمائشی الماریوں کو بدلنے کا ہنر جانتے ہیں۔ آپ کے پاس کوئی بہانہ نہیں ہے۔ آپ وہی کریں گے جو میں نے آپ سے کہا ہے۔"

جلالی اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے جو کچھ معلوم کرنا تھا کر چکا تھا۔ جلالی کے ساتھ منگی بھی کھڑا ہو گیا اور ایک کاغذ اسے دینے لگا۔

"یہ پرکاش کے گھر اور دفتر کے فون نمبر ہیں۔ براہ راست بات نہ کرنا چاہو تو کلارا کے گھر کا نمبر بھی ہے۔ اس کے ذریعے ملاقات کا انتظام ہو سکتا ہے۔ وہ پرکاش کو اچھی طرح جانتی ہے۔"

"میرے پیشے میں انفارمر کا کام کرنے والے مخبروں کو پمپ (Pimp) کہا جاتا

ہے۔" جلالی نے کاغذ لینے کے بجائے ہاتھ جیب میں ڈال لئے۔ "آپ مجھے ڈبل ایجنٹ یعنی ڈبل پمپ بنانا چاہتے ہیں۔ یہ کام آپ کے پیشے کی مجبوری ہے میری نہیں۔ میں اس کی دلالی میں ہاتھ کالے نہیں کروں گا۔"

"ملک کی سلامتی کی خاطر لوگ گلا کٹوا دیتے ہیں۔ تم خوش قسمت ہو کہ صرف ہاتھ کالے کرو گے۔" منگی کا لہجہ سخت ہو گیا۔ "یہ تمہارے اختیار کی بات بھی نہیں ہے۔ تم حکومت پاکستان کے ملازم ہو۔ تمہیں اپنی ذمے داریاں پوری کرنی پڑیں گی۔"

"میری ملازمت ختم ہو چکی ہے۔ رسمی طور پر استعفیٰ لکھ کر بھی دے سکتا ہوں۔ مجھے اب صرف واپس جانا ہے۔"

"تم پاسپورٹ کے بغیر کہیں نہیں جا سکتے۔ پاسپورٹ اس وقت تک نہیں ملے گا جب تک یہ کام ختم نہیں کرو گے۔" منگی کی دھمکی مسکراہٹ میں لپٹی ہوئی تھی۔

"مجھے جب تک پاسپورٹ نہیں ملے گا میں دفتر میں بیٹھ کر وہ تقریریں کروں گا جو آپ کو پسند نہیں آئیں گی۔ آپ کے دفتر کا ڈسپلن خراب ہو گا۔ اخباروں میں انٹرویو چھپواؤں گا جو آپ کو شرمندہ کر دیں گے۔ میرا پاسپورٹ سنبھال کر رکھئے۔ آپ اسے لے کر خود میرے پاس آئیں گے۔"

"تم یہ سب کچھ نہیں کر سکو گے۔" منگی غرایا۔ اس کے ہونٹوں سے مسکراہٹ غائب ہو گئی تھی۔

"مجھے کون روکے گا۔ سزا کے طور پر آپ مجھے صرف واپس بھجوا سکتے ہیں۔ آپ کی سزا میرا انعام ہو گی۔" جلالی کو مزا آنے لگا تھا۔

"تم کو واپس جانے کا بہت شوق ہے۔ جہاز سے اترتے ہی حوالات میں قدم رکھو گے۔ عمر بھر جیل میں سڑو گے۔ تم مجھے جانتے نہیں ہو۔" جلالی اس کی دھمکی سن کر ہنسنے لگا۔

"تم کو پتہ ہے تمہارا مسئلہ کیا ہے۔" جلالی نے بھی احترام کا چولا اتار دیا۔ "تم خود کو بہت اہم سمجھنے کے وہم میں مبتلا ہو۔ سسٹم کے محافظ، قومی سلامتی کے نگراں

وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اندر سے تم پولیس کے ایک گھٹیا سے تھانیدار ہو۔ میں ان کی لگامیں کھینچ چکا ہوں جن کے سامنے تم سلوٹ مار کر اٹین شن کھڑے رہتے ہو۔ تمہاری بھی پیٹی اتروا دوں گا۔ مجھے دھمکیاں مت دینا۔" جلالی جواب کا انتظار کئے بغیر مڑ کر دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ ابھی دروازے تک پہنچا بھی نہیں تھا کہ اس کے قدم فرش پر جم گئے۔

"تمہیں شاید اپنی دوست کا کیرئیر عزیز نہیں ہے۔" منگی نے بہت سرد آواز میں کہا۔

"میری دوست؟" جلالی وہیں کھڑے کھڑے مڑ گیا۔

"الزبتھ روڈوانسکی۔ مشہور رائٹر۔ صحافی!"

"اس کا اس معاملے سے کیا تعلق ہے؟"

"میں نے آج کے دن کے لئے ہی اس پر چار ہزار ڈالر کی سرمایہ کاری کی تھی۔"

"اس نے ایک پیسہ نہیں لیا۔ اس کے ایڈیٹر نے......"

"ایڈیٹر کے لئے ہی سہی، لیکن دونوں چیک آپ کی دوست نے کیش کرائے تھے۔ میرے پاس بینک کی رسیدیں ہیں۔" منگی نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

"اس ملک میں کمیونزم ختم ہو گیا لیکن حکومت کرنے والے اب بھی وہی ہیں۔ کے جی بی کے تربیت یافتہ۔ اسٹالن کے حواری۔ انہیں معلوم ہوا کہ ان کی ایک صحافی ایک غیر ملکی سفارتخانے کی مخبر ہے اور مخبری کے پیسے لیتی ہے تو وہ اس کی زندگی اجیرن کر دیں گے۔ اس کا کیرئیر ختم ہو جائے گا۔ اس کا ایڈیٹر بھی اسے نہیں بچا سکے گا۔"

"یو باسٹرڈ!" جلالی چلایا۔

"میں کم رتبہ اور کمزور لوگوں کی گالیوں کا برا نہیں مانتا۔" منگی مسکرایا۔ لیکن پھر کچھ سوچ کر سنجیدہ ہو گیا۔ "تمہارے پاس فیصلہ کرنے کے لئے ایک ہفتہ ہے۔ اس کے بعد میں تمہاری دوست کے بارے میں خبر لیک کر دوں گا۔ اچھی طرح سوچ لو۔

پرکاش والے کام میں زیادہ سے زیادہ تین مہینے لگیں گے۔ اس کے بعد میں تمہیں جانے سے نہیں روکوں گا۔ خود ایئرپورٹ چھوڑ کر آؤں گا۔" منگی اپنی کرسی پر بیٹھ گیا اور انٹرکام کا بٹن دبانے لگا۔ یہ ڈسمس کرنے کا اشارہ تھا۔ جلالی خاموشی سے باہر نکل آیا۔ اسے سوچنے کے لئے وقت چاہیے تھا۔

کیا منگی بلف کر رہا تھا؟

اس وقت ضرور ایک آدمی مدد کر سکتا تھا۔ جلالی سفارتخانے کی سیڑھیاں اتر کر ا۔ملکے ہوٹل کی طرف چل دیا۔ اسے ایک اہم فون کال کرنا تھی۔

رات کو فلیٹ میں الزبتھ کی اچانک آمد نے اسے حیران کر دیا۔ وہ ستار کی بیوی کو انگریزی پڑھانے آئی تھی۔ جلالی کو یقین تھا یہ محض اس سے ملنے کا بہانہ تھا۔ کافی دیر بیٹھی معمول کے مطابق باتیں کرتی رہی لیکن آخر میں خود پر قابو نہ رکھ سکی۔

"رک جاؤ پلیز مت جاؤ۔" رخصت ہوتے وقت اس نے جلالی سے لپٹ کر کہا اور اس کے سینے پر سر رکھ کر سسکیاں لینے لگی۔ جلالی کچھ نہیں بولا صرف اس کی پیٹھ تھپکتا رہا۔ وہ اس کی وجہ سے یرغمالی بن گیا تھا اور وہ جذباتی بھول .بھلیوں میں بھٹک رہی تھی۔ عورتیں دانش کی کسی بھی سطح پر پہنچ جائیں محبت میں اتنی بیوقوف کیوں ہو جاتی ہیں؟ وہ سوچتا رہا اور الزبتھ جس طرح اچانک گلے سے لگی تھی اسی طرح ایک جھٹکے سے اس سے الگ ہو کر تیر کی طرح باہر نکلی چلی گئی۔

دوسرے دن اس نے میجر افتخار کو دوبارہ انقرہ کال کی۔ وہی میجر افتخار جو صحافی بننا چاہتا تھا۔ جس نے اسے استنبول کی سیر کراتے ہوئے منگی کے بارے میں خبردار کیا تھا اور ضرورت پڑنے پر اس کی مدد کا وعدہ بھی۔ جلالی نے کل بھی رابطے کی کوشش کی تھی لیکن وہ موجود نہیں تھا۔ آج وہ پیغام کے مطابق فون پر موجود تھا۔

"سکندر اعظم کی فتوحات کا کیا حال ہے۔" دوسری طرف سے میجر افتخار کا مانوس قہقہہ گونجا۔

"سکندر اعظم پسپا ہونا چاہتا ہے۔"

"ضرور ضرور۔ آپ کے لئے تو لال قالین بچھا ہوا ہے۔ اب رکاوٹ کیا ہے؟" ایک اور قہقہہ۔

"آپ کا دوست منگی!" جلالی نے کہا اور جلدی جلدی ساری کہانی بیان کر دی۔ دوسری طرف تھوڑی دیر خاموشی طاری رہی۔

"مجھے معلوم کرنا پڑے گا کہ منگی یہ سب کچھ اسلام آباد کی ہدایت پر کر رہا ہے یا اپنا حساب چکا رہا ہے۔ سب کچھ ان کے کہنے پر ہو رہا ہے جنہوں نے آپ کو بھجوایا تھا تو مجبوری۔ دوسری صورت میں...... آپ کل اسی وقت مجھے فون کیجئے۔"

چار دن بعد جلالی ہنگری کی سرحد عبور کر کے سلوو یکیہ کے دارالحکومت براٹی سلاوا جانے والی ٹرین میں بیٹھا سفر کر رہا تھا۔ یانوش اور الزبتھ اس کے ہمسفر تھے۔ میجر افتخار نے بتایا تھا کہ اسلام آباد میں کسی کو اب جلالی کے آنے یا نہ آنے کی پرواہ نہیں تھی۔ منگی اس کے ساتھ کوئی اپنا ہی کھیل کھیل رہا تھا۔ لیکن میجر افتخار ہنگری میں جلالی کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ وہاں منگی کی عملداری تھی۔ جلالی کو ہنگری کی سرحد عبور کرنی تھی۔ میجر افتخار کا خیال تھا کوئی مقامی ذریعہ سرحد پار کرنے میں اس کی مدد کر سکتا ہے۔ براٹی سلاوا پہنچنے کے بعد کے معاملات میجر افتخار کے ذمے تھے۔ جلالی نے یانوش کو آزمانے کا فیصلہ کیا تھا۔ "کیفے نیویارک۔ چھ بجے شام۔" جلالی نے دفتر میں یانوش کو اسی طرح تحریری پیغام تھمایا تھا جیسے یانوش جلالی کو یوسف سعید کے پیغام دیا کرتا تھا۔

جلالی نے یانوش کو سب کچھ صاف صاف بتا دیا تھا۔ اسے حیرت ہوئی جب یانوش نے کچھ پوچھے، سوچے اور کوئی مطالبہ کئے بغیر اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔ جیسے اسے سب کچھ پہلے ہی سے پتہ تھا۔

"ہم ٹرین سے سفر کریں گے۔ آپ مجھے کل یہیں اور اسی وقت ملئے۔ میں آپ کو بتاؤں گا ہم کس دن اور کس وقت جائیں گے۔" یانوش نے جلالی کو اطمینان دلا دیا۔ جلالی نے اسے وہ لفافہ دیا تھا جس میں وہ ایک ہزار ڈالر رکھ کر لایا تھا۔ یانوش

نے کچھ کہے اور دیکھے بغیر لفافہ لے کر جیب میں رکھا لیا تھا۔

دوسرے دن کیفے نیویارک میں جب یانوش نے اسے جانے کے انتظامات کی تفصیلات بتائی تو اس کے جاتے ہی اچانک الزبتھ آ گئی تھی۔ جلالی اس الجھن میں پڑ گیا تھا کہ اسے اپنے جانے کے بارے میں بتائے یا نہیں۔ لیکن پھر بتانا پڑا تھا۔ یہ اس کا حق تھا۔ الزبتھ نے کچھ نہیں کہا تھا' بس خاموش ہو گئی تھی اور کچھ دیر بعد ہی اٹھ کر چلی گئی تھی۔ روانگی کے دن اسٹیشن پر وہ جلالی اور یانوش کے آنے سے پہلے سے موجود تھی۔ اسے دیکھ کر جلالی کچھ دیر کے لئے مبہوت ہو گیا تھا۔ وہ جلالی کے ساتھ اپنے تعلق کا اشتہار بنی ہوئی تھی۔ اس نے شلوار قمیض کا وہ سبز جوڑا پہنا ہوا تھا جو اسے ستار کی بیوی نے تحفے میں دیا تھا۔ دوپٹے کو اسکارف کی طرح چہرے کے گرد باندھ کر اس نے اپنی اداسی اور معصومیت کو فریم کر دیا تھا۔

"میں تمہیں چھوڑنے 'جیعور' تک جاؤں گی۔" اس کی آواز کسی بھی تاثر سے عاری تھی۔ ہر تاثر آنکھوں میں سمایا ہوا تھا۔ روئی روئی اور جاگی ہوئی آنکھوں میں خواب ابھی تک کروٹیں لے رہے تھے۔

جلالی نے سوالیہ نظروں سے یانوش کی طرف دیکھا تو اس نے حسب عادت کندھے اچکا دیئے تھے۔ جیعور ہنگری کا سرحدی شہر تھا جس سے گزر کر ٹرین سلوو یکیہ کی حدود میں داخل ہوتی تھی۔

تیزی سے دوڑتی ہوئی ٹرین کی چھک چھک نے ذہن کے خالی پن کو بھر دیا تھا۔ الزبتھ' یانوش اور جلالی تینوں خاموش بیٹھے ٹرین کے ردھم کے ساتھ ہلتے رہے۔ یانوش اس وقت تک ان کے ساتھ بیٹھا رہا جب تک ان کے ٹکٹ اور کاغذات چیک نہیں ہو گئے۔ یانوش نے جلالی کی ترجمانی کا فریضہ خود سنبھال لیا تھا۔ جلالی سے کوئی سوال نہیں کیا گیا۔ یہ مرحلہ طے ہوا تو یانوش دونوں کو تنہائی کا موقع دینے ڈائننگ کار کی طرف چلا گیا۔ ساتھ بیٹھی ہوئی ایک نوجوان لڑکی جو اپنے ساتھی کے ساتھ مسلسل بوسے بازی میں مصروف تھی اور اب تھک کر الزبتھ سے اس کے پاکستانی لباس کے

بارے میں پوچھنے لگی تھی۔ وہ دونوں اٹھ کر دروازے کے پاس آ کھڑے ہوئے۔ جلالی نے سگریٹ سلگا کر ایک الزبتھ کو دی اور خود بھی دھواں اڑا کر پیچھے بھاگتے ہوئے مناظر کو دیکھنے لگا۔ ٹرین دریائے ڈینوب کے مغربی کنارے کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ دریا کا پانی سردی سے سکڑا ہوا خاموش کھڑا تھا۔ گھرے بادلوں نے ماحول میں سانولی سی اداسی گھول دی تھی۔

"کوئی شعر سناؤ۔" الزبتھ نے باہر کے مناظر سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔ "ان میں سے کسی کا جنھوں نے ٹرین کے نیچے آ کر خود کشی کر لی تھی۔"

"انہیں چھوڑو۔ ایک شعر میرے حسب حال ہے وہ سنو۔

وہ دُور تھا تو میرا ہر اک پل اداس تھا
وہ میرے پاس آیا تو میں خود سے ڈر گیا"

"کیا تم واقعی ڈرپوک ہو؟" الزبتھ اس کی طرف مڑ گئی۔ پھر جلالی کے جواب دینے سے پہلے خود ہی بول پڑی۔ "مت بتاؤ۔ مجھے جاننے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ اب بہت دیر ہو چکی ہے۔ تم ڈرپوک ہو، محتاط ہو، بے حس ہو یا کوئی بہت گہرا راز دل میں چھپائے بیٹھے ہو۔ میرے لئے بس یہی کافی ہے کہ تم نے میری زندگی کی تکمیل کر دی ہے۔"

"میں نے.....؟"

الزبتھ نے جیسے سنا نہیں۔ وہ دوبارہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

"میں نے اسکول میں اسپینی زبان سیکھی تھی۔" وہ اپنے آپ سے بات کر رہی تھی۔ "لاطینی امریکہ کے ملکوں کی کہانیاں بہت شوق سے پڑھتی تھی۔ بعد میں میں نے کئی کہانیاں ہنگرین میں ترجمہ بھی کیں۔ وہ میرے لئے نئی دنیا کے قصے تھے۔ ایک کہانی نے مجھے بہت دنوں تک اداس رکھا۔ ایک شخص کا پورا بچپن مٹی کے ایک کھلونے کو ترستا ہوا گزرا تھا۔ وہ بڑا ہوا تو کھلونے بنانے والی بھٹی میں مزدوری کرنے لگا اور ایک کھلونا چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا۔ ہنگری میں بھی غربت کی کہانیاں کم نہیں تھیں۔ ہمارا پرانا ادب تو ایسی ہی کہانیوں کے گرد گھومتا تھا۔ میں نے تمہیں جوزف

ایلیا کی کہانی سنائی تھی۔ ہمارا سب سے مشہور شاعر جس نے ۳۸ سال کی عمر میں ٹرین کے نیچے آکر خودکشی کر لی تھی۔

”مجھے حسرت تھی کہ میری کوئی خواہش صرف حسرت بن کر رہ جائے۔ میری زندگی میں ایک خلاء رہ گیا تھا۔ میں اس جذبے سے نا آشنا تھی جو خواہش پوری نہ ہونے کے نتیجے میں جاگتا ہے۔ بچپن میں جن کھلونوں سے کھیلنا چاہتی تھی کھیلی۔ جس اسکول میں اور جو پڑھنا چاہا پڑھا۔ انگریزی کا شوق ہوا تو لندن بھیج دی گئی۔ صحافی بننا چاہا تو اخباروں کے صفحات کھل گئے۔ جس سے محبت کی اس کے دل کا دروازہ بھی کھلا ہوا ملا۔ پھر ایک دن مجھے تم مل گئے۔“

الزبتھ نے باہر کے مناظر کی طرف سے پیٹھ موڑ کر اپنا رخ جلالی کی طرف کر لیا اور نیا سگریٹ سلگا کر دوبارہ گویا ہوئی۔

”تم نے جب مجھے اپنی اور اپنی دنیا کی کہانیاں سنائیں تو مجھے ایسا لگا جیسے ایک انجانی دنیا کا ایک کردار میرے سامنے آ بیٹھا ہے جس کے قصے میں بچپن سے پڑھ رہی ہوں۔ میں نے بار بار فرار ہونا چاہا۔ لیکن مجھ پر ایک دیوانگی طاری ہو جاتی تھی۔ میں بھی تمہاری دنیا کا ایک کردار بننا چاہتی تھی۔ تمہارا حصہ بننا چاہتی تھی۔ میں تمہارے گلے لگ کر روتی اور گڑگڑاتی رہی۔ لیکن تم نے اچھا کیا جو مجھے نہیں اپنایا۔ مجھے پہلی بار پتہ چلا کہ کوئی خواہش پوری نہ ہو تو کیا گزرتی ہے۔ پہلی بار۔ مجھے پہلی بار لگا کہ میری زندگی مکمل ہو گئی ہے۔“

وہ خاموش ہو کر دوبارہ کھڑکی کی طرف مڑ گئی اور جلالی کو جون ایلیا یاد آنے لگا۔ زندگی خواب کیوں دکھاتی ہے۔ اور وہ بھی ایسے بے سروپا ادھورے خواب۔

”میں نے کل رات ایک نظم کہی ہے۔“ الزبتھ نے اچانک مڑ کر کہا تو جلالی خوفزدہ ہو گیا۔ کیا اس پر دورہ پڑنے والا تھا۔

”سنو گے؟“ جلالی نے بادل نخواستہ اثبات میں سر ہلا دیا۔

”حد فلک تک پھیل کر بھی
تنگ ہے محبس مرا

چاند تاروں کی ضیاء

اور روشنی کا بانکپن

قید کی سنگین سلاخوں کی طرح

مجھ پہ ہے سایہ فگن

کیا ترے زنداں سے بچنے کی کوئی تدبیر ہے

آسمانوں سے پرے

اور ماہ و انجم سے الگ

میرے خوابوں کی

کوئی تعبیر ہے

یا زندگی

زندہ رہنے کی فقط تعزیر ہے۔"

ٹرین نے بہت زور سے سیٹی بجائی۔ گاڑی کی رفتار ایک دم تیز ہو گئی۔ چھک۔ چھک۔ چھک۔ باہر حد نظر تک پھیلا ہوا دریا خاموش تھا لیکن پانی سے بھرے ہوئے بادلوں کا رنگ اور گہرا ہونے لگا تھا۔ ٹپ ٹپ ٹپ۔ بوندیں ٹپکیں اور پھر اچانک تیز بارش شروع ہو گئی۔ ٹرین کی چھک چھک پانی کے شور میں دب گئی۔

جلالی کو براٹی سلاوا آئے ہوئے چار روز ہو گئے تھے۔ آج اس کا یہاں آخری دن تھا۔ اس نے پہنچتے ہی میجر افتخار کو فون کر کے اپنے سلوو یکیہ پہنچنے کی اطلاع دے دی تھی۔ میجر افتخار نے اسے عارضی پاسپورٹ کوریئر کر دیا تھا اور سختی سے ہدایت کی تھی کہ پاکستان پہنچتے ہی پاسپورٹ کو پھاڑ کر پھینک دے۔ اسے پاسپورٹ کل ملا تھا اور پرواز آج رات جانے والی تھی۔ ان تین چار دنوں میں ذہن سے بڈاپسٹ میں گزارے ہوئے شب و روز، منگی، الزبتھ سب کچھ نکل گیا تھا۔ پاکستان پہنچ کر کچھ کرنے کی بے چینی تھی۔ امید کی تلاش جس کے لئے الزبتھ جیسی لڑکی کی محبت بھی ٹھکرا آیا تھا۔

الزبتھ "جیعور" کے اسٹیشن پر اتری تو جلالی کو لگا جیسے ایک بوجھ اتر گیا ہے۔

لیکن وہ جاتے جاتے اسے تماشا بنا گئی۔ لپٹ کر اس طرح روئی کہ آس پاس کے لوگ ایک لمحے کے لئے ٹھہر کر انہیں دیکھنے لگے تھے۔ وہ اس وقت تک جلالی سے لپٹی رہی جب تک ٹرین کے چلنے کا اشارہ نہیں ہو گیا۔ جلالی بھی کھڑکی سے سر نکالے اس وقت تک اسے دیکھتا رہا تھا جب تک کہ وہ نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئی۔ وہ اپنی جگہ سے ہلی تک نہیں تھی۔ اسی طرح کھڑی ہوئی دور ہوتی ہوئی ٹرین کو تکتی رہی تھی۔ جلالی کو اپنے خطاوار ہونے کا شدت سے احساس ہوا تھا۔

یانوش نے اسے بہت آسانی سے سرحد پار کرائی تھی اور کسی پریشانی کے بغیر براٹی سلاوا پہنچا دیا تھا۔ منگی اور سفارتخانے والوں کا خیال غلط نہیں تھا۔ یانوش یقیناً" حکومت کا آدمی تھا۔ اس نے سرحد عبور کرتے ہوئے اپنا شناخت نامہ دکھایا تھا اور امیگریشن والے جلالی کا ڈپلومیٹک کارڈ دیکھ کر مطمئن ہو گئے تھے۔ ہوٹل میں بھی کمرہ بک کرانے کا کام یانوش نے ہی کیا تھا۔ کسی نے جلالی سے کچھ پوچھنے یا پاسپورٹ مانگنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اسے بڈاپسٹ کی ٹرین پکڑنی تھی اس لئے فورا" ہی واپس چلا گیا تھا۔ جاتے جاتے وہ جلالی کو مزید حیران کر گیا۔ اس نے رخصت ہوتے وقت بہت روانی سے اردو اور پنجابی میں گفتگو کی تھی۔

براٹی سلاوا بہت بارونق شہر تھا۔ چیکو سلوو یکیہ کے دو ٹکڑے ہونے کے بعد سلوو یکیہ کا دارالحکومت بنا تھا۔ اس کا ہوٹل شہر کے عین وسط میں تھا۔ اردگرد دلچسپیاں ہی دلچسپیاں بکھری ہوئی تھیں۔ لیکن جلالی زیادہ تر اپنے کمرے میں رہا۔ الزبتھ سے رخصت ہوتے وقت ذہن پر جو اداسی طاری ہوئی تھی اس کا اثر اب بھی باقی تھا۔

ایئرپورٹ جانے کا وقت ہو گیا تھا۔ وہ سامان لے کر نیچے اترا اور چیک آؤٹ کرنے استقبالیہ پر گیا تو اس کے نام ایک فیکس آیا ہوا تھا۔ پڑھ کر جلالی کا چہرہ سفید ہو گیا۔ ایسا لگا جیسے دل کی دھڑکن رک جائے گی۔ ذہن میں قاتل قاتل کی گردان ہونے لگی۔ یانوش نے ایک سطر کا پیغام بھیجا تھا۔

"الزبتھ نے جیعور کے قریب ٹرین کے نیچے آکر خودکشی کر لی۔"

جلالی کے سر پر سے بہت سی ٹرینیں گزر گئیں۔ چھک چھک چھک۔ ٹپ ٹپ ٹپ۔ بارش پھر برسنے لگی تھی۔

واپسی

نواب ٹن کی رزم گاہ خالی تھی۔ اپنی اپنی کہانیوں کے بوجھ تلے دبے ہوئے نوادرات تھکی ہوئی نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ خود نواب ٹن گھر کے آخری کونے میں بنے ہوئے ایک کمرے میں تھا جس پر موٹے لوہے کا دروازہ اور دروازے پر الیکٹرونک قفل تھا جو صرف کوڈ نمبروں کے دبانے سے ہی کھل سکتا تھا۔ چھوٹا سا ساؤنڈ پروف کمرہ اندر سے کسی ریڈیو اسٹیشن کے آپریشن روم جیسا تھا۔ سائڈ میں رکھی ہوئی ٹیپ مشین، سامنے بچھا ہوا مکسنگ پینل، بے شمار نابز، بٹن، تھرکتی ہوئی سوئیاں۔ ایئر کنڈیشننگ کے باوجود نواب ٹن کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں چمک رہی تھیں۔ ساؤنڈ لیول ٹھیک نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے کئی نابز کی گردنیں مروڑیں لیکن سوئی الٹے ہاتھ کی نچلی سطح پر تھرکتی رہی۔ کانوں پر جو ہیڈ فون لگایا تھا اس میں آواز بہت دور سے آتی ہوئی سنائی دے رہی تھی۔ نواب ٹن نے جھنجلا کر پینل پر زور کا ہاتھ مارا۔ اسے آڈیو سسٹم لگانے والوں پر غصہ آگیا۔ ہانگ کانگ سے ساؤنڈ انجینیرز کی ایک ٹیم کو بلا کر برابر کے بنگلے سے مواصلات کا سلسلہ جوڑا تھا۔ مکمل رازداری کی

شرط تھی اس لئے دوگنے پیسے دیئے تھے۔ شروع میں سسٹم بہت اچھی طرح کام کر رہا تھا۔ آوازیں بہت صاف ریکارڈ ہوتی تھیں۔ لیکن اب کچھ عرصے سے سائیں سائیں زیادہ ہونے لگی تھی۔

نواب ٹن کے چہرے پر وہ لاپرواہی یا بشاشت نہیں تھی جو اس وقت نظر آتی تھی جب وہ رزم گاہ میں بیٹھ کر دربار لگاتا تھا۔ آنکھوں میں نشے کا ایک ڈورا نہیں تھا' صرف سوچیں بھری ہوئی تھیں۔ وہ نیلا سوٹ پہنے ہوئے تھا' ٹائی کی گرہ بھی اپنی جگہ قائم تھی۔ یہ اس کی وہ یونیفارم تھی جسے پہن کر اقتدار مافیا کے اجلاس میں بیٹھتا تھا۔ وہ کچھ دیر پہلے ہی اجلاس سے اٹھ کر آیا تھا۔ اٹھا نہیں تھا اٹھا دیا گیا تھا۔ وہ اپنی توہین خاموشی سے برداشت کر کے وہاں سے چلا آیا تھا۔ اجلاس کی ابتدائی رسمیات کے بعد اصل معاملے پر بات شروع ہوئی تھی۔ فیصلہ ہونا تھا کہ وزیراعظم کسے ہونا ہے۔ رضا سروہی کو یا ریاض توصیف کو۔ رضا سروہی گدی چھوڑنے اور ریاض توصیف رضا سروہی کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ نواب ٹن کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئی تھیں۔ اسے معلوم تھا فیصلہ آج ہو جائے گا۔ نواب ٹن نے ریاض توصیف پر بازی لگائی ہوئی تھی۔ قریشی کا تجزیہ بھی اس کے حق میں تھا۔ لیکن جنرل برلاس' بڈھے اختیار رضوی اور آصف علی کی تکون شاید رضا سروہی کی حمایت کرے۔ الیکشن میں پیسہ انہوں نے لگایا تھا۔ ان کی بات زیادہ وزن رکھتی تھی۔

"معاملہ اہم اور حساس نوعیت کا ہے اس لئے گفتگو اب صرف گروپ کے بنیادی ارکان کے درمیان ہو گی۔"

عارف علی نے بات شروع ہوتے ہی فیصلہ سنا دیا۔ قریشی نے کچھ کہنا چاہا لیکن جنرل برلاس اور اختیار حیدر نے زور زور سے سرہلایا اور اکبر خان نے قریشی کو گھور کر دیکھا تو قریشی بولتے بولتے رک گیا۔ عارف علی نے کسی کا نام نہیں لیا تھا۔ لیکن سب جانتے تھے وہاں موجود لوگوں میں صرف نواب ٹن بنیادی ارکان میں شامل نہیں تھا۔ وہ کچھ کہے بغیر باہر نکل آیا تھا۔ نواب ٹن کو حیرت تھی کہ عارف علی کے دل میں اس کے خلاف اتنا کینہ کیوں ہے۔ وہ شاید نواب ٹن کو اپنے لئے خطرہ محسوس کرنے

لگا تھا۔ کتنا احمقانہ خیال تھا۔ نواب ٹن جانتا تھا کہ عارف علی کی جڑیں زیر زمین بہت اندر تک اور شاخیں دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ اسے عارف علی کے برابر پہنچنے کے لئے ایک زمانہ چاہیے تھا۔ اتنی عمر باقی نہیں تھی۔ یہ بات عارف علی بھی جانتا ہو گا لیکن پھر بھی..... شاید میزائلوں والے سودے کی تلخی ابھی تک باقی تھی۔ نواب ٹن نے عارف علی کے بنائے ہوئے گلوب سے باہر چھلانگ لگائی تھی۔ یہ صحیح تھا کہ برازیل سے میزائل خریدنے میں اسے زیادہ فائدہ ہوا تھا۔ لیکن اس سے زیادہ فائدہ ملک کو ہوا تھا۔ اس نے کتنا زرمبادلہ بچایا تھا۔ "ملک کا فائدہ!" نواب ٹن کو اپنی احمقانہ سوچ پر ہنسی آ گئی۔ وہ سب تو ملک کی سلامتی کو بچانے کے نام پر پورے ملک کو گروی رکھ رہے تھے' بلکہ رکھ چکے تھے۔ مسئلہ زر مبادلہ نہیں اختیار بچانے کا تھا۔

نواب ٹن کو اجلاس سے اٹھائے جانے کا کوئی ملال نہیں تھا۔ وہ اجلاس میں ہوتا بھی تو اس کی رائے کی کوئی اہمیت نہ ہوتی۔ اس کی دلچسپی صرف فیصلہ جاننے کے بارے میں تھی جو اسے ابھی معلوم ہو جائے گا۔ اس نے خود کو خطرے میں ڈال کر دیواروں کے کان لگائے تھے۔ اگر اقتدار مافیا کو پتہ چل گیا کہ وہ خفیہ طور پر اجلاس کی کارروائی ٹیپ کرتا ہے تو جنرل سعید ملک اسے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ جنرل نے جلالی کے معاملے میں بھی بہت آگ اگلی تھی۔ اگر اکبر خان درمیان میں نہ ہوتا تو وہ جلالی کو پاتال میں بھی نہ چھوڑتا۔ جنرل کا غصہ یہ جان کر ٹھنڈا ہوا تھا کہ دلاور اور خانساماں کی لاشیں سمندر کی تہہ میں تیر رہی ہیں۔ اسے اگر پتہ ہوتا کہ ان دونوں کو بھی بحری جہاز میں سوار کرا کر برازیل بھیج دیا گیا تھا تو نواب ٹن کی خیر نہیں تھی۔ قریشی تو شاید بچ جاتا جو اس راز میں شریک تھا لیکن نواب ٹن سرحد پار ہو جاتا جہاں جنرل ملک کے افغان گوریلے اس کے بدن کو چھلنی کر کے مشترکہ قبر میں گاڑ دیتے۔ جنرل سعید ملک بہت بے رحم شخص تھا۔ اس کے لئے انسانی لاشیں مری ہوئی مکھیوں کی طرح تھیں۔ وہ فاتح افغانستان تھا۔ لاشوں کے انبار لگوا چکا تھا۔ سرحد کے اس پار بھی۔ سرحد کے اس پار بھی۔

"لیکن یہ جلالی تھا کہاں؟"

نواب ٹن کی سوچیں جلالی کی طرف مڑ گئیں' جلالی کو بڈاپسٹ سے آئے ہوئے کئی مہینے ہو چکے تھے لیکن وہ ایک بار بھی نواب ٹن سے ملنے نہیں آیا۔ نواب ٹن نے دو تین بار رابطے کی کوشش بھی کی لیکن فون پر صرف آنسرنگ مشین سے ملاقات ہو سکی تھی۔ جلالی نے جوابی فون نہیں کیا۔ نواب ٹن کو پتہ تھا وہ اب تک اس سے ناراض ہو گا۔ لیکن نواب ٹن کے لئے جلالی کو منا لینا کچھ مشکل نہیں تھا۔ بس وقت نہیں مل سکا تھا۔ انتخابات کی گہما گہمی تھی۔ اقتدار مافیا کے لئے یہ انتخابات اس کے وجود کا معاملہ تھے۔ نواب ٹن کو بھی اپنا کردار ادا کرنا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ جلالی بھی انتخابات میں مصروف ہو گا۔ لیکن اس نے کسی اخبار میں جلالی کے نام سے کوئی کالم یا خبر نہیں پڑھی۔ وہ کہاں غائب ہو گیا تھا؟ نواب ٹن کو اس کی ضرورت تھی۔ اسے ایک رازدار چاہیے تھا۔ دوستوں کی ایک فوج تھی لیکن جلالی جیسی خوبیاں کسی میں نہیں تھیں۔ نواب ٹن نے سوچا وہ پہلی فرصت میں جلالی سے رابطہ قائم کرے گا۔ اسے منائے گا۔

ہیڈ فون میں آنے والی سائیں سائیں کم ہو گئی۔ آوازیں آہستہ آہستہ ابھر رہی تھیں لیکن ابھی تک صاف نہیں تھیں۔ لگ رہا تھا جیسے مکھیاں بھن بھن کر رہی ہوں۔ نواب ٹن نے ایک بار پھر زور کا ہاتھ مارا اور مختلف ناب مروڑنے شروع کر دیئے۔ آوازیں آہستہ آہستہ صاف ہونے لگیں تو نواب ٹن نے ریکارڈ کا بٹن دبایا اور پوری توجہ گفتگو پر مرکوز کر دی۔

"رضا سروہی پر ہمیں پورا اعتماد ہے۔" جنرل برلاس بہت سرد لہجے میں کہہ رہا تھا۔ "اسے پتہ ہے ہمارے پاس اس کے معافی نامے محفوظ ہیں۔ اسے یہ بھی پتہ ہے کہ اس کی سیاست ہماری بیساکھیوں پر کھڑی ہے۔ وہ ہمارے دیئے ہوئے فریم ورک سے ایک انچ بھی نہیں ہلے گا۔"

"رضا سروہی نے یقین دلایا ہے کہ وہ میراج طیاروں کے سودے پر اثر انداز ہونے کی کوشش نہیں کرے گا۔" اسلحے کے تاجر عارف علی نے ٹکڑا لگایا۔ "اسے

حصہ بھی نہیں چاہیے۔ بحریہ کے چیف اسے آبدوزوں کے کمیشن میں شریک کرنے پر تیار ہو جائیں تو وہ مطمئن ہو جائے گا۔"

نواب ٹن کی سانس سینے میں اٹک گئی۔ آبدوزوں کے اسی سودے کے لئے وہ ریاض توصیف کے قریبی لوگوں سے معاملہ طے کر رہا تھا۔ اسے پتہ تھا عارف علی کو اس سودے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

"ریاض توصیف کسی قیمت پر رضا سروہی کو وزیراعظم بنانے پر تیار نہیں ہے۔" قریشی نے جو سیکریٹری دفاع اور اقتدار مافیا کا کوآرڈی نیٹر تھا انہیں بتانے کی کوشش کی۔

"ریاض توصیف کی ہوس بڑھتی جا رہی ہے۔ وہ چاہتا ہے سب کچھ اس کی پلیٹ میں ڈال دیا جائے۔" نوکر شاہی کے سب سے اعلیٰ عہدے پر فائز اختیار حیدر رضوی نے منہ بنایا۔ "ریاض توصیف کو وفاق میں اپنی پسند کی وزارت ملے گی۔ اسے پنجاب بھی مل رہا ہے۔ پنجاب پر حکومت کا مطلب پاکستان پر حکومت ہے۔ اسے اور کیا چاہئے؟"

"سندھ!" فلک پیر ہونٹوں سے سگار نکال کر زیر مونچھ مسکرایا۔

"سندھ؟" اختیار رضوی نے حیرت ظاہر کی۔ "سندھ میں تو عامر نذیر کو مکمل اکثریت حاصل ہے۔ وہ اسے کیسے مل سکتا ہے۔"

"اکبر خان سے پوچھئے۔" فلک پیر نے دوبارہ سگار ہونٹوں میں دبا لیا۔

"پیر صاحب آپ خود ہی بتا دیجئے۔ آپ کے پرانے دوست کا معاملہ ہے۔" بیورو کریسی کے گاڈ فادر، صدر کے مشیر اور اقتدار مافیا کے سربراہ اکبر خان نے مسکرا کر کہا۔

"اکبر خان نے سندھ کے سب سے بڑے شاطر کو صدر سے ملوایا ہے۔ وہ اکثریت کو اقلیت میں تبدیل کرنے کا ماہر ہے۔ اس نے یہ فن عامر نذیر کے باپ سے سیکھا تھا۔ اور اب اسی کے بیٹے پر آزمائے گا۔" سب ہنسنے لگے۔ سب سے زوردار قہقہہ اختیار رضوی کا تھا۔

"جنرل صاحب! آپ تو اس ماہر فن کو ختم کرانے والے تھے۔ کسی کو لندن بھی بھجوایا تھا۔" بوڑھا بیورو کریٹ ہنسی روک کر جنرل سعید ملک سے کہنے لگا۔

"کام کے آدمیوں کو ضائع نہیں کیا جاتا۔ سندھ میں ہمارے پاس عامر نذیر کے خلاف اس سے زیادہ موثر ہتھیار کوئی نہیں ہے۔" جنرل ملک نے کہا۔ جنرل ملک خفیہ ایجنسی کا سابق سربراہ تھا لیکن ایجنسی پر اس کی گرفت آج بھی مضبوط تھی۔

"اور اگر وہ کامیاب نہیں ہوا؟" عارف علی نے امکان ظاہر کیا۔

"سندھ کی اسمبلی توڑ کر گورنر راج نافذ کر دیں گے۔ نئے انتخابات میں عامر نذیر کو شکست دلوائیں گے۔ عامر نذیر کو ہم کسی قیمت پر حکومت نہیں کرنے دیں گے۔" جنرل اسلم برلاس گرجا۔ سب نے اس کی تائید میں سر ہلایا۔

"رضا سروہی کا معاملہ طے کیجئے۔ وقت کم ہے۔ مجھے مسجد میں نماز عشاء کے بعد ایک اجتماع سے خطاب کرنا ہے۔" جنرل ملک نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

"معاملہ طے ہو چکا ہے۔" جنرل برلاس کے لہجے میں گرج ابھی باقی تھی۔ "اکبر خان! آپ صدر صاحب سے کہئے کہ وہ ریاض توصیف کو بلا کر سمجھائیں۔ اسے وزیراعظم بننے کے لئے اپنی باری کا انتظار کرنا پڑے گا۔ رضا سروہی کے حق میں فیصلہ ہو چکا ہے۔ ریاض توصیف سے کہیں......"

"ابھی کوئی فیصلہ نہیں ہوا۔" اکبر خان نے جنرل کی بات کاٹ دی۔ "ابھی ہم صرف غور کر رہے ہیں۔ فیصلہ ہونا ابھی باقی ہے۔" جنرل برلاس کے ماتھے پر ناگواری کی لکیریں ابھر آئیں۔ اکبر خان کی نظریں اسی کے چہرے پر جمی تھیں۔ "رضا سروہی کے بارے میں صدر کچھ تحفظات رکھتے ہیں۔ ماہرین کے تجزیئے بھی کچھ اور کہہ رہے ہیں۔ عامر نذیر انتخاب ہارا ہے لیکن سیاسی طور پر زندہ ہے' وہ چوٹ کھایا ہوا سانپ ہے۔ ہمارے فیصلے میں کوئی کمزوری رہ گئی تو پلٹ کر ڈسنے کی کوشش کرے گا۔ ہمیں بہت سوچ کر فیصلہ کرنا ہو گا۔"

"میں اس سانپ کا پھن اپنی ایڑی کے نیچے مسل دوں گا۔" جنرل برلاس سانپ کی طرح پھنکارا۔ "عامر نذیر اس وطن کا غدار ہے۔ اس کا سر کچلنا میرا فرض

ہے۔"

"عامر نذیر اس ملک کی ایک بڑی سیاسی طاقت ہے۔ اسے وزیراعظم بننے سے روکا تو وہ بھی ہمارا دشمن ہو جائے گا۔ ایک ساتھ دونوں بڑی سیاسی طاقتوں کو اپنا دشمن بنا لینا حماقت ہے۔ اگلے سال آپ ریٹائر ہو گئے تو ہمارا اثر اور کم ہو جائے گا۔" اکبر خان نے جنرل برلاس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔ برلاس کو پتہ تھا کہ جنرل ملک کی طرح اس کے پیچھے کوئی بڑی طاقت نہیں ہے۔ ریٹائر ہو کر وہ بے اثر ہو جائے گا۔ جنرل کی ساری امیدیں رضا سروہی سے وابستہ تھیں۔ رضا سروہی وزیراعظم بنا تو جنرل برلاس اس کا بازو مروڑ کر تین سال کی توسیع لے سکتا تھا۔

"ہم نے جب رضا سروہی کو نگراں وزیراعظم بنوایا تھا تو اسے مستقل وزیراعظم بنانے کا وعدہ بھی کیا تھا۔ جنرل ملک گواہ ہیں۔" برلاس کی حمایت میں اختیار حیدر نے آواز اٹھائی۔

"یہ کوئی فلمی منظر نہیں ہے کہ جو وعدہ کیا وہ نباہنا پڑے گا۔" اس بار جنرل ملک بولا۔ "ہم یہاں اخلاقیات پر سیمینار نہیں کر رہے۔ فیصلہ پیار محبت کے وعدوں پر نہیں، حقائق کی بنیاد پر ہو گا۔"

"حقائق؟" جنرل برلاس نے غصے سے کہا۔ "وہ کیا ہیں؟"

اکبر خان نے قریشی کی طرف دیکھا جو ناک پر پڑھنے والی عینک ٹکائے اور گھٹنوں پر ایک فائل کھولے بیٹھا تھا۔ اس نے فائل پر ایک نظر ڈال کر بولنا شروع کیا۔

"حقائق صاف ہیں۔ اسمبلی میں ریاض توصیف کے حامیوں کی اکثریت ہے۔ رضا سروہی کو وزیراعظم بنایا تو خود اس کی پارلیمانی پارٹی اس کی وفادار ثابت نہیں ہو گی۔ ریاض توصیف اسے کبھی مضبوط نہیں ہونے دے گا۔ دوسری طرف عامر نذیر کے ارکان بھی بڑی تعداد میں منتخب ہوئے ہیں۔ اپوزیشن کی طرف سے وہ بھی دباؤ بڑھائے گا۔ رضا سروہی کی حکومت کسی ایک کا بھی دباؤ برداشت نہیں کر سکے گی۔ رضا سروہی کی سیاسی بنیاد بہت کمزور ہے۔ اس سے یہ توقع پوری نہیں ہوئی کہ وہ سندھ میں عامر

نذیر کے اثر کو توڑے گا۔ اس کے ساتھ صرف برساتی مینڈکوں کی فوج ہے جن کا کوئی سیاسی اثر نہیں ہے اور جو صرف رضا سروہی کے وزیراعظم ہونے کی وجہ سے اس کے ساتھ اچھل رہے ہیں۔ رضا سروہی نے مالی طور پر بھی توقعات پوری نہیں کیں۔ اس نے سندھ میں ہمارے امیدواروں کو انتخابی فنڈز دینے کا وعدہ بھی پورا نہیں کیا۔ جنرل برلاس نے اسے جو انتخابی فنڈز دلوائے تھے اس کے منشی اس میں سے بھی پیسے کھا گئے۔ رضا سروہی سیاسی اور مالی طور پر ایک مکمل ذمے داری ثابت ہو گا۔ Total Liability۔ اسے ہر قدم اٹھانے کے لئے ہماری انگلی تھامنا پڑے گی۔ اس کے مقابلے میں ریاض توصیف سیاسی' مالی' تنظیمی اور شخصی طور پر بہت مضبوط ہے اور اپنے طور پر عامر نذیر سے لڑنے کی طاقت رکھتا ہے۔" قریشی نے فائل بند کر کے چشمہ اتار لیا۔

کمرے میں تھوڑی دیر کے لئے خاموشی چھا گئی جسے بوڑھے اختیار رضوی نے توڑا۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم پورا ملک ریاض توصیف کی وفاق انڈسٹریز کے حوالے کر دیں؟"

قریشی نے کچھ بولنا چاہا لیکن اکبر خان نے اسے روک دیا۔

"رضا سروہی وزیراعظم بن گیا تب بھی وفاق انڈسٹریز کو کون روک سکے گا؟ ریاض توصیف وزیراعظم نہ ہوتے ہوئے بھی وزیراعظم سے زیادہ طاقتور ہو گا۔ صوبائی حکومتیں بھی اسی کے اثر میں ہوں گی۔ اسے کچھ کرنے سے کون روک سکے گا؟"

اکبر خان کے جواب کے بعد رضوی اور برلاس دونوں پسپائی اختیار کر کے صوفے کی پشت سے ٹک گئے۔ وہ جانتے تھے اکبر خان صرف اپنے زور پر نہیں بول رہا تھا۔ اس کی آواز صدر کی آواز تھی۔ وہ جنرل سعید ملک کا ردعمل بھی دیکھ چکے تھے۔ اختیار رضوی کو بیورو کریسی پر بہت اختیار حاصل تھا لیکن اسے پتہ تھا بیورو کریسی آج بھی صدر کے بعد اکبر خان کو اپنا بڑا مانتی تھی۔ آہستہ آہستہ قریشی بھی اپنی گرفت مضبوط کر رہا تھا۔ جنرل برلاس کو بھی پتہ تھا کہ کور کمانڈروں کی ہمدردیاں کس کس کے

ساتھ ہیں۔ رضا سروہی کو بیچنا آسان نہیں تھا۔ جنرل کے پاس ہتھیار ڈالنے کے سوا چارہ نہیں تھا۔

"ریاض توصیف سے بات ہو گئی ہے؟" جنرل سعید ملک نے اکبر خان سے پوچھا۔

"ریاض توصیف کل صدر سے ملنے آیا تھا۔ اس کے بعد وہ جنرل برلاس سے ملا تھا۔ اس نے فوج کو بھی بہت سی یقین دہانیاں کرائی ہیں۔ ہم آج فیصلہ کر کے اٹھے تو صدر اسے کل بلا کر حکومت بنانے کی دعوت دیں گے۔"

جنرل برلاس نے خاموشی سے سر ہلا دیا۔ ریاض توصیف سے وہ تنہا نہیں ملا تھا۔ کئی سینئر جنرل اس کے ساتھ تھے۔ سب خاموش رہے تھے اور آخر میں روایتی جملہ دہرا دیا تھا۔ "فوج جمہوری عمل میں کوئی مداخلت نہیں کرے گی۔" جنرل کو ریسرچ سیل کا بریف بھی مل چکا تھا۔ اس کا متن کم و بیش وہی تھا جو ابھی قریشی نے بتایا تھا۔

"ریاض توصیف میراج طیاروں کے معاہدے میں ٹانگ اڑانے کی کوشش کرے گا۔" عارف علی نے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔

"ریاض توصیف کو کل صدر کے ساتھ ہونے والی ملاقات میں صاف صاف بتا دیا جائے گا۔" اکبر خان نے جواب دیا۔ "ریاض توصیف کو حقائق کا خود بھی اچھی طرح علم ہے۔ امریکہ سے ایف ۱۶ طیارے ملنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ ملک کے دفاع کے لئے میراج طیاروں کی خریداری ناگزیر ہے۔ ڈیفنس کمیٹی خریداری کے سلسلے میں پوری طرح بااختیار ہے۔ وہ فیصلہ کر چکی ہے۔"

"ریاض توصیف کو آبدوزوں کے سودے میں زیادہ دلچسپی ہے۔" قریشی نے نصف شیشوں والی عینک دوبارہ ناک پر جما لی تھی اور فائل کے کاغذات پلٹنے لگا تھا۔ "میں نے بحریہ کے چیف سے بات کی ہے۔ انہیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ ریاض توصیف کے لوگ جب بھی تیار ہوں Presentation دے سکتے ہیں۔"

عارف علی نے بے توجہی سے سر ہلا دیا۔ نواب ٹن کو ہیڈ فون میں عارف علی

کی آواز نہیں سنائی دی تو اس کے منہ سے یا ہو کا نعرہ نکل گیا۔ اس کی کوشش کامیاب رہی تھی۔ عارف علی کو پتہ نہیں چل سکا تھا کہ اس سودے کے پیچھے اصل میں کون ہے ورنہ وہ ضرور بولتا۔ قریشی نے بہت اچھے انداز میں اسے آزمایا تھا۔ نواب ٹن کے ساتھ اس سودے میں قریشی بھی شامل تھا۔ اس کے بغیر یہ سودا ممکن ہی نہیں تھا۔ قریشی اور نواب ٹن کا یہ آخری بڑا سودا تھا!

''سپر پاور آج بالکل خاموش ہے۔'' فلک پیر شفیع رضا کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

''کیا؟'' شفیع رضا چونک سا پڑا۔ وہ ذہنی طور پر یہاں موجود نہیں تھا۔ پہلے اس کی ایجنسی کو اور اب خود اسے بھی اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ وزیراعظم کون بنتا ہے۔ جو بھی ہو گا واشنگٹن جا کر خود ناک رگڑے گا۔ دفاعی معاملات اس کے دائرہ اختیار میں نہیں تھے۔ سینٹرل کمان والوں کے اپنے چینل تھے۔ وہ آج کے اجلاس میں آتا بھی نہیں۔ لیکن اس کی بیوی کو بنکاک آنا تھا' اس نے بھی کراچی میں اسٹاپ اوور لے لیا۔ اسے اوپر کے کمرے میں جانے کی زیادہ بے چینی تھی۔ پچھلی بار جنرل کانی نے اس کے لئے ایک اسپیشل آئٹم لانے کا وعدہ کیا تھا۔

''آپ کے سفیر نے کسے سرٹیفکیٹ عطا کیا ہے؟'' فلک پیر نے اسی طرح مسکراتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''سفیر نے اب سیاستدانوں سے ملنا بند کر دیا ہے۔ رات وہ ڈنر پر شکایت کر رہا تھا کہ جو بھی مل کر جاتا ہے اخبار میں اپنے وزیراعظم بننے کی خبر چھپوا دیتا ہے۔'' شفیع رضا جوابی مسکراہٹ اچھال کر بولا۔

''اخبارات اب تک نصف درجن لوگوں سے حلف اٹھوا چکے ہیں۔'' قریشی فائلیں بند کر کے مسکرایا۔

''آپ کو کسی کے سرٹیفکیٹ کی کیا ضرورت ہے۔'' شفیع رضا پھر فلک پیر سے مخاطب ہوا۔ ''یہ آپ کا گھریلو معاملہ ہے۔ اپنا جمہوری حق استعمال کیجئے۔ کوئی مشکل در پیش ہو تو ستاروں سے رجوع کیجئے۔''

"پیر صاحب کے ستارے بھی اخبارات کی طرح ہیں۔ وہی کہتے ہیں جو ان سے کہلوایا جاتا ہے۔" اختیار حیدر رضوی نے قہقہہ لگا کر کہا۔

"ہمارے لئے سند بہت ضروری ہے۔" فلک پیر نے اختیار حیدر کے قہقہے کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "خلافت عثمانیہ ختم ہو گئی۔ سلطنت برطانیہ چلی گئی۔ مملکت سعودیہ غیر جانبدار ہے۔ ساری امیدیں آپ کے آستانے سے ہیں۔ سند دیکھے بغیر ہم وزیراعظم کیا، کلرک بھرتی نہیں کر سکتے۔" سب ہنس پڑے۔

"رضا سروہی نے یہ تاثر دیا ہے کہ وہ واشنگٹن سے سرٹیفکیٹ لے آیا ہے۔ انتخابات سے پہلے وہ امریکہ گیا تھا۔ اخباروں نے امریکی سینیٹروں سے اس کی ملاقات کی خبریں چھاپی تھیں۔" جنرل سعید ملک نے برا سا منہ کر کے کہا۔

"وہ اخبارات کی ہوائیاں ہیں۔ امریکہ کے کسی سینیٹر کو رضا سروہی کا نام تک معلوم نہیں۔" شفیع رضا سنجیدہ ہو کر بولا اور پھر چند لمحوں کے توقف کے بعد کہنے لگا۔ "آپ کے اخبارات کو تو یہ بھی نہیں معلوم کہ امریکہ میں اس کی بیوی فوت ہو گئی تھی۔ وہ اس کی آخری رسومات میں شرکت کرنے گیا تھا۔"

"کون؟ نادیہ سروہی؟" اکبر خان نے حیرت سے پوچھا۔

"اسے کینسر ہو گیا تھا۔ بہت اذیت میں مبتلا ہو کر مری ہے۔" شفیع رضا نے سر ہلا کر کہا۔

"وہ اپنے شوہر کو چھوڑ کر ایک بینکر کے ساتھ بھاگ گئی تھی اور اس کے ساتھ گناہ کی زندگی بسر کر رہی تھی۔ اسے اپنے گناہوں کی سزا اپنی زندگی ہی میں مل گئی۔" جنرل ملک کے لہجے میں بہت تضحیک تھی۔

"جسے سزا ملنی چاہئے تھی اسے آپ نے وزیراعظم بنوا دیا۔" شفیع رضا نے طنزیہ انداز میں کہا۔ اسے جنرل کا لہجہ ناگوار گزرا تھا۔ "نادیہ ایک اچھی عورت تھی۔ اس نے محلوں کو چھوڑ کر ایک چھوٹے سے فلیٹ میں زندگی گزار دی۔ ان کا فرار بھی رضا سروہی کی بد فعلیوں کا نتیجہ تھا۔ بینکر کی بیوی رضا سروہی کے ساتھ سندھ کلب میں پکڑی گئی تھی۔ رئیسہ بشیر کا قصہ سب کو پتہ ہے....." شفیع رضا اچانک خاموش ہو

گیا۔ وہ جذباتی ہونے لگا تھا۔ یہاں بیٹھے ہوئے لوگوں کو ان قصوں سے کیا دلچسپی تھی۔ یہ اس کے پرانے دوستوں کے قصے تھے جب سندھ کلب ان کا ٹھکانہ ہوتا تھا۔ سب کے چہرے ایک ایک کر کے نگاہوں کے سامنے آ گئے۔ نادیہ اور رضا سروہی۔ وحیدہ اور حفیظ شمشاد۔ ممتاز کھوسو جس نے اسے عامر نذیر کے باپ سے ملوایا تھا۔ صحافی یوسف سعید۔ بینکر شبیر بھائی۔ اس کی بیوی زہرہ۔ روفی منیب اور کتنے ہی چہرے تھے۔ کتنا وقت گزر گیا تھا۔ کیا کیا کچھ بدل گیا تھا۔ بلکہ سب کچھ بدل گیا تھا۔ وہ بہت اداس ہو گیا۔ اس کی بیوی نے صحیح کہا تھا۔ اب ان کے ریٹائر ہونے کا وقت آ گیا تھا۔ جذبات استدلال کی قوت پر حاوی ہونے لگے تھے۔ یہ کمزوری کی نشانی تھی۔

"سب جہنمی ہیں۔ سنگسار ہونے کے لائق۔" جنرل سعید ملک نے فتویٰ دیا اور گھڑی دیکھتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے شفیع رضا کے جذبات اور اس کے گنہگار دوستوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اسے اس سے بھی کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ یہاں بیٹھے ہوئے اس کے ساتھی اوپر کے کمروں میں جا کر رات بھر گناہوں کا کیا کھیل کھیلیں گے۔ یہ ان کا ذاتی معاملہ تھا۔ اس کے لئے بس یہی کافی تھا کہ وہ ان گناہوں میں شریک نہیں تھا۔ اس کی نماز کا وقت ہو رہا تھا۔ نماز کے بعد اسے خطاب کرنا تھا۔ "اسلام میں امن اور آشتی کے ساتھ رہنے کا تصور۔" وہ جلدی جلدی سب سے ہاتھ ملانے لگا۔ رکنے کی کوئی وجہ بھی نہیں تھی۔ فیصلہ ہو چکا تھا۔ صبح کی پہلی پرواز سے سب اسلام آباد جائیں گے اور ریاض توصیف کو تاج پہنانے کے فیصلے کو عملی شکل دیں گے۔ لیکن آج کی رات ان کی اپنی تھی۔ جنرل برلاس بھی جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ جنرل کانی سے اسے بھی دلچسپی نہیں تھی۔

شفیع رضا کی آنکھوں میں جو دھندلے چہرے ابھرے تھے وہ غائب ہو گئے۔ اسے اب اوپر جانے کی جلدی تھی۔ اسے دیکھنا تھا جنرل کانی اسے حیرت زدہ کرنے کے لئے کیسا تحفہ لے کر آئی ہے۔

لیکن اوپر کی سیڑھیوں کی طرف جانے والا پہلا شخص اختیار رضوی تھا۔ اس کی فرمائش پر آج نئے کھیل کا انتظام ہوا تھا۔ جب سے ہتھکڑیاں اور کڑے لگوانے کا

کھیل بند ہوا تھا اسے مزا نہیں آ رہا تھا۔ آج اس کے لئے آنے والی لڑکی مردانہ لباس میں تیار ہو کر بیٹھی ہو گی۔ خود اسے مادام بننا تھا۔ وہ سوچنے لگا آنکھوں میں کاجل، ہونٹوں پر سرخی اور سر پر سنہری وگ لگا کر اور لال نائٹی اور کالے اسٹاکنگز پہن کر وہ کیسا لگے گا۔ وہ سوچ کر ہی شرما گیا۔ پورے جسم میں سنسنی دوڑ گئی تھی۔ وہ بھاگتا ہوا سیڑھیاں چڑھا تو ہانپنے لگا۔ اس کے پیچھے کئی قہقہے بلند ہوئے۔ لیکن اسے پرواہ نہیں تھی۔ ایک وہی نہیں اس حمام میں سب ننگے تھے۔

نواب ٹن نے ہیڈ فون اتارا، ٹیپ پلٹا، سسٹم کے سوئچ آف کئے اور کمرہ مقفل کر کے بیڈ روم کی طرف جاتے ہوئے کوٹ کے اندر کی جیب سے چپٹی بوتل نکال کر کئی لمبے گھونٹ لئے۔ اس کے پاس وقت کم تھا۔ اسے فوری طور پر برابر کے بنگلے میں پہنچ کر حفاظتی انتظامات دیکھنے تھے۔ یہ اس کی پرانی اور بنیادی ذمے داری تھی۔ لیکن اس سے پہلے اسے اپنے اسٹاک بروکر کو تلاش کرنا تھا۔ سیاسی بے یقینی نے اسٹاک مارکیٹ کی قیمتیں گرا دی تھیں۔ ریاض توصیف کے حلف اٹھانے کی خبر نکلتے ہی قیمتیں ایک دم اوپر جائیں گی۔ اسے اس سے پہلے شیئرز کی خریداری کرنا تھی۔ ایک دن میں ایک آدھ کروڑ کا منافع برا نہیں تھا۔ کل اسے جلالی کو بھی ڈھونڈنا اور منانا تھا۔

جلالی بہت دنوں بعد مل سکا۔ نواب ٹن نے ایک دو بار فون کیا تھا لیکن وہی آنسرنگ مشین۔ نواب ٹن خود بھی بہت مصروف رہا تھا۔ ریاض توصیف کے حلف اٹھانے کے بعد وہ مستقل کراچی اور اسلام آباد کے درمیان گردش کر رہا تھا۔ ایک دن وہ صبح ہی صبح گیارہ بجے فون کئے بغیر جلالی کے گھر پہنچ گیا۔ نواب ٹن کے لئے گیارہ بجے کا وقت نور کا تڑکا تھا۔ وہ اتنی صبح اٹھنے کا عادی نہیں تھا۔ نواب ٹن بہت دیر تک اس کے فلیٹ کے سامنے کھڑا گھنٹی بجاتا رہا۔ جلالی شاید گھر میں نہیں تھا۔ وہ مایوس ہو کر جانے ہی والا تھا کہ دروازہ کھل گیا۔ نواب ٹن جلالی کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ کچھ اچھی حالت میں نہیں تھا۔ کئی دن کا بڑھا ہوا شیو۔ مسلے ہوئے کپڑے۔ وزن بھی کم

دکھائی دے رہا تھا۔ نواب ٹن فلیٹ کے اندر گیا تو ہر چیز بے ترتیب تھی۔ ہر سطح پر گرد کی موٹی تہہ جمی ہوئی تھی۔ پورے فلیٹ میں باسی کھانے کی بو بسی ہوئی تھی۔ نواب ٹن کو سانس لینا مشکل ہو رہا تھا پھر بھی وہ ایک کرسی کی گرد جھاڑ کر بیٹھ گیا اور سگریٹ سلگانے لگا۔

"میں بڈاپسٹ سے آتے ہی گاؤں چلا گیا تھا۔ چند دن پہلے واپس آیا ہوں۔ طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لئے نہ کہیں باہر گیا نہ کچھ کر سکا۔" جلالی نے اپنی اور فلیٹ کی خراب حالت کا جواز پیش کرتے ہوئے کہا۔ نواب ٹن کچھ نہیں بولا۔ اسی طرح بیٹھا ہوا سگریٹ کے کش لیتا رہا۔ سگریٹ ختم ہوا تو وہ جانے کے لئے کھڑا ہو گیا۔

"تم شیو کر کے اور کپڑے بدل کر تیار ہو جاؤ۔ ہوٹلوں میں مجنوں نظر آنے والوں کا داخلہ بند ہے۔ میں ایک گھنٹے بعد تمہیں لینے آؤں گا۔ کہیں بیٹھ کر لنچ کریں گے۔"

جلالی نے کچھ کہنا چاہا لیکن نواب ٹن اسے دیکھے بغیر دروازے کی طرف چلا گیا۔ جلالی کو یاد آیا کئی سال پہلے اسی طرح نواب ٹن نے بھائی جی کے دیئے ہوئے پیسے لینے پر مجبور کیا تھا اور اس طرح اس کی زندگی کا دھارا بدل گیا تھا۔ نواب ٹن کی بات نہ ماننا آسان نہیں تھا۔ اس کی خاموشی بھی بہت سحر انگیز ہوتی تھی۔ نواب ٹن کے جانے کے بعد وہ خاموشی سے اٹھ کر تیار ہونے چلا گیا۔

نواب ٹن ٹھیک ایک گھنٹے بعد واپس آیا تو جلالی بہت اجلا اور دھلا دھلا سا لگ رہا تھا۔ نواب ٹن اپنے نئے نوکر رحمٰن اور خانساماں کو ساتھ لے کر آیا تھا۔ رحمٰن دلاور کا بھائی تھا۔ اسے کھانا پکانا نہیں آتا تھا اس لئے اس کے ساتھ ایک خانساماں بھی رکھنا پڑا تھا۔

"جاؤ بیٹا شروع ہو جاؤ۔" نواب ٹن نے رحمٰن سے کہا اور پھر جلالی سے مخاطب ہوا۔ "تم اب یہاں اسی وقت واپس آؤ گے جب یہ جگہ آدمیوں کے رہنے کے قابل ہو جائے گی۔" جلالی کچھ کہے بغیر خاموشی سے اس کے پیچھے نکل آیا۔

انھوں نے کراؤن پلازہ کے خاموش کافی شاپ میں لنچ کیا۔ گفتگو میں کوئی پرانا حوالہ نہیں آیا۔ ملک کی سیاست' کراچی کا بدلتا ہوا موسم' اسلام آباد کی سردی' لاہور کے سری پائے' حیدر آباد کی ربڑی۔ دنیا بھر کی باتیں ہوئیں بس شعر و ادب کا تذکرہ نہیں ہوا۔ نواب ٹن کا کہنا تھا شین سے شروع ہونے والے سب شوق جیسے شاعری' شراب' شباب شام ہونے کے بعد ہی اچھے لگتے ہیں۔ نواب ٹن نے یہ پوچھنے کی کوشش نہیں کی کہ جلالی پر کیا گزری۔ جلالی نے بھی کوئی شکایت نہیں کی۔ جو کچھ ہوا تھا وہ سب ماضی کا قصہ تھا۔ حال تو کسی اور غم میں جھلس رہا تھا۔

نواب ٹن کو کہیں جانا تھا' اس نے جلالی کو پریس کلب میں اتار دیا اور شام کو اسے لینے کے لئے آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ جلالی بڈاپسٹ سے واپس آنے کے بعد پہلی بار پریس کلب آیا تھا۔ پرانے دوستوں سے ملا تو ذہن کی گرہیں کھلنے لگیں۔ پریس کلب کی دنیا بھی عجیب تھی۔ اوپر شطرنج کھیلنے والوں کا شور' باہر لان پر سگریٹ کا دھواں اڑاتی ہوئی ٹولیاں۔ منہ میں مباحث کے جھاگ۔ ایک طرف غیبت کارنر۔ ایک دوسرے سے خفا خفا سے بیٹھے ہوئے لوگ۔ وقت کی کڑی دوپہر میں جھلسے ہوئے چہرے' آنکھوں میں جلے ہوئے خوابوں کی راکھ لیکن انداز میں وہی لاپرواہی' تاج شاہی کو ٹھوکر مارنے والی رعونت۔

لنچ کا وقت گزر چکا تھا پھر بھی ڈائننگ ہال میں لنچ کھانے والوں کا ہجوم تھا۔ ابراہیم جلیس ہال میں کوئی پریس کانفرنس ہو رہی تھی اور گیٹ کے باہر نعرے لگاتا ہوا ایک جلوس انتظار کر رہا تھا کہ اخباری فوٹو گرافر کب کھانا ختم کریں گے اور باہر آ کر ان کی تصویریں اتاریں گے۔ وقت بدل گیا تھا۔ خبر اب رپورٹروں اور فوٹو گرافروں کا انتظار نہیں کرتی۔ خود چل کر خبر والوں کے پاس آ جاتی تھی۔

یہ جلالی کی اپنی دنیا تھی۔ وہ خواہ مخواہ ادھر ادھر بھٹکتا رہا۔ اسے لوٹ کر سیدھا یہیں آنا چاہئے تھا۔ براٹی سلاوا سے جہاز میں چڑھا تھا تو احساسات گنگ تھے۔ کراچی اترا تو ہر طرف وحشت رقص کرتی نظر آئی۔ ہر آواز ٹرین کی چھک چھک بن گئی تھی۔ ٹپ ٹپ ٹپ ٹپ۔ بارش نے گھر دیکھ لیا تھا۔ وہ گاؤں چلا گیا۔ بہت دنوں تک کھیتوں

کی بھربھری مٹی اور سر اٹھاتی فصلوں کے درمیان بنی ہوئی پگڈنڈیوں اور اونچی نیچی منڈیروں پر چلتا اور بھٹکتا رہا۔ اس نے کبھی اتنا عرصہ گاؤں میں نہیں گزارا تھا اس لئے اس کے بھائیوں کے خاندان والے بہت خوش تھے لیکن اس کی دیوانگی کم نہیں ہو رہی تھی۔ ماں کی قبر پر جا بیٹھتا تو چین آتا۔ وہاں بھی ناک میں لونگ کی خوشبو بس جاتی تو گھر پلٹ آتا۔ اس کی وحشت دیکھ کر بھائیوں کو تشویش ہونے لگی تھی۔ بھابیوں کا خیال تھا تنہائی کا روگ ہے۔ وہ رشتے لے کر آنے لگیں تو جلالی وہاں سے بھاگ نکلا۔ لیکن کہاں اور کس کے پاس جاتا۔ ایک ہی جگہ تھی۔ کراچی اور کراچی میں اس کا فلیٹ۔

جلالی کو یقین تھا کہ نواب ٹن کو کہیں کوئی کام نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جلالی کا جو بھی مرض ہے' پریس کلب کا ٹانک اس میں افاقہ کرے گا۔ اسی لئے وہ اسے یہاں چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ نواب ٹن اسے لینے آیا تو شام بجھنے لگی تھی۔ پریس کلب سے وہ بشیر پان والے کی دکان پر گئے۔ اس وقت رش نہیں تھا اس لئے بشیر نے اپنی گدی سے اتر کر گلے ملنے کی روایت نباہی' دونوں کے منہ میں اپنے ہاتھ سے پان کی گلوری رکھی اور پیسے نہ لے کر جلالی کا قرضہ اور بڑھا دیا۔

نواب ٹن اسے ساتھ لے کر اپنے گھر آیا تو رحمٰن اور خانساماں جلالی کے فلیٹ کی صفائی کر کے واپس آ چکے تھے۔ رزم گاہ بالکل ایسی ہی تھی جیسی جلالی چھوڑ کر گیا تھا۔ سب نوادرات اپنی اپنی جگہ تھے۔ وہ دیوار بھی ابھی تک خالی تھی جس پر گویا کی ایک نقل لگی رہی تھی۔

"چچا صدیقی کہاں ہیں؟" جلالی نے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"اپنی منجھلی بیوی کو منانے لندن گئے ہیں۔"

"لندن؟ لیکن وہ تو یہیں کہیں......"

"ناراض ہو کر چچا کو لندن میں رہنے کی سزا دے رہی ہے۔ چچا کہتے ہیں واپس نہیں آئی تو وہ اس کے kensington کے فلیٹ کا کرایہ دیتے دیتے دیوالیہ ہو جائیں گے۔ باقی دونوں بیویاں بھی سنگاپور اور پیرس جانے کی دھمکیاں دے رہی ہیں۔" جلالی

ہنس پڑا۔ وہ شاید اس عرصے میں پہلی بار ہنسا تھا۔ لیکن پھر ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ جیسے اس نے ہنس کر کوئی غلطی کی ہو۔

نواب ٹن نے جو اس کے بدلتے ہوئے موڈ کو دیکھ رہا تھا اٹھ کر ٹیپ آن کر دیا۔ استاد بڑے غلام علی خان کی آواز کمرے کو بھرنے لگی۔ "اے کرتار پوری کرو من کی آشا۔" دونوں کی خاموشی اور سنجیدگی تین تال میں کھو گئی۔ اسی وقت رحمٰن کمرے میں آ گیا اور ظروف سجانے کے لئے نواب ٹن کے اشارے کا انتظار کرنے لگا۔

"وہی کنوارے گلاس جو اب تک استعمال نہیں ہوئے تھے۔" اس نے آنکھیں کھول کر رحمٰن کو بتایا اور جب رحمٰن گلاس سجا کر چلا گیا تو جلالی سے کہنے لگا۔ "تم ہنگری سے میرے لئے دو گلاس بھی لے کر نہیں آئے۔ مجھے پتہ تھا کہ تم نہیں لاؤ گے۔ میں نے خاص طور پر ایک دوست سے منگوائے ہیں۔ تم انہیں دیکھتے ہی بڈاپسٹ پہنچ جاؤ گے۔" نواب ٹن نے گلاس کو ہاتھ میں لے کر اسکے شفاف ہونے کا جائزہ لیا۔ بہت نازک سا گلاس تھا جس پر فیروزی رنگ کے نازک پھول ہاتھوں سے نقش کئے گئے تھے۔

جلالی ان گلاسوں کو پہچانتا تھا۔ بڈاپسٹ کے شب و روز انہی پیالوں کی کھن کھناہٹ میں گزرتے تھے۔ اس نے سوچا رحمٰن بھی اب نواب ٹن کے اشارے پہچاننے لگا ہے۔ جلالی کو دلاور یاد آ گیا۔ وہ نواب ٹن کے اشارے ہی نہیں اس کا موڈ بھی پہچانتا تھا۔ وہ جانتا تھا کب المونیم کے کشکول کی باری ہے، کب مٹی کے پیالوں کی یا شیشے کے ترشے ہوئے گلاسوں کی اور کب ڈائریکٹ بوتل سے چلے گی۔ پتہ نہیں زندہ ہے یا مار ڈالا گیا۔

"دلاور برازیل میں ہے اور بہت خوش ہے۔" نواب ٹن نے جیسے اس کی سوچیں پڑھ لی تھیں۔ "وہ شکر کے ایک کارخانے میں ملازم ہے۔ پچھلے دنوں اس نے ایک پرتگالی لڑکی سے شادی بھی کر لی ہے۔"

"پرتگالی لڑکی سے؟" جلالی نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ کارنیوال دیکھنے آئی تھی اور کنگال ہو کر فٹ پاتھ پر زندگی گزار رہی تھی۔

دلاور اسے اٹھا کر اپنی کھولی میں لے گیا۔ ایک ہفتے کے اندر اندر دونوں نے شادی کر لی۔ اب وہ دلاور کو پرتگالی زبان سکھا رہی ہے اور دلاور اسے مسلمان بنانے کی کوشش میں ہے۔"

نواب ٹن ہنسنے لگا۔ جلالی کے ہونٹوں پر بھی ہلکی سی مسکراہٹ ابھر آئی۔ سینے سے اطمینان کی ایک سانس نکلی۔ بڈاپسٹ جاتے ہوئے دل پر یہ بوجھ تھا کہ اس کی وجہ سے دلاور بھی مارا گیا۔ اس نے سوچا کم از کم ایک بوجھ تو ہلکا ہوا۔ لیکن بڈاپسٹ سے جو پہاڑ جیسا بوجھ سینے پر رکھ کر لایا تھا وہ کیسے اترے گا؟

نواب ٹن نے سو سو کیرٹ کے ہیرے جیسی برف کی ڈلیاں گلاس میں ڈال کر اس پر سرخ سیال انڈیلا اور گلاس پانی سے لبریز کر کے جلالی کے ہاتھ میں تھما دیا' ساتھ ہی اپنا گلاس بنا کر جام تجویز کرنے لگا۔

"بڈاپسٹ کی شام' کسی کے گلابی رخساروں اور ڈینوب جیسی نیلگوں آنکھوں کے نام' اس شراب کے نام جس میں تم نے سرخ ہونٹوں کو ڈوبتے دیکھا ہو گا' ان زلفوں کے نام جن کے سائے تمہاری راتوں میں لہرائے ہوں گے۔ سفید برف میں لپٹی ہوئی اس صبح کے نام جس کی معصومیت تمہارے دل میں گھر کر گئی ہو گی......" نواب ٹن جھوم جھوم کر شاعری کر رہا تھا لیکن جلالی کے کان جیسے بند ہو گئے۔ آنکھوں میں سچ مچ بڈاپسٹ کا برف میں لپٹا ہوا سفید دن سما گیا۔ الزبتھ پریوں کی طرح دونوں ہاتھ پھیلائے ناچ رہی تھی۔

آسماں کی سفید پریو آؤ
نہاں خانۂ دل میں میرے
سفیدی اگاؤ......

اور پھر اس نے اپنے انگاروں جیسے سرخ ہونٹ اس کے ہونٹوں پر رکھ دیئے۔ جلالی نے گلاس منہ سے لگا کر ایک گھونٹ لینے کی کوشش کی۔ اسے لگا جیسے اس کے ہونٹ خون میں ڈوب گئے ہوں۔ چھک چھک چھک چھک۔ بہت سی ٹرینیں سر پر سے گزر گئیں۔ ٹپ ٹپ ٹپ ٹپ۔ بوندیں گرنے لگی تھیں۔ جلالی گلاس زمین پر پٹخ کر

یکلخت کھڑا ہو گیا۔

"نواب صاحب! یہ گلاس یہاں سے ہٹا لو۔" وہ تیزی سے کمرے سے نکل کر چلا گیا۔ نواب ٹن خاموشی سے اسی طرح بیٹھا چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں اطمینان تھا۔ اس نے بالکل صحیح جگہ چوٹ لگائی تھی۔ اسے جلالی کے دل سے غم کی چٹان سرکانا تھی۔ اسے پھر سے کام کا آدمی بنانا تھا۔

جلالی رزم گاہ سے باہر نکل کر باغ میں چلا گیا۔ آنسو بہت مشکل سے روکے تھے۔ کچھ دیر ٹھنڈی گھاس پر ننگے پاؤں گھومتا رہا۔ رات کی رانی کی مہک احساسات کو ہولے ہولے تھپکیاں دے رہی تھی۔ غسل خانے جا کر آنکھوں کو ٹھنڈے پانی کے چھپکے دیئے اور پھر رزم گاہ میں آ کر اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔ نواب ٹن بڑے غلام علی خان کی ٹھمری سنتا ہوا سر پٹک رہا تھا۔ ظروف بدل گئے تھے۔ شیشے کے سفید ترشے ہوئے بھاری گلاس آ گئے تھے۔ جلالی کا نئے سرے سے بھرا ہوا گلاس اس کی نشست کے سامنے رکھا تھا۔ اس نے اٹھا کر ایک لمبا گھونٹ لیا اور نواب ٹن کی بند آنکھوں کو گھورنے لگا۔

"یہ آسٹریا کا کٹ گلاس ہے۔" نواب ٹن نے آنکھیں کھول کر گلاس ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔ "اب تمہارے اندر ویانا کے گرجا گھروں کا سناٹا سما جائے گا۔"

"میرے ہاتھ خون سے رنگے ہوئے ہیں۔ میں بڈاپسٹ میں ایک قتل کر کے آیا ہوں۔ میرے مقدر میں اب سکون کا کوئی لمحہ نہیں آئے گا۔" جلالی نے کہا۔ دل ایک بار پھر بھر آیا۔ نواب ٹن سنبھل کر بیٹھ گیا اور جلالی کو حیرت سے دیکھنے لگا۔ وہ سمجھا تھا دل کی کوئی چوٹ ہو گی۔ یہ تو قتل کا معاملہ نکلا۔ لیکن اسے پوچھنا نہیں پڑا۔ جلالی خود ہی اپنا بوجھ اتارنے لگا۔ ایک ایک یاد۔ ایک ایک منظر۔ الزبتھ کی ایک ایک بات۔ اس کی سنائی ہوئی ایک ایک نظم۔ جانے کہاں سے اتنی روانی آ گئی تھی۔ زبان بھی یادوں کا ساتھ دے رہی تھی۔ آنکھیں بار بار گیلی ہو جاتیں۔ جیعور کے اسٹیشن پر الزبتھ کے رخصت ہونے کا منظر سنانے لگا تو آنسوؤں میں بھی روانی آ گئی۔

"میں خود کو کبھی معاف نہیں کر سکوں گا۔ میں خود اس کے پاس بھاگ

کر جاتا۔ وہ نہیں ملتی تو بے چین ہو جاتا۔ اس نے خود کو مکمل طور پر میرے حوالے کر دیا تو میں اس کا ہاتھ تھامنے کی بجائے اسے ریل کی پٹڑی پر پھینک آیا۔"

"کیوں؟" نواب ٹن نے بہت سنجیدگی سے پوچھا اور آستین سے آنکھیں پونچھتا ہوا جلالی اسے حیرت سے دیکھنے لگا۔

"تمہاری کیا مجبوری تھی۔ تمہیں کس نے روکا تھا۔ تم نے اس کا ہاتھ کیوں نہیں تھاما۔ اسے ساتھ آنے کے لئے کیوں نہیں کہا۔ کیا وہ منع کر دیتی؟"

"نہیں! وہ بہت جذباتی ہو رہی تھی۔ ضرور آ جاتی۔ لیکن بعد میں پچھتاتی۔ مجھے اسے بے وطن کرنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ میں اسے یہاں لا کر ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔"

"ضائع تو وہ ہو گئی۔" نواب ٹن نے بہت تلخی سے کہا۔ جانے کیوں اسے جلالی پر غصہ آ گیا تھا۔ "تم اس کے ہو کر اس کے ساتھ وہیں رہ سکتے تھے۔ یہاں کون تمہارے انتظار میں آنسو بہا رہا تھا۔" جلالی نے بہت دکھ بھری نظروں سے اسے دیکھا۔ لیکن نواب ٹن اس وقت بہت بے رحم ہو گیا تھا۔

"ذہین جلالی! تم ایک اذیت پسند شخص ہو۔ تمہیں اپنے آپ کو اذیت دینے میں مزا آتا ہے۔ ایک اذیت ختم ہوتی ہے تو تم دوسری اذیت کی تلاش میں بھٹکنے لگتے ہو۔ تمہیں کمٹ منٹ کرنے سے بھی ڈر لگتا ہے۔ تم خوفزدہ ہو جاتے ہو۔ میں تمہارا علاج کراؤں گا۔ تمہیں علاج کی سخت ضرورت ہے۔"

"مجھے علاج کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" جلالی غصے میں اٹھ کھڑا ہو گیا۔

"اور کمٹ منٹ؟ آپ مجھے کمٹ منٹ کا درس دے رہے ہیں؟ میرا کمٹ منٹ اپنی ذات سے نہیں ہے۔ بلکہ کسی کی بھی ذات سے نہیں ہے۔ یہ دیکھئے میرے ہاتھ۔ ان پر الزبتھ کے خون کے دھبے ہیں۔ کیونکہ میں نے کمٹ منٹ بیچ کر اسے اپنے جذبات کے حوالے نہیں کیا۔ میں امید ڈھونڈنے کے سفر پر آیا ہوں۔ اس سفر میں ایک انجانی لڑکی کا جو خون ہوا ہے وہ رائیگاں نہیں جائے گا۔ میری تلاش بیکار نہیں جائے گی۔"

"امید! ہاہاہا۔ امید!" نواب ٹن نے ایک مصنوعی قہقہہ لگایا۔ "تم امید بھی نہیں پا سکو گے۔ وہ بانہیں پھیلائے تمہارے سامنے کھڑی ہو گی اور تم اس سے نظریں پرا کر گزر جاؤ گے۔ تمہاری امید بھی الزبتھ کی طرح کسی ریل کی پٹڑی کے نیچے آ کر کچلی جائے گی۔"

جلالی بہت دکھ بھری آنکھوں سے دیکھتا ہوا آہستہ سے دوبارہ اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔ نواب ٹن کی آنکھیں جلالی کی آنکھوں میں پیوست تھیں لیکن وہ اب سنجیدہ ہو گیا تھا۔

"سویڈن کا ایک بہت مشہور مصور تھا۔ اینڈریش زورن۔ پورٹریٹ بنانے میں اس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ یورپ میں کون تھا جس کی تصویر اس نے نہیں بنائی۔ امریکی صدر نے اپنی تصویر بنوانے کے لئے اسے امریکہ بلوایا تھا۔ سویڈن میں اس کی بنائی ہوئی غسل لیتی کسان لڑکیوں کی نیوڈز بہت مشہور تھیں۔ لیکن اس سے اپنی محبوبہ کی تصویر مکمل نہیں ہو سکی۔ وہ جسم کا ایک ایک خط' ایک ایک نقشہ زندہ کر دیتا۔ لیکن اس سے آنکھیں نہیں بن پاتی تھیں اور تصویر چہرے سے محروم رہ جاتی۔ وہ دیوانہ ہو جاتا۔ نشے میں دھت ہو کر تصویریں پھاڑ دیتا۔ بار بار کوشش کرتا لیکن جب بھی آنکھوں پر پہنچتا خوفزدہ ہو جاتا اور جنون کی حالت میں تصویر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا۔"

نواب ٹن نے خاموش ہو کر ایک بڑا سا گھونٹ لیا۔ جلالی اسے خاموشی سے تکتا ہوا اس کہانی میں خود کو ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"ذہین جلالی! تم بھی اسی سویڈش مصور کی طرح ہو۔ جسم کا سفر طے کر کے آنکھوں تک پہنچتے ہو تو ڈر جاتے ہو۔ امید ڈھونڈنی ہے تو پہلے آنکھوں کی سوئیاں نکالنا سیکھو۔"

جلالی کے چہرے کا کرب کچھ اور بڑھ گیا۔ نواب ٹن کو اس پر رحم آنے لگا۔ لیکن جلالی کو کام کا آدمی بنانے کے لئے اس کی جراحت ضروری تھی۔ اسے خوابوں کی دھند سے باہر نکالنا تھا۔

"امید کے نام!" نواب ٹن نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اپنا گلاس ہوا میں بلند کیا۔ "لیکن اس سفر میں تم اکیلے نہیں ہو۔ ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔" جلالی کو اطمینان دلا کر اس نے ٹیپ کی آواز بڑھائی اور آنکھیں بند کر کے موسیقی کی لے میں ڈوب گیا۔ جلالی نے بھی اپنا سر دیوار سے ٹکا دیا اور استاد بڑے غلام علی خان کا الاپ سننے لگا ع

انوکھا لاڈلا، کھیلن کو مانگے چاند

امید

''وزیراعظم ریاض توصیف!''

''زندہ باد۔''

اس نے اپنے پھیپھڑوں کی پوری قوت استعمال کر کے نعرے کا جواب دیا۔ سینے میں درد کی ایک لہر اٹھی لیکن اسے پرواہ نہیں تھی۔ آج اس کی امید بر آنے کا دن تھا۔ بس اسے کسی طرح آگے پہنچنا تھا۔ لیکن آگے بڑھنے کی کوشش میں وہ چند قدم اور پیچھے دھکیل دیا گیا۔ اس نے اپنے دائیں ہاتھ میں کارکنوں کو جاری کیا جانے والا کارڈ تھاما ہوا تھا اور پنجوں کے بل اچک اچک کر دایاں ہاتھ اور اس میں دبا ہوا کارڈ بلند کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے یقین تھا پارٹی کے کسی ذمے دار نے دیکھ لیا تو اسے کھینچ کر آگے لے جائے گا۔ آگے راجہ صاحب ہوں گے۔ وہ اسے وزیراعظم کے پاس لے جائیں گے۔ انتخابات کے زمانے میں یہ کارڈ جادو کی طرح کام کرتا تھا۔ ہر جلوس میں سب سے آگے، نعرہ لگانے والوں میں سب سے پہلے۔ ایک دفعہ تو وہ اس ٹرک پر بھی چڑھ چکا تھا جس پر سوار ہو کر ریاض توصیف نے انتخابی جلوس کی

قیادت کی تھی۔ اور انتخابات کے دن جب ریاض توصیف ووٹ ڈالنے آیا تھا تو اس کے گرد ہاتھوں کی زنجیر بنا کر گھیرا ڈال کر لے جانے والوں میں وہ بھی شامل تھا۔ اس کے ہاتھ ریاض توصیف کے جسم کو چھو رہے تھے۔ اس کے پورے بدن میں روشنی بھر گئی تھی۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ انتخابات جیت کر ریاض توصیف وزیراعظم بنا تو ملک کی ہی نہیں خود اس کی تقدیر بھی بدل جائے گی۔ اسی وقت کسی کی کہنی اس کے سینے میں لگی اور وہ دوہرا ہو کر چیخ پڑا۔

''اوئے سور دے پترا......''

سور دے پترا نے جو پہلوان نما آدمی تھا اپنی لال لال آنکھوں سے اسے دیکھا تو وہ اس کی آنکھوں کے سامنے اپنا کارکنوں والا کارڈ لہرانے لگا۔

''چنگی تراں انکھاں کھول کے ویکھ لے۔ میں پارٹی دا خاص بندہ آں۔ خاص بندہ۔''

''تیرے خاص بندے دی بھینڑنوں....''

اسی وقت کسی نے وزیراعظم ریاض توصیف کا نعرہ لگایا اور وہ ''زندہ باد'' کہنے کے جوش میں پوری گالی نہیں سن سکا۔ نعروں کے ساتھ ہی وہ چند قدم اور پیچھے ہو گیا۔ اسے قدم مضبوطی سے جما کر رکھنے تھے۔ نیچے اترنے والی سیڑھیاں چند ہی قدم پیچھے تھیں۔ ایک دفعہ باہر ہو گیا تو کبھی آگے نہیں پہنچ پائے گا۔ اس میں اب پہلے والا دم خم نہیں تھا۔ اس کی دس سال پہلے جیسی صحت ہوتی تو دیکھتا کہ وہ سور دا پتر کس طرح اسے پیچھے دھکیل کر آگے بڑھ جاتا۔ دل کی بیماری نے ساری طاقت سلب کر لی تھی۔ اس کے بیٹے نے اسے آنے سے منع کیا تھا۔ لیکن وہ نہیں مانا تھا۔ ایسا موقع بار بار نہیں ملتا۔

ریاض توصیف وزیراعظم بننے کے بعد پہلی بار لاہور آ رہا تھا۔ اس نے اخبار میں پڑھا تو مال ختم ہونے کا انتظار نہیں کیا تھا۔ وقت سے پہلے ٹھیلا گھر لے آیا اور راجہ صاحب کے پاس چلا گیا۔ راجہ صاحب کو انتخابات میں جتانے کے لئے اس نے بہت کام کیا تھا۔ راجہ صاحب اسے مانتے بھی بہت تھے۔ وہ چٹھی لکھ کر نہیں دیتے تو

اسپتال میں اس کے دل کا معائنہ بھی نہ ہوتا۔ نہ اسے پتہ چلتا کہ اس کے دل کی کتنی رگیں بند ہیں۔ انہوں نے وعدہ کیا تھا ریاض توصیف کی حکومت آتے ہی اس کے بیٹے کی نوکری کی درخواست پر خود وزیراعظم سے حکم لکھوائیں گے۔ اس کا بیٹا دسویں پاس کر کے دو سال سے ڈنڈے بجا رہا تھا۔ اس کے بیٹے نے اس سے بہت کہا تھا کہ وہ آرام کرے۔ اس کی جگہ ٹھیلا وہ لگایا کرے گا۔ لیکن یہ سن کر اسے غصہ آگیا تھا۔ اس کا میٹرک پاس بیٹا چھولے نہیں بیچے گا۔ وہ خاندان کا پہلا پڑھا لکھا لڑکا تھا۔ وہ بابو بنے گا' بابو۔ اسے بابو بنانے کے لئے وہ عامر نذیر کو بھی آزما کر دیکھ چکا تھا۔ اس نے سنا تھا جاگیردار اپنے خاندان کے لوگوں کو مختلف پارٹیوں میں بانٹ دیتے ہیں۔ کوئی بھی پارٹی اقتدار میں آئے' ان کے مفادات کو نقصان نہیں پہنچتا۔ وہ خود پارٹی سے غداری نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے اس نے اپنے بیٹے کو عامر نذیر کی پارٹی میں بھیج دیا تھا جس کی اس وقت حکومت تھی۔ اس کا بیٹا گلی گلی جئے عامر نذیر کے نعرے لگاتا رہا لیکن نوکری کی کوئی امید نظر نہیں آئی تو گھر آ کر بیٹھ گیا۔ گھر بیٹھے بیٹے کو دیکھ کر اسے ریاض توصیف کی تقریروں کے ایک ایک لفظ پر مکمل یقین ہو گیا تھا۔ عامر نذیر کی حکومت نے مہنگائی اور بیروزگاری بڑھائی تھی۔ پارٹی کے جلسوں میں عامر نذیر کے خلاف نعرے لگاتے ہوئے اس کا جوش اور بڑھ جاتا۔

اسے خوف تھا کہ اس کا بیٹا ہری پگڑی والوں میں شامل نہ ہو جائے۔ اس کے پڑوسی کے بیٹے نے' جس نے اس کے بیٹے کے ساتھ دسویں پاس کی تھی' چھ مہینے پہلے داڑھی بڑھا کر سبز پگڑی پہن لی تھی اور اب نیفے میں پستول اڑس کو اسکوٹر پر گھومتا تھا۔ پورا محلّہ اس سے ڈرتا تھا۔ اسے پتہ تھا کہ وہ کسی کو مار کر جیل جائے گا یا خود مارا جائے گا۔ اسے اپنے بیٹے کا یہ انجام پسند نہیں تھا۔ اسی لئے وہ کل سرشام ہی راجہ صاحب کی حویلی میں جا کر بیٹھ گیا تھا۔ راجہ صاحب انتخابات کے بعد بہت مصروف ہو گئے تھے۔ اس نے پہلے بھی کئی بار کوشش کی تھی۔ لیکن وہ زیادہ تر اسلام آباد میں ہوتے تھے۔ لاہور آتے تو کسی نہ کسی اجلاس میں مصروف رہتے۔ اس نے سوچا تھا آج وہ ملے بغیر نہیں جائے گا۔ لیکن راجہ صاحب کا اجلاس جاری تھا۔ اجلاس

ختم ہوا تو انہیں کہیں کھانے پر جانا تھا۔ راجہ صاحب کے سیکریٹری نے اسے بتایا وزیراعظم ریاض توصیف کل چادر چڑھانے داتا دربار جائے گا۔ تمام کارکن وہیں جمع ہوں گے۔ وہ بھی آ جائے۔ راجہ صاحب اس کی درخواست پر وزیراعظم سے وہیں دستخط کروا دیں گے۔ وہ خوش خوش گھر آ کر سو گیا تھا۔ خواب میں اس نے اپنے بیٹے کو بابو اور پھر ترقی کر کے وزیراعظم بنتے دیکھا۔

صبح اٹھ کر اس نے ٹھیلے کی طرف نگاہ بھی نہیں کی۔ چٹے رنگ کا وہ شلوار کرتا پہنا جو وہ صرف خاص موقعوں پر پہنتا تھا۔ بیٹے کی نوکری کی وہ درخواست نکالی جو اس نے کچہری کے باہر بیٹھے ہوئے بابو سے ٹائپ کرائی تھی اور جو ایک سال سے تہہ کر کے اپنے ٹین کے صندوق میں رکھی ہوئی تھی۔ اس کا بیٹا چھت پر چڑھا ہوا سوراخ بند کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ چند دن پہلے بارش ہوئی تھی تو ان کا چھپر جگہ جگہ سے ٹپکنے لگا تھا۔ باپ نے جب اسے بتایا کہ وہ کہاں جا رہا ہے تو وہ نیچے اتر آیا۔

''ہجوم میں پھنس کر تیری سانس گھٹ جائے گی۔ نہ جا۔''

''میرے پاس یہ ہے!'' اس نے بڑے فخر سے پارٹی کا کارڈ دکھایا۔ اس کی بیوی کونے میں بیٹھی چھولے کی دیگ مانجھ رہی تھی اور بار بار پلو سے آنکھیں پونچھ رہی تھی۔

''حرام دی جڑیں موکا بے موکا رویا نہ کر۔ تیرے پیو دا جنازہ نئیں اٹھ ریا۔'' بیوی کو زیر لب گالیاں بکتا ہوا وہ باہر نکل آیا۔ پاؤں بہتے ہوئے گندے پانی پر پڑنے سے بال بال بچے تھے۔ وہ با آواز بلند ایک اور گالی دینے ہی والا تھا کہ اسے خیال آیا اس گندے پانی کی بڑی وجہ وہ خود ہے۔ چند مہینے پہلے پڑوسیوں سے اس کا جھگڑا ہو چکا تھا۔ وہ شکایت کر رہے تھے کہ اس کی دیگیں دھلنے کی وجہ سے پوری گلی میں کیچڑ بھر گئی ہے۔

''اوئے فکر نہ کرو۔ ساڈا شیر آوے ہی آوے۔ اوہدیں حکومت آندیاں ایس گلی پکی کرا دیاں گا۔'' اس نے سینہ تان کر سیاستدان جیسا وعدہ کیا تھا اور سب مرعوب ہو کر اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے تھے۔ سب کو پتہ تھا وہ ریاض توصیف کی پارٹی کا آدمی

ہے۔ اس کی چھت بوسیدہ سہی مگر اس پر لہرانے والا پارٹی کا جھنڈا سب سے اونچا تھا۔ گندے پانی کی بہتی ہوئی دھاروں سے بچنے کے لئے لمبے لمبے قدم رکھتا وہ گلی سے نکلا تو اسے گلی پکی کرانے کا وعدہ یاد آ گیا۔ اس نے کندھے جھٹک دیئے۔ صرف اس کی گلی کچی نہیں تھی۔ ہر گلی میں کیچڑ اور گندگی کے ڈھیر لگے تھے۔ صرف ایک گلی پکی کیسے ہو سکتی تھی۔ پھر بھی کوشش کرے گا۔ راجہ صاحب وزیر ہو گئے تو محلے والوں کی طرف سے ان کے لئے جلسہ کرائے گا۔ وہ اگر آنے پر راضی ہو گئے تو گلی خود بخود پکی ہو جائے گی۔ اس وقت تو وہ زیادہ بڑے مشن پر جا رہا تھا۔ اسے اپنے بیٹے کے مستقبل کو جانے والی سڑک پکی کرانی تھی۔

اچانک نعروں میں بہت جوش آ گیا۔ ہجوم کی دھکم پیل بھی بڑھ گئی۔ ہر طرف سے لہریں زور مارنے لگیں۔ آگے کی طرف سے لگاتار نعرے لگ رہے تھے۔

"ساڈا چیف تاڈا چیف۔"

"ایاز توصیف۔ ایاز توصیف۔"

شاید ریاض توصیف کا بھائی ایاز توصیف جو پنجاب کا وزیر اعلیٰ بنا تھا بڑے بھائی کا استقبال کرنے کے لئے پہلے سے پہنچ گیا تھا۔ چند لمحوں بعد ہی چیف چیف کے نعرے دب گئے اور وزیراعظم ریاض توصیف کے نعروں کا زور بڑھ گیا۔ نعروں کی سفر کرتی ہوئی آواز سے اسے اندازہ ہو گیا کہ محافظوں کے گھیرے میں پارٹی کے لیڈروں کے ساتھ ریاض توصیف چادر چڑھانے کے لئے آگے بڑھ رہا ہو گا۔ ریاض توصیف کے ساتھ لوگوں کا نیا ریلا داخل ہو گیا تھا اس لئے لہریں پیچھے کی طرف آ رہی تھیں۔ اس نے اپنی ساری قوت لگا دی پھر بھی چند قدم اور پیچھے کھسکتا چلا گیا۔ اس جدوجہد کے باوجود وہ نعروں کا پوری شدت سے جواب دے رہا تھا۔ وہ ہاتھ بھی جس میں پارٹی کا کارڈ تھا اسی طرح بلند تھا۔ اس نے ایک دفعہ اور اچکنے اور اچھلنے کی کوشش کی۔ شاید اسے راجہ صاحب نظر آ جائیں یا ان کی نظر اس پر پڑ جائے اور وہ اسے آگے بلا لیں۔ لیکن وہ اوپر کی طرف جنبش بھی نہیں کر سکا۔ چاروں طرف سے جسموں نے اس طرح جکڑا ہوا تھا کہ حرکت ممکن ہی نہیں تھی۔ سینے میں کھنچاؤ محسوس ہوا تو اس

نے اپنا بلند کیا ہوا ہاتھ واپس کھینچنے کی کوشش کی۔ دل پر اپنا ہاتھ رکھتا تو قرار آ جاتا لیکن اس کا بازو بھی چاروں طرف سے کندھوں میں جکڑا ہوا تھا۔ ہاتھ اسی طرح اٹھا رہا۔ واپس نہ آ سکا۔

غلطی خود اس کی تھی۔ اسے ہمیشہ کی طرح کارکنوں کی ٹولی کے ساتھ آنا چاہئے تھا۔ کارکنوں کا جلوس وزیراعظم کے پیچھے نعرے لگاتا ہوا داخل ہوا ہو گا۔ انہیں کون روک سکتا تھا۔ وہ بھی ان کے ساتھ ہوتا۔ لیکن اس نے سیانا بننے کی کوشش کی تھی۔ اسے پتہ تھا ہر کارکن کی جیب میں ایک درخواست ہو گی۔ نوکری کی، دل گردے کا علاج کرانے کی۔ کسی کو کالج میں داخلہ دلانے یا دوبئی کا ویزا لگوانے کی۔ پتہ نہیں اس کی باری آتی بھی یا نہیں۔ اسی لئے وہ وقت سے چار گھنٹے پہلے اکیلا آ کر بیٹھ گیا تھا۔ وزیراعظم کا جلوس جیسے ہی اندر آتا وہ لپک کر راجہ صاحب کی پناہ میں چلا جاتا جو اس کی درخواست کو ریاض توصیف کے سامنے کر دیتے۔ وزیراعظم کا قلم سب سے پہلے اسی کی درخواست پر چلتا۔ پیچھے آنے والے تمام کارکن اسے حیرت سے دیکھتے رہ جاتے۔

داتا دربار کے ٹھنڈے فرش پر جا کر بیٹھا تھا تو اسے لگا تھا جیسے حضرت گنج بخش نے اپنا سایہ اس پر دراز کر دیا ہو۔ آنکھ کھلی تو ایک پولیس والا بید سے ٹھونگے مار کر اسے اٹھا رہا تھا۔ وہ ہڑبڑا کر کھڑا ہو گیا تھا۔ چاروں طرف وردی والے اور سادہ پوش سپاہیوں اور پولیس افسروں کا مجمع تھا۔ اس نے گھڑی دیکھی وزیراعظم کے آنے میں ایک گھنٹہ باقی تھا۔ پولیس والے ایک ایک کونے میں بم یا آتش گیر مادہ تلاش کر رہے تھے اور ہر مشکوک نظر آنے والے شخص کو وہاں سے نکال رہے تھے۔ وہ پولیس کی اس کارکردگی پر خوش ہونے لگا تھا۔ یہ اس کے لیڈر کی زندگی کا سوال تھا۔

"او بابے چل اتھوں نس جا۔" ایک پولیس والے نے اس کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا، پیچھے کوئی نہیں تھا۔ وہ اسی سے مخاطب تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے پارٹی کارڈ پولیس والے کی آنکھوں کے سامنے کر دیا۔

"اس نوں تو اتھے واڑ لے۔" پولیس والے نے فحش اشارہ کرتے ہوئے بازو

پکڑ کر اسے دھکا دیا۔ اس کا ماتھا گھومنے لگا تھا لیکن پھر بھی اس نے اپنا دماغ ٹھنڈا رکھا اور پولیس والے کو بتانے لگا تھا کہ وہ پارٹی کارکن اور راجہ سائیں کا آدمی ہے۔

"جا کے وڑ جا راجہ صاحب دی......" پولیس والے نے منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے اس کی گدی پکڑ کر زور کا دھکا دیا تھا۔ وہ پولیس والوں کے دھکے کا عادی تھا اس لئے برا مانے بغیر کپڑے جھاڑتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا اور وہاں سے باہر نکل آیا۔ وہ عامر نذیر کی حکومت کے خلاف مظاہروں میں ہمیشہ آگے آگے ہوتا تھا۔ پولیس کے دھکے اور لاٹھیاں کھانا روز کی بات تھی۔ ڈنڈے کھا کر بھاگتے بھاگتے وہ پلٹ کر ایک پتھر ضرور مار جاتا۔ لیکن اب تو اس کی اپنی حکومت تھی۔ خود اپنے سر پر پتھر کیسے مارتا۔ مگر وہ ان کو چھوڑے گا نہیں۔ اس نے پولیس والے کی شکل اچھی طرح پہچان لی تھی۔ اس نے راجہ صاحب کی بے عزتی کی تھی۔ وہ اس کی پیٹی اتروا دے گا۔ بس آج کا دن نکل جائے۔ پہلے اس کا کام ہو جائے۔

پھر وہ دوسری طرف سے اندر آگیا جہاں اب مجمع بڑھتا جا رہا تھا۔ یہاں سے نکل کر وہ اس طرف جا سکتا تھا جہاں وزیراعظم کو آنا تھا۔ اسے کسی طرح راجہ صاحب کی توجہ حاصل کرنی تھی۔ وہ اسے دیکھتے ہی اپنے پاس بلوالیں گے۔ انہوں نے وعدہ کیا تھا۔ لیکن ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ جو زور آور تھے وہ کہنیاں مارتے مارتے آگے بڑھ رہے تھے۔ وہ بھی اپنی جگہ قائم نہ رہ سکا تھا۔ دھکے کھاتا ہوا بہت پیچھے آگیا تھا۔ لیکن اس کی امید پھر بھی قائم تھی۔ وزیراعظم چادر چڑھانے کے بعد واپس پلٹیں گے تو مجمع کا زور ٹوٹے گا۔ وہ رستہ بنا کر ان کے سامنے پہنچ جائے گا۔ راجہ صاحب نے نہیں دیکھا تو وزیراعظم کی گاڑی کے سامنے لیٹ جائے گا۔ وہ اپنا دیا ہوا کارڈ ضرور پہچانیں گے۔ وہ کارکنوں کی بہت عزت کرتے ہیں۔

سینے میں درد کی ایک اور لہر آئی لیکن وہ برداشت کر گیا۔ ہجوم نے اس کا پورا جسم شکنجے میں جکڑ لیا تھا۔ نہ نیچے لٹکا ہوا بایاں ہاتھ اوپر لے جا سکتا تھا اور نہ اوپر اٹھا ہوا دایاں ہاتھ نیچے لا سکتا تھا جس میں اس کا کارڈ دبا ہوا تھا۔ اس کی ایڑیاں پہلی سیڑھی کو چھو رہی تھیں۔ سامنے سے پیچھے کی طرف جو زور لگ رہا تھا وہ اس کا پوری

طاقت سے مقابلہ کر رہا تھا۔ اچانک پیچھے والوں نے "یا علی مدد" کہہ کر زور کا دھکا لگایا تو وہ کئی قدم آگے چلا گیا۔ لیکن آگے والوں کا دباؤ بھی واپس زور مار رہا تھا۔ جو کمزور تھے ان کے بدن کی ہڈیاں کڑکڑانے لگیں۔ اس نے اپنی سانس روک لی اور سینے کو پھلا کر اپنی دانست میں لوہے کا کر لیا۔ آگے سے کسی نے پھر نعرہ لگایا۔ "وزیراعظم ریاض توصیف۔" تو اس نے سانس چھوڑ دی اور پھیپھڑوں کا پورا زور لگا کر جواب دیا۔

"زندہ با......" آواز حلق ہی میں دم توڑ گئی۔ سانس واپس نہیں آ رہی تھی۔ وہ "پانی۔ پانی" چلا رہا تھا لیکن صرف خر خر کی آواز نکل رہی تھی۔ آگے اور پیچھے کے دھکوں میں تھوڑی دیر جھومتے ہوئے خر خر کی آوازیں بھی بند ہو گئیں۔ اس کا دایاں ہاتھ اسی طرح اکڑتا ہوا ہوا میں بلند رہا لیکن گردن کئی جھٹکے کھا کر ایک طرف لڑھک گئی۔ پلکوں نے بھی جھپکنا بند کر دیا تھا۔ وزیراعظم ریاض توصیف زندہ باد کا شور دور ہوتا جا رہا تھا۔ وزیراعظم شاید چادر چڑھا کر واپس چلے گئے تھے۔ چیف صاحب کے نعروں کی آواز بلند ہوئی اور پھر وہ بھی دور ہوتی گئی۔ تماشا ختم ہو گیا تھا۔ جو پیچھے تھے وہ پیچھے سے واپس چلے گئے۔ جو آگے تھے وہ دائیں بائیں ہونے لگے۔ شکنجہ اچانک کھل گیا تو اس کا جسم ٹوٹے ہوئے ستون کی طرح فرش پر گر پڑا۔ واپس جاتے ہوئے لوگ تیزی سے اس کی طرف پلٹ پڑے اور فرش پر پڑے ہوئے اس کے جسم کو اپنے نرغے میں لے لیا۔ کوئی ہتھیلی سہلا رہا تھا اور کوئی پاؤں کے تلوے۔ "پانی لاؤ پانی!" کوئی زور سے چیخا۔ ان میں سے ایک جو زیادہ تجربہ کار تھا وہ سینے سے کان لگا کر اس کے دل کی دھڑکن سننے کی کوشش کرنے لگا۔ کچھ سنائی نہیں دیا تو ناک پر ہاتھ رکھ کر سانس کی گرمی محسوس کرنے کی کوشش کی اور سر کو نفی میں ہلاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک نوجوان اس کے اکڑے ہوئے ہاتھ کو واپس اپنی جگہ لانے لگا تو ہاتھ میں دبا ہوا کارڈ گر پڑا۔ نوجوان دیکھتے ہی چیخ پڑا۔

"یہ ہمارا کارکن ہے۔ ہماری پارٹی کا کارکن۔ ہٹ جاؤ ہٹ جاؤ۔" بھیڑ چھٹنے لگی۔ لوگوں نے اطمینان کی سانس لی۔ لاش لاوارث نہیں رہی تھی۔ اس کا وارث مل

گیا تھا۔ پارٹی کے ایک دوسرے کارکن نے جس نے پارٹی کا ایک بڑا سا جھنڈا اٹھایا ہوا تھا پرچم کو ڈنڈے سے الگ کر کے لاش پر ڈال دیا' پارٹی کارڈ تمغے کی طرح اس کے سینے پر رکھ دیا اور اس کی آنکھوں کو جن میں امید بیٹھی ابھی تک جھانک رہی تھی بند کرنے لگا۔ آنکھیں بند ہونے سے پہلے امید پھدک کر آنکھوں سے باہر نکل آئی اور کوئی نیا گھر تلاش کرنے چل پڑی۔

"جئے عامر!"

"سدا جئے۔"

جئے عامر۔ سدا جئے۔ جئے عامر سدا جئے۔ جئے عامر سدا جئے......

نعرہ رقص کی دھن بن گیا۔ وہ خالی اسٹیج پر دونوں ہاتھ اٹھائے نعرہ لگاتے ہوئے تھرک رہا تھا۔ وہ لیوا رقص کا ماہر تھا۔ اس کے بدن کی بوٹی بوٹی تھرک رہی تھی۔ اس کا من بھی اندر سے ناچ رہا تھا۔ باوردی نے پہلی بار اس کی ڈیوٹی اسٹیج پر لگا کر اسے اسٹیج کا انچارج بنایا تھا۔ صرف وہی لوگ اسٹیج کے آس پاس آسکتے تھے جن کے پاس باوردی کے دیئے ہوئے پاس تھے۔ اسٹیج کے اوپر تو پاس والوں کا آنا بھی منع تھا۔ باوردی ایک گھنٹہ پہلے کچھ لوگوں کو لے کر آیا تھا جنہوں نے اسٹیج کے اوپر نیچے چاروں طرف اچھی طرح جائزہ لیا تھا۔ بھن بھن کرتے ہوئے کسی برقی آلے کو ہر طرف نچایا تھا اور پھر مطمئن ہو کر چلے گئے تھے۔

"اب اسٹیج پر کوئی بھی نہیں آئے گا۔ کوئی بھی نہیں۔" باوردی جاتے جاتے اسے ہدایت کر کے گیا تھا۔ باوردی کو کلفٹن سے عامر نذیر اور آصفہ کو لے کر آنا تھا۔ ان کی کاروں کا جلوس منظم کرنا تھا۔ آگے پیچھے کم از کم پچاس بجیرو جیپیں ہوں گی۔ کلفٹن سے لیاری تک ------ پوری کراچی کلاشنکوف رائفلوں کی ہوائی فائرنگ سے گونج اٹھے گی۔ اسے عامر نذیر کو دکھانا تھا کہ کراچی آج بھی اس کے ساتھ ہے۔ جب تک اس کے پاس بجیرو اور ہاتھ میں کلاشنکوف ہے کراچی اس سے کوئی نہیں چھین

سکے گا۔

"اڑے او چابی۔ او ترازو۔ اڑے او برش....." اس نے نعرے روک کر ایک داڑھی والے شخص کو للکارا جو اسٹیج کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کی آواز سنتے ہی اسٹیج کے آس پاس پہرہ دینے والے کارکنوں میں سے دو تین لڑکے داڑھی والے شخص کی طرف لپکے۔ داڑھی والا تھوڑی دیر بحث کرتا رہا لیکن پھر دو چار دھکے کھانے کے بعد واپس چلا گیا۔ جاتے جاتے اس نے پارٹی کا کارڈ نچا کر اسے دور سے دکھایا تھا۔

"اڑے شکل گم کرو نی۔" اس نے بے نیازی سے کہا۔ اسے اس وقت اپنے اہم ہونے کا احساس ہوا۔ کارکن کس طرح اس کی ایک ہی للکار پر دوڑ پڑے تھے۔ اس نے اپنے سینے پر لگے ہوئے لال اور ہرے ربن سے بنے پھول جیسے بیج کو ٹھیک کیا جس کے بیچ میں عامر نذیر کی تصویر لگی تھی۔ آج وہ اس تصویر پر عامر نذیر سے دستخط بھی لے گا۔ اس کا یہ بیج امر ہو جائے گا۔ ایسا خزانہ تو اس کے باپ کے پاس بھی نہیں تھا جو عامر نذیر کے باپ کے زمانے سے "جئے نذیر" کے نعرے لگا رہا تھا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ آج کی کارگزاری کے بعد باوردی کا مستقل نائب ہو جائے گا۔ ایسا ہو گیا تو پھر اس کی ڈیوٹی بھی عامر نذیر کے بند کمرے کے دروازے کے باہر لگ سکتی تھی۔ باوردی کی طرح اس کی قسمت کا دروازہ بھی کھل سکتا تھا۔

باوردی کی قسمت پر سب رشک کرتے تھے۔ اس کا نام کچھ اور تھا لیکن باوردی کہلاتا تھا۔ پہلے سب اسے مذاق میں عامر نذیر کا دربان کہتے تھے۔ اس کی ڈیوٹی دروازے پر ہوتی اور وہ عامر نذیر کے ملاقاتیوں کو اندر لانے لے جانے کا کام کیا کرتا تھا۔ وہ اس کام کو بہت سنجیدگی سے لیتا تھا۔ خاکی رنگ کی وردی پہن کر آتا اور سائے کی طرح اپنا سینہ پھلائے عامر نذیر کے آگے پیچھے رہتا۔ عامر نذیر سے ملنے والوں کے لئے ضروری تھا کہ وہ اسے خوش رکھیں۔ عامر نذیر کو بھی اس کی عادت سی ہو گئی تھی۔ وہ وزیراعظم بن کر اسلام آباد چلا گیا تو کراچی کے معاملات باوردی کے حوالے کر گیا۔ اس کی تیزی سے ہوتی ہوئی ترقی کو دیکھ کر جلنے والے اسے عامر نذیر کا نورا کہتے تھے۔ نورا عامر نذیر کے باپ کا ذاتی خادم تھا جو ایک جاگیردار نے عامر نذیر کے باپ کو

تحفے میں دیا تھا۔ لیکن باوردی خود کو خدا کا تحفہ کہتا تھا جسے عامر نذیر کے لئے آسمان سے اتارا گیا تھا۔ اسے کسی کے مذاق کی پرواہ نہیں تھی۔ جب تک عامر نذیر اس سے خوش تھا پوری دنیا اس کی تھی۔ ایک دن عامر نذیر کراچی میں تھا اور اس کا موڈ بہت اچھا تھا۔ اس نے باوردی کو سندھ کے وزیر اعلیٰ کا مشیر بنوا دیا۔ مشیر بننے کے بعد اس نے وردی پہننی بند کر دی۔ لیکن باوردی کا نام اس کے بدن پر ننگا رہ گیا۔ وہ اس نام کا بھی برا نہیں مانتا تھا۔ یہ نام اسے عامر نذیر کی بیوی آصفہ نے دیا تھا۔ یہ نام اس کے لئے تمغے کی طرح تھا۔

اسٹیج سے اب وہ نغمے بجنے لگے تھے جو خاص طور پر عامر نذیر اور اس کی پارٹی کے لئے تیار کئے گئے تھے۔ اس لئے اس نے نعرے لگانے بند کر دیئے۔ باوردی نے اسے ہوشیار رہنے کی ہدایت کی تھی۔ وہ بہت چوکنا ہو کر اسٹیج کے چاروں طرف چکر لگانے لگا۔ جسم میں جوش کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ عامر نذیر کے آنے تک یہ اسٹیج اس کا تھا۔ اس نے بہت فخر کے ساتھ سامنے پھیلے ہوئے میدان کو دیکھا جہاں کارکنوں کے قافلے آ کر جمع ہو رہے تھے۔ اسے لگا جیسے اسٹیج ہی نہیں پوری دنیا اس کی ہو گئی ہو۔ ہر شخص اسی کو دیکھ رہا ہو۔ اسٹیج سے بجنے والا ٹیپ ختم ہوا تو اس نے جیئے عامر۔ سدا عامر کے نعرے لگا کر پھر رقص شروع کر دیا۔ اسٹیج کے چاروں طرف پھیلے ہوئے کارکن بھی دونوں ہاتھ سر کے اوپر بلند کر کے تالیاں بجانے اور تھرکنے لگے۔

نعروں کی لے پر اس کا جسم خودکار طریقے سے تھرکنے لگتا تھا۔ آج سے نہیں، وہ اس دھن پر بچپن سے تھرک رہا تھا۔ یہ دھن اس کی رگ و پے میں سما گئی تھی۔ بیس سال پہلے اسی میدان میں عامر نذیر کے باپ کا جلسہ ہوا تھا تو اس کی عمر تین سال کی تھی۔ وہ اپنے باپ کے کندھوں پر چڑھ کر آیا تھا اور اس نے باپ کی آواز میں آواز ملا کر "جیئے نذیر سدا جیئے" کے نعرے لگائے تھے۔ لیکن اس کے باپ نے پوری عمر عامر نذیر کے باپ اور پھر اس کے بیٹے کے لئے نعرے لگانے میں گزار دی تھی۔ کچھ ملا تھا تو پولیس کی لاٹھیاں، حوالات کی سیر۔ پہلے اس کے باپ کے پاس دو گدھے ہوتے تھے، اب ایک رہ گیا تھا۔ اس نے اپنے باپ کو صاف صاف بتا دیا تھا کہ وہ

زندگی بھر گدھا گاڑی نہیں چلائے گا۔ جیسے ہی اس کا بچپن باپ کی گرفت سے آزاد ہوا اس نے ٹین کا وہ ڈبہ جس میں کنکر بھرے ہوئے تھے اور جسے بجا بجا کر وہ ٹریفک کو اپنے اور گدھے کے وجود سے آگاہ کرتا اپنے چھوٹے بھائی کے حوالے کیا اور گدھا گاڑی کے کام میں باپ کا ہاتھ بٹانا بند کر دیا۔ وہ سینماؤں پر نئی فلموں کے ٹکٹ بلیک میں بیچتا یا پرانے شہر کی پچھلی گلیوں میں اسمگلروں کا سامان بدن میں چھپائے پھرتا۔ رات کو پارک میں وہ اور اس کے دوست مل کر جھاڑیاں جلاتے اور چرس پی کر آگ کے الاؤ اور دھوئیں کے گرد لیوا کی دھن پر اپنے بدن کی بوٹیاں تھرکاتے اور پھر بھونکتے ہوئے آوارہ کتوں کی آواز میں آواز ملاتے یا انہیں پتھر مارتے ہوئے اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے۔

زندگی کلفٹن کی سیر بن کر گزر رہی تھی۔ صرف ہیرو اور ایک کلاشنکوف کی کمی تھی۔ اسے یقین تھا اب یہ کمی بھی پوری ہونے والی تھی۔ آج کے بعد وہ باوردی کا نائب بن کر اس کی ہیرو میں بیٹھے گا۔ ہو سکتا ہے باوردی اسے کلاشنکوف بھی دلوا دے۔ کلاشنکوف نہیں ٹی ٹی۔ اسے ٹی ٹی زیادہ پسند تھی۔ چھوٹی اور ٹھاں ٹھاں کرنے والی۔ اسے پتہ تھا وہ باوردی کی طرح کبھی مشیر نہیں بن سکے گا۔ اسے مشیر بننا بھی نہیں تھا۔ باوردی کی طرح اس کی زبان ریشم کی نہیں تھی۔ وہ باوردی کی طرح بارہ جماعت پاس بھی نہیں تھا۔ صرف تیسری جماعت میں تھا جب اس کے باپ نے اسے گدھے میں جوت دیا تھا۔ اسے باوردی کی طرح کلفٹن میں بنگلہ' ریکروٹنگ کا لائسنس یا اسٹیل مل کا ٹھیکہ بھی نہیں چاہیے تھا۔ اسے تو کراچی دوبئی کراچی چلنے والی ایک لانچ کی حصے داری لینا تھی۔ اسے راجہ بننا تھا۔ سمندروں کا راجہ۔ لیکن اس کے لئے عامر نذیر کا دوبارہ حکومت میں آنا ضروری تھا۔ اس نے پوری قوت سے نعرہ لگایا۔

"جئے عامر نذیر۔"

"سدا جئے۔" مجمعے نے پورے جوش سے جواب دیا۔ اس کے ساتھ ہی اسے پارک کے باہر گرد و غبار اڑتا نظر آیا۔ پوری فضا فائرنگ کی آواز سے گونج گئی۔ عامر نذیر کی کاروں کا جلوس شاید جلسہ گاہ تک پہنچ گیا تھا۔ مجمعے میں کلاشنکوف کی کئی

نالیاں بلند ہوئیں اور لوگوں سے بھرے میدان میں تڑ تڑ کی آوازوں کا شور اٹھنے لگا۔ پنڈال میں کئی گھنٹوں سے بیٹھے ہوئے لوگوں میں ہلچل مچ گئی۔ وہ اٹھ کر پیچھے کی طرف دیکھنے لگے۔ ڈھول کی تھاپ تیز ہوئی اور اس کی تال پر "آئے گا بھئی آئے گا۔ شیر ہمارا آئے گا۔" اور "جئے عامر سدا جئے" کے نعروں پر وحشیانہ اچھل کود شروع ہو گئی۔ اسٹیج تک کے راستے پر جو سرخ دری بچھی تھی اس کے دونوں طرف ایک دوسرے کو دھکا دے کر اپنے لئے جگہ بناتی ہوئی عورتوں کی صف تھی۔ وہ اب ہاتھوں میں ہار اور پھولوں کی پتیاں لئے ہوئے اپنے محبوب رہنما کے انتظار میں تعریف و ثنا کے گیت گا رہی تھیں۔ عامر نذیر انتخاب ہارنے کے بعد پہلی بار جلسہ کرنے لیاری آیا تھا۔ یقین تھا کہ وہ دوبارہ اقتدار میں آئے گا تو ان کے چہرے نہیں بھولے گا۔

وہ اسٹیج پر اور ہوشیاری سے پہرا دینے لگا۔ اس کی نظر خاص طور پر اس داڑھی والے پر تھی جو ایک بار پھر اسٹیج کی طرف بڑھنے اور اپنا پارٹی کارڈ دکھا کر کارکنوں کو کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے یقین تھا وہ دشمنوں کا ایجنٹ ہے جو ان کی صفوں میں گھس آیا ہے۔ باوردی نے ایسے لوگوں کے بارے میں خاص طور پر خبردار کیا تھا۔ وہ اس مولوی کا کچھ بندوبست کرنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ ہوائی فائرنگ میں شدت آ گئی۔ عامر نذیر مقامی رہنماؤں کے نرغے میں آصفہ اور قریبی ساتھیوں کے ساتھ پھولوں کے ہار پہنتا، پھولوں کی پتیاں روندتا، استقبالیہ نعروں کے جواب میں دونوں ہاتھ سر سے بلند کر کے ہلاتا اور مسکراتا ہوا اسٹیج کی طرف بڑھ رہا تھا۔ آصفہ گل پاشی کرنے والی عورتوں پر مسکراہٹ اور ان کی حوصلہ افزائی کے لئے کوئی جملہ اچھالتی ہوئی شانہ بشانہ چل رہی تھی۔ پیچھے پیچھے ڈی ڈی ٹی خان تھا جس کے دانت نکلے ہوئے تھے۔ وہ عامر نذیر کے انداز میں دونوں ہاتھ بلند کئے ہلا رہا تھا اور چاروں طرف اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے وہ سب اس کے استقبال کے لئے جمع ہوں۔ تعویذ علی شاہ اپنی وگ سنبھال رہا تھا جو پسینے کی وجہ سے بار بار سر سے پھسل جاتی تھی۔ پیچھے پیچھے دوسرے رہنما تھے۔ بڑے شاہ صاحب، متین رحیم، رے رے افغانی، ارشد تابانی اور بہت سے دوسرے جنہیں وہ پہچانتا تھا لیکن نام نہیں جانتا تھا۔

وہ اسٹیج پر آنے والی سیڑھیوں پر کھڑا ہو گیا۔ اس نے سوچا اسٹیج پر عامر نذیر سے ہاتھ ملا کر اسے اسٹیج پر خوش آمدید کہے گا۔ لیکن باوردی نے جو عامر نذیر کے لئے راستہ بناتا ہوا آگے آگے آ رہا تھا اسٹیج پر قدم رکھتے ہی اسے اپنے بازو سے ایک طرف کر دیا اور عامر نذیر اور آصفہ کو اسٹیج پر رکھی ہوئی کرسیوں پر بٹھانے لگا۔ دائیں بائیں دوسرے رہنما بیٹھنے لگے تھے۔ جو باقی بچے تھے وہ اطراف میں یا کرسیوں کے پیچھے کھڑے ہو گئے تھے۔ باوردی پیچھے جا کر سب کو دھکے دیتا ہوا عامر نذیر اور آصفہ کی کرسیوں کے درمیان میں سر نکال کر کھڑا ہو گیا۔ اخباری فوٹو گرافر فلیش لائٹس چمکا چمکا کر تصویریں اتار رہے تھے۔ باوردی کو پتہ تھا جب اخباروں میں تصویریں چھپیں گی تو عامر نذیر اور آصفہ کے دائیں بائیں بیٹھے ہوئے لوگ چھانٹ دیئے جائیں گے لیکن دونوں کے درمیان نکلا ہوا اس کا سر کوئی نہ کاٹ سکے گا۔ باوردی کو اپنی تصویر اور خبر چھپوانے کا فن آتا تھا۔

وہ باوردی کا دھکا کھا کر اسٹیج کے کنارے کھڑا آنے جانے والے لوگوں کی ٹکروں سے بچ رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے تک یہ اسٹیج اس کا تھا۔ سب کی نظریں اس پر تھیں۔ عامر نذیر اور باوردی کے آتے ہی اس کی اہمیت ختم ہو گئی تھی۔ لیکن وہ ہار ماننے والا نہیں تھا۔ وہ اب بھی باوردی کا نائب اور سٹیج کا انچارج تھا۔ وہ ایک دم اچھلا اور عامر نذیر اور آصفہ کے سامنے اسٹیج کے وسط میں آیا اور جئے عامر سدا جئے۔ جئے عامر سدا جئے۔ جئے عامر سدا جئے..... کے نعروں کی لے میں اسٹیج پر ناچنے لگا۔ اسٹیج کے سامنے جو کارکن حفاظتی دیوار بنے ہوئے کھڑے تھے وہ بھی اس کی لے اور بدن کی جنبشوں کا ساتھ دینے لگے۔ جلسہ گاہ میں جیسے کرنٹ دوڑ گیا۔ یہ لیاری کا مجمع تھا جو خالی پیٹ رہ کر ہنسنا اور پھٹے ہوئے کپڑے پہن کر ناچنا جانتا تھا۔ ہاتھ جھنڈوں کی طرح لہرانے اور بدن لٹو کی طرح گھومنے لگے۔ جئے عامر نذیر کے نعرے لے بن گئے تو خود عامر نذیر بھی جذبات میں بہہ گیا اور کھڑے ہو کر تالیاں بجانے لگا۔ اسٹیج پر سب لوگ کھڑے ہو کر عامر نذیر کی تالیوں کا ساتھ دے رہے تھے۔ عامر نذیر بیٹھا تو رقص بھی تھم گیا اور مجمع تالیاں بجا کر اسے داد دینے لگا۔ تالیاں بند ہوئیں اور شور کم ہوا

تو ڈی ڈی ٹی خان نے اٹھ کر اس کی پیٹھ تھپکی اور مائک کی طرف بڑھ گیا۔ تماشا بہت ہو چکا تھا۔ اسے اب جلسے کی کارروائی شروع کرنی تھی۔

وہ اب پھر آسمان پر پہنچ گیا تھا۔ عامر نذیر کے اسٹیج پر ہوتے ہوئے بھی اس نے سب کی توجہ جیتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ باوردی اس کی کارکردگی سے بہت خوش ہوا ہو گا۔ عامر نذیر بھی اس کا چہرہ نہ بھولے گا۔ اس کے اور عامر نذیر کے درمیان فاصلہ کم ہو رہا تھا۔ وہ کرسیوں کے پیچھے جا کر باوردی اور اس کے پاس کھڑے ہوئے شخص کے درمیان اپنی گردن گھمانے لگا۔ باوردی نے پلٹ کر اسے دیکھا تو اس کا کان اپنے منہ کے پاس لے آیا۔

"اسٹیج کے نیچے جا کر آس پاس کا خیال رکھو۔ خبر ہے آج سائیں پر حملہ ہو گا۔ ان کی جان کو خطرہ ہے۔ میں اسی لئے ان کے ساتھ چپکا ہوا ہوں۔ کوئی مشتبہ شخص نظر آئے تو پکڑ کر اسٹیج کے پیچھے لے آنا۔ شاباش۔"

اسے یقین ہو گیا کہ باوردی نے اسے نائب بنانا منظور کر لیا ہے۔ اس پر اعتماد کر کے عامر نذیر کی جان اس کے ہاتھ میں دے دی ہے۔ وہ "یس سر" کہہ کر اسٹیج کے نیچے کود آیا اور ہر چہرے کو شکاری کی طرح دیکھنے لگا۔ اسے اس داڑھی والے پر شبہ تھا جو لگاتار اسٹیج کی طرف آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی نظریں اسے ڈھونڈنے لگیں۔ اسی وقت ڈی ڈی ٹی خان مائک سے نعرے لگا کر جلسے کو گرم کرنے کے بعد جلسے کے باقاعدہ آغاز کے لئے کسی کو قرآن کی تلاوت کے لئے بلانے لگا۔ جس کا نام پکارا گیا تھا وہ اسٹیج کے نیچے کارکنوں کے گھیرے میں تھا۔ ڈی ڈی ٹی خان نے اسے جلدی سے اوپر آنے کا اشارہ کیا۔ داڑھی والے کو روکنے والے کارکن شرمندہ ہو کر راستے سے ہٹ گئے۔ وہ خود بھی دل ہی دل میں شرمندہ ہونے لگا۔ اس کا شبہ غلط تھا۔ یہ تو کوئی اپنا کامریڈ مولوی تھا۔ وہ اسٹیج کے قریب بیٹھے ہوئے لوگوں میں کسی اور مشکوک داڑھی والے کو تلاش کرنے لگا۔

تلاوت کے بعد ڈی ڈی ٹی خان نے جمہوریت اور غریب عوام کی حالت سدھارنے کے لئے کی جانے والی عامر نذیر کی کوششوں کو سراہا' حکومت وقت کو

گالیاں دیں، وزیراعظم ریاض توصیف کے خلاف مردہ باد کے نعرے لگوائے اور رے رے افغانی کو تقریر کرنے کے لئے بلانے لگا۔ رے رے افغانی ابھی مائک تک پہنچ بھی نہیں پایا تھا کہ جلسہ گاہ میں کئی دھماکے ہوئے۔ ہر طرف کثیف دھوئیں کے مرغولے منڈلانے لگے۔ ایک دھماکہ اسٹیج کے پاس ہوا اور اسٹیج بھی دھوئیں کی دیوار کے پیچھے چھپ گیا۔ ترڑ ترڑ۔ ہوا میں ایک بار پھر گولیاں چلنے لگیں اور اپنے گھونسلے چھوڑ کر اڑنے والے کئی خوفزدہ پرندے نشانہ بنا کر بھاگتے ہوئے ہجوم کے سروں پر آ گرے۔ دور سے آتی ہوئی پولیس کی موبائل گاڑیوں کے سائرن کی آواز بھی نزدیک آ گئی اور پارک کے بڑے دروازے سے خاکی وردی والے رینجرز کے سپاہی گھس کر مورچہ سنبھالنے لگے تھے۔

کچھ دیر تک اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کرے۔ پہلے اس نے "جئے عامر" کا نعرہ لگا کر بھاگتے ہوئے لوگوں کو روکنے اور جمع کرنے کی کوشش کی لیکن کسی نے "سدا جئے" کا جواب نہیں دیا۔ سب میدان سے باہر نکلنے کے لئے راستہ تلاش کر رہے تھے۔ جو کمزور تھے وہ پیروں تلے کچلے جانے کے خوف سے سہم کر ادھر ادھر ہو گئے تھے۔ وہ کود کر اسٹیج پر چڑھ گیا۔ اسے عامر نذیر کو بچانا تھا۔ لیکن اسٹیج ویران پڑا تھا۔ عامر نذیر اور آصفہ دھماکے کی پہلی آواز سنتے ہی ڈی ڈی ٹی خان اور رے رے افغانی کے ساتھ اسٹیج کے پیچھے سے باہر نکل گئے تھے اور ایک پجیرو میں بیٹھے ہوئے کلفٹن میں اپنے گوشۂ عافیت کی طرف رواں دواں تھے۔ دوسرے تمام رہنما بھی ان کے پیچھے پیچھے نکل گئے تھے۔ سب سے آخر میں اطمینان سے سر ہلاتا ہوا باوردی نکلا تھا۔

دھواں آہستہ آہستہ چھٹ گیا۔ وہ اسٹیج پر اب پھر اکیلا تھا۔ چاروں طرف کرسیاں اوندھی پڑی تھیں۔ اس نے پلٹ کر میدان کی طرف دیکھا جہاں ابھی تک ہڑبونگ مچی ہوئی تھی۔ اچانک کہیں سے ٹھاں ٹھاں کرتی ہوئی ٹی ٹی سے اسٹیج کی طرف فائرنگ شروع ہوئی اور کئی گولیاں اس کے سینے اور پیٹ میں گھس گئیں۔ ایک گولی اس کے سینے پر لگی جو عامر نذیر کی تصویر کو چیر کر اس کے دل کے پار ہو گئی۔ اس نے

پوری طاقت سے نعرہ لگانے کی کوشش کی۔

"جئے آم....." لیکن آواز آدھے رستے میں دم توڑ گئی اور وہ دھڑ سے لکڑی کے بنے ہوئے اسٹیج پر گر پڑا۔ داڑھی والے شخص نے جس کی تلاوت سے جلسہ شروع ہوا تھا اسے دور سے اسٹیج پر گرتے دیکھا اور وہ پلٹ کر بھاگتا ہوا اسٹیج پر چڑھ آیا۔ اس نے مدد کے لئے چاروں طرف دیکھا لیکن پہلا شاٹ فائر ہوتے ہی سب بھاگ نکلے تھے۔ داڑھی والے نے اپنی قمیض اتار کر پھاڑی' اس کے سینے پر جہاں سے خون فوارے کی طرح بہہ رہا تھا پٹیاں کسیں اور اسے اپنی کمر پر لاد کر اسٹیج کے پیچھے اس طرف دوڑا جہاں لیڈروں نے اپنی گاڑیاں پارک کی تھیں۔ سب جا چکے تھے صرف باوردی وہیں تھا لیکن وہ بھی اپنی پجیرو کا انجن اسٹارٹ کر چکا تھا۔

"باوردی صاحب! اس کے دل میں گولی لگی ہے۔ اس کا خون نہیں رک رہا۔ اسے فوراً اسپتال پہنچانا ہے۔" داڑھی والے نے اسے کمر پر لادے لادے کہا اور دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے لگا۔

"سامنے ایدھی کی ایمبولینس کھڑی ہے' اس میں لے جاؤ۔ مجھے سائیں کو دیکھنا ہے۔ ان کی جان خطرے میں ہے۔" یہ کہہ کر باوردی نے تیزی سے گیئر بدلا اور گاڑی بھگا کر لے گیا۔

ایدھی کی سوزوکی جس پر بڑے بڑے حرفوں میں ایمبولینس لکھا تھا دوسری طرف ذرا فاصلے پر کھڑی تھی۔ وہ انہیں لے کر لیاری کی کچی گلیوں اور ٹوٹی سڑکوں پر اچھلتی ہوئی اسپتال کی طرف بھاگنے لگی۔ داڑھی والے نے اسے گاڑی کے فرش پر لٹا کر اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا اور اسے جگانے کی کوشش کرنے لگا۔ اچانک ایمبولینس بہت زور سے اچھلی۔ اس کا پہیہ شاید کسی گڑھے سے ٹکرایا تھا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں اور کچھ کہنے کی کوشش کرنے لگا لیکن زبان نے ساتھ نہیں دیا اور اس کی گردن ایک طرف کو ڈھلک گئی۔

"اناللہ و انا الیہ راجعون!" داڑھی والے نے اس کی نبض ٹٹولنے کے بعد کہا اور اس کی آنکھیں بند کرنے لگا۔ بند ہونے سے پہلے اس کی آنکھوں سے امید پھدک

کر باہر نکل آئی اور ایمبولینس سے کود کر کسی انجانی منزل کی طرف چل دی۔

کلفٹن میں آصفہ ہاؤس کے بڑے سے کشادہ لاؤنج میں عامر نذیر بیٹھا ڈی ڈی ٹی خان اور رے رے افغانی پر برس رہا تھا۔
"آپ لوگ اب تک مرنے اور زخمی ہونے والوں کی تعداد معلوم نہیں کر سکے۔ باہر پریس انتظار کر رہا ہے۔ انہیں کیا بتاؤں گا؟ مجھ پر بھرے جلسے میں قاتلانہ حملہ ہوا اور ایک آدمی نہیں مرا؟ اخبار والے میرا مذاق اڑائیں گے۔ اگر وہ سب آواز اور دھویں کے بے ضرر بم تھے تو میرے کارکن کو جو گولی لگی ہے وہ کہاں سے آئی تھی۔ یا وہ گولیاں بھی بلینک تھیں؟"
"اس لڑکے کا پتہ نہیں چل رہا۔ شاید ایدھی والے اسے سول اسپتال لے گئے ہوں' لیکن وہاں کا فون نہیں مل رہا۔" رے رے افغانی نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ڈی ڈی ٹی خان کی انگلیاں اور تیزی سے فون کا نمبر گھمانے لگیں۔
"باوردی کہاں ہے؟" اسی وقت باوردی کمرے میں داخل ہوا۔ اس کا چہرہ جوش سے تمتا رہا تھا۔ عامر نذیر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔
"پورے شہر میں آگ لگا کر آیا ہوں۔ شیر شاہ میں لکڑیوں کی ٹال پھونک دی ہے۔ لیاری میں ایک بس جلا دی ہے۔ پرانے ٹائر جلا کر لیاری کی ایک ایک گلی اور ہر دکان بند کرا دی ہے۔"
"لیاری۔ لیاری۔ لیاری.....!" عامر نذیر غصے سے چیخا۔ "مجھے لیاری نہیں برنس روڈ میں آگ چاہئے۔ لالو کھیت' ناظم آباد' گلشن اقبال اور کلفٹن میں آگ چاہئے۔"
"ٹھیک ہے سائیں۔" باوردی نے کہا اور مڑ کر واپس جانے لگا۔
"کہاں جا رہے ہو؟"
"برنس روڈ۔ لالو کھیت' ناظم آباد....."
"بیٹھ جاؤ بیوقوف!" عامر نذیر نے بے بسی سے سر ہلایا اور دوسری طرف بیٹھے

ہوئے لوگوں سے مخاطب ہوا۔ ”تعویذ شاہ‘ متین رحیم‘ شاہ صاحب‘ آپ لوگ آج رات ہی اپنے اپنے علاقوں میں نکل جائیے اور دیکھئے سندھ میں کیا ہو سکتا ہے۔ میں جا کر پنجاب کو سنبھالتا ہوں۔ ریاض توصیف کے خلاف مہم شروع کرنے کا یہ بہترین موقع ہے۔“

”جی سائیں!“ تعویذ علی شاہ فوراً“ اچھل کر کھڑا ہو گیا لیکن عامر نذیر اسے بیٹھ جانے کا اشارہ کرنے لگا۔

”باوردی باہر دیکھ کر آؤ کون کون آ گیا ہے۔“

”میں دیکھتا ہوا آیا ہوں۔ سب اخبار والے آ گئے ہیں۔ اے پی‘ اے ایف پی اور بی بی سی والے بھی ہیں۔ زی ٹی وی کا کیمرہ بھی پہنچ گیا ہے۔“

”گڈ۔ رے رے اٹلانٹا فون کر کے رز خان سے بات کرو۔ مجھ پر قاتلانہ حملے کی خبر سی این این کے ہر بلیٹن میں آنی چاہئے۔ آصفہ تم واشنگٹن فون لگاؤ۔ امریکہ سے کسی کا بیان آنا ضروری ہے۔ گلستان سے کہہ دو لندن میں......“ اسی وقت ڈی ڈی ٹی خان کو سول اسپتال کی لائن مل گئی اور عامر نذیر خاموش ہو کر اسے دیکھنے لگا۔

”میں سابق وفاقی وزیر پروفیسر ڈی ڈی ٹی خان بول رہا ہوں۔ ایمرجنسی ملائیے۔ فوراً“.... ایمرجنسی؟.... میں سابق وفاقی وزیر پروفیسر....“

”کام کی بات کرو۔“ عامر نذیر غصے سے چیخا۔

”ہمارا ایک کارکن گولی لگنے سے زخمی ہوا تھا۔ وہ ایمرجنسی میں ہے۔ اس کی خیریت بتائیے۔“ ڈی ڈی ٹی خان نے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔ وہ اس وقت سب کی نگاہوں کا مرکز تھا۔

”جی؟...... مر گیا...... رستے ہی میں مر گیا تھا؟...... آپ کو یقین ہے؟...... تھینک یو ڈاکٹر۔ تھینک یو۔!“ ڈی ڈی ٹی خان کا چہرہ خوشی سے چمکنے لگا۔ وہ فون رکھ کر پلٹا تو اسے خبر دہرانے کا موقع نہیں ملا۔ عامر نذیر پہلے ہی اٹھ کر کمرے کے دروازے کی طرف جا چکا تھا۔ اسے پریس کانفرنس کرنی تھی۔ اسے پتہ تھا اگر دیر ہو گئی تو بی بی سی کی خبروں کا وقت نکل جائے گا۔ ڈی ڈی ٹی خان بھی تیزی سے اس کے

پیچھے پیچھے بھاگا۔

"..... میرے کارکن مجھے مرنے نہیں دیں گے۔" عامر نذیر پریس کانفرنس میں گرج رہا تھا۔ "وہ ریاض توصیف کی گولیوں کے سامنے آہنی دیوار بن جائیں گے۔ ان کی قربانیاں رائیگاں نہیں جائیں گی۔ میں اس ملک کے غریبوں کی آخری امید ہوں۔ آخری امید....."

فوٹوگرافروں کی فلیش لائٹوں میں چمکتا ہوا عامر نذیر کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا تھا۔ صحافیوں کے ٹیپ ریکارڈر پوری رفتار سے کام کر رہے تھے۔ کاغذوں پر ان کے قلم تیزی سے چل رہے تھے اور سہمی ہوئی امید پاؤں تلے کچلے جانے کے ڈر سے پھدکتی ہوئی کمرے سے باہر نکلنے کا راستہ ڈھونڈ رہی تھی۔

اسلام آباد سے کراچی جانے والا پی آئی اے کا بوئنگ ۷۲۷ ایک گھنٹہ پہلے ہی لیٹ تھا۔ مسافروں کو جہاز میں سوار ہوئے اور اپنی نشستیں سنبھالے ہوئے ایک گھنٹہ مزید گزر چکا تھا لیکن جہاز کے چلنے کے کوئی آثار نہیں تھے۔ ابھی تک سیڑھی بھی نہیں ہٹی تھی جس کا مطلب تھا کہ ابھی کوئی مسافر سوار ہونا باقی تھا۔ شاید کوئی مسافر اپنا سامان چڑھا کر غائب ہوگیا تھا۔ جس مسافر کا سامان چڑھ جائے اسے لئے بغیر جہاز اڑ نہیں سکتا تھا۔ کم از کم اس وقت تک نہیں جب تک اس کا سامان شناخت کر کے اتار نہ لیا جائے۔ جہاز کا ایئرکنڈیشنڈ صحیح کام نہیں کر رہا تھا اس لئے لوگ بے چین ہونے لگے تھے۔ جنہیں اخبار مل سکے تھے وہ اخبار کا نہ پڑھے جانے والا اداریہ تک پڑھ چکے تھے۔ جنہیں اخبار نہیں مل سکا وہ جہاز کے حفاظتی انتظام کا کتابچہ بار بار پڑھ کر اسے ازبر کر چکے تھے۔ مختلف نشستوں سے اب آہستہ آہستہ جملے بلند ہونے شروع ہوگئے تھے۔

"پائلٹ سوتا رہ گیا ہے۔ اسے اٹھاؤ۔"
"نہیں بھائی سویا نہیں ہے، ہڑتال پر ہے۔"

"ہڑتال پر؟"

"اسے ایئرہوسٹس پسند نہیں تھی۔ اب دوسری منگوائی ہے۔" پردے کے پارٹیشن کے پاس کھڑی ہوئی موٹے بدن والی ادھیڑ عمر ایئر ہوسٹس کو دیکھ کر کئی لوگوں کے چہروں پر مسکراہٹیں دوڑ گئیں۔

"آرڈر دے کر روس سے منگوائی ہے۔" کسی اور نے اپنی حس مزاح کا اظہار کیا۔

"شرم کیجئے آپ لوگ۔ ایئر ہوسٹس بھی کسی کی ماں بہن ہے۔" ایک سنجیدہ بزرگ کی غصے سے بھری ہوئی آواز گونجی۔

"ماں بہن نہیں، نانی دادی۔" مسکراہٹوں کی جگہ قہقہوں نے لے لی۔

"بہت بے شرم ہیں آپ۔"

"لڑنا جھگڑنا بند کرو بھائیو۔ کسی نے جہاز میں بم رکھ دیا ہے، اس کی تلاش ہو رہی ہے۔"

"درود پڑھو مومنو، درود۔ اپنے گناہوں کی معافی مانگو۔ جہنم سے ڈرو جہنم سے۔" ایک مولانا کی کپکپاتی ہوئی آواز ابھری۔

"ہم نہیں ڈرتے مولانا۔ ہمیں عادت ہے۔ ایک جہنم سے نکل کر دوسرے جہنم میں چلے جائیں گے۔ ڈرے وہ جسے جنت میں جانا ہو۔" وہی شوخ آواز ابھری۔

"استغفراللہ......۔"

"آپ لوگ بیوقوفی کی بحث مت کیجئے۔ بم کا خطرہ ہوتا تو اب تک مسافروں کو اتار لیا جاتا۔ شاید انجن میں کوئی خرابی ہو گئی ہے۔ یا ہو سکتا ہے ٹائر پنکچر ہو گیا ہو۔" ایک دانا نے سمجھایا۔

"میں نے آپ سے آج کا اردو اخبار مانگا تھا۔" بیزار بیٹھے ہوئے ایک شخص نے قریب سے گزرتے ہوئے اسٹیورڈ سے کہا۔ اسٹیورڈ جس نے اپنی مونچھوں اور بالوں پر گہرے کالے رنگ کا خضاب لگا کر عمر چھپانے کی ناکام کوشش کی تھی، اپنی توند پر تنی ہوئی قمیض کی طرح پھٹ پڑنے کے لئے تیار تھا۔

"آپ کو میں نے پہلے بھی بتایا تھا کہ سب اخبار بٹ چکے ہیں۔ کسی سے مانگ کر پڑھ لیجئے۔ صرف پانچ پانچ اخبار آتے ہیں۔ کئی بار شکایت کی لیکن کہتے ہیں کہ بجٹ نہیں ہے۔ بجٹ کہاں سے آئے گا۔ پانچ سو جنرل منیجر اور ڈائریکٹر ہیں۔ سارا بجٹ ان کے پیٹوں میں چلا جاتا ہے۔ آپ کو پی آئی اے کا پورا نام معلوم ہے؟"

"Pain in the Arse!" کسی نے آواز لگائی۔

"جی نہیں! پلیز انفارم اللہ۔ اللہ سے شکایت کیجئے۔ بندے کھانے پینے میں مصروف ہیں' ان کے پاس وقت نہیں ہے۔" وہ اسی طرح بڑبڑاتا ہوا کاغذ کے گلاسوں میں پانی ڈالتا اور مسافروں کے کپڑوں پر ٹپکاتا آگے بڑھ گیا۔

"میاں' جس تھالی میں کھاتے ہو اسی میں چھید کر رہے ہو۔" سنجیدہ بزرگ نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

"بڑے صاحب' تھالی اب چھلنی ہو گئی ہے۔ نیا سوراخ کرنے کی جگہ نہیں بچی۔" اسٹیورڈ نے بہت تلخ لہجے میں کہا۔ بزرگ آگ بگولہ ہو کر کچھ کہنا چاہتے تھے کہ ایمان علی کی آواز نے سب کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ وہ ایئرہوسٹس کو بلا رہا تھا۔

کون تھا جو ایمان علی کو نہیں جانتا تھا۔ جہاز میں مسافروں کے درمیان حاضر جوابی اور بزلہ سنجی کا جو مقابلہ ہو رہا تھا وہ شاید ایمان علی کی توجہ حاصل کرنے کے لئے ہی تھا۔ اسٹیورڈ نے جو تقریر کی تھی وہ بھی ایمان علی کو سنانے کے لئے تھی۔ وہ کھڑکی کے پاس کی نشست پر بیٹھا اکنامسٹ کا تازہ شمارہ پڑھ رہا تھا۔ رسالہ بند کر کے اس نے گھڑی دیکھی تو چونک پڑا۔ اس کا چہرہ آہستہ آہستہ سرخ ہونے لگا تھا۔ دور کھڑی ہوئی ایئر ہوسٹس جو بلائی جانے والی بہت سی گھنٹیوں اور آوازوں کو نظرانداز کر کے اپنا میک اپ درست کرنے میں مصروف تھی' آواز سنتے ہی تیر کی طرح ایمان علی کی طرف لپکی۔

"سر! آرینج جوس پئیں گے یا کافی؟" اس نے اپنی مسکراہٹ میں قتل کرنے والے تمام ہتھیار سجا لئے۔

"مجھے جوس یا کافی نہیں پائلٹ چاہئے پائلٹ۔ پائلٹ سے کہئے کہ وہ آ

کرتا ئیں ایک گھنٹے سے جہاز کیوں رکا ہوا ہے۔ وہ پانچ منٹ میں نہیں آئے گا تو مجھے خود کاک پٹ میں آنا پڑے گا۔" ایمان علی نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ایئر ہوسٹس سیدھی کاک پٹ کی طرف دوڑ گئی۔

سب کی توجہ ایمان علی کی طرف ہو گئی۔ کئی لوگوں نے دیکھ کر ہاتھ بھی ہلائے۔ ایمان علی نے صرف سر کی ہلکی سی جنبش سے جواب دیا۔ اس کی شکل دیکھ کر لگ رہا تھا کہ اس کے اندر ہی اندر غصہ ابل رہا ہے۔ پائلٹ کو آنے میں صرف دو منٹ لگے۔ وہ درمیانی عمر کا بہت اسمارٹ سا شخص تھا۔

"سر! آئی ایم کیپٹن اقبال درانی۔" اس نے مسکرا کر ایمان علی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"کیپٹن درانی' پرابلم کیا ہے۔ جہاز کیوں نہیں چل رہا۔ کوئی فنی خرابی ہے یا کسی کا انتظار ہے۔" ایمان علی نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے نرم لہجے میں پوچھا۔

"سر! ایک فیڈرل منسٹر اسی فلائٹ سے کراچی جا رہے ہیں۔ وہ وی آئی پی لاؤنج میں بیٹھے کسی وفد سے بات چیت میں مصروف ہیں۔ ان کے آنے تک جہاز رکا رہے گا۔ میں بار بار میسج بھیج رہا ہوں۔ لیکن مجھے پرواز کی اجازت نہیں مل رہی ہے۔" پائلٹ نے جو خود صورتحال سے بیزار تھا صاف صاف بتا دیا۔

"کیپٹن! میں جہاز اڑانا جانتا ہوں۔ میرے پاس کمرشل پائلٹ کا لائسنس بھی ہے۔ لیکن میں جہاز اڑاؤں گا نہیں۔ اگر دس منٹ میں یہ جہاز نہیں چلا تو میں جہاز کا کنٹرول سنبھال لوں گا اور اسے دوڑاتا ہوا اس وی آئی پی لاؤنج سے ٹکرا دوں گا جہاں یہ وزیر بیٹھا لوگوں کو بیوقوف بنا رہا ہے۔ آپ میری طرف سے پیغام بھیج دیجئے۔ انہیں پتہ ہے میں صرف کہتا نہیں ہوں کر بھی گزرتا ہوں۔" ایمان علی کی آواز پورے جہاز میں گونجی۔ تمام مسافروں نے زوردار تالیاں بجائیں۔ پائلٹ کے چہرے پر بھی مسکراہٹ آ گئی اور "یس سر" کہتا ہوا واپس کاک پٹ کی طرف جانے لگا۔ لیکن پھر کچھ سوچ کر پلٹ آیا۔

"سر! آپ فرسٹ کلاس میں تشریف لے چلئے۔ آدھا کیبن خالی پڑا ہے۔

رخسانہ آپ کا سامان وہیں پہنچا دے گی۔" پائلٹ نے پلٹ کر ایئر ہوسٹس کی طرف دیکھا جو کیپٹن کا حکم سنتے ہی آگے بڑھی لیکن ایمان علی نے اسے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔

"میں نے فرسٹ کلاس میں سفر کرنا چھوڑ دیا ہے۔ مجھے اکانومی کلاس زیادہ پسند ہے۔" مسافروں نے ایک بار پھر تالیاں بجائیں۔ ایمان علی نے غلط نہیں کہا تھا۔ وہ جب سے عملی سیاست میں آیا تھا اس نے عوامی طور طریقے اپنا لئے تھے۔ قیمتی کپڑے اور سوٹ استعمال کرنا بھی چھوڑ دیئے تھے۔ شلوار قمیض کا سادہ سوٹ اور پشاوری چپل پہنتا تھا۔

پائلٹ سر ہلاتا ہوا کاک پٹ کی طرف چلا گیا۔ ایمان علی گھڑی دیکھتا ہوا اپنی نشست پر بیٹھ گیا اور کھڑکی سے باہر ایئرپورٹ پر ہونے والی سرگرمیوں کو دیکھنے لگا۔ پورے جہاز میں خاموشی تھی۔ لوگوں نے اسٹیورڈ کو بلانے کے لئے آواز لگانا یا گھنٹی بجانا چھوڑ دی تھی۔ سب کے ذہنوں میں ٹائم بم کے کلاک کی سی آواز ٹک ٹک کر رہی تھی۔ کیا ایمان علی واقعی اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنائے گا۔ اس نے جہاز ٹکرایا تو کیا جہاز تباہ ہو جائے گا؟ کیا وہ سب مارے جائیں گے؟ لیکن وہ اس سے زیادہ آگے نہیں سوچ سکے۔ پانچ منٹ بعد ہی وفاقی وزیر مسکراتا ہوا جہاز میں داخل ہو رہا تھا۔ ایمان علی بھی وزیر کو جہاز میں داخل ہوتے دیکھ کر مسکرایا اور رسالہ کھول کر دوبارہ اسے پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔ اس کے چہرے پر جو اطمینان تھا اس سے لگتا تھا کہ اسے پہلے سے معلوم تھا کہ اس کی دھمکی کا یہی اثر ہو گا۔

وزیر نے کریم کلر کی ریشمی شلوار قمیض اور اس پر کالے رنگ کی واسکٹ پہنی ہوئی تھی۔ ایک انگلی میں یاقوت کی اور دوسری میں ہیرا جڑی سونے کی موٹی انگوٹھی تھی۔ پیچھے پیچھے ایک کارندہ ایک ہاتھ میں بریف کیس اور دوسرے میں موبائل فون لئے چل رہا تھا۔ وزیر چند نشستوں کے بعد رک کر تقریر کرنے لگا۔

"دوستو! مجھے معاف کر دیجئے' میری وجہ سے جہاز کو چلنے میں دیر ہوئی۔ لیکن آپ کو پتہ ہے ملک مسائل کی کیسی دلدل میں دھنسا ہوا ہے۔ وزیراعظم کا حکم ہے کہ

وقت ضائع نہ کرو۔ جہاں بھی موقع ملے، جب بھی موقع ملے کام سے گریز نہ کرو۔ میں ایئرپورٹ پر یہی کر رہا تھا۔ ایک بہت نازک مسئلہ حل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں ابھی نہیں بتاؤں گا لیکن کل کا اخبار پڑھ کر آپ کو پتہ چل جائے گا کہ پرواز کی اس تاخیر نے کتنا بڑا کام کیا ہے۔" مسافر ایک بار پھر تالیاں بجانے لگے۔ کتنا عوامی وزیر تھا۔ خود ہی معافی مانگ رہا تھا۔ سب کچھ دیر پہلے کی تلخی بھول گئے۔

جہاز کی سیڑھی ہٹا لی گئی تھی، دروازے بند ہو گئے تھے اور جہاز نے آہستہ آہستہ رن وے کی طرف رینگنا شروع کر دیا تھا۔ وزیر دونوں طرف بیٹھے ہوئے لوگوں سے مسکرا مسکرا کر ہاتھ ملاتا اور خیریت دریافت کرتا ہوا اپنی نشست کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ایمان علی کی نشست کے پاس پہنچا تو رک گیا۔ مسکراہٹ بھی کچھ اور پھیل گئی۔

"میری خوش قسمتی ہے کہ اس جہاز پر آپ بھی تشریف رکھتے ہیں۔" اس نے بہت گرمجوشی سے ایمان علی کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ لیکن ایمان علی نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا تک نہیں اور اسی طرح میگزین پڑھنے میں مصروف رہا۔ وزیر تھوڑی دیر ہاتھ بڑھائے کھڑا رہا لیکن پھر کھسیانا سا ہو کر اگلی نشست پر بیٹھے ہوئے لوگوں سے ہاتھ ملانے لگا۔ جنہوں نے یہ منظر دیکھا انہوں نے سوچا ایمان علی کی شہرت غلط نہیں تھی۔ وہ واقعی بہت مغرور اور بددماغ تھا۔ لیکن یہ بد تہذیبی تھی۔ وزیر نے خود ہاتھ بڑھایا تھا۔ ملانے میں کیا حرج تھا۔ جو اچھی طرح جانتے تھے انہیں معلوم تھا کہ ایمان علی کو ابھی سیاسی منافقت کا ہنر نہیں آیا۔ وہ ابھی تک کچا سیاستدان تھا۔ انہیں یہ بھی پتہ تھا کہ یہ ہنر ایمان علی شاید کبھی نہ سیکھ سکے۔

اسٹیورڈ نے جو کچھ دیر پہلے تقریر کر چکا تھا، وزیر سے درخواست کی کہ وہ نشست پر بیٹھ کر حفاظتی بند باندھ لیں۔ جہاز رن وے پر دوڑ لگا کر اوپر اٹھنے والا ہے۔

"ہاں، ٹھیک ہے۔ میرے سیکریٹری کو فرسٹ کلاس میں لے جا کر میری سیٹ بتا دیجئے۔ چند لوگ اور باقی ہیں۔ میں ان سے مل کر ابھی آتا ہوں۔"

"سر! لیکن آپ کی سیٹ تو......"

"اکانومی کلاس میں ہے! مجھے پتہ ہے۔ سرکاری ٹکٹ اکانومی کلاس کے ہوتے

ہیں لیکن سیٹ فرسٹ کلاس میں ہوتی ہے۔ پروٹوکول والے بیوقوف تھے۔ انہیں یہ کاؤنٹر سے کرا لینا چاہئے تھا۔ وہ اپ گریڈ کرانا بھول گئے ہیں۔ جائیے' پائلٹ سے پوچھئے اسے پتہ ہے۔" وزیر نے غصے سے کہا اور دوبارہ چہرے پر مسکراہٹ لا کر اگلی نشست کے مسافر سے ہاتھ ملانے لگا۔ اسٹیورڈ کاک پٹ کی طرف چلا گیا لیکن جلد ہی واپس آ گیا۔

"سر! کیپٹن نے کہا ہے وہ آپ کو فرسٹ کلاس میں اپ گریڈ نہیں کر سکتے۔" اسٹیورڈ نے مسکراہٹ چھپا کر اور لہجے کو اداس بنا کر کہا۔

"کیا؟" وزیر کے چہرے سے مسکراہٹ کا نقاب اتر گیا۔ "اسے معلوم ہے میں کون ہوں؟ وہ آج کے بعد کبھی جہاز نہیں اڑا سکے گا۔"

"سر! کیپٹن کی یہ آخری فلائٹ ہے۔ وہ دوبئی جا رہے ہیں' انہیں ایمریٹ ایئر لائنز میں جاب مل گئی ہے۔" اسٹیورڈ نے بہت ادب سے وزیر کو بتایا۔

"میں شیخ المختوم سے کہہ کر اسے دوبئی سے بھی نکلوا سکتا ہوں۔" وزیر چیخا۔ لیکن پھر دائیں بائیں دیکھ کر خاموش ہو گیا اور چہرے پر مسکراہٹ لانے کی کوشش کرنے لگا۔ اسے معلوم تھا اس نے بات آگے بڑھائی تو تماشا بنے گا۔ جب تک جہاز ہوا میں تھا وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ "کبھی تو جہاز زمین پر اترے گا۔" اس نے سوچا اور اپنی سیٹ پر بیٹھ کر حفاظتی بند باندھنے لگا۔ برابر کی سیٹ پر بیٹھا ہوا شخص بہت گرمجوشی سے مسکرایا اور ٹائی کی گرہ ٹھیک کرتے ہوئے سوچنے لگا کہ ڈیڑھ گھنٹے کی اس پرواز میں وزیر کو بتائے گا کہ ملک کو کس طرح چٹکی بجا کر مسائل کی دلدل سے نکالا جا سکتا ہے۔ لیکن وزیر نے نشست پر بیٹھتے ہی پشت سے سر ٹکایا اور آنکھیں بند کر لیں۔

جہاز اوپر اٹھ گیا تو ایمان علی میگزین بند کر کے کھڑکی سے دور تک پھیلے ہوئے شہر کو دیکھنے لگا۔ پرواز ہموار ہو گئی تو اس نے اپنے بریف کیس سے ایک موٹی رپورٹ نکالی اور اسے پڑھتے ہوئے حاشیوں پر نوٹس لکھنے لگا۔ امید پھدکتی ہوئی آئی اور اچک کر ایمان علی کے برابر کی خالی نشست پر بیٹھ گئی۔ وہ ایمان علی کو بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔

مرینہ شاہ

جلالی ہنگری کے قومی دن کی تقریب میں شرکت کرنے ان کے سفیر کی دعوت پر اسلام آباد آیا ہوا تھا۔ بڈاپسٹ میں جلالی کے جو انٹرویو چھپے تھے' سفیر نے وہ تراشے دیکھے تھے۔ اس نے جلالی سے ملنے کے لئے بہت اشتیاق ظاہر کیا تھا۔ براہ راست فون کر کے بہت اصرار سے اسے دعوت قبول کرنے پر آمادہ کیا تھا۔ جلالی ٹھیک وقت پر سفیر کی رہائش گاہ پر پہنچ گیا جہاں وسیع و عریض لان پر استقبالیہ کا اہتمام تھا۔ ابھی بہت کم لوگ آئے تھے۔ مختلف ملکوں کے چھوٹے عہدوں والے سفارتکار مختلف ٹولیوں میں بٹے ہوئے گپیں مار رہے تھے۔ جلالی کا خیال تھا کہ اسلام آباد کے صحافیوں سے ملاقات ہو جائے گی۔ لیکن اسے کوئی ایسا نظر نہیں آیا جسے وہ جانتا ہو۔ دو چار مولوی قسم کے صحافی جنہیں وہ پہچانتا ضرور تھا لیکن جانتا نہیں تھا' اطراف میں لگی ہوئی کھانے کی میزوں پر سجے ہوئے سینڈوچ ٹٹول رہے تھے۔ ایک باوردی بیرا شربتوں کی ٹرے ہاتھوں پر اٹھائے جلالی کی طرف آیا۔ جلالی ٹماٹر جوس کا گلاس اٹھا کر چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرنے لگا۔ اسے پتہ تھا پاکستان میں غیرملکی سفارتخانے کھلی دعوتوں میں

شراب پیش نہیں کرتے تھے۔ جس زمانے میں شراب پیش کی جاتی تھی استقبالیہ شروع ہوتے ہی کھوے سے کھوا چھلنے لگتا تھا۔

جلالی نے بہت سالوں بعد اسلام آباد کا سفر کیا تھا۔ اس کی ماں اکثر ایک کہاوت دہرایا کرتی تھی "سفر وسیلۂ ظفر"۔ سوتیلے بھائیوں کے ڈر سے جب وہ کراچی بھگایا گیا تھا تو اسی کہاوت نے اس کی ماں کو جدائی سہنے کی طاقت دی تھی۔ وہ اس کہاوت پر کامل یقین رکھتی تھی۔ اس نے رخصت کرتے وقت جو دعا دی تھی وہ جلالی کے کانوں میں آج بھی گونجا کرتی تھی۔

"جا بیٹے سفر پر جا۔ اللہ تیری حفاظت کرے اور قدم قدم پر تجھے کامیابیاں عطا کرے۔"

کبھی کبھی جلالی کو لگتا جیسے اس کی ماں کی دعا قبول ہو گئی ہو۔ ماں کے انتقال پر مولانا نے فاتحہ کے بعد کہا تھا کہ ماں کی دعا ہر وقت سر پر سایہ کئے رہتی ہے۔ ڈھال بن کے دشمن کا ہر وار روک لیتی ہے۔ جلالی کو مولانا کی بات پر یقین آ گیا تھا۔ اسے معلوم تھا ہر مصیبت کے وقت ایک نادیدہ ہاتھ اسے تکلیف اور آفت سے باہر کھینچ کر اس کی مشکل آسان کر دیتا ہے۔ لیکن اسے یہ جاننے کا موقع نہ مل سکا کہ اس کی ماں کے لئے کامیابیوں کا مطلب کیا ہوتا۔ اچھا عہدہ' بڑا رتبہ' زیادہ دولت' اچھی شہرت' اونچی اور کشادہ حویلی' نئی گاڑی' نیک بیوی' ہونہار بچے' وفادار دوست اور مروجہ معیار کی ایسی ہی دو چار اور چیزیں۔ ماں ہوتی تو شاید یہ سب کچھ نہ دیکھ کر مایوس ہو جاتی۔ لیکن وہ خود بہت مطمئن تھا۔ سکون کا ایک لمحہ' ایک خوبصورت شام' اچھی سی گفتگو' کوئی دلچسپ کتاب' کسی تمنا کا سراغ' کوئی بامقصد جستجو' امید کا سفر------ دل و دماغ کی رہ گزار پر کامیابیوں کے کتنے سنگ میل گڑے تھے۔ ضمیر پر کوئی بوجھ نہیں تھا۔ جو کچھ مل چکا ہو اسے کھو دینے کا خوف اور مزید پانے کی ہوس رات کی نیند نہیں اڑاتی تھی۔ اسے یاد تھا جب اخبار میں اس کی کوئی کہانی یا اس کے نام سے کوئی بڑی خبر چھپتی تو اسے لگتا جیسے وہ کامیابی کے آسمان پر پہنچ گیا ہو۔ کامیابیوں کے ان آسمانوں پر وہ آج بھی اڑ رہا تھا۔ بس ایک امید ڈھونڈنا باقی تھی۔ جس کا تعاقب جاری تھا۔

اسلام آباد کے اس سفر میں اسے امید کی ایک کرن نظر آئی تھی لیکن جلالی کو پتہ نہیں تھا کہ وہ واقعی امید کی کرن تھی یا نظر کا فریب۔ لیکن اس نے کھوج لگانے کا فیصلہ کیا تھا۔ کہیں سے تو شروعات کرنی تھی۔ اسی سفر میں اسے مرینہ شاہ بھی ملی تھی۔ چچا صدیقی کے لئے عورت کامیابی کا استعارہ تھی۔ وہ کہتے تھے حالات ٹھیک کرنے ہوں تو کسی عورت پر عاشق ہو جاؤ۔ عشق کی صلاحیت نہیں تو ایک اور شادی کر لو۔ ان کی تین شادیوں کا راز ان کا یہی آزمودہ نسخہ تھا۔ اور کچھ ایسا غلط بھی نہیں تھا۔ ہر شادی کے بعد انہیں نیا ٹھیکہ ملا تھا۔ تیسری شادی کے بعد جو ٹھیکہ ملا تھا اس نے چچا صدیقی کو کروڑ پتی بنا دیا تھا۔ بیویاں ان سے اور آپس میں جھگڑے کرتیں، ناراض رہتیں، لیکن چچا صدیقی کو ان کی پرواہ نہیں تھی۔ یہ ان کے لئے گھاٹے کا سودا نہیں تھا۔ اس سودے میں انہوں نے صرف منافع کمایا تھا۔

جلالی اپنے میزبان کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ سیاہ سوٹ اور سنہری کمانیوں والا چشمہ پہنے ایک شخص تیزی سے جلالی کی طرف بڑھا۔ جلالی کو یقین تھا کہ وہ ہنگری کا سفیر ہو گا۔ جلالی کا یقین غلط نہیں تھا۔ اس نے بہت گرمجوشی سے ہاتھ ملا کر اپنا تعارف کرایا۔

"خوش آمدید! خوش آمدید! مجھے جارج نے ابھی ابھی بتایا کہ آپ آ گئے ہیں۔ وہ داخلے پر کھڑا مہمانوں کا استقبال کر رہا تھا، اس لئے مجھے پہلے آ کر نہیں بتا سکا تھا۔ کچھ لوگ اندر ہیں، میں انہیں دیکھنے گیا تھا۔ آپ کا سفر کیسا رہا۔ یہاں پہنچنے میں کوئی مشکل تو نہیں ہوئی؟"

"جی نہیں......"

"اچھی بات یہ ہے کہ موسم اچھا ہے۔ دن میں بادل آئے تھے لیکن شام ہوتے ہوتے چھٹ گئے۔ بارش ہوتی تو دعوت برباد ہو جاتی۔ میں نے اندر متبادل انتظام کر رکھا تھا۔ پھر بھی...... آپ کو ہنگری کا موسم کیسا لگا؟" جلالی سوچنے لگا کوئی ایسا سفارتکار بھی ہے جو گفتگو کی ابتدا موسم سے نہ کرتا ہو۔ اسی وقت ایک مہمان آ

کر سفیر کو قومی دن کی مبارکباد دینے لگا اور جلالی موسم کا حال سنانے کی مشقت سے بچ گیا۔

"یہ میکس واکر ہیں۔ کینیڈا کے پریس اتاشی۔ میکس' یہ ذہین جلالی ہیں۔ دی گریٹ کالمسٹ۔" سفیر نے دونوں کا تعارف کرایا۔

"ان کا نام کون نہیں جانتا۔" میکس واکر بہت گرمجوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہنے لگا۔ "آپ کا پچھلا کالم بہت تیز تھا۔ حکومت کو آپ نے بہت زور زور سے درے مارے ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے۔ کیا عامر نذیر دوبارہ اقتدار میں آ سکے گا؟"

"نو' میکس نو۔" سفیر نے درمیان میں ٹوک دیا۔ "آج ہنگری کا قومی دن ہے۔ آج پاکستان کی سیاست پر کوئی بات نہیں ہو گی۔ جلالی ہنگری میں پاکستان کے پریس اتاشی تھے۔ تم ان سے پوچھو کہ انہیں بڈاپسٹ کیسا لگا۔"

"فارگٹ بڈاپسٹ۔ یہ بتاؤ ہنگری کی لڑکیاں کیسی تھیں؟" میکس نے آنکھ مار کر بے تکلفی کا مظاہرہ کیا۔ جلالی کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑنے لگا۔

"بیوقوفی کی باتیں مت کرو۔" سفیر نے صورتحال سنبھالنے کی کوشش کی اور میکس ہنستا ہوا کسی اور مہمان سے ملنے کے لئے چلا گیا۔

"آئی ایم ساری۔" سفیر نے کہا اور جلالی کا بازو پکڑ کر اس طرف لے جانے لگا جہاں نسبتاً" کم لوگ تھے۔ "مجھے الزبتھ والے المیے کا علم ہے۔ الزبتھ کی ماں میری بہت پرانی دوست ہے۔ ہم کبھی پارٹی میں ایک ساتھ کام کیا کرتے تھے۔ اب تو۔ اب تو پارٹی از اوور۔" سفیر ایک لمحے کے لئے ماضی میں چلا گیا۔ لیکن فورا" ہی پلٹ آیا۔ "مسز رڈوانسکی نے تمہارے لئے مجھے ایک خط بھیجا تھا اور سختی سے کہا تھا کہ تمہیں ڈھونڈ کر ذاتی طور پر تمہارے حوالے کروں۔" سفیر نے جیب سے ایک لفافہ نکال کر جلالی کو دیا۔

جلالی کو استقبالئے میں بلائے جانے کی اصل وجہ معلوم ہو گئی۔ لیکن وہ کچھ نہیں بولا۔ اس نے لفافہ لیا اور اپنے کوٹ کی جیب میں رکھ کر سوالیہ نظروں سے سفیر کو دیکھنے لگا۔

"میری بیوی آج کل یہاں نہیں ہے اس لئے مجھ پر میزبانی کی دوہری ذمے داری ہے۔ مہمان آنا شروع ہو گئے ہیں' آدھ گھنٹے بعد وزیراعظم بھی آکر استقبالئے کو اعزاز بخشیں گے۔ اس لئے مجھے اب گیٹ پر کھڑے ہو کر مسکرانا ہے۔ تم چاہو تو اندر جا سکتے ہو۔ تمہارے سارے دوست وہیں شغل میں مصروف ہیں۔" سفیر معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

"نہیں' میں یہیں ٹھیک ہوں۔" جلالی نے مسکرائے بغیر کہا۔ سفیر نے سر ہلایا لیکن جاتے جاتے کچھ سوچ کر ٹھہر گیا اور چاروں طرف نظریں دوڑانے لگا۔ اس کی نظریں لان کے ایک کم روشنی والے کونے میں جا کر رک گئیں۔ ساڑھی میں ملبوس کوئی عورت اکیلی کھڑی سگریٹ پی رہی تھی۔ روشنی کم ہونے کی وجہ سے وہ سائے کی طرح لگ رہی تھی۔ سگریٹ کا شعلہ دہکتا نظر آ رہا تھا لیکن چہرہ پہچاننا مشکل تھا۔

"میری ایک اور مہمان کسی ساتھی کے بغیر اکیلی آئی ہے اور بور ہو رہی ہے۔ تم بھی پارٹنر کے بغیر ہو۔ میں تمہاری جوڑی بنا دیتا ہوں۔ مجھے یقین ہے تم دونوں ایک دوسرے میں دلچسپیاں تلاش کر سکو گے۔" سفیر ایک بار پھر معنی خیز انداز میں مسکرایا اور جلالی کا بازو پکڑ کر قدم بڑھانے لگا۔

جلالی کا کسی اجنبی اور وہ بھی اکیلی عورت سے ملنے اور رسمیات نباہنے کا کوئی موڈ نہیں تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ بازو چھڑا کر سفیر کو منع کرتا' وڈیو والے فلم بنانے کے لئے سفیر کی طرف لپکے۔ آنکھوں کو چکاچوند کر دینے والی لائٹ کھلی تو سامنے کھڑی ہوئی عورت روشنی کی زد میں آکر چمکنے لگی۔ روشنی پڑتے ہی اس نے سگریٹ ہاتھ سے چھوڑ دی اور روشنی کی تیزی سے بچنے کے لئے آنکھوں پر ہاتھوں کی اوٹ کر لی۔ جلالی اسے دیکھ کر مبہوت سا ہو گیا اور کسی مفعول کی طرح سفیر کے ساتھ ساتھ اس کی طرف کھنچا چلا گیا۔ اس نے شوخ نارنجی رنگ کی مختصر سی ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ جلالی نے منی ساڑی پہننے والے بہت شاہکار دیکھے تھے۔ لیکن اتنے متناسب جسم پر لپٹی ہوئی ساڑھی دیکھنے کا اتفاق کم ہوا تھا۔ ساڑھی سے جسم کے جن حصوں کو چھپانے کی کوشش کی گئی تھی وہ زیادہ نمایاں ہو گئے تھے۔ اس کی کمر کسی پاکستانی

عورت کی کمر نہیں تھی۔ اونچے بلاؤز اور بہت نیچی بندھی ہوئی ساڑھی کے درمیان بہت ہموار اور مسطح سا ایک طویل فاصلہ تھا جہاں اس کی سفید جلد تیز روشنی میں جھل مل کر رہی تھی۔ لیکن جلالی کو رنگین موتیوں والی چاندی کی اس بالی نے سحرزدہ کیا ہوا تھا جو اس نے اپنی ٹونڈی میں پہنی ہوئی تھی۔ سرچ لائٹ ناف میں ٹنگی ہوئی بالی پر پڑ کر بجلیاں منعکس کر رہی تھی۔ جلالی کو یہ بجلیاں اپنے جسم میں مچلتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ پورے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی تھی۔

جلالی اس کی ناف پر نظریں جمائے اس کے پاس پہنچا بھی نہیں تھا کہ لائٹ بند ہو گئی۔ کیمرہ مین کسی دوسری طرف بڑھ گیا تھا۔ اس نے آنکھوں پر سے ہاتھ ہٹا لیا۔ ہلکی ہلکی روشنی میں اس کا چہرہ اب صاف نظر آنے لگا تھا۔ اس کا جسم ہی نہیں چہرہ بھی بہت خوبصورت تھا۔ کتنا جانا پہچانا چہرہ تھا۔ جلالی سوچنے لگا اس نے اسے کہاں دیکھا تھا؟ وہ کون تھی؟

"مائی ڈیئر مرینہ۔ اندھیرے میں اکیلی کیا کر رہی ہو۔ گردش کیوں نہیں کرتیں۔ میکس تمہارے لئے سخت بیتاب ہو رہا ہے۔" سفیر نے اس کے رخسار پر بوسہ ثبت کرتے ہوئے کہا۔

"میکس کا نام مت لو۔ اسی سے بچ کر یہاں کھڑی ہوں۔ ملتا ہے تو گلے کا ہار ہو جاتا ہے۔ تمہیں پتہ ہے سفارتی استقبالیوں کا کراؤڈ مجھے بہت بور کرتا ہے۔ مسکراتے مسکراتے باچھیں چھل جاتی ہیں۔"

"ان سے ملو' یہ ذہین جلالی ہیں۔ دی جرنلسٹ۔ یہ بھی تمہاری طرح اکیلے ہیں۔ جلالی' یہ مرینہ شاہ ہیں۔ ہماری فیملی فرینڈ۔ میری بیوی کو انہوں نے اردو سکھائی تھی۔" سفیر نے جلدی جلدی تعارف کرایا۔ سفیر کو جانے کی عجلت ہو رہی تھی۔ وہ انہیں پہلے ہی بہت وقت دے چکا تھا۔ اسے اب زیادہ اہم مہمانوں کا سواگت کرنا تھا۔ اور جلالی سوچ رہا تھا کہ سفیر کے ساتھ وہ بھی یہاں سے کھسک جائے۔ اسے پتہ تھا اس عورت سے اس کی ملاقات خوشگوار نہیں ہو گی۔ نام سنتے ہی سب کچھ یاد آ گیا تھا۔ اس نے اسے اس سے پہلے ذاتی طور پر نہیں دیکھا تھا' صرف تصویریں دیکھی

تھیں۔ بلکہ تصویریں اس کے اسکینڈل کے ساتھ ساتھ خود اسی نے چھاپی تھیں۔ بہت سالوں پرانی بات تھی۔ اس زمانے میں وہ ایک اردو اخبار میں کام کرتا تھا' جو اسکینڈل چھاپنے میں شہرت رکھتا تھا۔ ایک وفاقی وزیر کا کالج کی نوجوان لیکچرر سے معاشقہ کوئی چھوٹا اسکینڈل نہیں تھا۔ اسکینڈل کے ساتھ جلالی کے نام کا بھی خوب چرچا ہوا تھا۔ جلالی کو یقین تھا وہ اس کا نام نہیں بھولی ہو گی۔ لیکن سفیر تعارف کراتے ہی وہاں سے چلا گیا۔ جلالی کے قدم نہ چاہتے ہوئے بھی وہیں جم کر رہ گئے۔

مرینہ شاہ اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ جلالی نروس ہونے لگا۔ اس نے سگریٹ نکال کر مرینہ کو پیش کیا جو اس نے خاموشی سے لے کر ہونٹوں میں دبا لیا۔ جلالی نے لائٹر جلایا تو وہ سگریٹ سلگانے شعلے پر جھکی اور جلالی کے دماغ میں ایک تیز سیٹی گونج گئی۔ اس کے کھلے ہوئے ریشم جیسے لمبے بال اس کے ننگے بازو پر آگرے تھے۔ وہ آج قتل کرنے کا پورا اہتمام کر کے آئی تھی۔

"تو تم ہو ذہین جلالی؟" اس نے دھواں اڑاتے ہوئے خاموشی توڑی۔ "دیکھنے میں تو ٹھیک لگتے ہو۔ میرا خیال تھا تمہاری شکل بھی بدمعاشوں جیسی ہو گی۔" اس نے کسی تکلف کو ملحوظ رکھے بغیر بھرپور حملہ کیا۔

"شکریہ!" جلالی نے مسکرا کر کہا اور ساتھ ہی اعصاب سے تناؤ جھٹک دیا۔ اس نے سوچا اب آمنا سامنا ہو ہی گیا۔ قتل وہ کر چکی ہے تو دل کی بھڑاس بھی نکال لے۔ سینے میں کب سے الاؤ جلائے ہوئے بیٹھی ہو گی۔

"تم کل کے اخبار میں لکھنا مرینہ شاہ سگریٹ اور شراب پیتی ہے اور ایک کینیڈین ڈپلومیٹ اس کا دیوانہ ہے۔ لکھنا تم نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔"

"آئی ایم ساری۔" جلالی نے بہت خلوص سے کہا۔ "میں نے جب آپ کے بارے میں لکھا تھا وہ میری صحافت کا ابتدائی زمانہ تھا۔ میں اب اسکینڈل نہیں چھاپتا۔ سنجیدہ کالم لکھتا ہوں۔"

"مجھے پتہ ہے۔ میں نے پڑھے ہیں تمہارے کالم۔ تم اب بڑے صحافی ہو گئے ہو۔ اب تم حکومت کے کپڑے اتارتے ہو۔ تم لوگ قلم ہاتھ میں لیتے ہی خود کو بادشاہ

سمجھنے لگتے ہو۔ تم سمجھتے ہو کہ تم جب چاہو، جس کے چاہو اور جہاں چاہو کپڑے اتار سکتے ہو۔"

"سب کے نہیں صرف بادشاہوں کے۔" جلالی نے کہا اور دل میں یہ سوچ کر مسکرانے لگا کہ اس کے کپڑے اتارنا چاہے بھی تو کیا اتارے گا۔ اس نے تو کپڑے جیسے پہنے ہی نہیں تھے۔ نگاہیں پھر ناف میں لٹکی ہوئی بالی پر اٹک گئیں۔

"یو نو جلالی! یو آر آ باسٹرڈ!!" اس نے پچھلے پندرہ برسوں میں کتنی بار یہ جملہ دہرایا تھا۔ جس کے لئے دہرایا تھا اب اس وقت اس کے سامنے کہا تو دل میں ٹھنڈک پڑ گئی۔ سارا غصہ باہر نکل گیا۔

"آپ کو غلط فہمی ہو گئی ہے۔ میں آپ کے قبیلے کا آدمی نہیں ہوں۔" جلالی نے اچانک حملے سے سنبھل کر مسکراتے ہوئے جوابی وار کیا۔

مرینہ شاہ اسے شعلہ بار نگاہوں سے گھورتی رہی۔ لیکن کچھ دیر میں شعلہ دھیما ہوتے ہوتے بجھ گیا اور نئے رنگ برنگے قمقمے آنکھ مچولی کھیلنے لگے۔ ہونٹوں کا کھنچاؤ بھی ختم ہو گیا۔ جس طرح اچانک غصے میں آئی تھی اسی طرح اچانک ہنس پڑی۔ ہنسی سے اس کی ناف میں لٹکی ہوئی بالی ہلنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی اندر سے جلالی کا پورا بدن بھی۔ "میرے خدا" جلالی نے سوچا وہ کیا کرے۔ نظر بار بار ادھر ہی جاتی تھی۔

"آئی ایم ساری۔" وہ ہنسی روک کر بولی۔ "باسٹرڈ وہ تھا جو مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔" آدھا جلا ہوا سگریٹ اس نے دور کیاری میں پھینک دیا۔ جلالی کچھ نہیں بولا۔ خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

"جاؤ، تمہیں بھی معاف کیا۔" وہ سر کو جھٹک کر مسکرائی۔ "دوستی کرو گے؟" اس نے ہاتھ بڑھایا۔ جلالی نے ہاتھ تھام لیا۔ وہ دیر تک اس کا ہاتھ اسی طرح تھامے کھڑا رہا۔ نرم لمس جیسے ہاتھ پر چپک کر رہ گیا تھا۔ اس نے ہاتھ واپس کھینچا تو جلالی کا ہاتھ چند لمحوں کے لئے اسی طرح فضا میں معلق رہا۔ لیکن پھر اس کے حواس واپس آ گئے۔ اسے لگا جیسے وہ کسی پرانی شناسا سے مخاطب ہو۔

"تم جسے میسر تھیں وہ تمہیں کیسے چھوڑ گیا۔ وہ بھی اپنی پرانی بیوی کے لئے جو اس سے عمر میں بڑی ہے۔"

"انیس شمشاد بہت خودغرض تھا۔" وہ کچھ اداس ہو گئی۔ "اس کی پہلی بیوی ہمیشہ سے بہت چالباز ہے۔ وہ انیس اور حکومت کے درمیان سودے بازی کرانے میں کامیاب ہو گئی تو اس نے شرط رکھ دی۔ میں نے جب انیس سے شادی کی تھی تو وحیدہ کو طلاق دینے کی شرط نہیں رکھی تھی۔ لیکن میں نے اب ایک سبق سیکھ لیا ہے۔ نو طلاق۔ نو شادی۔ تم شادی شدہ ہو؟"

"ہوتا بھی تو آج ہی طلاق دے دیتا۔"

"ایک ہی ملاقات میں؟ ایک نمبر کے فلرٹ لگتے ہو۔ تم جیسے معصوم صورت والوں کو میں خوب جانتی ہوں۔ لڑکیاں دیکھتے ہی ترس کھانے لگتی ہیں۔ کئی تم پر بھی مری ہوں گی؟"

"شاید! ایک تو سچ مچ مر گئی تھی۔" جملہ اچانک ہی اس کے منہ سے نکل گیا تھا۔ جلالی کو دل ہی دل میں سخت شرمندگی ہوئی۔ اسے الزبتھ کی ماں کا وہ خط بھی یاد آیا جو سفیر نے اسے دیا تھا۔ جانے کیوں وہ خط پڑھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

"کوئی مکھی ہو گی۔" اس نے کہا اور اپنے مذاق پر خود ہی ہنس پڑی۔ ناف میں لٹکی ہوئی بالی پھر ہلنے لگی۔ جلالی کی سوچیں اور نظریں پھر بھٹکنے لگیں۔

"وہ جس کی عمر تیس سال سے زیادہ ہو گئی ہو اور جس نے شادی نہ کی ہو' تمہاری طرح دبلا پتلا اور صاف ستھرا بھی نظر آتا ہو اس کے بارے میں امریکیوں کا فتویٰ ہے کہ وہ سو فیصدی "گے" ہو گا۔ تم تو نہیں ہو؟"

"اگر ہوں تو؟"

"تمہارے ساتھ رات گزارتے ہوئے ڈر نہیں لگے گا۔"

"وعدہ!"

"شکل دیکھی ہے اپنی؟ جاؤ پہلے منہ دھو کر آؤ۔"

"مجھ جیسے چالیس سال سے زیادہ عمر کے دبلے پتلے اور صاف ستھرے کنوارے

کے لئے پاکستانیوں کا فتویٰ کیا ہے؟"

"پلے بوائے جس کا ابھی تک کھیلنے سے دل نہیں بھرا۔ یا بیچارہ مڈل کلاس کا ہے اور ابھی تک کیرئیر بنانے کی مشقت میں مصروف ہے۔"

"تم جیسا لباس پہننے اور ناف میں بالی لٹکانے والیوں کے بارے میں جو فتوے ہیں وہ سنو گی؟"

"جسٹ شٹ اپ۔ ایک لفظ مت کہنا ورنہ قتل کر دوں گی۔ میں اسی لئے اتنی دور اور اتنے اندھیرے میں کھڑی ہوں۔"

"لیکن کیوں؟ یہ شوخ رنگ، توجہ حاصل کرنے والے یہ ہتھیار کس کے لئے سجا کر آئی ہو؟"

"مجھے بے ضرورت تماشا بننے کا شوق نہیں ہے۔ میرا خیال تھا انیس اور اس کی لال بالوں والی بوڑھی میم بھی آئے گی۔ میں میکس کی بانہوں میں بانہیں ڈالے روشنیوں میں گردش کرتی اور وہ آگ پر لوٹتا یا اس اندھیرے کونے میں آ کر چھپ جاتا۔"

"لگتا ہے انیس شمشاد کے عشق کی چنگاری بجھی نہیں۔ اس نے ہاتھ بڑھایا تو......"

"بڑھا کر تو دیکھے۔ آگ کے دریا پھلانگ کر اور لاشیں روندتی ہوئی اس کے پاس چلی جاؤں گی۔ لیکن تم حسد کرنے والے کون ہو؟"

"اور کینیڈین۔ میکس واکر؟ اس کا کیا ہو گا؟" جلالی سچ مچ جلنے لگا تھا۔

"اوہ نو! وہ ایک بے تکلف دوست ہے۔ یہ سفارتی دعوتوں کا مذاق ہے۔ اس کی بیوی آج کل کینیڈا گئی ہوئی ہے اس لئے چانس لینے کی کوشش کر رہا ہے۔" وہ ہنس پڑی لیکن پھر جلد ہی سنجیدہ ہو گئی۔ "انیس اگر آتا تو مزا آ جاتا۔ آج میکس کی ضرورت نہیں پڑتی، تمہارا ہاتھ پکڑ کر گھومتی۔ وہ تمہارے نام سے چڑتا ہے۔ جل کر کوئلہ ہو جاتا۔" وہ سوچ کر ہی مزا لینے لگی۔

"میں نے جو لکھا تھا کیا وہ سچ نہیں تھا؟"

"کیا؟"

"کبھی کبھی میرے دل میں خیال آتا ہے کہ جیسے تم کو بنایا گیا ہے میرے لئے۔"

"اوہ وہ!" وہ ہنس پڑی۔ بولی تو جیسے خوابوں میں کھو گئی ہو۔ "انیس کی محبت میں بہت گرمجوشی اور ایک عجیب سی بے خوفی تھی۔ باہر قومی دن کے لئے لڑکیوں کی ریہرسل ہوتی اور وہ ریہرسل دیکھنے کے بہانے ہر شام کالج آتا اور دفتر میں میرے ساتھ اکیلا بیٹھا فلمی ڈائیلاگ بولا کرتا تھا۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ اتنا بڑا قانون داں' اتنا اہم وزیر اور اتنا مشہور سیاستدان ہے۔ وہ نیا نیا جوان ہونے والا ایسا لڑکا تھا جسے پہلی بار عشق ہوا ہو۔ اس زمانے میں انڈیا کی فلم "کبھی کبھی" بہت مشہور تھی۔ وہ دیکھ کر آیا تو اس شام میرا ہاتھ پکڑ کر بیٹھ گیا۔ پورا گانا یاد کر کے آیا تھا۔ مجھے گا گا کر سناتا رہا۔ خود کو بالکل امیتابھ سمجھ رہا تھا۔ اس کی آواز بہت اچھی تھی۔ کسی کو دفتر میں آنے کی اجازت نہیں تھی لیکن اس روز غلطی سے یا جان بوجھ کر وائس پرنسپل اچانک دروازہ کھول کر اندر آ گئی۔ گانا اس وقت اپنے شباب پر تھا۔ وہ واپس تو چلی گئی لیکن اس نے یہ کہانی مرچ مصالحہ لگا کر سب میں پھیلا دی۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"پھر کیا ہوتا؟ ٹائیں ٹائیں فش۔ شادی ہو گئی۔ میں بھی اس کی دیوانی تھی۔ لیکن میں نے اسے صاف صاف بتا دیا تھا کہ اسے شادی کرنی ہو گی۔ اس کی بیوی نے بہت شور مچایا۔ بہت لڑی۔ لیکن انیس اس کی بلیک میلنگ سے پہلے ہی بیزار تھا۔ تمہیں پتہ ہے انیس سے وحیدہ کی شادی کیسے ہوئی تھی؟"

"کیسے؟"

"تاش کے پتوں کے ذریعے۔" اس نے تجسس پیدا کرنے کی کوشش کی۔ "وحیدہ' انیس کے سب سے قریبی دوست کی بیوی تھی اور تاش کے کھیل میں انیس کی پارٹنر تھی۔ انیس کی اپنی بیوی انیس کے دوست کی پارٹنر تھی۔ برج کی پارٹنر شپ بڑھتے بڑھتے بستر تک پہنچ گئی۔ ایک دن ہاکس بے کی ہٹ میں دونوں دوستوں نے اپنی

اپنی بیویوں کو ایک دوسرے کے ساتھ پکڑ لیا۔ بس وہیں دونوں نے اپنی اپنی بیویوں کو طلاق دے کر ایک دوسرے کی بیوی سے شادی کر لی۔"

"میں نے سنا ہے سب کچھ اتنی آسانی سے نہیں ہوا تھا۔ پستول بھی نکلے تھے۔" جلالی نے کہا جس نے بیویوں کے تبادلے کی یہ کہانی کسی اور سے بھی سنی تھی۔

"ہو سکتا ہے۔ مجھے انیس نے بس اتنی ہی کہانی سنائی تھی۔" وہ کلائی میں بندھی ہوئی نازک سی سنہری گھڑی میں وقت دیکھنے لگی۔ "وزیراعظم کی سواری اب تک نہیں آئی۔ آ جائے تو میں بھی اندر جاؤں۔"

"کیوں؟ تمہیں کس نے روکا ہے؟"

"سفیر نے اخبار والوں کے لئے اندر کچھ انتظام کیا ہے۔ سب وہیں جمع ہیں۔ وزیراعظم کے آئے بغیر باہر نہیں نکلیں گے۔ میں اگر ان کے سامنے گئی تو آنکھوں ہی آنکھوں میں کھا جائیں گے۔" بے خیالی میں اس کی انگلیاں اپنی ناف والی بالی سے کھیلنے لگیں۔ جلالی کے دل کی دنیا پھر درہم برہم ہو گئی۔ نظریں پھر وہیں جا کر اٹک گئیں۔

"تم بھی ان سے مختلف نہیں ہو۔ جب سے ملے ہو میرے پیٹ کو گھور رہے ہو۔" اس نے برا سا منہ بنا کر اپنی بالی کو آزاد چھوڑ دیا۔

"بالی پہننے کے لئے وہ جگہ کچھ عجیب لگ رہی ہے۔ اس لئے۔"

"مجھے پیٹ کے بیچوں بیچ کھدا ہوا سکڑے کناروں والا گڑھا بہت بدصورت لگتا ہے۔ بدنما داغ کی طرح۔ میں ساڑی پہنتی ہوں تو اپنے بیلی بٹن کو سجا کر رکھتی ہوں۔" اس نے اتنی سنجیدگی سے کہا جیسے کوئی بہت اہم نکتہ بیان کر رہی ہو۔ لیکن اس کی سنجیدگی ایک بار پھر رخصت ہو گئی۔ اب وہ بہت شرارتی نظروں سے جلالی کو دیکھ رہی تھی۔

"چھو کر دیکھو گے؟...... ڈرو مت، کرنٹ نہیں لگے گا۔ بس میرے پیٹ کو ہاتھ مت لگانا۔ مجھے گدگدی ہوتی ہے۔"

جلالی کے حواس شاید معطل ہو گئے تھے۔ اس نے انگلی بڑھا کر سچ مچ بالی کو

چھو لیا لیکن پھر ایک دم ہاتھ واپس کھینچ لیا۔ جیسے واقعی کرنٹ لگ گیا ہو۔ چاندی کے تار نے مرینہ کے جسم کی ساری بجلی جلالی کے جسم میں پہنچا دی تھی۔ مرینہ اپنے مذاق کا مزا لیتے ہوئے بری طرح ہنس رہی تھی۔ جلالی بھی اس کے ساتھ جھینپی جھینپی ہنسی ہنسنے لگا۔ لیکن بدن میں جو سنسنی دوڑ گئی تھی وہ ختم نہیں ہوئی تھی۔ اسی وقت لان میں ویڈیو بنانے والوں کی تیز لائٹیں چمکنے لگیں۔ مہمانوں میں ہلچل مچ گئی۔ سب کی توجہ دروازے کی طرف تھی۔ وزیراعظم کی سواری آ گئی تھی۔ جلالی اور مرینہ روشنیوں سے بچنے کے لئے اور پیچھے کی طرف سرک گئے۔ کچھ دیر بعد اندر بیٹھے ہوئے صحافی بہت تیزی سے باہر نکلتے ہوئے نظر آئے۔ انہیں بھی شاید وزیراعظم کی آمد کی خبر دے دی گئی تھی۔ ان میں کئی جلالی کے دوست تھے۔ لیکن اس وقت انہیں متوجہ کرنا بیکار تھا۔ وہ بہت جلدی میں تھے۔ انہیں وزیراعظم سے سوال و جواب کر کے کل کے اخباروں کے لئے شہ سرخیاں حاصل کرنا تھیں۔

''کیا تم بھی جاؤ گے؟'' مرینہ شاہ نے اندر جانے کے لئے قدم اٹھاتے ہوئے جلالی سے پوچھا۔

''نہیں، میں ڈیوٹی پر نہیں ہوں۔'' جلالی نے مرینہ کے قدموں سے قدم ملاتے ہوئے کہا۔ اندر جا کر مرینہ اپنا میک اپ درست کرنے چلی گئی اور جلالی خالی گلاس سمیٹنے والے بیرے کو اپنی ڈرنک آرڈر کرنے لگا۔ کشادہ لاؤنج روم خالی تھا لیکن آخری کونے میں رکھی ہوئی ایک آرام کرسی پر نیم دراز ایک شخص جھونکے لے رہا تھا۔ جلالی کافی دیر دیکھنے کے بعد پہچان سکا۔ اس نے چودھری صاحب کو بہت سالوں بعد دیکھا تھا۔ چودھری صاحب ایک پرانے صحافی تھے۔ انہیں بھی اصول پسندی کا مرض تھا اسی لئے عمر کا آخری حصہ الکحل میں گھل کر رہ گیا تھا۔ انہوں نے شاید اب تک ہار نہیں مانی تھی۔

''چوہدری صاحب!'' جلالی نے آواز لگائی تو انہوں نے آنکھیں کھول کر دیکھا اور تھوڑی دیر تک پلکیں جھپکنے کے بعد اسے پہچان لیا۔

''اوئے ذہین جلالی تو ادھر کیا کر رہا ہے۔ اوئے باہر جا۔ ریاض توصیف امیدوں

کا جمعہ بازار لگائے کھڑا ہے۔ اک میرے واسطے بھی لے کر آ۔ اوئے جلدی کر۔ دکان بند ہو جائے گی۔" انہوں نے آنکھیں پھر بند کر لیں۔ گردن ڈھلک گئی' ایک خراٹا بھی بلند ہوا تھا۔ جلالی مسکراتا ہوا ایک صوفے پر آ کر بیٹھ گیا۔ چودھری صاحب کو ہوش میں لانا ناممکن تھا۔ کیا امید ڈھونڈنے والوں کا یہی انجام ہوتا ہے؟ جلالی نے سوچا تو اسے مستقبل کے آئینے میں اپنی تصویر بھی چودھری صاحب جیسی دکھائی دی۔

اندر گرمی محسوس ہو رہی تھی۔ جلالی نے کوٹ اتار کر برابر کے صوفے پر رکھا تو جیب سے الزبتھ کی ماں کا وہ خط جھانکتا نظر آیا جو سفیر نے اسے دیا تھا۔ لفافہ چاک کر کے اندر سے ٹائپ کیا ہوا کاغذ نکالا جسے پڑھ کر اطمینان کی ایک گہری سانس لی۔ الزبتھ کی ماں نے صرف چند سطریں تحریر کی تھیں۔

"ڈیئر جلالی'

تمہیں یانوش سے خبر مل گئی ہو گی۔ الزبتھ نے تمہیں رخصت کرنے کے بعد ٹرین کے نیچے آ کر خود کو ہلاک کر لیا تھا۔ وہ ایسے لاعلاج ذہنی مرض کا شکار تھی جس میں مبتلا ہونے والوں کا انجام خودکشی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ وہ تمہیں بہانہ نہ بناتی تو کسی اور وجہ سے خودکشی کرتی۔ ہمیں ڈاکٹروں نے بہت پہلے بتا دیا تھا۔ ہم اس کے اس انجام کے لئے بہت پہلے سے تیار تھے۔ تم خود کو قصوروار مت سمجھنا۔

کبھی ہنگری آؤ تو ہمیں ضرور اطلاع کرنا۔ مجھے اور میرے شوہر کو تم سے مل کر بہت خوشی ہو گی۔

مسز میری ایف رڈوانسکی"

جلالی تھوڑی دیر خط کو ہاتھوں میں لئے گھورتا رہا۔ اس کے بعد اس نے خط کے پرزے پرزے کئے اور میز پر رکھی ہوئی ایش ٹرے میں ڈال دیئے۔ الزبتھ کی ماں نے اس کے سینے پر رکھی ہوئی ایک بھاری سل ہٹا دی تھی۔ سامنے سے مرینہ شاہ آتی نظر آئی تو وہ اتنا ہلکا پھلکا ہو رہا تھا کہ ایک ہی جست میں اس کے پاس پہنچ کر اس کی آنکھوں کی ساری سوئیاں نکال سکتا تھا۔

مرینہ آتے آتے رک گئی۔ کوئی اندر داخل ہو رہا تھا۔ وہ اس سے سلام دعا کرنے لگی۔ دونوں باتیں کرتے ہوئے جلالی تک پہنچے تو وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ مرینہ دونوں کا ایک دوسرے سے تعارف کرانے لگی۔ دونوں ایک دوسرے کو جانتے تھے لیکن ملاقات پہلی بار ہوئی تھی۔

''آپ اس ہجوم میں شامل ہونے نہیں گئے جو باہر آپ کے وزیراعظم کو گھیرے ہوئے کھڑا ہے؟'' ایمان علی کا لہجہ بہت طنزیہ تھا۔ جلالی کو اچھا نہیں لگا۔

''میں اب صرف کالم لکھتا ہوں۔ رپورٹنگ نہیں کرتا۔ میں ڈیوٹی پر بھی نہیں ہوں۔''

''آپ کو شاید برا لگا۔ لیکن جس طرح کے سوال و جواب ہو رہے ہیں انہیں سن کر مجھے قے آنے لگی تھی۔''

''وزیراعظم سے وہی سوال پوچھے جائیں گے جن سے خبر بنے گی۔ فلسفہ بگھارنے اور دانشوری کی باتوں سے خبر نہیں بنتی۔ صحافیوں کو اخبار کا پیٹ بھرنا ہے۔ اپنی نوکری کرنی ہے۔'' جلالی نے اپنے ساتھیوں کا دفاع کیا اور پھر مسکرا کر ایمان علی سے کہنے لگا۔ ''انہوں نے آپ کو دیکھا ہو گا تو آپ سے بھی بہت کچھ پوچھا ہو گا۔''

''جی نہیں! میں اب انہیں سوال کرنے کا موقع نہیں دیتا۔ ان کے پاس اور خاص طور پر اردو اخبار کے صحافیوں کے پاس مجھ سے پوچھنے کے لئے میری شادی کے سوا کوئی اور سوال نہیں ہے۔'' ایمان علی نے بہت برا سا منہ بنا کر کہا۔

''لوگ چٹپٹی خبریں زیادہ شوق سے پڑھتے ہیں۔ آج کل چٹخارے کی صحافت کا دور ہے۔'' جلالی ایک بار پھر مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ دیکھ کر ایمان علی کا پارہ اور چڑھ گیا۔

''یہ ملک آپ کے اسی چٹخارے کی نذر ہو جائے گا۔ آپ کی آنے والی نسلیں جاہل رہیں گی اور بچے چیتھڑوں تک سے محروم ہو جائیں گے۔ آپ کو اندازہ نہیں ہے یہ ملک دیوالیہ ہونے کے کتنا قریب پہنچ چکا ہے۔''

''مجھے معلوم ہے۔'' جلالی بھی سنجیدہ ہو گیا۔ ''آپ ابھی نئے نئے سیاست میں

آئے ہیں اس لئے زیادہ جذباتی ہو رہے ہیں۔" جلالی نے ایمان علی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ "میں نے پچھلے بیس سالوں میں بہت سیاستدانوں کے انٹرویو کئے ہیں۔ ان سے بیروزگاری اور غربت دور کرنے تعلیم عام کرنے اور مہنگائی کم کرنے کی بہت سی تقریریں سنی ہیں۔ لیکن کوئی یہ نہیں بتاتا کہ یہ معجزہ ہو گا تو کیسے ہو گا۔ سب یہی کہتے ہیں کہ وہ اقتدار میں آتے ہی چٹکی بجا کر سب کچھ ٹھیک کر دیں گے۔ مریض کو کسی ماہر سرجن کے ہاتھوں ایک بڑے آپریشن کی ضرورت ہے لیکن نیم حکیم میٹھی معجونوں اور اسپرو کی گولیوں سے علاج کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کچھ خود ساختہ معالج ایسے ہیں جن کے پاس اسپرو تک نہیں ہے۔"

"ٹیک اٹ ایزی۔" مرینہ نے ہنس کر کہا۔ "تم خواہ مخواہ سنجیدہ ہو گئے ہو۔ سیاست آرام سے کھیلے جانے اور مزا لینے والا کھیل ہے۔ مجھ سے پوچھو۔ میں کئی برس ایک ایسے سیاستدان کی بیوی رہی ہوں جو وزیراعظم بننے کے خواب دیکھ رہا تھا۔" لیکن جلالی نے مرینہ کی بات پر کوئی توجہ نہیں دی۔ وہ بدستور ایمان علی کو دیکھ رہا تھا۔

"ایمان علی! آپ مجھے یہ بتایئے کہ آپ کے پاس اس ملک کو دیوالیہ ہونے سے بچانے کا کیا نسخہ ہے اور وہ کس طرح کارگر ہو سکتا ہے۔ ورنہ بدحالی کے نوحے نہ پڑھیں۔ میں نے ایسے مرثیئے بہت سنے ہیں۔"

جلالی کا خیال تھا کہ ابھی اور گرما گرمی ہو گی۔ اس نے ایمان علی کی گرم مزاجی کی بہت سی کہانیاں سنی تھیں۔ لیکن اس کی توقع کے برخلاف ایمان علی اسے خاموشی سے دیکھتا ہوا کچھ سوچنے لگا۔

"میں کل دوپہر کی فلائٹ سے لاہور واپس جا رہا ہوں۔" اس نے مسکرا کر کہا۔ "آپ صبح کا ناشتہ میرے ساتھ کیجئے۔ میں آپ کو دکھاؤں گا کہ میرے پاس اسپرو کی جو گولیاں ہیں وہ کتنی زود اثر ہیں۔"

ماحول کا تناؤ ایمان علی کی مسکراہٹ میں گھل گیا۔ جلالی نے بھی خاموشی سے سر ہلا کر ہاں کر دی۔

"مرینہ! اگر تم کچھ نہیں کر رہی تو تم بھی..... " ایمان علی نے رسماً" مرینہ شاہ کو بھی دعوت دینے کی کوشش کی لیکن اس نے جملہ پورا نہیں ہونے دیا۔

"نو۔ تھینک یو۔ تم لوگ سیاست پر بات شروع کرتے ہی مرغوں کی طرح لڑنے لگتے ہو۔ سیاست میرے لئے بس ایک فن ہے۔ ایف یو این۔ فن۔ میں اسے تم لوگوں کی طرح سنجیدگی سے نہیں لیتی۔" مرینہ شاہ پھر کچھ سوچ کر کہنے لگی۔ "ویسے بھی کل جلالی میرے ساتھ ڈنر کر رہے ہیں۔ میں کسی سے ایک دن میں دو بار نہیں ملتی۔" اس نے اٹھلا کر جلالی کو دیکھا۔ آنکھوں میں شرارت تھی۔ جلالی جانے کیوں نظریں چرانے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا یہ ڈنر کس نے اور کب طے کیا تھا؟

اسی وقت دوسرے کونے میں خراٹے لے کر سوتے ہوئے چودھری صاحب چونک کر اٹھ گئے اور لڑکھڑاتے ہوئے ان کے پاس آکر کھڑے ہو گئے۔

"اوئے ذہین جلالی' تو امید لے آیا؟" انھوں نے جلالی کے چہرے کے سامنے انگلی گھما کر کہا۔ جسم آگے پیچھے جھول رہا تھا۔

"چودھری صاحب! ان سے ملئے یہ ایمان علی ہیں۔" جلالی نے تعارف کرانا چاہا۔

"میں جانتا ہوں۔ اچھی طرح جانتا ہوں۔ کیا۔ کیا یہی ہے تری امید؟" چودھری صاحب نے لڑکھڑاتے ہوئے کہا اور جواب کا انتظار کئے اور پلٹ کر دیکھے بغیر سر کو نفی میں ہلاتے ہوئے باہر نکل گئے۔

ایمان علی کے پاس صرف اسپرو کی گولیاں نہیں تھیں۔ اس نے تو پورا دواخانہ سجا رکھا تھا۔ رنگ برنگے مرہم' اینٹی بایوٹک کیپسول اور وٹامن کے ڈھیر۔ عمل جراحت کے لئے آپریشن تھیٹر تیار تھا۔ ایک ایک آلہ اپنی جگہ رکھا تھا۔ وہ نیم حکیم بھی نہیں تھا۔ وہ ایک ماہر سرجن کی طرح ایک ایک رگ پہچانتا تھا۔ شریانوں میں کہاں کہاں بلاک تھے جن سے خون کی گردش رک گئی تھی۔ کسے بائی پاس کی ضرورت تھی اور کسے ہلکے سے دھکے کی۔ کون سا گردہ سڑ گیا تھا اور کون سا پھیپھڑہ انفیکشن کا

شکار تھا۔ کسے بدلنا ضروری تھا اور کسے ٹھیک کرنا۔ اس کے پاس پورا نقشہ تیار تھا۔ جلالی حیرت زدہ رہ گیا۔ جس ملک میں سیاست صرف زبانی جمع خرچ کا کاروبار اور سیاسی تجربہ بیوقوف بنانے کی مہارت کا نام ہو اور جہاں کسی کو ترجیحات متعین کرنے کا حوصلہ اور ہوم ورک کرنے کی عادت نہ ہو' ایمان علی کا ہر تجزیہ اعداد و شمار اور حقائق کی ایک دنیا سمیٹے ہوئے تھا۔ اس کے ہر منصوبے کی نوک پلک درست تھی۔ اس کے پاس حکومت کرنے کے لئے پورا ڈھانچہ موجود تھا۔ وہ ۲۴ گھنٹے کے نوٹس پر حکومت کرنے کے لئے تیار تھا۔

جلالی اس سے کئے ہوئے وعدے کے مطابق صبح ہی صبح ۸ بجے پہنچ گیا تھا۔ بہت شاندار کوٹھی تھی۔ باہر دروازے کے ستون پر رفیقہ چنائے کے نام کی تختی لگی ہوئی تھی۔ ایمان علی اسی وقت جاگنگ کر کے آیا تھا اور پسینے میں شرابور تھا۔ وہ برآمدے میں کھڑا جلالی کے آنے کا ہی انتظار کر رہا تھا۔ اندر کھانے کی میز پر جب تک ناشتہ لگتا وہ نہا کر کپڑے بدل آیا۔ ناشتے کے بعد کھانے کی وہی میز کانفرنس ٹیبل بن گئی۔ ایک طرف کافی کا گرم پاٹ اور پیالیاں رکھی تھیں اور دوسری طرف رپورٹوں اور فائلوں کا انبار تھا۔ اس نے جلالی کو بتا دیا تھا کہ بات چیت آف دی ریکارڈ ہو گی۔

جلالی نے خاموشی سے سر ہلا دیا۔ ایمان علی اس کے بعد اپنے منصوبوں کے نکات بتانے اور سمجھانے لگا۔ جلالی کی آنکھیں آہستہ آہستہ کھلتی جا رہی تھیں۔ شاید وہ صحیح جگہ آ گیا تھا۔ یہاں صرف امیدوں کا ڈھیر ہی نہیں' امید بر آنے کے نسخے بھی موجود تھے۔ آنکھوں میں ایسی چمک تھی جیسے دنیا فتح کرنے کا حوصلہ ہو۔ ہر جنبش یقین سے پر تھی۔ جلالی اداس ہو گیا۔ کاغذ پر سب کچھ کتنا اچھا لگ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا یہ سب کچھ کاغذ پر ہی لکھا رہ جائے گا۔ سسٹم کو بدلنا اتنا آسان نہیں تھا۔ اس سسٹم کے محافظ بہت طاقتور تھے۔ وہ کچھ بدلنے نہیں دیں گے۔

"یہ نیا پاکستان ہے۔" ایمان علی نے کاغذوں کو اپنے سامنے سے سرکا کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ "یہ میرا' آپ کا اور اس ملک کے عوام کا پاکستان ہے۔ یہ نیا پاکستان بنانا ہی ہو گا۔ ہر قیمت پر بنانا ہو گا۔"

"لیکن کیسے؟" جلالی نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد پوچھا۔

"کیسے؟..... ایسے!" ایمان علی نے بہت غصے سے رپورٹوں کا سارا ڈھیر جلالی کے سامنے کر دیا۔ "آپ نے شاید وہ سب کچھ جو میں نے ابھی بتایا ہے سنا نہیں۔ سنا ہے تو سمجھا نہیں۔"

"اچھی طرح سنا اور سمجھا ہے۔ یہ رپورٹیں سونے میں تولی جانی چاہئیں۔ لیکن آپ کو ان رپورٹوں پر عمل کرنے کا اختیار کیسے ملے گا؟"

"عوامی طاقت کے ذریعے۔"

"عوامی طاقت کے ذریعے؟" جلالی ہنسنے لگا۔ "اس جہالت زدہ معاشرے میں آپ کی ان مشکل رپورٹوں کو کون پڑھے گا' کون سمجھے گا۔ آپ کو پتہ ہے عوامی طاقت آج کل دولت اور جذباتی نعروں سے جیتی جاتی ہے۔"

"مجھے معلوم ہے یہ مشکل کام ہے۔ لیکن میں اس مشکل کام کو آسان بنا دوں گا۔ میں انہیں سمجھاؤں گا۔ مجھے اپنے لوگوں پر پورا بھروسہ ہے۔ ان کی سمجھ میں کوئی خرابی نہیں ہے۔ صرف ان کے پاس جانے' ان کا اعتبار جیتنے اور اعتماد حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔"

"عامر نذیر اور اس کی بیوی اس غریب ملک کے کروڑوں ڈالر لوٹ کر لے گئے' لیکن عوام جئے عامر کی دھن پر ناچ رہے ہیں۔ ریاض توصیف معمولی لوہار سے اتنا بڑا صنعتکار بن گیا' بینکوں کے اربوں روپے ہڑپ کئے بیٹھا ہے اور لوگ آج بھی اس کے دیوانے ہیں۔ آپ اس عوامی طاقت سے پھر بھی پرامید ہیں؟"

"آپ چاہتے ہیں عوام کو ریاض توصیف اور عامر نذیر کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے اور مایوس ہو کر بیٹھ جایا جائے؟ نہیں۔ میں یہ نہیں کر سکتا۔ عوام کو متبادل دینا پڑے گا۔" ایمان علی نے غصے سے میز پر مکا مارا جس سے میز پر رکھی ہوئی پیالیاں بج اٹھیں۔ لیکن پھر اس نے خود پر قابو پا لیا۔

"آپ نے مرغوں کی لڑائی دیکھی ہے؟ لوگ سیاست کا کھیل بھی مزا لینے کے لئے کھیلتے ہیں۔ اپنی اپنی پسند کے مرغوں پر شرط لگا کر ان کا حوصلہ بڑھانے کے لئے

نعرے لگاتے اور ایک دوسرے سے جھگڑتے ہیں۔ انہیں کسی مرغے کا رنگ پسند آتا ہے، کسی کی نسل، کسی کے سر کی کلغی اور کسی کی چونچ۔ لیکن وہ کسی بھی مرغ کے لئے نعرے لگائیں اور کسی کا بھی مرغ جیتے، انہیں پتہ ہے کہ مرغ انڈا نہیں دے گا۔ انہیں زمین سے پانی نکالنے کے لئے گڑھا خود کھودنا ہو گا۔" وہ میز پر آگے کی طرف بڑھ آیا۔

"جلالی بھائی! یہ نظام اب بہت سڑ گیا ہے۔ بدبو اتنی بڑھ گئی ہے کہ سانس لینا مشکل ہو گیا ہے۔ پانی نکالنا دن بدن مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ لوگ سیاسی اکھاڑے کے مرغوں کی لڑائی بھول جائیں گے اور یہی وقت ہو گا جب وہ اقتدار کی میوزیکل چیئر کھیلنے والوں کی ٹانگیں توڑ دیں گے اور اپنے اپنے مرغ ذبح کر کے کھا جائیں گے۔ انہیں کوئی متبادل نہ ملا تو وہ مایوسی کے خلاؤں میں بھٹکیں گے اور ایک دوسرے کی بوٹیاں نوچنا شروع کر دیں گے۔"

جلالی کو پتہ تھا وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ لیکن وہ جو خواب دیکھ رہا تھا ان کی تعبیر اتنی آسان نہ تھی۔

"آپ کو یقین ہے عوام آپ کو قبول کر لیں گے؟"

"ہاں!" ایمان علی نے کہا تو جلالی اسے حیرت سے دیکھنے لگا۔

"مجھے پتہ ہے آپ کیا سوچ رہے ہیں۔" ایمان علی نے ہنس کر کہا۔ "میں سیاست میں نووارد ہوں لیکن نابالغ نہیں ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ میں انتخاب ہار جاؤں گا۔ لیکن میں ہار نہیں مانوں گا۔ میں اس کے بعد ہونے والا انتخاب بھی لڑوں گا۔ پھر اس کے بعد۔ اس کے بعد اور پھر اس کے بعد ہونے والا بھی۔ ہو سکتا ہے مجھے پانچ سال لگیں، دس سال، پندرہ یا بیس سال۔ میں سیاست میں صرف ایک چھلانگ لگانے نہیں آیا۔ یہ لانگ مارچ ہے جو بہت دور اور بہت دیر تک جاری رہے گا۔"

"آپ کے ساتھیوں میں اس طویل مسافت کا حوصلہ ہے؟"

"وقت بتائے گا۔ لیکن مجھے کچھ دور تک ساتھ چلنے والوں کی نہیں، لمبی دوڑ

کے ساتھیوں کی ضرورت ہے۔"

"لمبی دوڑ!" جلالی نے سر ہلایا۔ "آپ کی لمبی دوڑ ختم ہونے سے پہلے آپ کا مریض گزر چکا ہو گا۔"

ایمان علی کچھ نہیں بولا۔ کچھ سوچتا ہوا جلالی کو دیکھنے لگا۔ اسے اپنی سوچوں کو ترتیب دینے کے لئے شاید وقفہ چاہئے تھا۔ اس نے میز پر رکھی پیالیوں میں کافی بھری اور جلالی کی پیالی اس کی طرف سرکا دی۔

"آپ صحیح کہتے ہیں۔ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔" ایمان علی نے کافی کے دو تین گھونٹ لینے کے بعد کہا۔ "میں اسی لئے آپ سے ملنا چاہتا تھا۔ آپ مریض کی حالت سے باخبر ہیں۔ آپ علاج میں مدد کر سکتے ہیں۔"

"میں؟ میں کیا کر سکتا ہوں؟" جلالی نے حیرت سے کہا۔ لیکن ایمان علی نے جیسے سنا ہی نہیں۔

"آپ ایک لمبی مسافت کو مختصر کرنے میں ہمارا ہاتھ بٹا سکتے ہیں۔"

"لیکن کیسے؟ میں آپ کی مدد کیسے کر سکتا ہوں؟" جلالی کو سچ مچ ہنسی آ گئی۔ ایمان علی کو اس کے بارے میں جانے کیا غلط فہمی ہو گئی تھی۔

"مجھے دو سال چاہئیں۔ دو سالوں میں نئے پاکستان کا پہیہ چل پڑے گا۔" ایمان علی کچھ سوچنے کے بعد بولا۔ "مجھے وزیراعظم بننے کے لئے وزیراعظم نہیں بننا۔ اگر بننا ہوتا تو کئی شارٹ کٹ تھے۔ لیکن اس طرح میں یہ سب کچھ نہیں کر سکوں گا۔" اس نے رپورٹوں کے ڈھیر کی طرف اشارہ کیا۔ "میں نے لمبی مسافت اسی لئے چنی ہے کہ مجھے بندھے ہوئے ہاتھوں اور مصلحتوں کے جال میں پھنسی ہوئی حکومت نہیں چاہئے۔ مجھے پتہ ہے اس میں بہت وقت لگے گا۔ مجھے اگر آج دو سال مل جائیں' مکمل اختیارات کے ساتھ' تو میں اس ملک کا نقشہ بدل دوں گا۔ ورنہ جیسا آپ نے کہا ہے بہت دیر ہو جائے گی۔"

"میں آپ کو یہ دو سال کیسے دے سکتا ہوں؟" جلالی نے مذاق اڑانے کے انداز میں کہا۔ ایمان علی لانگ مارچ کی بات کر رہا تھا۔ اسے شارٹ کٹ نہیں چاہئے

تھا۔ پھر بھی شارٹ کٹ کی تلاش میں تھا۔ جلالی الجھن میں پڑ گیا۔

"آپ سے کل اچانک ملاقات نہ ہوتی پھر بھی میں آپ سے ملنے کی کوشش کرتا۔" ایمان علی نے فائلوں کے ڈھیر سے ایک فائل نکال کر کھول لی تھی اور بے خیالی میں اس کے ورق پلٹ رہا تھا۔ جلالی دور سے بھی دیکھ سکتا تھا کہ اس فائل میں کیا ہے۔ اس کی الجھن حیرت میں بدل گئی۔

"اس فائل میں آپ کے وہ سب کالم ہیں جو آپ نے حال ہی میں لکھنے شروع کئے ہیں۔ آپ کی ان پرانی خبروں کے تراشے بھی ہیں جن کی وجہ سے آپ اپنے ایک دوست کے کہنے کے مطابق اخباری مارکیٹ کی بہت "ہاٹ پراپرٹی" بن گئے تھے۔" ایمان علی مسکرایا لیکن جلالی خاموش رہا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ ایمان علی کے اس ابتدائیے کا اختتام کہاں ہو گا۔

"آپ کی دنیا کے کئی سینئر لوگ میرے دوست ہیں۔" ایمان علی کہہ رہا تھا۔ "ان سب کو یقین ہے کہ آپ کو طاقت کے اہم ستونوں کی حمایت حاصل ہے۔ آج کل آپ کے کالموں کا بہت چرچا ہے۔ ان کالموں میں حکومت پر کڑی نکتہ چینی ہوتی ہے اور یہ انگریزی کے سب سے زیادہ چھپنے والے اس معتبر اخبار میں چھپتے ہیں جس کی اپنی پالیسی بہت نیوٹرل ہے۔ سب کا خیال ہے آپ کو آزادی برتنے کا لائسنس ملا ہوا ہے تاکہ آپ کے اعتبار کو مستحکم رکھا جائے اور جب بھی ضرورت ہو آپ کے ذریعے اسٹیبلشمنٹ کی لائن چلا دی جائے۔ کون ہے جسے آپ کے لکھے ہوئے لفظ پر یقین نہیں آئے گا۔"

"آپ کے وہ سارے دوست خود اسٹیبلشمنٹ کے آدمی ہیں۔" جلالی سے اپنا غصہ برداشت نہ ہو سکا۔ "سچ لکھنے کے لئے لائسنس کی نہیں جرأت کی ضرورت ہے۔ لیکن ہمارے اور آپ کے یہ دوست پناہ حاصل کئے بغیر سچ لکھنے کی ہمت نہیں کرتے۔ سب نے اپنی پارٹی چن لی ہے۔ وہ ایک پارٹی کی پناہ میں رہ کر دوسری پارٹی کی حکومت کے خلاف لکھنے کو جہاد سمجھتے ہیں اور جب ان کی حمایت کردہ پارٹی کی حکومت آتی ہے تو اسٹیبلشمنٹ کا حصہ بن جاتے ہیں۔ یہ معذرت خواہوں کا گروہ ہے۔ جاہلوں

کا ٹولہ جو خود کو عقل کل سمجھنے لگا ہے۔"

"ان کا خیال ہے کہ آپ کا تعلق کسی نہ کسی ایجنسی سے ہے۔ وہ امریکی سی آئی اے سے لے کر نیول انٹیلی جنس تک، ملک کی ان تمام بڑی ایجنسیوں کے نام لیتے ہیں جو اس ملک کے سیاستدانوں کی ڈوریاں ہلاتی ہیں۔" ایمان علی نے جلالی کے غصے کو نظرانداز کر کے اپنی بات جاری رکھی۔

"اور آپ کا خیال ہے کہ میں ان ایجنسیوں سے کہہ کر آپ کو دو سال کے لئے اس ملک کا ٹھیکہ دلوا دوں تاکہ آپ اپنی ان رپورٹوں کے ذریعے اس ملک کی بیماریوں کو ٹھیک کر سکیں۔" جلالی کا لہجہ طنز میں ڈوب کر بہت کڑوا ہو گیا۔ "ایمان علی! آپ نے غلط آدمی کو چنا ہے۔ میں اگر ایجنسی کا آدمی ہوں تب بھی میرا ان پر اتنا اثر نہیں ہو سکتا کہ آپ کو حکومت دلوا سکوں۔ آپ اپنے ان صحافی دوستوں سے بات کیجئے جو صدر کے ساتھ غیرملکی دورے پر جانے کو صحافت کی معراج سمجھتے ہیں۔ جہاز کے سفر میں بہت وقت ہوتا ہے۔ وہ صدر سے ون ٹو ون ملاقات کر کے آپ کی سفارش کر سکتے ہیں۔"

"مجھے کسی سفارش کی ضرورت نہیں ہے۔" ایمان علی نے غصے سے کہا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ جلالی نے سوچا اب اٹھ جانا چاہئے ورنہ بات بڑھ جائے گی۔ لیکن ایمان علی نے حیرت انگیز طور پر اپنے غصے پر قابو پا لیا۔

"صدر کے ساتھ ون ٹو ون میں بھی کر سکتا ہوں۔ کئی بار ان کے ساتھ شکار کھیل چکا ہوں۔ وہ آج بھی چاہتے ہیں کہ میں ان کے ساتھ شکار پر جاؤں۔ لیکن مجھے سرکاری خرچ پر اور بیہوش پرندوں کا شکار پسند نہیں ہے۔" جلالی کو پتہ تھا ایمان علی غلط نہیں کہہ رہا۔

"جن دوستوں پر آپ طنز کر رہے ہیں ان کا خیال ہے ایک فارن پوسٹنگ کا انعام آپ بھی حاصل کر چکے ہیں۔" ایمان علی نے مسکرا کر کہا اور جلالی کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ اس نے سوچا وہ کسی کو یقین نہیں دلا سکے گا کہ یہ غیرملکی پوسٹنگ انعام نہیں اس کی سزا تھی۔

"میری بے تکلفی آپ کو بری لگی ہو تو آئی ایم ساری۔" ایمان علی کے لہجے میں خلوص تھا۔ "میں نے آپ کو وہ باتیں بتائی ہیں جو میں نے سنی ہیں۔ آپ کے بارے میں میری بھی یہی رائے ہوتی تو میں آپ کو ناشتے پر نہیں بلاتا۔" ایمان علی ایک بار پھر فائل پر نظریں مرکوز کر کے ورق پلٹنے لگا۔

"میں نے آپ کے کالم بار بار پڑھے ہیں۔ انہیں لکھنے والا کسی کا ایجنٹ نہیں ہو سکتا۔ آپ اس درد کی شدت کو محسوس کرتے ہیں جس میں یہ ملک مبتلا ہے۔ آپ کو بھی شاید امید کی تلاش ہے۔ میں تم سے اسی درد اور امید کا رشتہ قائم کرنا چاہتا ہوں۔" ایمان علی نے تکلف کی دیوار ایک دم ہی گرا دی۔ جلالی اب بھی کچھ نہیں بولا، بس خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ ویسے بھی وہ بولنے نہیں سننے آیا تھا۔

"نیا پاکستان بنانے کے لئے ان رپورٹوں پر سارا کام دنیا بھر میں پھیلے ہوئے میرے ان دوستوں نے کیا ہے جو اپنے اپنے شعبے کے ماہر ہیں۔" ایمان علی نے اپنی ٹانگیں پھیلاتے ہوئے کہا۔ "وہ سب بھی درد اور امید کے رشتے کی اسی زنجیر میں بندھے ہوئے ہیں۔ میرے کچھ مقامی مددگار بھی ہیں۔ مجھے جو حقائق اور اعداد و شمار چاہئیں وہ میرے یہی مقامی مددگار فراہم کرتے ہیں۔ وہ سب بیورو کریسی کے بڑے لوگ ہیں۔ لیکن حکومت کے ڈر سے وہ مجھ سے چھپ کر ملتے ہیں۔ میرے کانوں میں سرگوشی کر کے چلے جاتے ہیں۔ میں نے اسٹیبلشمنٹ کے ان بازیگروں سے تمہارے بارے میں پوچھا تھا۔" جلالی اچانک سنبھل کر بیٹھ گیا۔ کیا ایمان علی کو پتہ تھا؟ کیا وہ اقتدار مافیا کے بارے میں جانتا تھا؟

"ان کا بھی یہی خیال ہے کہ تمہاری پہنچ بہت اعلیٰ ذرائع تک ہے۔ ان ذرائع تک جہاں میرے دوستوں کی بھی پہنچ نہیں ہے۔" ایمان علی پیر سکیڑ کر میز پر آگے جھک آیا۔ وہ اب براہ راست جلالی کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

"تمہیں پریس اتاشی بنا کر ہنگری بھیجنے کے احکامات راتوں رات آئے تھے۔ کسی کو نہیں پتہ کہاں سے۔ وزیراعظم ہاؤس کو بھی نہیں پتہ تھا۔ وزیراعظم کی منظوری تمہارے ہنگری پہنچنے کے بعد حاصل کی گئی تھی۔ انفارمیشن منسٹر نے سخت احتجاج کیا

تھا۔ مسئلہ کابینہ میں بھی اٹھایا تھا۔ لیکن عامر نذیر کچھ نہیں کر سکا تھا۔ عامر نذیر کی حکومت جانے کے بعد تمہاری برطرفی کا نوٹس بھی جاری ہوا تھا۔ لیکن دو دن میں تمہاری بحالی کے نئے احکامات جاری ہو گئے۔ اس دفعہ بھی وزیراعظم ہاؤس کو نہیں پتہ تھا۔ پھر تم اچانک واپس آ گئے۔ تمہاری واپسی بھی سرکاری ضابطوں اور احکامات کے بغیر ہوئی تھی۔" ایمان علی پلکیں جھپکائے بغیر جلالی کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ "ذہین جلالی! تمہارے وہ ذرائع کیا ہیں جن کے سامنے ملک کا ہر وزیراعظم مجبور ہے؟" کمرے میں تھوڑی دیر کے لئے خاموشی طاری ہو گئی۔ چند لمحے اسی طرح گزر گئے۔ جلالی پہلے بھی خاموش تھا اب بھی خاموش رہا۔ ایمان علی کی نظریں اس کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔ جلالی کچھ دیر بعد اٹھ کھڑا ہوا۔

"مجھے اجازت دیجئے۔ آپ کی فلائٹ کا وقت ہونے والا ہے۔"

"آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا؟" ایمان علی پھر تم سے آپ پر آ گیا۔

"ضرورت نہیں ہے۔ آپ اپنے اخباری دوستوں سے پوچھئے گا' وہ آپ کو بتائیں گے کہ صحافی کبھی اپنا ذریعہ نہیں بتاتے۔"

"یہ صحافتی ذرائع کا معاملہ نہیں ہے۔ آپ سرکاری ملازم بن کر گئے تھے۔ صحافی بن کر نہیں۔"

"میں کیا بن کر اور کہاں گیا تھا یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ آپ حکومت میں نہیں ہیں اس لئے آپ کو پوچھنے کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ جب آپ کی حکومت آ جائے تو پھانسی پر چڑھا دیجئے گا۔"

غصے سے ایمان علی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ لیکن وہ آہستہ آہستہ معمول پر آ گیا اور بے ساختہ ہنسنے لگا۔

"میرے دوست سچ کہتے ہیں کہ میں کبھی سیاستدان نہیں بن سکوں گا۔" ایمان علی نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "مجھے آپ کے ذاتی معاملات نہیں کریدنے چاہئیں۔ آئی ایم ساری۔" اس نے تیسری بار معذرت طلب کی۔ "آئیے' میں آپ کو

دروازے تک چھوڑ آؤں۔ میری فلائٹ کا وقت واقعی قریب آ گیا ہے۔"

دونوں کچھ کہے بغیر باہر گیٹ تک آ گئے۔ ایمان علی نے جاتے جاتے ایک کوشش اور کی۔

"آپ اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ آپ کے ذرائع بہت....."

"ذرائع ہر صحافی کے ہوتے ہیں۔" جلالی نے بہت نرمی سے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "خبریں وحی بن کر نازل نہیں ہوتیں۔ ان کے لئے ذرائع تلاش کرنے پڑتے ہیں۔ وہ ذرائع میرے بھی ہیں۔ لیکن خبروں کے ذرائع سے ہمارا رشتہ فاعل و مفعول کا نہیں ہوتا۔ سب کی اپنی اپنی وجوہات ہوتی ہیں۔ کوئی دوستی میں کوئی ڈینگیں مار کر اپنی انا کو تسکین دینے اور کوئی ہمیں استعمال کرنے کے لئے ہماری خبروں کا ذریعہ بنتا ہے۔ ان کی اپنی جو بھی وجوہات ہوں' وہ ہماری بات ماننے کے پابند نہیں ہوتے۔ نہ ہم سے رہنمائی چاہتے ہیں۔"

"مجھے پتہ ہے۔" ایمان علی نے بھی جلالی جیسے ہی نرم لہجے میں کہا۔ "میں آپ سے یہ نہیں کہتا کہ آپ اپنے ذرائع سے میری سفارش کریں۔ اقتدار کی راہداریوں میں' میں بھی بلا روک ٹوک جا سکتا ہوں لیکن اس طرح سب کو غلط سگنل ملیں گے۔ طاقت کے سارے ستون "اسٹیٹس کو" اپنے سر پر سنبھالے کھڑے ہیں۔ اس لئے کوئی فائدہ بھی نہیں ہو گا۔ آپ کی ان طاقتوں تک رسائی ہے تو کوئی ایسا ذریعہ ڈھونڈیئے جو درد اور امید کے رشتے کا ساتھی بن سکے۔ کوئی ایسا ہو تو میں خود اس سے مل کر اسے سمجھانے کے لئے تیار ہوں کہ انہوں نے آنکھیں نہیں کھولیں تو نہ چھت رہے گی اور نہ ستون!"

"آپ پانی میں چاند پکڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔" جلالی نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

"تم چاند ڈھونڈ کر لاؤ میں راکٹ لے کر آؤں گا۔" ایمان علی نے ہنستے ہوئے اسے بہت گرمجوشی سے خدا حافظ کہا۔

واپس جاتے ہوئے جلالی اقتدار مافیا کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ٹھگوں کے

ٹولے کو اگر ایمان علی کے نئے پاکستان کے بارے میں معلوم ہو جائے تو وہ اسے صفحۂ ہستی سے غائب کر دیں گے۔

جلالی جب اسلام آباد آیا تھا تو اس نے سوچا تھا کہ وہ دو روز وہاں رہ کر واپس چلا جائے گا۔ لیکن کئی دنوں تک اس کی واپسی ممکن نہ ہو سکی۔ مرینہ شاہ نے اپنی ناف میں جو بالی پہنی تھی وہ جلالی کے پاؤں کی زنجیر بن گئی تھی۔ اسلام آباد کا ہر دن مرینہ کے ساتھ بہت مصروف گزرا۔ جانے سے پہلے اس نے آنکھوں سے آخری سوئی بھی نکال دی تھی۔ چہرے اور آنکھوں سمیت پورا پورٹریٹ تیار کر لیا تھا۔ اب نواب ٹن اسے سویڈش مصور سے تشبیہ نہیں دے سکتا تھا۔

جس دن وہ ایمان علی سے ملا تھا اسی رات مرینہ کے ساتھ میریٹ میں ڈنر کیا تھا۔ جلالی کا خیال تھا وہ کسی خاموش ریسٹورنٹ کے نیم تاریک گوشے میں ایک دوسرے کے چہرے پر موم بتی کی روشنی کا رقص دیکھیں گے۔ لیکن مرینہ بہت جوشیلی ہو رہی تھی۔ اسے میریٹ ہوٹل کے چمکدار' کشادہ اور لوگوں سے بھرے ہوئے کافی شاپ میں بیٹھنا پسند تھا۔ پہلی ہی ملاقات میں ایک رومان پرور ماحول میں بیٹھ کر ڈنر کرنے سے گریز کرنے کی وجہ جلالی کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ وہ شاید محتاط رہنا چاہتی تھی۔ لیکن میریٹ میں بیٹھ کر کھانے کا مطلب پورے شہر میں اپنے تعلقات کے اشتہار بانٹنا تھا۔ جلالی اسلام آباد میں نہیں رہتا تھا پھر بھی کئی جاننے والوں سے ٹکراؤ ہوا تھا۔ اور مرینہ کو تو سب ہی جانتے تھے۔ کئی لوگ تو قریب آ کر بہت تپاک سے ملے۔ کسی نے اپنی میز سے بیٹھے بیٹھے ہاتھ یا سر ہلا کر شناسائی ظاہر کی تھی۔ جلالی حیران تھا کہ مرینہ کو اس طرح اس کے ساتھ اکیلے دیکھے جانے کی ذرا بھی پرواہ نہیں تھی۔ وہ بات بات پر قہقہہ لگا رہی تھی۔ اس کے انگ انگ سے خوشی پھوٹ رہی تھی۔ کیا واقعی اسے جلالی کا ساتھ اتنا خوشگوار لگا تھا؟ یہ سوچ کر جلالی کے دل میں بھی لڈو پھوٹنے لگے۔

ڈنر کے بعد وہ پان کھانے آبپارہ گئے۔ مرینہ اپنی گاڑی خود ڈرائیو کر کے لائی

تھی۔ پان کی دکان پر بہت سے لوگ جمع تھے۔ کئی گاڑیاں پان لینے کے انتظار میں کھڑی تھیں۔ مرینہ نے گاڑی روکتے ہی اتنی بار ہارن بجائے کہ سب کی توجہ اس کی طرف ہو گئی تھی۔ وہاں بھی کئی جاننے والے موجود تھے۔ پان والا پان کی پڑیاں سنبھالے اپنی گدی سے کود کر ان کی گاڑی کی طرف آیا۔

"بیگم صاحب، بہت دنوں بعد آئیں۔" پان والے نے گاڑی کے اندر جھانکتے ہوئے کہا۔

"شمشاد صاحب کو ڈھونڈ رہے ہو؟ ان کی چھٹی ہو گئی۔ ان سے ملو، یہ جلالی صاحب ہیں۔ پاکستان کے سب سے بڑے صحافی۔" جلالی خواہ مخواہ شرمندہ ہونے لگا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ تصحیح کرتا مرینہ شاہ ایکسیلیٹر دبا چکی تھی۔

"کل صبح چھ بجے تمہیں لینے کے لئے ڈرائیور کو بھیجوں گی۔ تم تیار رہنا۔" مرینہ نے جلالی کو اس کے ہوٹل پر اتارتے ہوئے کہا۔

"صبح چھ بجے؟ کیا مجھے فجر کی نماز پڑھنی ہے؟"

"میں واک پر جاتی ہوں۔ تم دیکھ کر حیران رہ جاؤ گے۔ پورا اسلام آباد دوڑنے اور چہل قدمی کرنے وہیں آتا ہے۔ تمہیں ایک سے ایک وی آئی پی وہاں مل جائے گا۔ جس کو چاہو روک کر انٹرویو کر لو اور تازہ آکسیجن مفت میں۔"

"تمہیں پتہ ہے میں یہاں انٹرویو کرنے نہیں آیا۔"

"انٹرویو مت کرنا۔ میرا ہاتھ پکڑ کر چہل قدمی کرنا۔" اس نے ایک ادا سے مسکراتے ہوئے کہا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔ جلالی کچھ دیر اسی طرح کھڑا اپنے دل کی دھڑکنوں کو سنبھالتا رہا۔

"مرینہ نے مذاق نہیں کیا تھا۔ جلالی کے ساتھ چہل قدمی کرتے ہوئے اس نے ہاتھ تھام لیا تھا۔ جلالی جھینپا تھا لیکن اس نے ہاتھ نہیں چھڑایا۔ وہاں بھی سب ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ بھاگتے اور تیز تیز چلتے لوگوں نے معنی خیز نظروں سے انہیں دیکھا تھا۔ جو سلام دعا کرنے رکے تھے ان سے مرینہ نے جلالی کا بڑھا چڑھا کر تعارف کرایا تھا۔ جلالی شرمندہ ہونے کے سوا کچھ نہ کہہ سکا تھا۔ ہوا خوری کے بعد وہ اسے

اپنے گھر لے کر آئی۔ اس کے ماں باپ پشاور گئے ہوئے تھے اس لئے اکیلی تھی۔ ملازمہ نے آملیٹ اور پراٹھے کا ناشتہ کرایا۔ اس دوران مرینہ کالج جانے کے لئے تیار ہو کر آ گئی تھی۔

"رات کو ڈنر کہاں کراؤ گے؟"

"جہاں کہو!"

"میں رات کو آٹھ بجے تمہیں لینے آؤں گی۔" اس نے اٹھلا کر کہا۔ جلالی شہید ہوتے ہوتے بچا۔ مرینہ کا ڈرائیور جلالی کو اس کے ہوٹل چھوڑ آیا۔

اس رات بھی انہوں نے بہت پرہجوم ریسٹورنٹ میں کھانا کھایا۔ "جہانگیر" کی دونوں منزلوں کی ہر میز بھری ہوئی تھی۔ لیکن وہ ایک مشہور وفاقی وزیر کی بیوی رہی تھی۔ پانچ منٹ کے اندر اندر ان کے لئے ایک میز تیار کر دی گئی۔ کھانے کے بعد وہ ٹہلتے ہوئے کافی پینے نزدیک کے ایک کیفے تک گئے۔ ہر میز اور ہر قدم پر جاننے والے ملے اور سب کو پاکستان کے سب سے بڑے صحافی سے تعارف حاصل ہوا۔ جلالی نے اب شرمندہ ہونا چھوڑ دیا تھا۔ اسے یقین تھا اسلام آباد میں اب تک اس کے اور مرینہ کے عشق کے چرچے ہو چکے ہوں گے۔ لیکن وہ سوچ رہا تھا جو عشق زبان زد عام ہو گا وہ خود ان کے لبوں پر کب آئے گا؟

دوسرے دن اسلام آباد کے پریس کلب میں دوستوں سے ملنے گیا تو اسے دیکھ کر کئی آنکھیں معنی خیز انداز میں مسکرائیں۔ "کیا آپ یہیں رہیں گے۔ کراچی واپس نہیں جائیں گے؟" ایک نے پوچھا۔ جو بے تکلف تھے انہوں نے کانوں میں سرگوشی کی۔ "بہت شہرہ ہے۔ کیا سچ مچ اسلام آباد فتح کر لیا ہے؟" جلالی نے کسی کی بات کا جواب نہیں دیا۔ بس مسکرا کر رہ گیا۔

اس رات مرینہ نے راولپنڈی جا کر انٹرکان میں ڈنر کرنے کا پروگرام بنایا تو جلالی دل ہی دل میں مسکرایا۔ ان کے عشق کی شہرت اسلام آباد کی حدود سے نکل کر جی ایچ کیو تک پہنچنے والی تھی۔ اس کا یہ خیال بھی غلط نہیں نکلا۔ انٹرکان میں کسی فوجی افسر کی شادی کا استقبالیہ تھا۔ لابی میں مرینہ کے جاننے والے بے شمار لوگ ملے۔

جلالی کو تعارف در تعارف کے کئی مرحلوں سے گزرنا پڑا۔ لیکن ان کا ڈنر پر سکون تھا۔ انہیں نسبتاً تاریک گوشے میں ایک میز ملی تھی۔ موم بتی کے شعلے کی روشنی مرینہ کے چہرے پر رقص کر رہی تھی۔ رنگ بدلتے تو اس کا چہرہ ہی نہیں پوری شخصیت بدل جاتی۔ وہ اس رات جلالی کو بہت اداس سی لگی۔ بہت تھکی تھکی سی۔

ڈنر ختم کر کے وہ ہوٹل سے باہر نکلے تو مرینہ نے لابی میں کسی جاننے والے کو ڈھونڈنے یا ہیلو ہائے کرنے کی کوشش نہیں کی۔ راولپنڈی سے اسلام آباد کے سفر کے دوران دونوں پچھلی نشست پر درمیان میں ذرا فاصلہ رکھ کر بیٹھے تھے۔ گاڑی کھلی سڑک پر آئی تو ڈرائیور نے ٹیپ آن کر دیا۔ گاڑی میں امیتابھ بچن والے گانے کی آواز بھر گئی۔ "کبھی کبھی میرے دل میں خیال آتا ہے....."

"گلاب خان! ٹیپ بند کر دو۔" مرینہ نے چونک کر کہا۔ گلاب خان نے ٹیپ بند کر دیا لیکن سامنے لگے ہوئے آئینے کے ذریعے پیچھے بیٹھی بیگم صاحبہ کو حیرت سے دیکھنے لگا۔ آج بیگم صاحبہ کو کیا ہو گیا تھا' ڈرائیور نے سوچا۔ مرینہ اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں الجھائے انگوٹھوں کو ایک دوسرے سے رگڑ رہی تھی۔ جلالی نے اس کا ایک ہاتھ اس کے دوسرے ہاتھ کی گرفت سے آزاد کرا کے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ جلالی کی ماں ہمیشہ کہا کرتی تھی کہ ہاتھوں کا ایک دوسرے سے مسلنا نحوست کی نشانی ہے۔ مرینہ نے کوئی مدافعت نہیں کی۔ بس ایک نظر کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھا اور نشست سے سر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔ جلالی راستے بھر اسی طرح اس کا ہاتھ تھامے بیٹھا رہا۔ ایسا لگا تھا جیسے چاندنی ہتھیلی کے راستے اس کے بدن میں اترتی جا رہی ہو۔ دونوں کے درمیان فاصلہ اسی طرح برقرار تھا۔ ڈرائیور عقبی آئینے میں ایک دوسرے سے الگ تھلگ اور خاموش بیٹھے ہوئے مسافروں کو تشویش بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ جلالی کو ہوٹل اتارتے ہوئے بھی مرینہ میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ بس آنکھیں کھل گئی تھیں۔

"کل کا پروگرام یاد ہے؟" اس نے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ لا کر پوچھا۔ جلالی سر ہلاتا ہوا گاڑی سے اتر گیا۔ وہ اس وقت تک کھڑا رہا جب تک گاڑی ڈرائیو

وے سے نکل کر آنکھوں سے اوجھل نہیں ہو گئی۔ جلالی کو یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ مرینہ نے کل کی طرح جاتے ہوئے اسے پلٹ کر دیکھ کر ہاتھ نہیں ہلایا تھا۔ لیکن پھر اس نے اپنا وہ ہاتھ دیکھا جس میں مرینہ کا ہاتھ تھا۔ ہتھیلی پر ابھی تک چاند چمک رہے تھے۔ جلالی کی مایوسی دور ہو گئی۔

دوسری طرف گاڑی کے ڈرائیو وے سے نکلتے ہی مرینہ نے ڈرائیور سے کہا "گلاب خان ٹیپ آن کر دو۔" گاڑی میں مکیش کی آواز بھر گئی۔ کبھی کبھی مرے دل میں خیال آتا ہے...... "کیسے اترے گا یہ بھوت....." اس نے سوچا اور ایک بار پھر نشست سے سر ٹکا کر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

ان کی کار مری کے پیچدار پہاڑی راستے پر چکر کاٹتی ہوئی اوپر چڑھ رہی تھی۔ جلالی کبھی کبھی کھڑکی سے دوپہر کی سنہری دھوپ میں چمکتے ہوئے پہاڑ اور طویل قامت درختوں کو دیکھتا لیکن پھر فوراً" آنکھیں میچ لیتا۔ اسے پہاڑ کے کنارے پر بنی گول چکراتی ہوئی پگڈنڈیوں جیسی سڑک کو دیکھ کر خوف آتا تھا۔ کہیں کوئی موڑ کٹنے سے رہ گیا اور گاڑی پہاڑوں کی ڈھلانوں میں لڑھکتی ہوئی میلوں دور نیچے گر پڑی تو؟ "گر پڑے!" اس نے ایک بار کندھے جھٹک کر سوچا۔ عشق کی ایک ناتمام کہانی امر ہو جائے گی۔ "کیا اسے واقعی عشق ہو گیا ہے؟" اس نے مسکرا کر مرینہ کی طرف دیکھا جو گاڑی میں لگے ہوئے ٹیپ کی موسیقی میں گم تھی۔ گلاب خان بھی عقبی آئینے میں انہیں دیکھے بغیر موسیقی کا مزا لے رہا تھا۔ بیگم صاحبہ نے رات گاڑی سے اترتے ہوئے "کبھی کبھی" کا وہ کیسٹ اس سے لے کر پھینک دیا تھا جسے سن سن کر گلاب خان بیزار ہو گیا تھا۔ اسے آج اپنی پسند کا فرمائشی پروگرام چلانے کی پوری اجازت تھی۔ اس نے عیسیٰ خیلوی کے کیسٹوں کا ذخیرہ گاڑی میں منتقل کر دیا تھا اور سن کر جھوم رہا تھا۔

"سجن دی دید نہ تھئی۔ تے ساڈی عید نہ تھئی۔"

کسی موڑ پر جب سامنے سے آتی ہوئی گاڑی یا کسی بس کو بچاتے ہوئے گاڑی

کے ٹائر سڑک کے باہری کنارے کو چھونے لگتے اور گلاب خاں اسی رفتار اور بے فکری سے موڑ کاٹتا تو ایک لمحے کے لئے جلالی کا سانس رک جاتا۔ جلالی کو یقین تھا عیسیٰ خیلوی کا گانا آج ان کی جان لے کر رہے گا۔ اس سفر کے لئے تو وہی کیسٹ موزوں تھا۔ کبھی کبھی مرے دل میں.......

مرینہ شاہ اسے پریشان دیکھ کر ہنس پڑی اور اس کے ہاتھ کو تھپکنے لگی جو نشست پر دراز تھا۔ جلالی نے باہر کی طرف دیکھنا بند کر دیا اور اپنی تمام توجہ مرینہ کی طرف مبذول کر دی۔ وہ اب رات کی طرح تھکی تھکی سی' الجھی ہوئی یا اداس نہیں تھی۔ وہی پہلی جیسی مرینہ شاہ تھی۔ اٹھلاتی' شوخیاں کرتی اور ہنستی ہوئی۔ آنکھوں میں ناچنے والی شرارت بھی واپس آ گئی تھی۔ آج وہ ساڑھی پہنے ہوئے تھی۔ ہنگری کے سفارتخانے میں جب وہ پہلی بار ملی تھی اس کے بعد سے جلالی نے اسے ساڑھی میں نہیں دیکھا تھا۔ جلالی سے ملنے وہ ہمیشہ شلوار جمپر پہن کر آئی تھی۔ آج اس نے پہلی جیسی شوخ اور مختصر نہیں' ہلکے ہلکے بھورے رنگ کی سادہ سی ساڑھی پہنی تھی جو بہت قاعدے سے بندھی ہوئی تھی۔ بلاؤز بھی آستینوں والا تھا۔ لیکن بلاؤز اور ساڑھی کے درمیان چار انگلی چوڑی پیٹ کی پٹی پر کسی کپڑے کا سایہ نہ تھا۔ ناف میں پروئی ہوئی موتیوں والی بالی مسکراتی ہوئی صاف نظر آ رہی تھی۔ جلالی کے جسم میں آج کوئی بجلی نہیں دوڑی۔ اس نے اپنی نظریں بلند رکھی تھیں۔ وہ مرینہ کے پیٹ کو نہیں اس کے چہرے کو گھور رہا تھا۔ آج اس نے پہلی بار مرینہ کے چہرے پر اپنی نگاہوں کا اثر دیکھا تھا۔ مرینہ کے رخساروں پر گلاب آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔

آج چھٹی کا دن تھا اور انہوں نے بھوربن کے پرل کانٹی نینٹل میں لنچ کرنے کا پروگرام بنایا تھا۔ مرینہ نے کہا تھا واپسی میں مری کی سیر کریں گے۔ جلالی کل صبح کراچی واپس جا رہا تھا اس لئے وہ دن کا بیشتر حصہ ساتھ گزارنا چاہتے تھے۔ بھوربن پہنچتے پہنچتے ایک بج گیا۔ لنچ کا وقت ہو گیا تھا لیکن انہیں بھوک نہیں تھی۔ گاڑی میں بیٹھے بیٹھے گھٹنے بھی تھک گئے تھے۔ وہ ہوٹل کے عقب میں پھیلے ہوئے باغیچے کی روشوں پر ٹہلتے ہوئے گھٹنے سیدھے کرنے لگے۔ بادلوں نے سورج کو اپنی آغوش میں

سمیٹ لیا تھا۔ سردیوں کا موسم نہیں تھا پھر بھی ہلکی ہلکی خنکی تھی۔ سامنے دور تک پھیلے ہوئے پہاڑ سر اٹھائے کھڑے تھے۔ ایک نیا نیا شادی شدہ جوڑا چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ٹہل رہا تھا۔ لڑکی نے ہرے رنگ کا بھاری کام والا غرارہ پہنا ہوا تھا' دوپٹہ بھی گوٹے ستاروں والا تھا جو اس کے جسم اور سر کو ڈھانپے ہوئے تھا۔ ناک میں بڑا سا دائرہ بناتی ہوئی نتھ تھی۔ کانوں' گلے اور ہاتھوں میں سونا بھرا ہوا تھا۔

"آج کل اکثر جوڑے ہنی مون منانے اسی ہوٹل میں آتے ہیں۔" مرینہ نے نئی دلہن کو دلچسپی سے دیکھتے ہوئے بتایا۔

"تم بھی یہیں آئی تھیں؟"

"اس زمانے میں یہ ہوٹل نہیں بنا تھا۔ ہوتا بھی تو نہیں آتے۔ ہم فرانس گئے تھے۔" اس نے ایک ادا سے کہا اور یادوں میں کھو گئی لیکن پھر فوراً" ہی واپس آ گئی اور جلالی کو شوخ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔ "میں اب پکی نیشنلسٹ ہو گئی ہوں۔ اس بار اپنا ہنی مون یہیں مناؤں گی۔"

"تو آؤ چلیں۔"

"کہاں؟"

"وہ جو دور پہاڑ پھیلے ہوئے ہیں ان کی چوٹیوں پر۔ ابھی بادل ہٹیں گے تو دھوپ چاروں طرف سونا بکھیر دے گی۔ ہم اسے سمیٹ کر تمہارے لئے زیور بنائیں گے۔ سبز پتوں سے عروسی لباس بنا کر ان پر لال لال پھول ٹانکیں گے اور کسی گپھا کو اپنا ہنی مون سوئٹ بنا کر سو جائیں گے۔"

"سچ مچ! جلالی کیا تم واقعی اتنے رومینٹک ہو۔ کیا تم یہ سب کچھ کر سکتے ہو۔" وہ بچوں کی طرح خوش ہو کر بولی۔

"شاید یہ سب کچھ کرنا مشکل ہو۔ ایسا کرتے ہیں ہوٹل کی بوتیک سے شادی کا لباس خریدتے ہیں اور ہوٹل ہی میں ہنی مون سوئیٹ بک کرا لیتے ہیں۔"

"منہ دھو کر آؤ۔" اس کی شوخی پھر واپس لوٹ آئی۔

"منہ دھو کر یا وزیر بن کر۔" جلالی نے اپنے رومانس کا خود ہی قتل کر دیا۔

لیکن جملہ اچانک منہ پر آ گیا تھا۔ مرینہ کچھ نہیں بولی بس شکایت بھری نظروں سے دیکھا اور ہوٹل کی طرف چل دی۔

وہ ہوٹل میں داخل ہوئے تو ایک طرف سے لڑھکتے ہوئے آتے چودھری صاحب سے ٹکرا گئے۔ دوپہر کا وقت تھا پھر بھی ان کے منہ سے بھبکے اٹھ رہے تھے۔ آنکھیں بھی آدھی کھلی اور آدھی مچی ہوئی تھیں۔

''ذہین جلالی تو نے اب تک امید نہیں بدلی؟'' انہوں نے اپنے مخصوص لہجے میں اور ایک نظر مرینہ کو دیکھنے کے بعد کہا۔ ''ایک جگہ نہ کھڑا رہ۔ گھومتا رہ۔ گردش کر۔ گھل مل جا۔ نئی نئی امیدوں پر نظر نہ رکھ۔ اور بھی امیدیں ہیں۔ پورا جما بزار لگا ہے۔ چل کوئی نوی دکان ویکھ۔'' جلالی ہنسنے لگا۔ وہ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ چودہری صاحب کو ان کے ساتھی نے آواز دی اور وہ مزید کچھ کہے اور سنے بغیر چلے گئے۔

''چودہری صاحب غلط مشورہ نہیں دے رہے۔'' مرینہ نے ڈائننگ ہال میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

''کیا؟''

''میں نے تمہیں monopolise کر لیا ہے۔ تمہیں دوسروں سے بھی ملنا چاہئے۔''

''تم چودہری صاحب کو جانتی ہو؟'' جلالی نے اس کی بات کو نظرانداز کرتے ہوئے پوچھا۔

''اچھی طرح۔'' مرینہ نے سر ہلا کر کہا۔ ''چودھری صاحب انیس شمشاد کے بہت پسندیدہ صحافیوں میں سے تھے۔ کئی بار دعوتوں میں گھر بھی آ چکے ہیں۔ وہ مجھے نکی کہتے ہیں۔''

انہوں نے دور افتادہ کونے کی ایک میز منتخب کی تھی۔ مرینہ نے کسی جاننے والے کو دیکھنے' ڈھونڈنے یا کسی سے سلام دعا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ کسی طرف نظر کئے بغیر سیدھی میز پر آ گئی تھی۔ کھانے کے دوران جلالی اسے اپنے زمیندار بھائیوں' بھتیجوں اور بھتیجیوں اور نواب ٹن کے قصے سناتا رہا۔ مرینہ اسے اپنے باپ

اور بیمار خالہ کے بارے میں بتاتی رہی۔ اس کے باپ حکومت کے ایک بڑے عہدے سے چند سال پہلے ریٹائر ہوئے تھے۔ خالہ اس کالج کی پرنسپل تھیں جس میں مرینہ شاہ بھی پڑھاتی تھی لیکن اب بیماری کی وجہ سے وہ بھی ریٹائر ہو گئی تھیں۔ جلالی کو اس وقت پھر وہ بہت اداس سی لگنے لگی۔ کل رات کی طرح تھکی تھکی سی۔

گاڑی ایک بار پھر پہاڑی سڑکوں کے موڑ کاٹ رہی تھی۔ مری پہنچے تو شام کے سائے دراز ہو گئے تھے۔ سورج نے بادلوں کو دھکا دے کر اپنے سامنے سے ہٹا دیا تھا۔ لیکن دھوپ میں شدت نہیں تھی۔ بہت خوشگوار سی ٹھنڈک تھی۔ وہ مری کی مرکزی شاہراہ پر ٹہلتے اور خوش فعلیاں کرتے ہوئے ایک دوسرے پر جملے پھینکتے رہے۔ ایک بار سڑک سے ہٹ کر پگڈنڈی پر اتر گئے۔ چاروں طرف پھیلے ہوئے سناٹے اور فطری حسن کے نظاروں نے جو سحر قائم کر رکھا تھا اسے توڑے بغیر وہ بلا ارادہ ادھر ادھر بھٹک رہے تھے۔ پھر سائے گہرے ہونے لگے۔ ساڑھی کی وجہ سے مرینہ کو بھی کچے' پتھریلے' اونچے نیچے اور سرسبز راستوں پر چلنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ انہوں نے سڑک کے کنارے کافی بنوا کر پی اور بازار کی چھوٹی تنگ گلیوں میں داخل ہو گئے۔ مرینہ ہر ایک دکان پر شالیں اور کپڑوں کے ڈیزائن دیکھ رہی تھی۔ ایک سرخ کشمیری شال اسے بہت پسند آئی تھی۔ وہ دکاندار سے قیمت پر الجھتی رہی۔ لیکن اسے خریدنا نہیں تھی اس لئے وہ آگے بڑھ گئی۔

وہ کپڑوں' شالوں' میووں اور دستکاریوں کی زیر زمین دنیا سے باہر نکل کر آئے تو ڈوبتے سورج نے افق پر خون بکھیر دیا تھا۔ خنکی بڑھ گئی تھی۔ مرینہ نے سردی سے بچنے کے لئے دونوں بازو سینے پر لپیٹ لئے پھر بھی اسے ہلکی سی پھریری آ گئی۔ وہ خوانچے والے لڑکے سے ایک اور کافی بنوانے لگی اور جلالی ایک منٹ بعد واپس آنے کا کہہ کر دوبارہ دکانوں کی زیر زمین دنیا میں چلا گیا۔ واپس آیا تو مرینہ جلدی جلدی گرم کافی کے گھونٹ لے کر سردی بھگانے کی کوشش کر رہی تھی۔ جلالی نے اسے وہ لال شال اوڑھا دی جو مرینہ کو پسند آئی تھی لیکن اس نے خریدی نہیں تھی۔ وہ کچھ دیر کے لئے حیرت زدہ سی رہ گئی اور شال پر نگاہیں جمائے رہی۔

"تھینک یو۔" اس نے کچھ دیر بعد نظر اٹھا کر کہا اور شال کو کس کر اپنے جسم پر لپیٹتے ہوئے نظر جھکا لی۔ شال کا لال رنگ اس کے رخساروں پر بھی پھیل گیا تھا۔ اس کے جسم پر لپٹی ہوئی شال اور رخساروں سے لے کر دور شفق تک سرخ رنگ کی ایک زنجیر بن گئی تھی اور جلالی سوچ رہا تھا "مرینہ کو شرمانا بھی آتا ہے۔"

واپسی کے سفر میں پہاڑی راستے پر جو موڑ آئے انہوں نے جلالی کو خوفزدہ نہیں کیا۔ اترائی کا سفر اور اندھیرا تھا۔ تاریکی نے اس کے خوف کو چھپا لیا تھا۔ اندھیرا نہ ہوتا تب بھی اسے باہر دیکھنے کی مہلت نہیں تھی۔ مرینہ شاہ نے پہاڑی راستے پر آتے ہی آنکھیں بند کر کے اپنا سر اس کے کندھے پر ٹکا دیا۔ جلالی نے خود کار طریقے سے اپنا ہاتھ اس کے شانے پر دراز کیا تو وہ کسی سہمی ہوئی چڑیا کی طرح سمٹ کر اس کے اور قریب آ گئی اور سمٹ گئی۔ اسلام آباد تک دو گھنٹے کا سفر مرینہ نے بند اور جلالی نے کھلی آنکھوں سے خواب دیکھتے ہوئے گزارا۔ مرینہ کو شاید اس کی پرواہ نہیں رہی تھی کہ گلاب خاب عقبی آئینے میں انہیں دیکھ سکتا تھا۔ گلاب خان کو دیکھنے کی فرصت بھی نہیں تھی۔ اس کی آنکھیں سڑک پر جمی تھیں اور جذبات میں عیسیٰ خیلوی ہلچل مچائے ہوئے تھا۔ "میرے گیتاں دی رانی۔ شالا واڑھے جوانی۔"

اسلام آباد پہنچے تو مرینہ آخری خدا حافظ کہنے اور کافی پینے جلالی کے ساتھ اس کے کمرے میں آ گئی۔ جلالی نے کافی منگوانے کے لئے فون اٹھایا ہی تھا کہ اس نے جلالی کا ہاتھ پکڑ کر اسے روک دیا اور اسی طرح ہاتھ پکڑے پکڑے اس کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گئی۔

"تم مجھ سے شادی کرو گے؟" اس نے اپنی خوابناک آنکھوں سے جلالی کو دیکھتے ہوئے بیباکی سے کہا۔ جلالی کو لگا جیسے پوچھ رہی ہو "کافی پیو گے؟" وہ حیرت زدہ ہو کر کچھ دیر کے لئے گنگ ہو گیا۔ لیکن آہستہ آہستہ حواس واپس آ گئے۔

"سچ مچ یا صرف انیس شمشاد کو جلانے کے لئے!" جلالی کو اپنے لہجے پر افسوس ہوا۔ لیکن مرینہ میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

"پہلے میں نے بھی یہی سوچا تھا۔ اس نے اپنی صاف گوئی سے جلالی کو ایک بار

پھر حیران کر دیا۔" تمہاری نمائش اسی لئے کر رہی تھی کہ وہ آگ پر لوٹے اور بھاگ کر میرے پاس آ جائے۔ لیکن پھر عقل آ گئی۔ سایوں کے پیچھے بھاگنے سے کچھ نہیں ملے گا۔ پھر آہستہ آہستہ تم بھی دل میں بستے چلے گئے۔" اس نے جلالی کا بازو تھام کر آنکھیں اس کی آنکھوں میں ڈال دیں۔ "کہو نا۔ مجھ سے شادی کے لئے۔ کہو نا!" وہ بچوں کی طرح ضد کر رہی تھی۔

جلالی کچھ کہنے والا تھا کہ اس نے جلالی کے ہونٹوں پر اپنی انگلی رکھ دی۔

"ایسے نہیں۔ میری بالی کو تھام کر کہو۔" جلالی حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ "کیا وہ مذاق کر رہی تھی۔" لیکن وہ بے حد سنجیدہ تھی۔ جلالی نے اس کی ناف میں لٹکی ہوئی بالی کو اپنی دونوں انگلیوں سے تھام لیا۔ وہ ہنستی ہوئی دوہری ہو گئی تو جلالی نے جھینپ کر ہاتھ کھینچ لیا۔

"پیٹ کو مت ہاتھ لگاؤ۔ مجھے گدگدی ہوتی ہے۔" اس نے کہا اور پھر سیدھی ہو کر جلالی کو دعوت دیتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگی۔ جلالی نے ایک بار پھر اس کی بالی پکڑ لی۔ لیکن بہت احتیاط سے۔

"مجھے سچ مچ تم سے محبت ہو گئی ہے۔ آئی لو یو مرینہ۔ کیا تم واقعی مجھ سے شادی کرو گی۔" جلالی اظہار محبت کرتے ہوئے خود کو بہت احمق سا لگا۔

"یس یس یس!!!" مرینہ نے کہا اور اپنا چہرہ جلالی کے بالوں بھرے سینے سے رگڑنے لگی۔ جلالی نے اپنے دونوں ہاتھ اس کی کمر کے گرد لپیٹ کر اپنے اور قریب کر لیا۔ کمرے کی خاموشی میں پیار کی جلترنگ بجنے لگی تھی۔

"کوئی گانا سناؤ۔ اچھا سا پیار بھرا گانا۔" مرینہ نے چہرہ جلالی کے سینے سے ہٹا کر اس کے چہرے کے مقابل کرتے ہوئے کہا۔ اس کے سانسوں کی گرمی جلالی کے گالوں کو پگھلا رہی تھی، آنکھیں آنکھوں میں پیوست تھیں۔

"مجھے گانا نہیں آتا۔ غزل سنا سکتا ہوں۔ سنو گی؟" مرینہ نے سر ہلایا اور ایک بار پھر جلالی کے سینے سے سر ٹکا دیا۔ جلالی سرگوشی کرتے ہوئے اس کے کانوں میں غزل کا رس گھولنے لگا۔

کانوں میں رس گھولو نا

چپ چپ کیوں ہو بولو نا

ساون بیتا جائے ہے

آؤ مل کر رو لو نا

اپنے بس اک آنسو ہے

جیون ساگر دھو لو نا

کتنی لمبی راتیں ہیں

چہرہ اپنا کھولو نا

دل کا رستہ سیدھا سا

اس رستے پر ہو لو نا

پھولوں جیسے ہاتھوں سے

کانٹوں کو بھی تولو نا

غزل ختم ہوگئی لیکن اس کا ترنم پورے کمرے میں پھیلا ہوا تھا۔ مرینہ سحر زدہ ہو گئی تھی۔ اس نے چہرہ اٹھایا تو آنکھوں کے پپوٹے بہت بھاری ہو رہے تھے۔ پلکیں بہت مشکل سے اٹھ سکیں۔ جلالی کو بڈاپسٹ کے آنابار والی کلارا یاد آ گئی۔ وہی ادھ کھلے دائرہ بناتے اور رس ٹپکاتے ہوئے ہونٹ جو جلالی کے ہونٹوں سے چند انچ کے فاصلے پر تھے۔ لیکن جلالی کے آگے بڑھنے سے پہلے اس کے ہونٹ پیچھے ہٹ گئے۔ جلالی کے کھلے ہوئے ہونٹ دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ مرینہ نے سگریٹ کے پیکٹ سے ایک سگریٹ نکال کر جلالی کے ہونٹوں میں ٹھو دیا اور دوسرے سگریٹ سے اپنے ہونٹوں کو بند کر کے لائٹر جلانے کی کوشش کرنے لگی۔

تقریباً” ایک مہینے بعد ایک سادہ سی مختصر تقریب میں دونوں کی شادی ہو گئی۔

مسز چنائے

مسز چنائے نے ایک بڑا سا گھونٹ لے کر جام خالی کیا اور میز پر رکھ دیا۔ شیخ علی کا جام ابھی تک اس کے ہاتھوں میں تھا اور وہ چھوٹے چھوٹے گھونٹ لے رہا تھا۔ بحرین میں اپنے پینٹ ہاؤس کے ٹیرس میں کھڑے دونوں اپنی اپنی سوچوں میں گم تھے۔ مسز چنائے کی نظریں چاند پر تھیں۔ یہ خزاں کے موسم کا پہلا مکمل چاند تھا۔ بالکل گول اور چمکدار۔ شیخ علی کو خزاں کے موسم اور اس میں چمکتے ہوئے چاند سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ دور دمام کی روشنیوں کو دیکھ رہا تھا۔ مسز چنائے کی نظریں چاند سے ہٹ کر ساحل پر بنے ہوئے احمد کے قہوہ خانے کی روشنیوں کی طرف مڑ گئیں۔ ابھی صرف آٹھ بجے تھے۔ اس نے سوچا احمد کے ساحلی قہوہ خانے کی زیادہ تر بنچیں بھر گئی ہوں گی اور حقے کی گڑگڑاہٹ چڑھتے اترتے جہازوں کی آواز سے مل کر ایک عجیب طرح کی موسیقی پیدا کر رہی ہو گی۔ اس کا دل چاہا کہ وہ اڑتی ہوئی جائے اور ساحل کی ایک بینچ پر ڈیرہ جما دے۔

"تم نے مجھ سے شادی کر کے مجھ سے احمد کا قہوہ خانہ چھین لیا۔" مسز چنائے

نے مڑ کر شیخ علی کو دیکھتے ہوئے شکایت کی۔

"میں نے تمہیں جانے سے کب روکا ہے۔" شیخ علی نے چونک کر کہا۔ اسے پتہ تھا رنی کو ساحل کی کھلی ہوا میں احمد کے قہوے خانے کی بینچ پر بیٹھ کر حقہ پینا اور چڑھتے اترتے جہازوں کو دیکھنا کتنا پسند تھا۔ ایک رات وہ رنی کے لئے قہوہ خانے کو ساحل سے اٹھا کر اپنے دیوانئے میں لا چکا تھا۔ یہ وہی رات تھی جب رنی اس کی زندگی میں آئی تھی۔ اور اس طرح آئی تھی کہ اس کی زندگی کا ایک حصہ بن گئی تھی۔

"اگر جاؤں گی تو تمہارے ساتھ۔ اکیلی نہیں جاؤں گی۔ دنیا بھر میں اکیلی گھوم سکتی ہوں۔ لیکن بحرین میں تمہارے بغیر کہیں نہیں جاؤں گی۔"

"ٹھیک ہے کل چلیں گے۔ لیکن گیارہ بجے کے بعد۔" شیخ علی نے ہتھیار ڈال دیئے۔

"مجھے کرفیو لگوا کر جانا پسند نہیں ہے۔ احمد گیارہ بجے اپنا قہوہ خانہ بند کر دیتا ہے۔" مسز چنائے نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "میں کل اسلام آباد جا رہی ہوں۔ ایمان علی لندن سے واپس آ رہا ہے۔ اس نے اجلاس بلایا ہے۔ کوئی بہت اہم بات ہے۔"

"تم واقعی سنجیدہ ہو۔ میرا مطلب ہے ایمان علی اور اس کی سیاست میں۔"

"بہت! لیکن تمہیں شک کیوں ہے۔ تم پہلے بھی کئی بار پوچھ چکے ہو۔"

"مجھے ڈر لگتا ہے۔ سیاست بہت گندی چیز ہے۔ اور خاص طور پر پاکستان کی سیاست۔ تم پر چھینٹے آئے تو مجھے اچھا نہیں لگے گا۔"

"تم فکر مت کرو۔" رنی نے مسکرا کر کہا اور قریب جا کر شیخ علی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ "میں اپنا خیال رکھ سکتی ہوں۔ مجھے کچھ نہیں ہو گا۔"

"ایمان علی سے پوچھنا اگر میں کچھ کر سکوں تو۔ فنڈز کی ضرورت ہو تو میرے اکاؤنٹس سے نکلوا سکتی ہو۔ میں کچھ اہم لوگوں کو جانتا ہوں۔ ان سے ملوا سکتا ہوں۔"

"نہیں ڈارلنگ' ابھی پیسے ہیں میرے پاس۔ اور ہمیں اوپر سے اتر کر نہیں نیچے سے ابھر کر حکومت جیتنی ہے۔"

اسی وقت شیخ علی کی پرانی فلپائنی خادمہ مسز چنائے کے لئے تازہ جام بنا کر لے

آئی۔ رنی کے پہلے گھونٹ نے ہی ایک چوتھائی گلاس خالی کر دیا۔

"تم بہت پینے لگی ہو۔" شیخ علی نے اسے تشویش سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم بھی!" مسز چنائے نے کہا اور ہنسنے لگی۔ "خالص شوہروں کی زبان میں گفتگو کر رہے ہو۔ تمہیں تو میرے پینے کی ادا بہت پسند تھی۔"

"مجھے تمہاری ہر ادا پسند ہے۔ لیکن تمہاری صحت زیادہ اہم ہے۔ پچھلے سال ویانا میں تمہیں ڈاکٹروں نے خبردار کیا تھا۔"

"مجھے پتہ ہے۔" مسز چنائے نے دھیمی آواز میں کہا۔ "میں شراب نہیں پیتی۔ اب شراب مجھے پی رہی ہے۔ میں امریکہ کے کسی الکحل فری فارم میں دو تین مہینے رہ کر آؤں گی تو ڈرائی ہو جاؤں گی۔ اس وقت تک مجھے مت روکو۔"

"ڈرائی ہو کر تم بہت بور ہو جاؤ گی۔" شیخ علی مسکرایا۔

"تو کیا ہوا۔" رنی بھی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرائی۔ "تم نے تو شراب کا پورا بیرل چھپا کر رکھا ہوا ہے۔ ۱۹۹۰ء کی مس کولمبیا جو ریوڈی جنیرو میں تمہارے دیئے ہوئے فلیٹ میں رہتی ہے۔"

"آج بالکل بیویوں کے انداز میں بات کر رہی ہو۔" شیخ علی ہنس پڑا۔ "مجھے حیرت ہے کہ تم بھی حسد کر سکتی ہو۔"

"میں حسد نہیں کر رہی۔" مسز چنائے نے مصنوعی غصے سے کہا۔ "مجھے تم پر افسوس ہو رہا ہے۔ تم باسی حسینہ پر قناعت کر رہے ہو۔ تمہارے پاس بالکل نئے ماڈل کی مس کولمبیا ہونی چاہیے تھی۔ شیخ علی تمہارا معیار کچھ گرتا جا رہا ہے۔"

"وہ کسی بھی سال کی ہوں سب ایک سی ہیں۔" شیخ علی سنجیدہ ہو گیا۔ "سیکس شاپس میں سو ڈالر کی پلاسٹک کی گڑیا ملتی ہے۔ ہوا بھرنے سے وہ قد آدم عورت بن جاتی ہے جس میں بیٹری سے چلنے والے اعضاء بھی لگے ہوتے ہیں۔ اسے جب اور جس طرح چاہو استعمال کرو اور استعمال کے قابل نہ رہے تو پھینک دو۔ مقابلۂ حسن جیتنے والی حسینائیں بھی پلاسٹک کی انہیں گڑیوں کی طرح ہیں' Throw away dolls۔"

شیخ علی نے رنی کی کمر کے گرد بازو حمائل کر کے اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ "اصل چیز

تم ہو۔ ہمیشہ رہنے والی ایک حقیقت جو میرے دماغ کے خلیوں میں بس گئی ہے۔ تمہیں پتہ ہے مجھے تم سے کتنا پیار ہے؟"

"مجھے بھی تم سے اتنا ہی پیار ہے۔" رفی نے شیخ علی کے رخسار پر بوسہ دے کر اس کے بالوں میں انگلیاں پرو دیں۔ "کبھی کبھی مجھے لگتا ہے تمہارے اندر کسی عرب کی نہیں قدیم ہندوستانی عاشق کی روح بھری ہوئی ہے۔"

"قیس اور فرہاد راجستھانی نہیں تھے۔ وہ عربوں کے فوک ہیرو ہیں۔" شیخ علی نے سنجیدگی سے کہا اور رفی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اسی وقت فلپائنی خادمہ اپنی نظریں نیچی کئے ان کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔

"ٹھیک ہے، ہم آ رہے ہیں۔" شیخ علی نے اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی کہہ دیا۔ خادمہ تیزی سے واپس چلی گئی۔ "ہمارا مہمان نیچے پہنچ گیا ہے اور اب اوپر آنے ہی والا ہے۔" وہ رفی کا بازو پکڑے ہوئے ٹیرس سے اندر کشادہ لاؤنج میں آ گیا۔

"کیا یہ کوئی بہت اہم مہمان ہے جس کے لئے تم نے خاص طور پر مجھے بھی رکنے کے لئے کہا تھا؟" رفی نے پوچھا۔

"اسلحے کا بہت بڑا تاجر ہے۔ میرے ساتھ اس علاقے میں کاروبار کرنا چاہتا ہے۔ میں نے اس کے ایک سودے میں پیسے بھی لگائے ہیں۔ تمہیں اس لئے روکا ہے کہ اس سے مل سکو۔ وہ پاکستان کا بہت اہم آدمی ہے۔ کہتا ہے حکومت اس کی جیب میں پڑی رہتی ہے۔"

رفی ایک بار پھر ہنسنے لگی۔ شیخ علی نے اس کی طرف حیرت سے دیکھا تو اس نے ہنسنا بند کر دیا۔

"پاکستان میں کوئی ایسا نہیں ملا جو بہت اہم نہ ہو۔ سب کی جیب میں کوئی نہ کوئی رہتا ہے۔ حکومت، سیاستدان، وزیر، جنرل، عوام، سب کی بہت بڑی بڑی جیبیں ہیں۔"

"عارف علی ایک اہم شخص ہے۔ یہ کوئی اور نہیں میں کہہ رہا ہوں۔" شیخ علی نے ذرا ناگوار لہجے میں کہا۔

"مجھے پتہ ہے۔" رفی نے سنجیدہ ہو کر شیخ علی کا بازو تھپتھپایا۔ "اس کے اہم ہونے کا یہی ثبوت کافی ہے کہ تم نے اسے ملنے کا وقت اور کھانے کی دعوت دی ہے۔" شیخ علی کا موڈ ٹھیک ہو گیا۔

اسی وقت لفٹ کا دروازہ کھلا۔ یہ شیخ علی کے ذاتی استعمال کی لفٹ تھی جو صرف چودھویں منزل کے اس پینٹ ہاؤس کے لئے مخصوص تھی۔ لفٹ سے بہت دلکش شخصیت والا درمیانی عمر کا ایک آدمی برآمد ہوا جو شیخ علی ہی کی طرح اسمارٹ سا غیر رسمی لباس پہنے ہوئے تھا۔

"خوش آمدید شیخ عارف۔" شیخ علی نے آگے بڑھ کر اس کا استقبال کرتے ہوئے کہا اور پھر رفی سے اس کا تعارف کرانے لگا۔ "میری بیوی رفیقہ بٹ۔ میں انہیں رفی کہتا ہوں لیکن آپ کے ملک میں یہ آج بھی مسز چنائے کہلاتی ہیں۔"

"رسمیات کا تبادلہ کرتے ہوئے رفی اور عارف اپنی اپنی نشست پر بیٹھ گئے۔ شیخ علی بھی لفٹ سے واپس نیچے جاتے ہوئے ڈرائیور کو کچھ ہدایات دینے کے بعد ان کے ساتھ شامل ہو گیا۔ مسز چنائے عارف علی کو پاکستان میں اپنی مصروفیات کے بارے میں بتا رہی تھی۔ فلپائنی خادمہ انہیں ان کی منگائی ہوئی مشروبات پیش کرنے میں مصروف تھی۔

"پاکستان میں میں نے آپ کے بارے میں بہت سنا ہے۔" عارف علی رفی کو بتا رہا تھا۔ "لیکن آپ انداز اور لہجے سے بالکل انگلستان کی لگتی ہیں۔"

"میرا باپ پاکستانی تھا۔ مجھے میری انگریز ماں نے پالا ہے۔ دس سال پہلے اپنے مرحوم شوہر مسٹر چنائے کے ساتھ پاکستان منتقل ہوئی تھی، اس کے بعد سے اب وہی میرا وطن ہے۔" عارف علی نے اس طرح سر ہلایا جیسے اس کی وضاحت سے مطمئن ہو۔

"آپ کی دیواریں کچھ خالی خالی لگ رہی ہیں۔" اس نے شیخ علی کی طرف دیکھ کر کہا۔ اس کے انگریزی بولنے کا انداز اور تلفظ بہت اچھا تھا۔

"رفی نے گھر کی سجاوٹ بدل دی ہے۔" شیخ علی نے رفی کی طرف دیکھ کر

جواب دیا۔ "کچھ تصویریں یہاں سے اتار کر انہوں نے اسلام آباد کے گھر میں لگا دی ہیں۔ رفی کو یورپ جانے کی فرصت نہیں ہے اور میں ان کے مشورے کے بغیر تصویریں نہیں خریدتا۔ یہ آرٹ کے بارے میں بہت زیادہ جانتی ہیں۔"

"مجھے پتہ ہوتا تو میں آپ کو گویا کی بالباس ماہیا پیش کرتا۔ چند سال پہلے کوئی اسپین سے چرا کر لایا تھا۔ میں نے بھاری قیمت دے کر خریدی تھی۔ لیکن میرے گھر کی دیواروں پر جگہ نہیں ہے۔ وہ اب بھی میرے تہہ خانے میں رکھی ہے۔"

شیخ علی نے برا سا منہ بنا کر کچھ کہنا چاہا لیکن اس سے پہلے رفی بول پڑی۔

"آپ نے یہ تصویر انطونی نامی کسی اطالوی سے خریدی ہو گی۔"

"آپ کو کیسے معلوم؟" عارف واقعی حیرت زدہ رہ گیا۔

"رفی کو یورپ کے ہر آرٹ ڈیلر کا شجرۂ نسب پتہ ہے۔" شیخ علی نے فخریہ لہجے میں کہا۔ آج اس کی محبت بہت جوش میں تھی۔

"انطونی نے مجھے بھی بیوقوف بنانے کی کوشش کی تھی۔" رفی نے مسکراتی نظروں سے عارف علی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "وہ مالدار پاکستانیوں کو ٹھگنے آیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ آرٹ کے بارے میں پاکستانی کچھ نہیں جانتے۔ اس نے گویا کی جو تصویر آپ کو بیچی ہے وہ اصلی تصویر کا نقلی منی ایچر ہے۔"

عارف علی کا چہرہ شرمندگی سے سرخ ہو گیا۔ اس نے سوچا وہ نواب ٹن کو زندہ نہیں چھوڑے گا جس نے یہ تصویر اسے بکوائی تھی۔

"رفی! یہ آرٹ کے آدمی نہیں ہیں۔ یہ اسلحہ کے ڈیلروں کا حسب نسب پہچانتے ہیں۔ توپ پر ہاتھ رکھ کر بتا دیتے ہیں کہ اس کا لوہا کس کان سے نکلا تھا۔" شیخ علی نے قہقہہ لگا کر عارف علی کی شرمندگی چھپا لی۔

"مجھے بھی بارود کی بو آ رہی ہے۔" رفی نے مسکرا کر کہا اور عارف علی بھی ہنس پڑا۔ ماحول سے تناؤ ختم ہو گیا۔ رفی اٹھ کر خود عارف علی کا جام بنا کر لائی۔ وہ شیخ علی کا مہمان تھا' وہ اسے شرمندہ کر چکی تھی' اب اس کی تعظیم کرنا بھی لازم تھا۔

"مجھے واقعی آرٹ کے بارے میں زیادہ نہیں معلوم۔" عارف علی نے سنبھلتے

ہوئے کہا۔ ”لیکن مجھے آپ کے دیوانخے کی سجاوٹ زیادہ پسند ہے۔ آپ نے اس کے در و دیوار تو نہیں بدلے۔“

”جی نہیں۔ دیوانخے کی دیواروں پر پستول اور تلواریں اسی طرح سجی ہیں۔“ شیخ علی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”آؤ ڈارلنگ اندر چلیں۔ اسلحے کے تاجروں سے کام کی بات اسلحے کی چھاؤں میں ہو گی۔“

شیخ علی مسکراتا ہوا رفی کا ہاتھ پکڑ کر دیوانخے کی طرف بڑھا تو عارف علی ایک لمحے تک انہیں حیرت سے دیکھتا رہا۔ اس کا خیال تھا شیخ علی اس کا اشارہ سمجھ جائے گا اور صرف وہی اس کے ساتھ اندر جائے گا۔ آج اسے شیخ علی سے بہت اہم معاملات طے کرنے تھے۔ لیکن یہ عورت بھی...... یہ تو ایمان علی کے ساتھ پاکستان کی سیاست میں ملوث تھی۔ وہ خاموشی سے دیوانخے میں داخل ہوا اور دیوار پر ٹنگی ہوئی دو قدیم تلواروں کے نیچے فرشی گدے پر کمر ٹکا کر بیٹھ گیا۔ شیخ علی اور مسز چنائے ان کے مقابل کی نشستوں پر بیٹھے تھے۔ فلپائنی خادمہ ان کے پیچھے پیچھے آئی اور ان کے سامنے گلاس سجا کر چلی گئی۔

”اگر مسز چنائے اجازت دیں تو ہم کھانے سے پہلے کام کی بات کر لیں۔“ عارف علی نے تخلیہ حاصل کرنے کی ایک اور کوشش کی۔ لیکن شیخ علی پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس نے اس طرح سر ہلایا جیسے بات شروع کرنے کی اجازت دے رہا ہو۔

”میں جا کر دیکھتی ہوں کہ کھانے میں کیا دیر ہے۔“ مسز چنائے نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”شیف کو تمہاری مدد کی ضرورت نہیں ہے۔“ شیخ علی نے رفی کا ہاتھ پکڑ کر بٹھاتے ہوئے کہا۔ اس کے چہرے پر ایک لمحے کے لئے سختی آ گئی تھی لیکن اس نے فوراً ہی دوبارہ ہونٹوں پر مسکراہٹ سجا لی۔ ”آپ ان کے سامنے بات نہیں کرنا چاہتے تو ہم آرٹ پر گفتگو کریں گے اور موسیقی سنیں گے۔ کاروباری بات چیت کل ہو گی۔ لیکن یہاں نہیں۔ میرے دفتر میں۔“

رفی خاموش ہو کر بیٹھ گئی۔ وہ سچ مچ اٹھ جانا چاہتی تھی۔ لیکن شیخ علی نے اس

کا ہاتھ سختی سے تھاما ہوا تھا۔ اسے پتہ تھا شیخ علی نے جو سخت رویہ اختیار کیا تھا اس کے بعد اگر وہ اٹھ کر چلی گئی تو شیخ علی برا مان جائے گا۔

عارف علی کے ماتھے پر ایک بار پھر شرمندگی پسینہ بن کر چمکنے لگی۔ لیکن وہ اب رنی کو مختلف زاویئے سے دیکھ رہا تھا۔ پہلے اس کا خیال تھا وہ صرف شیخ علی کی زندگی کے سماجی اور تہذیبی حصے کو سنبھالتی ہو گی' لیکن وہ تو شیخ کے کاروباری معاملات میں بھی دخیل تھی۔ اس نے سوچا شیخ علی سے کاروبار کرنے کے لئے اسے اب مسز چنائے کو بھی خوش رکھنا ہو گا۔

''آئی ایم ساری۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔'' عارف علی نے جوابی مسکراہٹ اچھالی۔ ''میرا خیال تھا مسز چنائے کو خشک کاروباری گفتگو بور کر دے گی۔''

''بور؟'' شیخ علی ہنسنے لگا۔ ''کاروباری گفتگو رنی کا سب سے دلچسپ مشغلہ ہے۔''

''آپ دونوں اچھے کاروباری نہیں ہیں۔'' رنی نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''کاروباری لوگ رسمیات میں اتنا وقت ضائع نہیں کرتے۔''

''رنی نے غلط نہیں کہا۔'' شیخ علی نے ہاتھ میں بندھی ہوئی گھڑی دیکھی۔ ''شیخ عارف گولہ باری شروع کیجئے۔''

''میراج طیاروں کے سودے میں تھوڑی سی گڑ بڑ ہو گئی ہے۔'' شیخ علی کو لگا جیسے عارف علی نے سچ مچ اس کے سر پر گولہ دے مارا ہو۔ اس کے چہرے کے تاثرات بالکل بدل گئے۔ یہ اب ہارورڈ میں پڑھے ہوئے مہذب شخص یا ایک شائستہ میزبان کا چہرہ نہیں رہا تھا۔

''میں نے اس سودے کے ایڈوانس کی جو گارنٹی دی تھی وہ میں کل واپس لے لوں گا۔'' شیخ علی نے بہت سرد لہجے میں فیصلہ سنایا۔ ''میرے ایک سو بیس ملین ڈالر ایک سال سے پھنسے ہوئے ہیں۔ اس میں آپ نے جو منافع پروجیکٹ کیا تھا اسے میں ایک خراب سودا سمجھ کر بھول جاؤں گا۔ لیکن مارکیٹ ریٹ سے ایک سال کا سود آپ کو ادا کرنا پڑے گا۔''

"صرف چھ مہینے کی بات اور ہے۔"

"اس سودے میں سال بھر پہلے جو گڑ بڑ ہوئی تھی اس وقت بھی آپ نے چھ مہینے کی مہلت مانگی تھی۔"

"آپ کو حالات کا علم ہے۔ اس وقت عامر نذیر وزیراعظم تھا۔ اس کی بیوی نے عنان شروتی کے داماد سے کوئی معاملہ طے کیا تھا۔ وہ میراج طیاروں کے سودے میں بھی ٹانگ اڑانا چاہتا تھا۔"

"میں نے آپ کو بتایا تھا کہ عنان شروتی دیوالیہ ہو چکا ہے۔ میں دیوالیہ ہو جانے والوں سے کاروبار نہیں کرتا۔"

"ہم نے آصفہ کی بات نہیں مانی تھی۔" عارف علی نے اثبات میں سر ہلا کر کہا۔ "اسی لئے ہمیں ان کی حکومت بدلنی پڑی تھی۔"

"عامر نذیر کا تختہ الٹ کر آپ جو نئی حکومت لائے اس نے آپ سے وعدہ کیا ہو گا اور پھر وعدہ بھول گئی ہو گی۔ اب آپ کو حکومت تبدیل کرنے کے لئے ایک بار پھر چھ مہینے کی ضرورت ہے۔" شیخ علی نے مضحکہ اڑانے والے انداز میں کہا۔

"حکومت بدلنی ہی پڑے گی۔" عارف علی نے بہت آہستہ سے کہا جیسے اپنی کمپنی کے کسی منیجر کو برطرف کرنے پر افسوس ہو رہا ہو۔ "ایک یہی نہیں کئی اور بھی معاملے ہیں۔"

"عامر نذیر اقتدار میں آنے کے بعد پھر اپنا وعدہ بھول جائے گا۔ اس کی بیوی اپنی کسی دوست کے بھائی یا عنان شروتی کو درمیان میں لے آئے گی۔" شیخ علی کا غصہ اسی طرح برقرار تھا۔ "شیخ عارف! آپ کی حکومت کی لگامیں دیوالیہ ہو جانے والے بیوپاریوں اور کمیشن ایجنٹوں کے ہاتھوں میں آ گئی ہیں۔ ان پر بھروسہ کرنا مشکل ہے۔"

"آپ صحیح کہہ رہے ہیں' یہ صرف ہمارا نہیں تیسری دنیا کی تمام جمہوریتوں کا ایک عام مسئلہ ہے۔" عارف علی نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ اسے شیخ علی کے ردعمل کا پہلے سے اندازہ تھا۔ وہ چاہتا تھا شیخ علی کا غصہ جلد از جلد باہر نکل جائے تاکہ وہ شیخ علی کو اپنے پتے دکھا سکے۔ وہ آج کی ملاقات کا پورا نقشہ بنا کر لایا تھا۔

”جی نہیں ایسا نہیں ہے۔“ شیخ علی کے غصے پر سنجیدگی غالب آ گئی اور انداز لیکچر دینے والے پروفیسر کا سا ہو گیا۔ ”تیسری دنیا کی جمہوریتیں اس دور سے نکل آئی ہیں۔ سب اپنے ماتھے سے تیسری دنیا کا لیبل کھرچنے میں مصروف ہیں۔ لیکن آپ کا ملک الٹے پاؤں واپس جا رہا ہے۔ اس طرف جہاں نائجیریا، روانڈا اور کانگو جیسے خانہ جنگی میں مبتلا ملک کھڑے ہیں۔ آپ کو ملائشیا نہیں افغانستان بننے کا شوق ہے۔ آپ کی جمہوریت بھی ایک مذاق ہے۔ مغربی جمہوریت کا ایک بھونڈا سا چربہ! وزیراعظم عوام کا نمائندہ بن کر آتا ہے اور بادشاہوں سے زیادہ مطلق العنانی کے ساتھ حکومت کرتا ہے۔ پھر بھی اس کی سیاسی بنیاد اتنی کمزور ہوتی ہے کہ آپ چھ مہینے کے نوٹس پر اس کی چھٹی کر دیتے ہیں۔“

عارف علی کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں آیا۔ وہ خاموشی سے شیخ علی کا لیکچر سن رہا تھا۔ اس کے پاس دفاع کرنے کے لئے کچھ نہیں تھا۔ جواب میں وہ صرف حملہ کر سکتا تھا۔ عرب ملکوں میں جو کچھ ہو رہا تھا اس کے قصیدے اور مرثیے پڑھ سکتا تھا۔ لیکن وہ وار روکنے یا وار کرنے نہیں آیا تھا۔ واقعات عالم یا پاکستان کے احوال کا تجزیہ کرنا اس کا کام نہیں تھا۔

”مجھے پتہ ہے میں نے آپ کی حب الوطنی کو صدمہ پہنچایا ہے۔ آئی ایم ساری۔“ شیخ علی نے خاموش بیٹھے ہوئے عارف علی کو دیکھ کر کہا۔

”میری حب الوطنی جغرافیائی حدود کی پابند نہیں ہے۔“ عارف علی نے چہرے پر مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔ ”دنیا کے جس حصے میں میرے کاروبار کی فصل اچھی ہوتی ہے میری حب الوطنی اسی زمین کے تابع ہو جاتی ہے۔“

”شیخ عارف! پاکستان کی زمین ہمارے اور آپ کے کاروبار کی فصل اگانے کے لئے موزوں نہیں رہی۔“ شیخ علی چند لمحوں کے توقف کے بعد کہنے لگا۔ ”یہ سیاسی مبصروں کا تجزیہ نہیں وال اسٹریٹ کے ماہرین کی رائے ہے جو دو اور دو چار کی بنیاد پر تجزیئے کرتے ہیں۔ انہوں نے مجھے پیسہ لگانے سے منع کیا تھا۔ انہوں نے سات وجوہات بتائی تھیں۔ حکومت شدید بدانتظامی کا شکار ہے۔ معیشت کا انحصار مختصرمدت

کے قرضوں پر ہے۔ نجی شعبے کے قرضوں پر کوئی کنٹرول نہیں ہے۔ بینکاری نظام بہت کمزور ہے۔ سرمایہ داری تحفظ اور سرپرستی کی بنیادوں پر کھڑی ہے۔ امن و امان کی صورتحال سنگین ہے۔ نوکر شاہی اور انصاف فراہم کرنے والے ادارے بدعنوانیوں کا شکار ہیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ صحیح کہہ رہے ہیں میں نے ان کی بات نہیں مانی تھی۔"

شیخ علی گھونٹ بھرنے کے لئے خاموش ہوا اور پھر عارف علی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگا۔

"اس کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو یہ مختصر مدت کا سودا تھا۔ ابتدا میں آپ نے صرف چھ مہینے کہے تھے۔ اور دوسری وجہ آپ تھے۔ آپ کے ساتھ میں پہلے بھی کاروبار کر چکا ہوں۔ مجھے آپ کی کاروباری ذہانت اور معاملہ فہمی پر بھروسہ تھا۔"

"اس سودے میں ہم دونوں ایک وجہ سے شریک ہیں۔ منافع اور صرف منافع!" عارف علی نے بھی شیخ علی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ گندم یا چینی کی درآمد برآمد نہیں ہے۔ ایک اعشاریہ دو بلین ڈالر کا سودا ہے اور ایسے سودوں کے طے ہونے میں ایک دن کئی کئی مہینوں کے برابر ہوتا ہے۔ لیکن یہ سودا ابھی زندہ ہے۔ صرف وزیراعظم کے دستخط ہونے باقی ہیں۔ دستخط ہوتے ہی حکومت ایک سو بیس ملین ڈالر کا ایڈوانس ادا کر دے گی اور آپ نے رقم کی جو ضمانت دی ہے وہ ریلیز ہو جائے گی۔ صرف چھ مہینے کی بات اور ہے۔"

"ان چھ مہینوں میں میرے پیسوں کو دیمک لگ جائے گی۔ آپ حکومت بدلنے میں ناکام رہے یا نئی حکومت نے بھی آپ کی بات نہیں مانی تو سپلائر ایڈوانس ضبط کرنے کے لئے عدالت کا رخ کرے گا۔ میری رقم کئی سالوں تک پھنسی رہے گی۔ ڈیڑھ فیصد منافع کی امید پر میں سو فیصد کھونے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔" شیخ علی نے اٹل لہجے میں کہا اور عارف علی سوچنے لگا اسے اپنا نقشہ کھولنا ہی پڑے گا۔

"آپ کا کوئی نقصان نہیں ہو گا۔ آپ کی رقم کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔" عارف علی کے مضبوط لہجے نے شیخ علی کی پوری توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ "چھ مہینے میں ریاض

توصیف کی حکومت اور اسمبلی ٹوٹ جائے گی۔ اس بار ہم کوئی چانس نہیں لیں گے۔ نگراں حکومت عامر نذیر کے اقتدار میں آنے سے پہلے ہی معاہدے کو آخری شکل دے کر ایک سو بیس ملین ڈالر کا ایڈوانس ادا کر دے گی۔ ہم نے ڈچ کمپنی سے طے کر لیا ہے' وہ ایڈوانس ملتے ہی ہمارے کمیشن کے ساٹھ ملین ڈالر ادا کر کے ہمیں فارغ کر دے گی۔ نئی حکومت نے معاہدے پر عملدرآمد نہیں کیا تو پاکستان کو ایک سو بیس ملین ڈالر سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔ ایڈوانس ضبط ہو جائے گا۔ کچھ کئے بغیر ساٹھ ملین ڈالر کا فائدہ ڈچ کمپنی کے لئے بھی برا نہیں ہے۔"

شیخ علی اب بھی پوری توجہ سے عارف علی کو دیکھ رہا تھا جو خاموش ہو کر اپنی جیبیں ٹٹولنے لگا تھا۔

"اگر سب کچھ اس طرح نہیں ہوا اور حکومت نہیں بدل سکی تو آپ چھ ماہ بعد اپنی ضمانت واپس لے لیجئے گا جس کے بعد معاہدہ خود بخود کالعدم ہو جائے گا۔" عارف علی نے وہ کاغذ جو اس نے ابھی ابھی جیب سے نکالا تھا شیخ علی کے ہاتھ میں دے کر کہا۔

"یہ نو ملین ڈالر کا آئی۔ او۔ یو ہے۔ سودا مکمل نہ ہونے کی صورت میں آپ کا نقصان پورا کرنے کی ضمانت!" عارف علی کو پتہ تھا اگر اسے نو ملین دینے پڑے تب بھی یہ گھاٹے کا سودا نہیں تھا۔

"مجھے کسی ضمانت کی ضرورت نہیں ہے۔" شیخ علی کاغذ واپس اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے مسکرایا۔ "چھ مہینے بعد اگر معاہدہ ختم ہو گیا تو میرے نقصان کا چیک دے کر میرے ساتھ کھانا کھایئے گا۔ لیکن پانچ نہیں ساڑھے چار فیصد کے حساب سے۔ میں آپ سے آدھا فیصد کم چارج کروں گا۔" دونوں قہقہہ لگا کر ہنسنے لگے۔ رفی کو لگا جیسے دونوں ایک غریب ملک کے ایک سو بیس ملین ڈالر کھا کر ڈکاریں لے رہے ہوں۔

"آپ حکومت کیسے ختم کریں گے؟ صدر نے آپ کے کہنے پر حکومت توڑ بھی دی تو عدالت بحال کر دے گی۔" رفی نے پوچھا۔

"جنرل برلاس جب اپنی دستی چھڑی ریاض توصیف کے نرخرے پر رکھ کر استعفیٰ دینے کے لئے کہے گا تو وہ چپ چاپ انگوٹھا لگا کر چلا جائے گا۔" عارف علی کا لہجہ بہت سفاکانہ تھا۔

"جنرل برلاس اپنی دستی چھڑی ریاض توصیف کے نرخرے پر رکھ کر میراج طیاروں کے معاہدے پر دستخط کرنے کے لئے کیوں نہیں کہتا؟" رفی کا انداز مضحکہ اڑانے والا تھا۔

"اس لئے کہ اس طرح یہ بات مشتہر ہو جائے گی کہ میراج طیاروں کے کمیشن میں جنرل برلاس کا بھی حصہ ہے۔" عارف علی نے ہنس کر کہا۔ لیکن پھر سنجیدہ ہو گیا۔ "صدر بھی ریاض توصیف سے ناراض ہیں۔ اس نے ان کے بھتیجے کو اس کی پسند کی وزارت نہیں دی اور ایک داماد کو نوکری سے نکال دیا ہے۔ نوکر شاہی میں صدر کے جو پرانے وفادار ہیں انہیں بھی تتر بتر کر دیا ہے۔ صدر اور جنرل برلاس کا خیال ہے کہ ریاض توصیف کے دور میں بدعنوانی اور بدامنی بڑھی ہے' معیشت بد تر ہوئی ہے اس لئے اس کی حکومت کا خاتمہ ملک کے مفاد میں ہے۔"

رفی جواب میں کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن عارف علی اسے نظر انداز کر کے شیخ علی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"پاکستان میں یہ میرا آخری سودا ہے۔ اب میں اس خطے میں کام نہیں کروں گا۔" شیخ علی اور رفی اسے حیرت سے دیکھنے لگے۔

"پاکستان میں اب معاملات پہلے جیسے نہیں رہے۔ درمیانی لوگوں کی زنجیر بھی بہت طویل ہو گئی ہے۔ نئے نئے بیوپاری پیدا ہو گئے ہیں۔ ہر ایک کی جیب میں کوئی وزیر یا سفیر رکھا ہوا ہے۔ میں اپنے گلے میں اتنی زنجیریں ڈال کر کاروبار کرنے کا عادی نہیں ہوں۔ میں اب آپ کے علاقے میں اور آپ کے ساتھ کام کرنا چاہتا ہوں۔" عارف علی نے اپنے گلے میں پڑی ہوئی مہین سی سنہری زنجیر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"میرے ساتھ اس علاقے میں آپ پہلے بھی کام کر چکے ہیں۔" شیخ علی نے اسے ٹٹولتی ہوئی نگاہوں سے دیکھا۔

"وہ پچاس سو ملین کے چھوٹے چھوٹے سودے تھے۔" عارف علی سنبھل کر بیٹھ گیا۔ "گلف وار کے بعد علاقے میں اسلحے کی برسات ہو رہی ہے۔ دفاعی بجٹ دس گنا بڑھ گئے ہیں۔ آپ کے پڑوسی امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے احسان مند ہیں اس لئے منہ مانگی قیمتیں دے رہے ہیں۔ میں آپ کے ساتھ مل کر اس دوڑ میں شامل ہونا چاہتا ہوں۔" عارف علی نے وہ فائل اٹھا کر اپنے زانو پر رکھ لی جو وہ ساتھ لے کر آیا تھا۔ شیخ علی اب بھی اسے خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔

"امارات نے دس تیز رفتار مسلح گشتی کشتیوں کا ٹینڈر جاری کیا ہے۔" عارف علی نے فائل کھول کر اس کے کاغذات کو الٹ پلٹ کرتے ہوئے کہا۔ "ایک برطانوی کمپنی ایک بلین ڈالر کے اس ٹھیکے میں فیورٹ ہے۔ کینیڈا کا ایک شپ یارڈ یہی کشتیاں کم وقت اور چھ سو ملین ڈالر میں دینے کے لئے تیار ہے۔ پندرہ فیصد ہمارا کمیشن ہے۔ ہم دو سو ملین ڈالر کی پرائس لوڈنگ کر کے آٹھ سو ملین ڈالر کا ٹینڈر دیں گے۔ برطانوی کمپنی ہماری قیمت کا مقابلہ نہیں کر سکے گی۔" وہ شیخ علی کو دیکھے بغیر ایک اور کاغذ پلٹنے لگا۔

"کویت نے اسلحے کی خریداری کے لئے بارہ سالہ منصوبہ بنایا ہے جس کے لئے بارہ بلین ڈالر پہلے سے مخصوص کر دیئے ہیں۔ سعودی عرب اگلے پانچ سالوں میں صرف جنگی سامان کی خریداری پر ۳۲ بلین ڈالر خرچ کرے گا۔ اومان' قطر اور امارات بھی پیچھے نہیں ہیں۔ ہم انہیں اچھی قیمت اور زیادہ کمیشن دلوا سکتے ہیں۔ اسلحہ سازوں سے میرے جو تعلقات ہیں ان سے آپ بخوبی واقف ہیں۔"

شیخ علی اب بھی کچھ نہیں بولا۔ وہ خاموشی سے عارف علی کو دیکھ رہا تھا۔ آنکھوں میں سوچ بھری ہوئی تھی۔ رنی کو معلوم تھا وہ فیصلہ پر پہنچنے کی کوشش کر رہا ہے۔

"شیخ علی! آپ کے اس علاقے میں آئندہ دس برسوں کے دوران ایک سو ارب ڈالر سے زیادہ کا جنگی سامان خریدا جائے گا۔" عارف علی نے فائل کے آخری کاغذ پر نظریں دوڑاتے ہوئے فائل بند کر دی اور شیخ علی کو غور سے دیکھتے ہوئے کہنے

لگا۔ ”صرف دس فیصد سودے بھی ہمارے ذریعے طے پائے تو ہم ایک ارب ڈالر کمائیں گے۔ اور یہ بہت محتاط اندازہ ہے۔ ہمارا منافع اس سے کہیں زیادہ ہو گا۔ اتنا منافع آپ کے یہ ہوٹل، شپنگ کمپنیاں اور دنیا بھر میں پھیلے ہوئے تجارتی ادارے آپ کو بیس سال میں نہیں دیں گے۔“

”آپ کی فائل میں شاید میری بیلنس شیٹ بھی موجود ہے۔“ شیخ علی نے ہنستے ہوئے کہا۔ آنکھیں جن میں پہلے سوچیں بھری ہوئی تھیں وہ اب بالکل صاف اور چمکدار ہو گئی تھیں۔ رفی نے ایک طویل سانس لی۔ اسے پتہ تھا منافع کی مہک نے شیخ علی کی کاروباری حس کو پوری طرح بیدار کر دیا ہے۔ اس نے فیصلہ کر لیا ہے۔

”قیمت کم کر کے صرف چھوٹے سودوں کے ٹینڈر جیتے جاتے ہیں۔“ شیخ علی کہہ رہا تھا۔ ”ہم ایک بلین ڈالر کی کشتیاں ایک بلین ڈالر میں ہی بیچیں گے۔ کینیڈا کو بتائیے کہ پریزنٹیشن میں خود کروں گا۔ چار سو ملین کی پرائس لوڈنگ میں سے تین سو ملین ڈالر اس ذریعے کے جو ٹھیکہ دلوائے گا اور سو ملین ڈالر میرے۔ چھ سو ملین ڈالر پر پندرہ فیصد کمیشن میں ففٹی ففٹی۔ اگر منظور ہو تو ہاتھ بڑھائیے ورنہ چلئے کھانا کھاتے ہیں۔“

”ڈیل“ عارف علی نے ہاتھ بڑھایا جو شیخ علی نے بڑی گرمجوشی سے اپنے ہاتھ لے لیا۔ عارف علی کو پتہ تھا شیخ علی سودے بازی کا ماہر ہے اس لئے عارف علی نے اس سودے میں اپنے پانچ فیصد الگ سے طے کئے ہوئے تھے۔

”اس فائل میں تمام ضروری تفصیلات ہیں۔“ عارف علی نے اپنی فائل شیخ علی کی طرف بڑھا کر کہا۔ ”کویت، قطر اور اومان کو جو کچھ چاہئے اس کی تفصیلات بھی ہیں۔ میں کل ہی آپ کو تفصیلی بروشرز بھجوا دوں گا۔ ابو ظہبی کا ٹینڈر اور معاہدے کے کاغذات بھی۔“

”یہ ہفتہ میں ابو ظہبی میں گزاروں گا۔ اگلے ہفتے کویت میں اعلیٰ حضرت کو فون کر کے وقت مانگوں گا۔ میری اگلے مہینے مسقط میں ایک میٹنگ ہے۔ اس کی بعد میں سعودی......“

مسز چنائے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ جانتی تھی شیخ علی تمام معاملات طے کر کے ہی اٹھے گا۔ شیخ علی کو کھانے کے دوران اور ڈنر کے بعد کاروباری گفتگو پسند نہیں تھی۔ شیخ علی نے باہر جاتی ہوئی رفی کو نظر اٹھا کر دیکھا لیکن روکنے کی کوشش نہیں کی اور دوبارہ اس فائل پر جھک گیا جس میں ان کے کروڑوں ڈالر کا منافع جمع تھا۔ رفی نے ٹیرس میں آ کر سگریٹ سلگا لیا اور دور ساحل پر احمد کے قہوہ خانے کی ٹمٹماتی روشنیوں کو دیکھنے لگی۔ اس وقت روشنیاں زیادہ چمکدار اور ان کے سامنے چاند کچھ پھیکا پھیکا نظر آ رہا تھا۔ رفی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ اسے پتہ تھا آج رات کا قہوہ خانہ رات گئے تک کھلا رہے گا۔ کھانے کے بعد شیخ علی اسے حیرت زدہ کرنے کے لئے وہاں لے جائے گا۔ اس نے شیخ علی کو ڈرائیور کے کان میں سرگوشیاں کرتے دیکھا تھا اور وہ سمجھ گئی تھی کہ اس نے ڈرائیور کو قہوہ خانہ کھلا رکھنے اور ان کے وہاں جانے کا انتظام کرنے بھیجا ہو گا۔ اسے شیخ علی پر پیار آ گیا۔ اتنے بڑے سودوں کے درمیان اسے اس کی ایک چھوٹی سی خواہش کا بھی کتنا خیال تھا۔

مسز چنائے اس وقت بھی ایک دریچے میں کھڑی پودوں میں سگریٹ کا دھواں پھینک رہی تھی۔ آنکھیں سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ خدوخال میں تیکھا پن آ گیا تھا۔ لیکن اس وقت مقام بدلا ہوا تھا۔ وہ بحرین کے پینٹ ہاؤس میں فضا میں لٹکے ہوئے باغیچے جیسی ٹیرس کی جگہ اس وقت اسلام آباد میں اپنے مکان کے اس دریچے میں کھڑی تھی جو سگریٹ نوشی کرنے والوں کے لئے مخصوص تھا۔ سگریٹ ختم ہو گیا تو اس نے بے پرواہی سے اسے بجھائے بغیر باہر لان پر پھینک دیا اور پلٹ کر اندر دیکھنے لگی جہاں ایمان علی کسی سے فون پر بات کرنے میں مصروف تھا۔ اجلاس شروع ہونے میں ابھی دو گھنٹے باقی تھے۔ اس نے سوچا اگر لوگوں کی آمد شروع ہو گئی تو پھر اسے ایمان علی سے بات کرنے کا موقع نہیں ملے گا۔ اسے ایمان علی سے اجلاس سے پہلے بات کرنی تھی اور بتانا تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔

اس نے ایک بار پھر پلٹ کر دیکھا۔ ایمان علی ابھی تک فون پر مصروف تھا۔

یقیناً" کوئی اہم کال ہو گی۔ ایمان علی کو فون پر دیر تک باتیں کرنے کا شوق نہیں تھا۔ اس نے ایک اور سگریٹ جلا لیا۔ لیکن اسی وقت ایمان علی نے فون رکھ دیا اور دریچے میں آ کر دھواں اڑاتی مسز چنائے کو مسکراتی نظروں سے دیکھنے لگا۔

"ماحول میں پھیلائے ہوئے اس زہر کو تم خود صاف کرو گی۔" ایمان علی نے چاروں طرف پھیلے ہوئے دھوئیں کے مرغولوں کو مصنوعی تشویش سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں تمہیں ماحولیات کا وزیر بناؤں گا۔"

"سگریٹ کے اس ایک کش پر تمہاری دس وزارتیں قربان!" مسز چنائے نے ایک بڑا سا کش لے کر سگریٹ پھینکا تو رات کے اندھیرے میں جگنو سا تیر گیا۔ "میرے سگریٹ کو چھوڑو۔ اس موضوع پر بور کرنے کے لئے ڈاکٹر شفا کافی ہے۔ یہ بتاؤ آج کی میٹنگ کا ایجنڈا کیا ہے۔ تم نے مجھے اب تک نہیں بتایا۔"

"الیکشن!" ایمان علی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ مسز چنائے کو سخت حیرت ہوئی۔ وہ تو ایمان علی کو بتا کر چونکانے والی تھی لیکن کیا اسے پہلے سے معلوم تھا؟ ایمان علی نے وضاحت کی تو اس کی حیرت دور ہو گئی۔ اسے پتہ نہیں تھا۔ وہ صرف اندازے لگا رہا تھا۔

"ریاض توصیف کی حکومت دو سال سے زیادہ نہیں چلے گی۔ اس عرصے میں ہمیں اپنا ڈھانچہ مکمل کرنا ہے۔ ہمیں ہر سیٹ پر مقابلہ کرنا ہے۔ امیدواروں کی تلاش آسان نہیں ہو گی۔ مجھے پتہ ہے ہم یہ انتخاب نہیں جیتیں گے۔ لیکن ہماری تنظیم مضبوط ہو جائے گی۔ جو باقی بچے گا وہ چھوڑ کر نہیں جائے گا۔ اس کے بعد جو انتخاب ہو گا وہ ہم جیتنے کے لئے لڑیں گے۔"

"تمہارے پاس دو سال کیا دو مہینے بھی نہیں ہیں۔" مسز چنائے اسے چونکا کر آج کی دنیا میں واپس لے آئی۔ "ریاض توصیف کی حکومت ختم کرنے کا فیصلہ کیا جا چکا ہے۔ نئی نگراں حکومت بنے گی، تین مہینے کے اندر انتخابات ہو جائیں گے اور عامر نذیر دوبارہ برسر اقتدار آ جائے گا۔"

"تم نے شاید کوئی خواب دیکھا ہے یا کسی مصری جادوگرنی نے تمہیں تاش کے

پتوں میں مستقبل دکھا کر بیوقوف بنایا ہے۔" ایمان علی اسے تیز نظروں سے گھور رہا تھا۔

"یہ تاش کے پتوں کا کھیل نہیں ہے۔ مستقبل کا منظر نامہ ہے۔ بہت قریبی مستقبل کا۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"شیخ علی!"

"شیخ علی؟! لیکن شیخ علی کا ان معاملوں سے کیا تعلق؟"

"میراج طیاروں کی خریداری کا کوئی معاملہ ہے۔ اس سودے میں شیخ علی نے پیسے لگائے ہیں۔ اسلحے کے تاجروں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ صدر اور آرمی چیف بھی ریاض توصیف کو نکالنے کے حق میں ہیں۔"

ایمان علی کچھ دیر اسے حیرت سے دیکھتا رہا اور پھر نزدیک ہی رکھی ہوئی ایک کرسی میں ڈھیر ہو گیا۔

"تمہیں ریاض توصیف کے جانے کا صدمہ ہو رہا ہے؟" مسز چنائے نے حیرت سے پوچھا۔

"تم نے ہم سب کو اور اپنے آپ کو بڑی مشکل میں ڈال دیا ہے۔"

"اس میں مشکل کیا ہے۔ ریاض توصیف اور عامر نذیر ایک دوسرے سے لڑ لڑ کر اور کمزور ہوں گے۔ ہمارا کام زیادہ آسان ہو جائے گا۔"

"ہماری مشکل ریاض توصیف نہیں میراج طیاروں کا معاملہ ہے۔" ایمان علی کے چہرے پر پریشانی چپک گئی تھی۔ "اعجاز محمد خان نے میراج طیاروں کے سودے کی ایک تفصیل حاصل کی ہے۔ کون کون جنرل شامل ہے۔ عامر نذیر کا ایجنٹ کون تھا۔ ریاض توصیف کا کون ہے۔ وہ آج کے اجلاس میں اس سودے کے خلاف مہم چلانے کی منظوری لے گا۔ میں بھی اس مہم کے حق میں ہوں۔ ہمیں پچاس ارب روپے کے جنگی طیارے نہیں پچاس اسکول اور پچاس اسپتال چاہئیں۔"

"تو پھر؟ اس میں پریشانی کیا ہے؟"

"تم اتنی بیوقوف کیوں ہو گئی ہو۔ بالکل مکھی کے برابر دماغ ہو گیا ہے تمہارا۔ مکھی کے برابر۔" ایمان علی غصے میں بھرا ہوا اٹھ کھڑا ہوا اور کرسی کو پاؤں سے ٹھوکر مار کر ایک طرف کر دیا مسز چنائے بے ساختہ ہنس پڑی۔

"ریٹا۔ وہی تمہاری آکسفورڈ کے زمانے والی گرل فرینڈ صحیح کہتی تھی۔ تم غصے میں اور خوبصورت لگنے لگتے ہو۔"

"رفی یہ مذاق کا وقت نہیں ہے۔" ایمان علی نے نارمل ہونے کی کوشش کی۔ لیکن چہرہ اسی طرح آگ بھبھوکا ہو رہا تھا۔ "ہم کل پریس کانفرنس کر کے اپنے حملے کا آغاز کرنے والے تھے۔ اگر ہم نے یہ مہم روکنے کی کوشش کی تو ہمارے دوست بدظن ہو جائیں گے۔ اور اگر مہم شروع کی تو ہم خود اپنے پاؤں تلے کچلے جائیں گے۔"

"لیکن کیسے؟"

"ایسے کہ شیخ علی تمہارا شوہر ہے جو اس سودے میں حصہ دار ہے۔ یہ بات چھپی نہیں رہے گی۔" ایمان علی غصے سے بولا۔ "سب کو پتہ ہے ہماری پارٹی تمہاری مالی مدد سے چل رہی ہے۔ اس مکان کے پھاٹک پر جہاں میں آکر ٹھہرتا ہوں اور جہاں ہمارے اجلاس ہوتے ہیں موٹے موٹے حرفوں سے تمہارا نام لکھا ہوا ہے۔ شیخ علی کا نام آتے ہی ریاض توصیف اور عامر نذیر کی پروپیگنڈہ مشینیں ہمارا قیمہ بنا دیں گی۔ خود ہمیں اپنے ساتھیوں کو یقین دلانا آسان نہیں ہوگا۔"

مسز چنائے کو پتہ تھا کہ ان کی پارٹی کا جنرل سیکریٹری اعجاز محمد خان کتنا غیر لچکدار تھا۔ وہ سیاست کی پیچیدگیوں اور نزاکتوں کو اس حد تک نہیں سمجھتی تھی۔ ایمان علی کو بتانے سے پہلے اس کے اندر بہت بحث ہوئی تھی کہ بتائے یا نہ بتائے۔ پاکستان کی سیاست کا یہ معاملہ شیخ علی کے ایک کاروبار سے نتھی ہو گیا تھا۔ لیکن اگر شیخ علی کو یہ سب کچھ اس سے اور ایمان علی سے خفیہ رکھنا ہوتا تو وہ عارف علی کے ڈنر میں اور اس سے ہونے والی بات چیت میں رفی کو ساتھ بٹھانے پر اصرار نہیں کرتا۔ اس نے سوچا ایمان علی بھی غلط نہیں تھا۔ شیخ علی اور اس کا نام آیا تو کوئی یقین نہیں کرے گا کہ ایمان علی ملوث نہیں ہے۔

"میراج طیاروں کے سودے سے میرا جو تعلق ہے اس کے بارے میں آج کے اجلاس کو صاف صاف بتا دوں گی۔ میں تمہاری سیاست میں جھوٹ بولنے اور منافقت کرنے کے لئے شامل نہیں ہوئی۔ تمہارے ساتھیوں کو پھر بھی شک ہوتا ہے تو وہ جہنم میں جائیں۔ مجھے پرواہ نہیں ہے۔" مسز چنائے نے کندھے جھٹک دیئے۔ اس نے سوچا وہ خواہ مخواہ الجھ رہی تھی۔ ایمان علی بھی تائید میں سر ہلانے لگا۔

"ہم اپنے دوستوں کو اعتماد میں لیں گے۔ ہم کوئی غلط کام نہیں کر رہے اس لئے ہمیں ڈرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔" اس نے کہا اور مسز چنائے کو سگریٹ سلگانے سے روکنے لگا۔

"پہلے اندر چل کر شیخ علی کو فون کرو۔ اسے بتانا ضروری ہے۔ ہماری وجہ سے میراج طیاروں کا سودا ختم ہوا تو اسے بہت غصہ آئے گا۔"

"تم شیخ علی کو مجھ پر چھوڑ دو۔" مسز چنائے نے اسی لاپرواہی سے کہا۔ "مجھے ضرورت ہوگی تو میں کسی وقت اسے فون کر کے خود بتا دوں گی۔"

"کسی وقت نہیں ابھی۔" ایمان علی نے اس کا بازو مضبوطی سے پکڑ کر اندر کی طرف لے جاتے ہوئے کہا۔ "اپنے لئے نہیں میرے لئے فون کرو۔ میں نہیں چاہتا وہ یہ کہے کہ ہم نے پہلے نہیں بتایا تھا۔"

مسز چنائے خاموشی سے فون کی طرف بڑھ گئی۔ اس نے سوچا ایمان علی غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ کاروبار کے معاملے میں شیخ علی کا رویہ بہت غیر جذباتی تھا۔ کاروبار کرتے وقت وہ تعلق کی عینک اتار کر الگ رکھ دیتا تھا۔ اور یہ کوئی چھوٹا معاملہ نہیں تھا۔ شیخ علی کے ایک سو بیس ملین ڈالر پھنسے ہوئے تھے۔ وہ شیخ علی کے اتنے بڑے نقصان کی وجہ نہیں بن سکتی تھی۔ وہ تیزی سے شیخ علی کے نمبر ڈائل کرنے لگی۔

شیخ علی کو فون پر آنے میں دیر نہیں لگی۔ وہ اسے جلدی جلدی صورتحال بتانے لگی لیکن دوسری طرف سے شیخ علی کا قہقہہ سن کر چپ ہو گئی۔

"تم میری فکر مت کرو۔ میرے کاروباری مفادات بالکل محفوظ ہیں۔ تم اور ایمان علی میراج، مگ اور ایف ۱۶، ۱۸ جس کے خلاف چاہو مہم چلاؤ، میری طرف سے

پوری اجازت ہے۔" شیخ علی نے چہکتی ہوئی آواز میں کہا۔ مسز چنائے کو پتہ تھا کوئی کاروباری معاملہ طے پا جائے تو وہ اسی طرح خوش ہوتا ہے۔

"عارف علی!" مسز چنائے نے اپنا خدشہ ظاہر کیا۔

"عارف علی میرا نام کبھی نہیں لے گا۔ اسے پتہ ہے کہ اس نے ایسا کیا تو وہ میرے علاقے میں کبھی کاروبار نہیں کر سکے گا۔"

"لیکن....." مسز چنائے نے کچھ کہنا چاہا تو شیخ علی نے اس کی بات کاٹ دی۔

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔ اس معاملے سے صرف تم اور اب ایمان علی واقف ہے۔ کسی اور کو بتاؤ گی تو بات آگے بڑھے گی۔ سمجھو تم کل رات ڈنر پر موجود نہیں تھیں۔ تمہیں کچھ نہیں معلوم۔"

"لیکن اگر ہماری مہم کامیاب ہو گئی اور میراج طیاروں کا سودا......"

"اچھی باتوں پر عمل کرنے کا رواج ہو جائے تو دنیا جنت بن جائے اور ہم جیسے کاروباری جہنم رسید ہو جائیں گے۔" شیخ علی نے ہنستے ہوئے اس کی بات کاٹ دی۔

"علی مذاق مت کرو۔"

"میں مذاق نہیں کر رہا۔" شیخ علی نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ "میراج طیاروں کا سودا طے پا گیا ہے۔ ریاض توصیف نے آج شام معاہدے کی منظوری دے دی ہے۔ مجھے ابھی ابھی عارف علی کا فون آیا تھا۔ کل ڈچ کمپنی کو ایک سو بیس ملین ڈالر بھی مل جائیں گے اور میری ضمانت ریلیز ہو جائے گی۔" مسز چنائے تھوڑی دیر کے لئے گنگ ہو گئی۔

"عارف علی چھ مہینے کی مہلت مانگ رہا تھا۔ ایک ہی رات میں کایا پلٹ کیسے ہو گئی۔" مسز چنائے نے حیرت ظاہر کی۔

"عارف علی کو میرے ساتھ کاروبار شروع کرنے کی جلدی ہے۔ وہ بہت شاطر آدمی ہے۔ اس نے وزیراعظم تک خبر پہنچوا دی تھی کہ فوج حکومت کا تختہ الٹنے والی ہے۔ ریاض توصیف ایک گھنٹے کے اندر اندر فائل لے کر جنرل برلاس کے پاس پہنچ گیا۔"

فون پر کچھ دیر کے لئے دونوں طرف پھر سناٹا چھا گیا۔ مسز چنائے کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے۔ ایمان علی کے اجلاس کا ایجنڈا برباد ہو گیا تھا۔ اسے افسوس ہو رہا تھا کہ میراج طیاروں کے خلاف ایمان علی کی مہم شروع ہونے سے پہلے ہی دم توڑ جائے گی۔ سودا طے ہو چکا تھا۔ مہم چلانے کا اب کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ لیکن پھر اس نے سوچا شاید ٹھیک ہی ہوا تھا۔

"اچھا ہوا ریاض توصیف نے اپنی حکومت بچا لی۔ ہمیں تیاری کا وقت مل جائے گا۔" مسز چنائے نے کہا تو شیخ علی ایک بار پھر ہنسنے لگا۔

"ریاض توصیف حکومت پھر بھی نہیں بچا سکا۔" اس نے اپنی بیوی کے کانوں میں حیرت سے بھرا ہوا ایک اور بم چھوڑا۔ "کہو تو تمہیں وہ دن بھی بتاؤں جس دن اس کی حکومت توڑی جائے گی۔ اور ڈارلنگ تمہارا نیا وزیراعظم پاکستانی نہیں۔ امریکی ہو گا! ٹاٹا۔"

مسز چنائے فون رکھ کر پلٹی تو ایمان علی وہاں نہیں تھا۔ اجلاس میں شرکت کے لئے اس کی پارٹی کے رہنماؤں کی آمد شروع ہو گئی تھی۔ وہ انکا استقبال کر رہا تھا۔

کرم قریشی

کرم قریشی نے گھڑی دیکھی تو ڈیڑھ بج رہا تھا۔ اس نے کھڑکی سے باہر ٹریفک کو دیکھ کر دل ہی دل میں کئی گالیاں دیں۔ اسے پتہ تھا اسے شیرٹن ہوٹل تک پہنچنے میں کم از کم آدھا گھنٹہ لگے گا اور اعوان جسے اس نے ایک بجے کا وقت دیا تھا لنچ پر اس کا انتظار کرتا ہوا بری طرح کھول رہا ہو گا۔ آغا خان اسپتال سے ٹی وی اسٹیشن تک تو گاڑی صحیح رفتار سے آئی لیکن اس کے بعد رینگنے لگی۔ سبزی منڈی والی سڑک کھدائی ہونے کی وجہ سے بند تھی اس لئے تمام ٹریفک اسی طرف منتقل ہو گیا تھا۔ ڈرائیور نے کہا بھی تھا کہ گلیوں میں ہوتا ہوا نکل جائے گا۔ لیکن قریشی نے منع کر دیا تھا۔ اسے کراچی کی گلیوں میں کھو جانا پسند نہیں تھا۔ کراچی کے حالات آج کل زیادہ خراب تھے۔ عامر نذیر نے قتل عام شروع کر رکھا تھا۔ قریشی کی سرکاری گاڑی دور سے پہچانی جا سکتی تھی۔ گلیوں میں نہ جانے کی ایک یہی وجہ نہیں تھی۔ یہ جاننا بھی مشکل تھا کہ کونسی گلی کھدی ہوئی ہوگی' کس میں گٹر ابل رہا ہو گا۔ کہاں پائپ لائن ڈالی جا رہی ہو گی اور کس گلی میں شادی کا شامیانہ لگا ہوگا۔

قریشی کو صرف ٹریفک کی وجہ سے نہیں' اس سے پہلے اسپتال میں بھی دیر ہو گئی تھی۔ وہ اکبر خان کو دیکھنے گیا تھا جس کا کولہے کا آپریشن ہوا تھا۔ اکبر خان نے نیا صدر منتخب ہونے کے بعد مستقل ریٹائرمنٹ لے لی تھی۔ عامر نذیر نے وزیراعظم بن کر بہت کوشش کی تھی کہ بادشاہ گری کے کمالات دکھانے والا اکبر خان اس کا مشیر بن جائے لیکن اکبر خان نے منع کر دیا تھا۔ ایوان اقتدار چھوڑا تو اقتدار مافیا بھی چھوڑ دی تھی۔ ریاض توصیف کی حکومت کا تختہ الٹنا اس کا آخری کارنامہ تھا جس کے بعد اس نے سربراہی کا تاج قریشی کے حوالے کر دیا تھا۔ اکبر خان نے قریشی پر بہت محنت کی تھی۔ وہ سارے ذریعے اور رابطے ایک ایک کر کے قریشی کے حوالے کئے تھے جو اکبر خان کی اصل طاقت تھے اور جن سے اقتدار مافیا کے دوسرے ارکان باخبر نہیں تھے۔ کئی سال لگے تھے۔ لیکن اکبر خان منتقلی کے اس عمل سے پوری طرح مطمئن تھا اور اب سال بھر سے اپنے گاؤں کی آبائی حویلی میں سکون کی زندگی گزار رہا تھا۔

قریشی کے آنے کا مقصد اکبر خان کی تیمارداری کرنا نہیں تھا۔ تیمارداری کرنے وہ کل آ چکا تھا۔ اور کل پھر آ سکتا تھا۔ قریشی اکبر خان کو آج کی رات کا نقشہ سمجھانے اور اس سے مدد لینے آیا تھا۔ آج کی رات بہت اہم تھی۔ آج مہینے کی پہلی جمعرات تھی۔ لیکن یہ دوسرے مہینوں کی پہلی جمعراتوں سے مختلف تھی۔ آج صرف حکومت بدلنے کا نہیں بلکہ حکومت بدلنے والوں کو بدلنے کا فیصلہ بھی ہونا تھا۔ لیکن گاؤں سے تیمارداری کرنے والوں کا ایک جتھہ آیا ہوا صبح سے وہیں بیٹھا تھا۔ قریشی بار بار گھڑی دیکھتا لیکن وہ بہت دور سے اور کئی دنوں کا سفر طے کر کے آئے تھے۔ انہیں جانے کے لئے کہنا مشکل تھا۔ سب اپنے پلو میں کھانے کی کوئی نہ کوئی سوغات باندھ کر لائے تھے۔ سب کے ہاتھوں میں ایک ایک درخواست تھی۔ سب کو پتہ تھا اکبر خان سے ملنے کے لئے آنے والے ان کی قسمتوں میں سحر پھونک سکتے تھے۔ وہ ایک بجے اٹھ کر گئے۔ وہ بھی اس وقت جب نرس نے آ کر اعلان کیا کہ مریض کے آرام کا وقت ہو گیا ہے۔ سب جاتے جاتے درخواستوں کی شکل میں اپنا مستقبل اکبر خان کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے گئے تھے۔

"ہم کتنے اندھے ہو گئے تھے۔ ہم نے کبھی آنکھیں کھول کر نہیں دیکھا کہ ان کے چہروں پر کیسے کیسے دکھ کھدے ہوئے ہیں۔" اکبر خان نے درخواستوں کا پلندہ قریشی کے ہاتھوں میں دیتے ہوئے کہا۔ "ہم خدا بن گئے تھے۔ محلوں میں بیٹھے حکومتیں گرانے بنانے کا کھیل کھیلتے رہے۔ لیکن کبھی اپنی ناک کے نیچے نہیں دیکھا۔ اپنے سامنے پھیلے ہوئے خالی دامن نہیں دیکھے۔ دیکھا بھی تو پاؤں تلے کچل کر آگے بڑھ گئے۔ کیسی غلطی ہو گئی۔ کیسی غلطی ہو گئی۔"

"آپ فکر مت کیجئے' ان سب درخواستوں پر کل ہی کارروائی ہو جائے گی۔" قریشی نے اکبر خان کا بازو تھپ تھپایا۔

"کس کس کی درخواستوں پر کارروائی کرو گے۔" اکبر خان کے انداز میں مایوسی تھی۔ "سینکڑوں' ہزاروں' لاکھوں اور ہیں۔ باہر نکل کر دیکھو درخواستوں کے انبار تمہارا راستہ روک لیں گے۔ دامن پکڑ کر کھینچیں گے۔ شاید گریبان بھی پکڑ لیں۔" اکبر خان نے تکئے پر رکھا ہوا اپنا سر قریشی کی طرف گھماتے ہوئے اپنی بڑی بڑی آنکھیں اس کی آنکھوں میں ڈال دیں۔ "اپنا وعدہ مت بھولنا۔ تم نے مجھ سے جو وعدہ کیا تھا اس پر قائم رہنا۔ ورنہ اس بستر پر لیٹے ہوئے میری طرح پچھتاؤ گے اور کچھ نہیں کر سکو گے۔ میرے سرہانے تو تم کھڑے ہو۔ تمہارے سرہانے تم جیسا کوئی نہیں ہو گا۔"

قریشی خاموشی سے سرہلانے لگا۔ اکبر خان جب سے اقتدار کی گلیوں سے نکل کر اپنے گاؤں میں رہنے گیا تھا اس نے پہلی بار سچ مچ کی دنیا دیکھی تھی۔ نئے نئے دکھ پھیلے دیکھے تو پہلے حیران اور پھر بہت اداس ہو گیا۔ عمر کا تقاضا بھی تھا اس لئے احساس جرم کچھ اور بڑھ گیا تھا جسے وہ اب قریشی کے ذریعے دور کرنا چاہتا تھا۔ قریشی سوچنے لگا درد کا احساس ہمیشہ دیر سے کیوں ہوتا ہے۔ ضمیر وقت پر کیوں نہیں جاگتا۔ قریشی کو پتہ تھا آج اعوان کے ساتھ لنچ کے دوران بھی اسے ایسی ہی تقریریں سننا پڑیں گی۔ اکبر خان نے اس سے ریٹائر ہونے کے بعد اب وعدہ لیا تھا' اعوان تو کالج کے زمانے سے دنیا بدلنے کی باتیں کر رہا تھا۔

"آج کی رات کا کیا نقشہ ہے؟" اکبر خان کچھ دیر بعد بولا تو قریشی چونک پڑا۔ اسے لگا جیسے پرانا اکبر خان بیدار ہو گیا ہو۔

"عارف علی ایک بار پھر عامر نذیر کا تختہ الٹوانا چاہتا ہے۔" قریشی بتانے لگا۔ "جنرل برلاس اور اختیار رضوی اس کے ساتھ ہیں۔ جنرل سعید ملک پہلے ہی عامر نذیر کے خلاف ہے۔ فوج بھی خوش نہیں ہے۔ عامر نذیر نے جھوٹ بولا تھا کہ امریکہ نے ایف ۱۶ طیارے ریلیز کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس کی بیوی اب امریکہ میں اپنی سفیر کے ذریعے قیمت واپس لینے کی کوشش کر رہی ہے۔ وہ پانچ سو ملین ڈالر سے کوئی نیا سودا کرنا چاہتے ہیں۔"

"بار بار حکومت کی تبدیلی ایک مذاق بن گئی ہے۔" اکبر خان نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "لیکن تمہیں گروپ پر اپنی گرفت مضبوط کرنی ہے تو حکومت تبدیل کرنے کی اہلیت ثابت کرنا ہی ہو گی۔ یہ کام اب اتنا آسان نہیں ہو گا۔" اکبر خان کی چوڑی پیشانی پر گہرے بل پڑ گئے۔ "ریٹائر ہونے کے بعد جنرل برلاس غیر موثر ہو گیا ہے۔ نیا آرمی چیف براہ راست پارٹی نہیں بنے گا۔"

"جنرل برلاس نے ناصر بھٹی سے ساز باز کی ہے۔" قریشی نے مسکرا کر بتایا۔ "ناصر بھٹی وزیراعظم بننا چاہتا ہے۔ وہ اپنے چالیس ممبروں اور ریاض توصیف سے مل کر عامر نذیر کے خلاف عدم اعتماد لے کر آئے گا۔ برلاس اور رضوی نے پیسوں کا انتظام کرنے کا ذمہ لیا ہے۔"

"بڈھے پاگل ہو گئے ہیں۔" اکبر خان نے غصے سے کہا اور بستر پر اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسی وقت نرس دوڑی ہوئی آئی اور لیور گھما کر بستر کا سرہانہ اونچا کرنے لگی۔ وہ چلی گئی تو اکبر خان غرایا۔ "حکومت توڑنے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ ضرب کاری۔ تمہیں اس کے لئے صدر کو تیار کرنا ہو گا۔"

"وہ انتظام ہو گیا ہے۔" قریشی نے سرسری لہجے میں کہا۔ "سردار نے ۵۸-بی استعمال کرنے کی حامی بھر لی ہے۔"

"گڈ!" اکبر خان کے منہ سے بے ساختہ نکلا اور اس کی آنکھیں یکلخت چمکنے

گئیں۔ ”میرا اندازہ غلط نہیں تھا۔ مجھے یقین تھا کہ صدر زیادہ عرصے عامر نذیر کا انگوٹھا چھاپ نہیں رہ سکتا۔ لیکن یہ ہوا کیسے؟“

”کسی محفل میں صدر کی بیوی کو خاتون اول کہہ کر زیادہ عزت دے دی گئی تھی۔ آصفہ بھی وہاں تھی اسے اچھا نہیں لگا۔ اس نے سب کے سامنے صدر کی بیوی کو یہ کہہ کر شرمندہ کر دیا تھا کہ خاتون اول وہ ہے جس نے تمہیں خاتون اول بنایا ہے۔ صدر نے عامر نذیر سے شکایت کی تو جواب میں عامر نذیر بھی احسان جتا کر بدتمیزی کرنے لگا۔ سردار صاحب بہت غصے میں ہیں۔“

”سردار کو عامر نذیر سے الگ ہونے کا بہانہ چاہئے تھا۔“ اکبر خان نے طنز آمیز لہجے میں کہا۔ ”وہ اب صدر رہنے کے بجائے سچ مچ کا اقتدار چاہتا ہے۔“

”فیاض منگی نے صدر کے سامنے عامر نذیر اور آصفہ کی بدعنوانیوں کی فائلیں ڈھیر کر دی ہیں۔ صدر کو اب صرف اشارے کی ضرورت ہے۔“

”فیاض منگی ایجنسی کا پرانا آدمی ہے۔ لیکن وہ برلاس کا وفادار ہے۔ تمہیں اس سے ہوشیار رہنا ہو گا۔“ اکبر خان کے لہجے میں تشویش تھی۔ اس نے کچھ دیر بعد قریشی کی آنکھوں میں دیکھ کر پوچھا۔ ”سی جے اور سی این سی؟“ قریشی نے خاموشی سے سر ہلا دیا۔

”جنرل برلاس اور رضوی صدر کو مضبوط کرنا نہیں چاہتے۔ صدر نے انہیں ایکسٹینشن دینے کی مخالفت کی تھی۔ وہ ناصر بھٹی کا ذریعہ استعمال کرنے پر مصر ہیں۔“ قریشی نے کہا اور ایک لمحے کا توقف کر کے وہ بات بتائی جس کے لئے وہ خاص طور پر آیا تھا۔ ”گروپ کی مدت مکمل ہو گئی ہے۔ مجھے آج رات گروپ توڑ کر نئے گروپ کا فیصلہ کرنا ہے۔ آپ کو جنرل سعید ملک سے بات کرنی ہو گی۔ اس کی تائید کے بغیر یہ فیصلہ منوانا مشکل ہو گا۔“

اکبر خان کی آنکھوں میں ایک بار پھر چمک آ گئی۔ قریشی پر اس کی محنت بیکار نہیں گئی تھی۔ اس کا یہ اعتماد غلط نہیں تھا کہ قریشی میں مشکل فیصلے کرنے کی جرات تھی اور وہ فیصلوں پر عمل درآمد کا ہنر بھی جانتا تھا۔

"پانچ سال پہلے یہ رات مجھ پر بھی آئی تھی۔" اکبر خان نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "نیا گروپ بنانے کے لئے پرانا گروپ توڑنا آسان نہیں تھا۔ کسی کو یہ سمجھانا مشکل کام ہے کہ ان کا وقت پورا ہو چکا ہے۔ وہ اپنا کردار ادا کر چکے ہیں۔" اکبر خان نے اپنے بستر کے سرہانے رکھا ہوا قریشی کا ہاتھ تھپتھپایا۔ "تمہیں جو کرنا ہے وہ کرو۔ جنرل ملک کو مجھ پر چھوڑ دو۔"

سوچوں میں ڈوبے ہوئے قریشی نے ایک بار پھر گھڑی دیکھی تو دو بجنے والے تھے۔ اس کی کار اس وقت میٹروپول کے چوراہے پر پھنسی ہوئی تھی۔ ڈرائیور نے ہارن دے کر جگہ بنائی اور لال بتی کی پرواہ کئے بغیر سیدھا نکلا چلا گیا۔ پانچ منٹ بعد قریشی شیرٹن ہوٹل کے ریسٹورنٹ میں اعوان کو تلاش کر رہا تھا لیکن وہ اسے کہیں نظر نہیں آیا۔ ویٹر نے کونے میں پڑی ہوئی ایک میز کی طرف قریشی کی رہنمائی کی تو وہ بیٹھ کر پائپ سلگاتا ہوا حیران ہونے لگا کہ اعوان کہاں گیا۔ وہ ایک گھنٹہ دیر سے آیا تھا لیکن وہ ایک دوسرے کا دو دو تین تین گھنٹوں تک انتظار کرنے والے دوست تھے۔ دیر سے آنے پر ایک دوسرے سے لڑ سکتے تھے لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ اٹھ کر چلے گئے ہوں۔ ان کا اسکول اور کالج کے زمانے کا ساتھ تھا۔ انہوں نے سگریٹ پینا اور عشق کرنا ایک ساتھ شروع کیا تھا۔ سول سروس میں بھی ایک ساتھ آئے تھے۔ اعوان خواب دیکھنے والوں میں سے تھا۔ سول سروس کے امتحان میں بھی وہ قریشی کے مجبور کرنے سے بیٹھا تھا جو اسے خوابوں کی تعبیر حاصل کرنے کے عملی نسخے سمجھایا کرتا تھا۔ لیکن اعوان تھا کہاں؟

قریشی بجھے ہوئے پائپ کو ایش ٹرے میں ٹھونک کر خالی کرتے ہوئے بیرے کو کھانے کا آرڈر نوٹ کرا ہی رہا تھا کہ اسی وقت کرسی کھینچ کر اعوان اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

"کریلوں کا آرڈر مت دینا ورنہ کڑوا بولنے لگو گے۔" اعوان نے اپنی سانسوں پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ وہ شاید بہت تیزی سے چلتا ہوا آیا تھا۔ "لیکن ڈانٹنے سے پہلے سن لو۔ میں ایک جنازہ پڑھنے چلا گیا تھا۔ اس لئے دیر ہو گئی۔"

قریشی مسکراتا ہوا بیرے کو آرڈر نوٹ کراتا رہا۔ اسے پتہ تھا کہ اعوان کیا کھائے گا۔ اعوان موٹے شیشوں کا سنہری کمانیوں والا پروفیسروں جیسا چشمہ اتار کر صاف کرنے لگا۔ اس کے سر کے بال سفید ہو گئے تھے لیکن آج بھی پہلے کی طرح گھنے تھے۔ گھنگریالے اور الجھے ہوئے۔ ناتراشیدہ۔ قریشی نے اپنے نصف گنجے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے رشک بھری نظروں سے اعوان کی طرف دیکھ کر سوچا اس نے اعوان کے ساتھ زیادتی کی تھی۔ اسے مقابلے کے امتحان میں بیٹھنے پر مجبور نہیں کرنا چاہئے تھا۔ اس کے لئے یونیورسٹی کے استاد کی نوکری ٹھیک تھی۔ وہ شکل و صورت، حلیے، مزاج، عادت، سوچ اور فکر ہر اعتبار سے بنا بنایا پروفیسر تھا۔ اس نے اپنا ایم اے بھی فلسفے میں کیا تھا۔ فلسفہ پڑھتا اور فلسفہ پڑھاتا۔ نوکر شاہی کی دنیا میں رہ کر زندگی کی تلخ حقیقتوں سے روز اپنا سر پھوڑنے کے بجائے تصورات کی دنیا سجا کر خوش رہتا یا اپنے اوپر عاشق ہو جانے والی کسی حسین طالبہ کی انگلی پکڑ کر اسے دانشوری کے آسمانوں پر سیر کرانے لے جاتا اور اپنی رومان پسند طبیعت کو آسودہ کرتا۔

"تمہیں صدیقی صاحب یاد ہیں۔" اعوان پانی کا ایک پورا گلاس چڑھانے کے بعد بولا۔

"اچھی طرح!" قریشی نے اپنے خیالوں سے چونک کر کہا۔ "وہ کمیونی کیشن منسٹری میں میرے ساتھ جوائنٹ سیکریٹری تھے۔ ان کی اصول پسندی سے وزیر بہت نالاں تھا۔ میں نے بہت مشکل سے ان کی نوکری بچائی تھی۔"

"وہی مسٹر ایماندار!" اعوان نے کرسی کی پشت سے ٹک کر تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ان کا آج صبح انتقال ہو گیا۔"

"اوہ!" قریشی کو سچ مچ افسوس ہوا۔ "مجھے ان کا پتہ بتانا۔ میں تعزیت کرنے ان کے گھر جاؤں گا۔"

"نہ۔ نہ۔ نہ تم وہاں مت جانا۔ تمہارا ضمیر تمہیں ٹھونگے مارے گا۔" قریشی نے نظریں اٹھا کر حیرت سے اعوان کو دیکھا جو چہرے پر ایک تلخ سی مسکراہٹ سجائے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"میں پچھلے سال نیویارک میں تمہارا لانگ آئی لینڈ والا مکان دیکھ چکا ہوں۔ جس میں گرم اور سرد پانی کا سوئمنگ پول ہے، ٹینس کورٹ ہے، پیچھے بڑا سا باغ ہے جس کے آخری کونے میں ایک گوشۂ عافیت بھی بنا ہوا ہے۔ تمہارے بیٹے بتا رہے تھے وہ مکان تم نے انہیں اس وقت خرید کر دیا تھا جب وہ وہاں پڑھ رہے تھے اور اب اس کی قیمت آدھے ملین ڈالر تک پہنچ گئی ہے۔"

قریشی سوچنے لگا کہ اعوان کو ابھی پتہ نہیں ہے کہ اس نے یہ مکان چھ لاکھ ڈالر میں بیچ کر ایسٹ سائیڈ مین ہٹن کی ایک فلک توڑ عمارت میں ایک ملین ڈالر کا پینٹ ہاؤس خرید لیا ہے۔ اس کے بیٹے نواحی علاقے کی زندگی سے بیزار ہو گئے تھے۔ وہ بیچ نیویارک میں جگمگاتی روشنیوں کے درمیان رہنا چاہتے تھے۔ لیکن وہ کچھ نہیں بولااور خاموشی سے پائپ میں تمباکو بھرنے لگا۔

"تمہارے بیٹوں کو نہیں معلوم کہ انہیں امریکہ میں پڑھانے اور نیویارک میں مکان خرید کر دینے کے لئے ان کے باپ کے پاس لاکھوں ڈالر کہاں سے آئے تھے۔" اعوان کی تقریر دوبارہ شروع ہو گئی۔ "صدیقی صاحب اورنگی کی غریب بستی کے دو کمرے کے ایک چھوٹے سے مکان میں رہتے تھے۔ اس کا کرایہ بھی ان کا وہ بیٹا بھیجتا ہے جسے تم نے پولیس کے ہاتھوں مرنے سے بچایا تھا۔ وہ بھاگ کر سڈنی چلا گیا تھا اور اب وہاں ٹیکسی چلاتا ہے۔"

"میں اگر اتنا بااختیار نہ ہوتا کہ امریکہ میں مکان خرید سکوں تو صدیقی صاحب کے بیٹے کو بھی پولیس کے ہاتھوں مرنے سے نہ بچا سکتا۔ سوچو کہ وہ اورنگی کی غریب بستی کے دو کمرے والا مکان کا کرایہ بھی نہ دے پاتے تو کہاں رہتے۔ کبھی کبھی میرے کرپشن میں کوئی اچھائی بھی تلاش کر لیا کرو۔" قریشی نے مسکرا کر کہا۔

"تمہیں پتہ ہے مجھے آنے میں دیر کیوں ہوئی؟" اعوان نے قریشی کا جملہ نظر انداز کر کے اپنی بات جاری رکھی۔ "پوری بستی میں پانی کا قحط تھا۔ پانی کا ٹینکر منگوایا تھا مگر ٹینکر کے پٹھان ڈرائیور کو خوف تھا کہ مہاجر بستی میں گیا تو مارا جائے گا۔ کوئی مہاجر ڈرائیور مل نہیں رہا تھا۔ دو گھنٹے تک میت غسل کے انتظار میں پڑی رہی۔

قبرستان جانے والا آدھا راستہ کچا تھا۔ جہاں تک سڑک گئی تھی وہ بھی جگہ جگہ سے ٹوٹی اور کچے راستے سے زیادہ خراب تھی۔ صدیقی صاحب کے کئی پرانے ماتحت اپنی اپنی نئی گاڑیوں کو ٹوٹ پھوٹ سے بچانے کے لئے آدھے راستے سے پلٹ گئے۔" اعوان قریشی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مسکرایا۔ "پتہ نہیں کیوں' اس وقت مجھے نیویارک کی چکنی سڑکیں اور تمہارے لانگ آئی لینڈ والے گھر کے سوئمنگ پول کا نیلا شفاف پانی بہت یاد آیا تھا۔"

"Its a cheap shot" قریشی نے برا مانے بغیر پائپ کا دھواں اگلتے ہوئے کہا۔ اسے اعوان کی ان تقریروں کی عادت تھی۔ "صدیقی صاحب کی موت سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان کی ایمانداری کی کہانیاں بھی نئی نہیں ہیں۔ ہم بہت بار دہرا چکے ہیں۔ میری دولت کمانے کی صلاحیت سے بھی تم بہت زمانے سے واقف ہو۔ اس لئے پرانے جوڑ لگا کر نئے افسانے بنانے بند کرو اور خاموشی سے کھانا کھاؤ۔" قریشی نے پائپ بجھاتے ہوئے کہا۔ بیرا ان کی میز پر کھانا لگانے لگا تھا۔

"کریلے میں نے اپنے لئے منگائے ہیں۔ انہیں ہاتھ نہ لگانا۔ تم پہلے ہی بہت کڑوے ہو رہے ہو۔" قریشی نے اپنی پلیٹ میں سالن ڈالتے ہوئے کہا۔ اسے بہت بھوک لگی تھی۔

"یار قریشی! کل ہم بھی مر جائیں گے اور سارے خواب اسی طرح ادھورے رہ جائیں گے۔" اعوان نے کھانے کو ہاتھ نہیں لگایا۔ وہ ابھی تک صدیقی صاحب کا ماتم کر رہا تھا۔ "انہیں مٹی میں دبا کر جب فاتحہ ہونے لگی تو میں ہاتھ اٹھائے سوچ رہا تھا کہ صدیقی صاحب بہت اطمینان کی موت مرے ہوں گے۔ وہ دنیا کو بدلنے اور خواب دیکھنے والے نہیں تھے۔ ایمانداری اور اصول پسندی ان کے لئے زندگی گزارنے کا ایک طریقہ تھا۔ انہیں کوئی اور راستہ آتا ہی نہیں تھا۔ وہ بس ناک کی سیدھ میں اپنے راستے پر چلتے رہے۔ سفر ختم ہو گیا تو اطمینان کی نیند سو گئے۔" قریشی کچھ بولے بغیر نوالے چباتا ہوا اعوان کی تقریر سن رہا تھا۔

"ہم اتنے اطمینان سے نہیں مریں گے کیونکہ ہم دنیا بدلنے کی ٹھیکیداری

کرنے نکلے تھے۔ آنکھوں میں خواب اور ہاتھوں میں امیدیں سجائے۔ لیکن کیا ہوا؟ تم کہیں اور بہت آگے نکل گئے اور میں ایک چوراہے پر کھڑا سوچ رہا ہوں کہ کیا کروں۔ کہاں جاؤں۔ خواب بھوت بن کر ڈرانے لگے ہیں۔ امیدیں لمبی ناکوں والی چڑیلیں بن گئی ہیں۔ ہماری موت بہت خراب ہو گی۔ بہت خراب ہو گی۔"

"تم پر اچانک اتنی یاسیت کیوں سوار ہو گئی ہے۔" قریشی نے اپنا ہاتھ روکتے ہوئے کہا۔ "کسے پڑھ رہے ہو آج کل؟"

"میں نے پڑھنا بالکل چھوڑ دیا ہے۔" اعوان نے ہاتھ لہرا کر اعلان کیا۔ "پڑھنا وڑھنا سب بکواس ہے۔ فریب اور دھوکہ دینے والی خوشنما نقاب۔ خود لذتی کا شریفانہ طریقہ۔ تم بہت پڑھا کرتے تھے۔ فرانسیسی ادب پڑھنے کے لئے برسوں فرانسیسی سیکھی تھی۔ کہتے تھے فرانسیسی ادب انگریزی یا اردو میں پڑھنا ایسا ہے جیسے بند گردن کی بوتل سے شراب پینا اور.....".

"بے چھید کی عورت کے ساتھ زنا کرنا۔" قریشی نے مسکراتے ہوئے جملہ مکمل کیا اور پلیٹ کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ اسے پیرس میں گزاری ہوئی شامیں یاد آنے لگیں۔

"لیکن کیا ہوا؟ سارتر بھی تمہارا کچھ نہ بگاڑ سکا۔" اعوان اسے دوبارہ آج کی دنیا میں واپس لے آیا۔ "کہاں گیا تمہارا وہ فلسفہ کہ کچھ کرنے کے لئے کچھ کرنے کا اختیار حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ اختیار حاصل کر کے بھی تم نے کچھ نہیں کیا۔ توپ میں سر گھسا دیا اور دونوں ہاتھوں میں بم پکڑ لئے۔ تمہیں یہ بھی نہیں پتہ تمہارے عقب میں کیا ہو رہا ہے۔ تمہاری مقعد ننگی ہو گئی ہے۔ بالکل ننگی۔ اس پر مکھیاں بھن بھنا رہی ہیں۔ تمہیں خبر ہے؟"

"کھانے کے دوران گندی باتیں مت کرو۔" قریشی نے برا سا منہ بنایا اور سالن نکالنے کے لئے ایک اور ڈش کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن پھر کچھ سوچ کر رک گیا اور اعوان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگا۔

"میرا فلسفہ آج بھی نہیں بدلا۔ لیکن میں ڈیفنس سیکریٹری اور تم کلچر سیکریٹری

بن کر کچھ نہیں کر سکتے۔ ہم نہ توپ بدل سکتے ہیں اور نہ کلچر۔ بڑے کام کرنے کے لئے بڑے اختیار کی ضرورت ہوتی ہے۔ مکمل اختیار کی۔ جس دن یہ اختیار مل گیا تم آس پاس کی دنیا بدلی ہوئی دیکھو گے۔ بس اب بکواس بند کرو، کھانا کھاؤ اور مجھے بھی کھانے دو۔"

قریشی نے ڈش اٹھا کر اعوان کی پلیٹ میں کریلوں کا سالن الٹ دیا۔ اعوان نے کچھ کہنا چاہا لیکن پھر نظریں جھکا کر تازہ آئے ہوئے گرم نان کا بڑا سا نوالہ توڑ کر اپنے پسندیدہ سالن پر ہاتھ صاف کرنے لگا۔

قریشی سوچ رہا تھا وہ کھانا کھاتے ہی اٹھ جائے گا۔ اجلاس میں جانے سے پہلے وہ آرام کرنا چاہتا تھا۔ آج کی رات جاگنے والی تھی۔ قریشی کو معلوم تھا کہ آج کے اجلاس میں ایمان علی کے موضوع پر بھی بہت آتش بازی ہو گی۔ جلالی کے لکھے ہوئے تفصیلی تجزیئے کی کاپیاں اس نے کل ہی سب کو بھیجی تھیں۔ جنرل برلاس دو دفعہ فون کر چکا تھا لیکن قریشی نے جوابی کال نہیں کی تھی۔ آج کی رات کے آخری معرکے سے پہلے وہ جنرل برلاس سے گفتگو کرنا نہیں چاہتا تھا۔

ایمان علی کے نئے پاکستان سے اس کی شناسائی صرف جلالی کے ذریعے نہیں ہوئی تھی۔ کئی ہفتے پہلے مسز چنائے نے اسے ایمان علی کے نئے پاکستان کا پورا پلندہ بھیجا تھا۔ قریشی نے ایک شام اور رات مری کی کاٹیج میں تنہا بسر کی تھی۔ ایک ایک لفظ غور سے پڑھا تھا۔ کئی جھول تھے لیکن ایسے نہیں کہ دور نہ کئے جا سکیں۔ اس نے رپورٹیں رکھ کر بہت سالوں پرانی وہ شام یاد کی تھی جب مسز چنائے بھی اس کاٹیج میں اس کے ساتھ تھی۔ منہ میں کریلوں کی کڑواہٹ بسی تھی لیکن ہونٹوں پر ایک میٹھی سی مسکراہٹ رینگ گئی۔

مسز چنائے نے سب کچھ خفیہ رکھنے کے لئے کہا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ایمان علی کو پتہ چلے کہ وہ اس کا نیا پاکستان پرانے پاکستان کے رکھوالوں کے حوالے کر رہی تھی۔ قریشی کے پاس جلالی کا ذریعہ موجود تھا۔ جلالی نے ایمان علی کے نئے پاکستان کی بہت پرزور انداز میں وکالت کی تھی۔ قریشی کے ذہن میں اکبر خان اور اعوان سے

کئے گئے وعدوں کو پورا کرنے کا نقشہ بننے لگا تھا۔ اس نے سوچا جلالی کو ساتھ ملانے کا فیصلہ غلط نہیں تھا۔ جلالی اس کے لئے ایک قیمتی اثاثہ ثابت ہوا تھا۔ ایمان علی کے نئے پاکستان تک پہنچنے کے لئے پل کا کام بھی جلالی کو انجام دینا تھا۔

مرینہ شاہ اونگھتے ہوئے جلالی کے گال پر پیار کی مہر لگا کر تیزی سے باہر نکلی تو اس کے پیچھے دروازہ بند ہونے کی آواز جلالی کے خوابیدہ ذہن میں شور مچانے لگی۔ وہ کافی ٹیبل پر پاؤں پھیلائے صوفے پر نیم دراز تھا اور اخبار پڑھتے ہوئے جھونکے کھا رہا تھا۔ وہ ایک گھنٹے پہلے ہی گھر آیا تھا۔ ایک گھنٹے بعد اسے پھر جانا تھا اس لئے کپڑے تبدیل کئے بغیر ڈرائنگ روم میں ستانے لگا تھا۔ اس وقت اندر کمرے میں جانا ویسے بھی مشکل تھا۔ ملازمہ چھٹی پر تھی اور مرینہ باہر جانے کی تیاریوں میں کپڑوں اور جوتوں سے اٹھا پٹخ کر رہی تھی۔ جلالی کو معلوم تھا کمرے میں طوفان آیا ہوا ہوگا۔

جلالی کو حیرت ہوتی تھی کہ مرینہ کچھ نہیں کرتی تھی پھر بھی کتنی مصروف رہتی تھی۔ ہر وقت تیزی سے حرکت کرتی ہوئی جیسے گاڑی چھوٹنے والی ہو۔ آج تو اسے واقعی دیر ہو گئی تھی۔ اسے کلب جا کر سومنگ کرنی تھی' سوانا میں بیٹھ کر پسینہ بہانا اور پھر ٹھنڈے پانی کا غسل لے کر بیوٹی پارلر جانا تھا۔ بال بنوا کر اور میک اپ کروا کر سات بجے ایک دوست کو اس کے گھر سے لینا اور ساڑھے سات بجے جرمن قونصل جنرل کی بیوی کی طرف سے دیئے گئے استقبالیہ میں پہنچنا تھا۔ جلالی نے گھڑی دیکھی تو پانچ بجے تھے۔ اس نے ایک طویل انگڑائی اور گہرا سانس لیا اور مرینہ جاتے جاتے خوشبو کی جو رہگزر چھوڑ گئی تھی اس پر چل پڑا۔

شادی کو ایک سال سے زیادہ ہو گیا تھا لیکن مرینہ کی خوشبو کا سحر کم نہیں ہوا تھا۔

"ہماری شادی شرعاً" جائز نہیں ہے۔" ایک دن جلالی نے اس سے مذاق میں کہا تھا۔

"پہلے تمہاری پیٹ کی بالی نے بجلی کے جھٹکے دیئے۔ پھر تم نے اپنی خوشبو کے

سحر سے مفلوج کر دیا۔ ہمارا نکاح ہوش و حواس کی حالت میں نہیں، بالجبر ہوا ہے۔"

مرینہ نے اسی روز ٹونڈی میں پہنی ہوئی بالی کٹوا دی تھی اور جلالی سے کہا تھا۔ "جاؤ تمہیں ایک بار پھر آزاد کیا۔" لیکن وہ خوشبو کا کیا کرتی۔ ایک دن اس نے خوشبو نہیں لگائی تھی۔ لیکن اس کے جسم سے پھوٹتی ہوئی اس کی اپنی خوشبو اتنی تیز تھی کہ جلالی پر دیوانگی طاری ہو گئی تھی۔ اس دن مرینہ کو بھی جلالی پر بہت پیار آیا تھا۔ پرفیوم کا اسپرے کر کے مصنوعی خوشبوؤں کے حصار میں چلی گئی تو اس نے جلالی کو ہنستے ہوئے بتایا تھا۔

"میں خوشبو چھپانے کے لئے خوشبو لگاتی ہوں۔"

جلالی نے مرینہ سے شادی کے بعد کئی بار سوچا تھا کہ شاید وہ جذبات کی رو میں بہک گیا تھا۔ اسے جلد بازی نہیں کرنی چاہئے تھی۔ اسے پتہ تھا کہ مرینہ اونچے خواب دیکھنے اور آسمانوں پر اڑنے والی عورت ہے۔ ان کی شادی کا سفر آسان نہیں ہو گا۔ دوستوں میں چند مہینوں میں شادی ختم ہونے کی شرطیں بھی لگی تھیں۔ لیکن سب اندازے اور خدشے غلط نکلے تھے۔ مرینہ ایک اچھی بیوی ثابت ہوئی تھی۔ اس نے جلالی کے لئے کبھی کوئی مشکل کھڑی نہیں کی۔ اس کی کسی بات کو منع نہیں کیا۔ جلالی شادی کے فوری بعد اسے گاؤں لے جانا چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ ناک بھوں چڑھائے گی۔ لیکن وہ فوراً ہی مان گئی تھی بلکہ اس نے اس ایڈونچر کا پورا مزا لیا تھا۔ گاؤں والے اس شہری لڑکی کو حیرت سے دیکھتے جو پنجابی فلموں کی ہیروئن جیسے کپڑے پہنے کھیتوں کے درمیان پگڈنڈیوں پر دوڑتی پھرتی تھی۔ جلالی کی بھابھیاں اس کی دیوانی ہو گئی تھیں۔ مرینہ کو بھی واپس آنے کی جلدی نہیں تھی لیکن جلالی بھائیوں سے اہم کاموں کا بہانہ کر کے وقت سے پہلے کراچی آ گیا۔ اسے تماشا بننا پسند نہیں تھا۔

جلالی کا خیال تھا مرینہ اسلام آباد میں رہنے پر اصرار کرے گی۔ جلالی کراچی چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن مرینہ نے کوئی بحث نہیں کی۔ وہ کراچی آنے کے لئے پہلے سے تیار تھی۔ اس کے ماں باپ اپنے آبائی مکان میں رہنے پشاور چلے گئے اور مرینہ اپنی پرانی ملازمہ کو لے کر جلالی کے ساتھ کراچی آ گئی۔ کراچی اس کے لئے نیا شہر

نہیں تھا۔ اس کے پہلے شوہر انیس شمشاد کا ایک گھر اس شہر میں بھی تھا۔ وہ یہاں مستقل نہیں رہی لیکن آتی جاتی رہی تھی۔ جلالی سے شادی کر کے آئی تو اب یہی اس کا مستقل گھر تھا۔ وہ جلد ہی سماجی زندگی کی شریانوں میں تازہ خون بن کر دوڑنے لگی۔ کافی مارننگز، چیریٹی لنچ، کیک ایوننگز، یوگا، سوئمنگ اور پھر رات کو یہ مشکل کہ کس کے ڈنر پر جانا ہے اور کسے منع کرنا ہے۔ اس کے شب و روز کا ہر لمحہ کسی نہ کسی مصروفیت کی گرہ میں بندھا ہوا تھا۔ جلالی کی مانگ کم نہیں تھی۔ اس کے نام روز کسی نہ کسی سفارتی استقبالئے یا ڈنر کا دعوت نامہ ہوتا۔ پہلے وہ نہیں جاتا تھا۔ اب مرینہ کی وجہ سے جانے لگا تھا۔ وہ جانتا تھا مرینہ کو اس طرح کی دعوتوں کا کتنا شوق تھا۔

مرینہ ان دعوتوں میں کبھی شوخ بھڑکیلے کپڑے یا منی اور ہپسٹر ساڑھی پہن کر نہیں گئی۔ سفارتی استقبالیوں میں بہت لئے دیئے رہتی۔ اس نے کسی کو فلرٹ کرنے کا موقع نہیں دیا تھا۔ شادی کے بعد کبھی انیس شمشاد کا نام تک نہیں لیا تھا۔ ایک استقبالئے میں آمنا سامنا ہوا بھی تھا تو اسے نظرانداز کر کے جلالی کا بازو تھام لیا تھا اور استقبالئے میں تمام وقت جلالی کے ساتھ چپکی رہی تھی۔ جلالی ایک بدلی ہوئی مرینہ کو دیکھ کر سوچتا یہ وہ چنچل بوٹی تو نہیں ہے جس سے وہ ہنگری کے استقبالئے میں ملا تھا اور جس کے ساتھ اس نے اسلام آباد میں کئی ہنگامہ خیز دن گزارے تھے۔ ایک دن اس نے پوچھ ہی لیا۔

"میں تمہیں اپنی ہتھیلی کی لکیروں کی طرح پڑھ سکتی ہوں۔" وہ جواب میں اپنی ہتھیلی اس کے چہرے کے سامنے نچا کر مسکرائی تھی۔ "تمہاری ترقی پسندی، کشادہ ذہنی، تمہارا سارا لبرل ازم، ماڈرن ازم سب فراڈ ہے۔ اندر سے تم بدبودار قدامت پرست، سخت دقیانوسی اور جل ککڑے ہو۔" جلالی سوچنے لگا تھا ترقی یافتہ ہونے کے لئے اپنی بیوی کو کسی دوسرے کی بانہوں میں رقص کرتے دیکھ کر خوش ہونا کیوں ضروری ہے؟

جلالی کی بھا بھیوں نے پچھلے ہفتے ہی انہیں ایک خوبصورت گڑیا بھیجی تھی۔ وہ ایک سال سے ہر خط میں اچھی خبر سنانے کی فرمائش کرتی تھیں۔ مرینہ نے گڑیا کو بھینچ کر پیار کیا تھا اور اسے اپنی ڈریسنگ ٹیبل پر سجا دیا تھا۔

"سچ مچ! باپ بنو گے؟" اس نے جلالی سے پوچھا تو جلالی کو بہت سالوں پرانی وہ رات یاد آ گئی تھی جب اس نے نشے میں آ کر اعلان کیا تھا کہ ادیبوں اور صحافیوں کی بیویوں کو حاملہ نہیں ہونا چاہئے۔ اس نے مرینہ کو بھی اس رات کی کہانی سنائی تھی اور ہنس کر بات ٹال دی تھی۔ لیکن اس رات اس نے خواب میں دیکھا کہ اس کے ایک نہیں دو بچے ہیں جنہیں مرینہ اس سے چھین کر انیس شمشاد کے پاس لے گئی ہے اور وہ بندوق لئے انیس شمشاد کے گھر کے سامنے کھڑا گولیاں برسا رہا ہے۔ وہ ہڑبڑا کر جاگ گیا۔ نیلے نائٹ بلب کی مدھم روشنی میں اسے دیر تک اندھیرے چمکتے ہوئے نظر آتے رہے۔ اس نے کروٹ بدل کر ساتھ لیٹی ہوئی مرینہ کو دیکھا تھا جو بے خبر سو رہی تھی۔ اس کے بند پپوٹوں کے نیچے آنکھوں کے ڈھیلے حرکت کر رہے تھے۔ وہ بھی شاید کوئی خواب دیکھ رہی تھی۔ کوئی اچھا خواب تھا کیونکہ ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ شاید وہ بھی خواب میں انیس شمشاد کو دیکھ رہی تھی۔ جلالی نے سوچا اور اپنی سوچ پر خود ہی شرمندہ ہو کر دوبارہ سو گیا تھا۔

جلالی نے پاؤں اور اخبار سمیٹے اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ سوچوں میں ڈوبے ہوئے بہت دیر ہو گئی تھی۔ آج مہینے کی پہلی جمعرات تھی۔ مہینے کی ہر پہلی جمعرات اہم ہوتی تھی۔ لیکن آج کی رات خاص طور پر اہم تھی۔ آج جو کچھ طے ہونا تھا اس کے نتیجے میں کئی مستقبل داؤ پر لگ سکتے اور کئی سنور سکتے تھے۔ شاید اس ملک کی قسمت سنورنے کا سامان بھی نکل آئے۔ "امید!" جلالی کا ذہن گنگنایا۔ کنگھی کرتے ہوئے آئینے میں دیکھا تو کنپٹی سے کئی سفید بال جھانک رہے تھے۔ کتنا وقت گزر گیا تھا۔ شاید وقت اتنا نہیں گزرا تھا لیکن تیزی سے گزرتے ہوئے واقعات نے گزرے ہوئے وقت کا احساس بڑھا دیا تھا۔

ایک عہد تبدیل ہوتا ہے تو کئی نسلیں گزر جاتی ہیں۔ جلالی کی کنپٹی کے سفید ہوتے ہوئے چند بال بھی شاید نسلوں کے اسی سفر کا فاصلہ تھے۔ اس نے ایک ہی نسل میں رہتے ہوئے اندر ہی اندر کئی نسلیں گزار دی تھیں۔ کتنے دور بدلے یا تاریخ کے کسی پرانے باب کی طرف لوٹ گئے تھے۔ اس نے اپنی آنکھوں کے سامنے تاریخ کو

ختم ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ دنیا جو پہلے چکی کے دو پاٹوں کے درمیان پستی تھی اب ایک طاقت کے شکنجے میں کسی ہوئی تھی۔ کتنی سرحدیں ٹوٹیں اور کتنی نئی لکیریں کھنچ گئی تھیں۔ خود پاکستان آدھا ہو گیا تھا۔ یہ کل ہی کی بات تھی جب وہ کراچی کے گورنر ہاؤس میں کھڑا نشے میں دھت ننگے صدر کو سنسان سڑک پر بھاگتے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے امیدوں کو روٹی کپڑے مکان کے نعرے کی ڈور میں بندھتے اور بہت بیدردی سے ٹوٹتے دیکھا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ وقت جو ہمیشہ آگے کی طرف بڑھتا ہے پاکستان میں اس کی سوئیاں بار بار پیچھے کی طرف کیوں گھوم جاتی ہیں۔

نواب ٹن پر جب شاعری کا دورہ پڑتا تو وہ کہتا تھا اس کا افسوس یہ ہے کہ وہ غالب کے عہد میں پیدا نہیں ہوا لیکن فخر یہ ہے کہ وہ اس دور میں زندہ ہے جس میں اس نے فیض اور فراز کو دیکھا' سنا اور محسوس کیا ہے۔ جلالی جو زمانوں کو سیاست کی عینک لگا کر دیکھتا تھا' سوچتا وہ ایک ایسے عہد میں کیوں زندہ ہے جس میں بار بار عامر نذیر اور ریاض توصیف جیسے افسوس کے مقام آتے ہیں۔ عامر نذیر سوکھی روٹی' پھٹا ہوا کپڑا اور ٹوٹے ہوئے مکان کی وراثت لے کر آیا اور مسٹر ٹین پرسنٹ بن کر نکالا گیا۔ ریاض توصیف کے لوہا کوٹنے کا زمانہ آیا لیکن اس کے اقتدار کی کشتی بھی گڈانی کے ساحل پر توڑے جانے والے جہاز کی طرح ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ عامر نذیر ٹین پرسنٹ سے ترقی کر کے اب سو فیصد بنا بیٹھا تھا۔ صدر اس کا اور جج بھی اس کے تھے۔ لیکن اقتدار مافیا نے ایک بار پھر اس کی چھٹی کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ریاض توصیف ایک بار پھر اپنی شیروانی ہاتھ میں لئے کھڑا تھا۔ جلالی کو پتہ تھا آج کی رات فیصلہ کن رات تھی۔ آج طے ہونا تھا کہ اس ملک کو صرف لوہار اور کمیشن ایجنٹ بیچتے اور کھاتے رہیں گے یا امید کی کوئی کرن بھی کبھی مقدر بن کر جگمگائے گی؟ اسے وہ رات یاد تھی جب اتفاقاً" اس پر اقتدار مافیا کے راز کا انکشاف ہوا تھا۔ اس رات بھی عامر نذیر کی چھٹی کرنے کا فیصلہ ہوا تھا۔ کیا آج رات بھی.....؟

جلالی کو آج اپنے حواس اور ریکارڈنگ کے آلات درست رکھنے تھے۔ وہ نواب ٹن کے خفیہ کمرے میں بیٹھ کر اقتدار مافیا کے اجلاس کی کارروائی سنے گا اور

ریکارڈ کرے گا۔ جلالی نے سوچا انہونی بھی ہو گئی تھی۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ایک دن وہ خود اقتدار مافیا کے لئے کام کرے گا۔ وہی اقتدار مافیا جو اس کی لاش بوری میں بند کر کے سڑک پر پھینکنے والی تھی لیکن جس نے ایک احسان چکانے کے لئے اسے سفارتکار بنا کر ہنگری بھیج دیا تھا۔ جلالی نے ٹائی کی گرہ ٹھیک کرتے ہوئے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ جیسے چہرے سے کوئی نقاب اتار رہا ہو۔ لیکن نقاب اتارنا اتنا آسان نہیں تھا۔ نواب ٹن اور قریشی نے جب اسے اقتدار مافیا کی یہ نقاب پہنائی تھی وہ منع نہیں کر سکا تھا۔ اس نے گردن اٹھا کر شیشے میں دیکھا اور اطمینان کی گہری سانس لی۔ یہ لوہے کی نقاب نہیں تھی۔ اسے سر جھکانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہ پہلے کی طرح ہلکا پھلکا تھا۔ اس کے ضمیر پر کوئی بوجھ نہیں تھا۔

جلالی نے سوچا پچھلے ایک سال میں اس کی زندگی کا ہر زاویہ بدل گیا تھا۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ شادی کرے گا لیکن مرینہ اس کی زندگی میں آ گئی تھی۔ دوسری طرف نواب ٹن نے اسے اقتدار مافیا سے چپکا کر اس کی زندگی کا رخ موڑ دیا تھا۔ اس ایک سال کا ہر واقعہ اسے کل کی طرح یاد تھا۔

جلالی اسلام آباد کے سفر سے واپس آیا تو ابل رہا تھا۔ ابال نکالنے کی ایک ہی جگہ تھی۔ لیکن نواب ٹن کی رزم گاہ آج کل سنسان تھی۔ وہ کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ اسے یقین تھا جب نواب ٹن سنے گا کہ اس نے اپنی محبت کی ایک تصویر مکمل کر لی ہے اور وہ مرینہ سے شادی کر رہا ہے تو خوشی سے اچھل پڑے گا۔ اس نے سوچا وہ نواب ٹن کو ایمان علی کے نئے پاکستان کے بارے میں بھی بتائے گا۔ اسے پتہ تھا نواب ٹن اس کا کس طرح مذاق اڑائے گا۔ جلالی کے دونوں اندازے اس کی توقع کے بالکل برعکس نکلے۔

ایک ہفتے بعد نواب ٹن واپس آ گیا اور رزم گاہ میں اکیلا بیٹھا چاندی کے کٹورے میں بھنگ پی رہا تھا۔

''میں اگست کے مہینے میں انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہو کر پکا قوم پرست ہو

جاتا ہوں۔" نواب ٹن نے اس کی طرف بھی ایک کٹورہ بڑھایا۔ "تم بھی پیو۔ اپنے سامنے گھٹوائی ہے۔ گھوٹنے والے موصل نے جو گھنگرو پہنے تھے ان کی چھن چھن ہر گھونٹ میں بسی ہوئی ہے۔ حلق میں اترتے ہی گھنگرو بج اٹھیں گے۔"

"نہیں نواب صاحب۔ مجھے بھنگی بننے کا کوئی شوق نہیں ہے۔"

"ہاہاہا۔" نواب ٹن نے ہاتھ بلند کر کے ایک زور کا قہقہہ لگایا۔ "غیر طبقاتی سماج کے مبلغ، مارکسسٹ انقلابی، ذہین جلالی تمہارا بھی پول کھل گیا۔ تم بھی ایک نمبر کے فراڈ ہو۔ بھنگی کو کم ذات سمجھنے والے رتبہ پرست!" جلالی نے جواب نہیں دیا۔ صرف مسکرا کر رہ گیا۔ اسے پتہ تھا بھنگ کے نشے کا رخ انقلاب کی طرف ہو گیا ہے۔ آج انقلابیوں کی خیر نہیں تھی۔

"تم ظفریاب خان کو جانتے ہو؟" نواب ٹن نے بھنگ کا ایک بڑا سا گھونٹ بھر کر پوچھا۔ جلالی کے جواب دینے سے پہلے ہی کہنے لگا۔ "وہی ہاری مزدور پارٹی کا صدر جس کی پارٹی میں کوئی کسان یا مزدور نہیں ہے۔ وہ میرا قلندری زمانے کا دوست ہے۔ ایک دن اس نے مجھے شراب پلانے اپنے گھر بلایا۔ کلفٹن میں اس نے اپنے دو ہزار گز کے محل نما مکان میں دوسری منزل کے ٹیرس پر کھلی ہوا میں محفل جمائی۔ پہلے کراچی کے موسم کا رونا روتا رہا۔ دن بھر ایئر کنڈیشنڈ میں رہنے سے اسے زکام ہو گیا تھا اور اب سمندری ہوا کی نمی اسے تنگ کر رہی تھی۔ بہت دیر یورپ کے برفانی موسموں کو یاد کر کے خوش ہوتا رہا۔ نوکر کو برف لانے میں دیر ہو گئی تو بلیک لیبل کا جام بناتے ہوئے اچھے نوکروں کی کمی کی شکایت کرنے لگا۔ نوکر ڈانٹ کھا کر چلا گیا تو اس ریشم کے خواص گنوائے جس کا بنا ہوا گاؤن وہ پہنے ہوئے تھا اور جو اس کی بیوی پچھلے ہفتے اس کے لئے پیرس سے خرید کر لائی تھی۔ اس کے بعد اس نے اپنے ڈنہل پائپ کو ڈنہل کے ہی سنہرے لائٹر سے سلگایا اور ایک بڑا اباؤٹ ٹرن لے کر سرمایہ داری کے خلاف تقریر شروع کر دی۔ نیچے اس کی بیوی گھر کی پُتائی کرنے والے ایک مزدور سے چیخ چیخ کر لڑ رہی تھی اور اسے حرامخور قرار دے کر اس کی آدھی مزدوری کاٹنے کی دھمکی دے رہی تھی۔ اس کی آواز اوپر تک آ رہی تھی لیکن ظفریاب خان

اس سے بے نیاز مجھے لینن کے اقوال سنا رہا تھا۔ میں نے انقلاب زندہ باد کا ایک زوردار نعرہ لگایا تو مزدور اپنی آدھی مزدوری بھی چھوڑ بھاگا۔ تمہیں پتہ ہے مزدور انقلاب کے نعروں سے کتنا ڈرتے ہیں؟" جلالی ہنسنے لگا لیکن نواب ٹن برے برے منہ بنا رہا تھا۔

"نواب صاحب! ترقی پسندوں کا برے حال' خستہ تن اور خالی پیٹ ہونا کیوں ضروری ہے؟" جلالی نے سنجیدہ ہو کر پوچھا۔

"بہت ضروری ہے۔ اور یہ میں نہیں تمہارے اس گرو گھنٹال کا کہنا ہے جسے تم کبھی انقلابیوں کا دیوتا سمجھتے تھے۔" نواب ٹن نے بڑا سا گھونٹ لے کر کٹورہ خالی کرتے ہوئے کہا۔ "بہت سالوں پرانی بات ہے کامریڈ غلیل عیار مجھے بازار میں مل گیا اور ڈنر کھلانے کی ضد کرنے لگا۔ اس کا خیال تھا میں اسے انٹرکان کی یونین دلوا سکتا ہوں۔ ہم کھڑے بات کر رہے تھے کہ اس کا ایک کل وقتی کامریڈ آ گیا جو سندھ کے کسی اندرونی علاقے میں کسانوں کو منظم کرنے کا کام کرتا تھا اور بسوں میں دھکے کھاتا ہوا اسی وقت کراچی پہنچا تھا۔ سر دھول میں اٹا ہوا' میلے کپڑے۔ کئی دن کا بڑھا ہوا شیو لیکن آنکھوں میں ایسی چمک جیسے پوری دنیا اس کی ہو۔ وہ غلیل عیار کو اندرون سندھ ابھرنے والی تحریک کا احوال سناتا رہا اور پھر جاتے جاتے کہنے لگا کہ اس نے کئی دن سے پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا ہے' اسے کچھ پیسے چاہئیں۔ کامریڈ نے جیب سے دو روپے نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھے اور اس کی پیٹھ تھپک کر اسے رخصت کیا۔ مجھے آج بھی اس کی چال یاد ہے۔ وہ ایک بھوکے شخص کی چال نہیں تھی۔ ایسا لگتا تھا کوئی جرنیل قلعے پر دھاوا بولنے جا رہا ہو۔ غلیل عیار نے ایک اچھے ہوٹل میں مجھے کھانا کھلایا اور وہ جب ایک سو چالیس روپے کا بل دے کر باہر نکلا تو میں نے کہا اپنے بھوکے کامریڈ کو بھی روک لیتے اور کھانا کھلا کر بھیجتے۔ تمہیں پتہ ہے غلیل عیار نے کیا کہا؟"

جلالی کچھ نہیں بولا۔ اسے پتہ تھا۔ نواب ٹن ایک لمحہ توقف کر کے اسے بتانے لگا۔

"غلیل نے کہا اسے کھانے پر روک لیتا تو وہ بھرے پیٹ گھر جا کر اطمینان کی نیند سو جاتا اور ساتھ ہی اس کی انقلابی روح بھی سو جاتی۔ بھوک کے خلاف جہاد کے لئے بھوک کا گہرا ادراک ضروری ہے۔ میں نے زور سے انقلاب زندہ باد کا نعرہ لگایا تو کامریڈ غلیل عیار بھی ڈر کے بھاگ گیا۔" اس بار جلالی کو ہنسی نہیں آئی۔ اس نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔ لیکن نواب ٹن نے موضوع بدلا تو حیرت سے اس کا سر دوبارہ اٹھ گیا۔

"انقلاب کو چھوڑو۔ یہ بتاؤ مرینہ شاہ سے تمہارا عشق کس مرحلے میں ہے۔"

"آپ کو کیسے معلوم؟"

"میں دیوار کی دوسری طرف ہونے والی سرگوشی بھی سن لیتا ہوں۔ تمہارے عشق کا تو نقارہ بج رہا ہے۔ یہ بتاؤ صرف ملنا جلنا ہوا یا.....؟"

"نواب صاحب میں مرینہ شاہ سے شادی کر رہا ہوں؟" جلالی نے اس کی بات کاٹ کر غصے سے کہا۔

"پاگل ہو گئے ہو!" نواب ٹن اس سے زیادہ تیز لہجے میں غرایا۔ لیکن پھر سمجھانے والے انداز میں کہنے لگا۔ "وہ تمہیں استعمال کر رہی ہے۔ سب کو پتہ ہے وہ انیس شمشاد کو......"

"مجھے بھی پتہ ہے۔ مرینہ نے مجھے خود بتایا تھا۔" جلالی نے اس کی بات ایک بار پھر کاٹ دی۔ "نواب صاحب ہم نے شادی کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس موضوع پر اب کوئی بات نہیں ہو گی۔"

نواب ٹن نے کچھ کہنا چاہا لیکن پھر خاموش ہو گیا۔ بحث کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ خود اس نے ہی تو آنکھوں کی سوئیاں نکال کر تصویر مکمل کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ جلالی عاقل و بالغ تھا۔ اسے اپنے فیصلے خود کرنے تھے۔ اپنے تجربے سے خود سیکھنا تھا۔

"چلو یہ کام بھی ہوا۔ لیکن کب؟ سہرے کے پھول کب کھلاؤ گے۔"

"جب آپ کہیں گے۔ میرے سرپرست آپ ہیں۔ یہ کام بھی آپ کو ہی کرنا ہے۔"

"جب کہو۔ جب کہو۔" نواب ٹن نے کہا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ جیسے اس موضوع پر بات ختم ہو گئی ہو۔ جلالی بھی موضوع بدلنا چاہتا تھا۔ وہ نواب ٹن کو ایمان علی کے نئے پاکستان کے بارے میں بتانے لگا۔

"ایمان علی کو یقین ہے کہ میری بہت اعلیٰ ذرائع تک پہنچ ہے۔" جلالی نے مسکرا کر کہا۔ "وہ چاہتا ہے کہ میں اس کے اور ان اعلیٰ ذرائع کے درمیان پل بن جاؤں تاکہ وہ انہیں اپنا نئے پاکستان کا نقشہ دکھا سکے اور دو سال کے لئے حکومت حاصل کر کے سب کچھ ٹھیک ٹھاک کر دے۔ الہ دین کے جن کی طرح۔" جلالی کو نواب ٹن کا ردعمل دیکھ کر بہت حیرت ہوئی۔ نواب ٹن بہت سنجیدہ ہو گیا تھا اور براہ راست جلالی کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔

"تو پھر تم نے کیا کیا؟"

"میں نے؟ میں کیا کرتا۔ اٹھ کر چلا آیا۔"

"کیوں؟ کیا ایمان علی کا نیا پاکستان تمہیں پسند نہیں آیا؟"

"ایمان علی کا نیا پاکستان سچ مچ سونے چاندی کا بنا ہوا ہے۔ یہ میں نے ایمان علی کو بھی بتایا تھا۔" جلالی نے بہت جوشیلے لہجے میں کہا۔ "لیکن اس کے سارے منصوبے صرف کاغذ پر لکھے رہ جائیں گے۔ اس نے ہر طاقت پر ضرب لگانے کا پروگرام بنایا ہے۔ صنعتکار۔ جاگیردار۔ فوج۔ نوکر شاہی۔ سیاستدان۔ مذہبی ادارے جنہوں نے ملک کو اس انجام تک پہنچایا ہے۔ وہ مل کر ہنگامہ کھڑا کر دیں گے۔ پورا ملک افراتفری کا شکار ہو جائے گا۔ ایمان علی کا پاکستان ایک ناممکن پاکستان ہے۔"

"جلالی! تم واقعی ایک ڈھونگی شخص ہو۔ محض تقریریں کرنے والے ایک بے عمل انسان۔" نواب ٹن کا لہجہ بہت نوکیلا تھا۔ "تم نے بہت بڑے بڑے مکالمے بولے تھے۔ امید تلاش کرنے اور امید ڈھونڈنے کے بڑے بڑے دعوے کئے تھے۔ امید ڈھونڈنے کے لئے اپنے اس عشق کو قربان کر آئے جس نے تمہارے لئے جان تک دے دی تھی۔ اور جب امید خود تمہاری انگلی پکڑے تمہیں اپنے گھر لے گئی تو ہاتھ چھڑا کر ایک فلرٹ سے عشق کرنے چلے گئے۔"

"نواب صاحب....."

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ تمہارا یہ عشق بھی فرشتوں جیسا ہے۔ لیکن امید کا کیا ہوا۔ وہ ملی تو اس سے کترا کر کیوں نکل آئے؟"

"وہ ایک بے نتیجہ رہ جانے والی امید ہے۔ محض ایک خواب۔ ایمان علی کا دیکھا ہوا خواب۔"

"امید چوراہے پر رکھی ہوئی پکی پکائی ہانڈی نہیں ہے کہ پسند آئی تو اٹھا کر کھا لو اور دل چاہا تو چھوڑ کر لے آئے۔ امید افیم کی گولی بھی نہیں ہے کہ کھائی اور سو گئے۔ پہلے خواب دیکھنا پڑتا ہے۔ انہیں پالنا پڑتا اور پھر ان کے لئے لڑنا پڑتا ہے۔ جتنا بڑا آدرش ہوگا اتنی بڑی لڑائی بھی لڑنا پڑے گی۔"

"لیکن....."

"جو لیکن میں اٹکے رہتے ہیں وہ امید نہیں پاتے۔"

"الٹا چور کوتوال کو سبق پڑھا رہا ہے۔" جلالی سے اب غصہ برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ "آپ اس ٹولے کے محافظ ہو جو امید کا سب سے بڑا دشمن ہے اور آپ ہی مجھے لڑنے کی شہ بھی دے رہے ہو۔ ڈھونگی آپ ہو کہ میں؟"

"دشمن کو زیر کرنے کا سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ اسے دوست بنا لو۔"

"مجھے پتہ ہے۔ میں نے بھی پڑھا ہے۔ لیکن اقتدار مافیا دشمن نہیں ہے ایک عفریت ہے۔ شیطانی کارخانہ ہے جو نئے نئے سانچوں میں حکومتوں کے بت تراشتا ہے۔ لیکن اب اس کے پاس دو سانچے رہ گئے ہیں۔ جلد ہی صرف ایک سانچہ رہ جائے گا۔ جس دن ایسا ہوا آپ کے شیطانی کارخانے کی ساری مشینیں ٹوٹ جائیں گی۔ یہ ذہین جلالی کا تجزیہ ہے نواب صاحب! اسے لکھ کر رکھ لو۔" جلالی نے ایک لمحے کے لئے توقف کیا اور پھر طنزیہ لہجے میں کہنے لگا۔ "اب آپ کہو گے کہ میں بھی اس شیطانی چکر کا حصہ بن جاؤں۔ اقتدار مافیا میں شامل ہو جاؤں۔"

"ہاں میں یہی کہوں گا۔" نواب ٹن نے سرد لہجے میں کہا۔ "تم اقتدار مافیا میں شامل ہو جاؤ۔ اور تمہیں شامل ہونا پڑے گا۔" جلالی حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ نواب

ٹن نے اٹھ کر رزم گاہ کا دروازہ بند کر کے اندر سے مقفل کیا اور دوبارہ واپس جا کر اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔

"یہ میری نہیں قریشی کی تجویز ہے۔" نواب ٹن نے کچھ دیر خاموش رہ کر کہا۔

"ہوں!" جلالی نواب ٹن کی آنکھوں میں دیکھ کر غرایا۔ "دروازے کے باہر پہریدار کھڑا ہو گیا ہو گا اور اب آپ پستول میری کنپٹی پر رکھ کر اقتدار مافیا کے لئے حلف اٹھوائیں گے یا ملک بدر کر دیں گے۔ نواب صاحب! آپ میری لاش بوری میں بند کر کے پھنکوا دیجئے۔ میں اس بار آپ کی یا قریشی کی بات نہیں مانوں گا۔" جلالی غصے میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"چھلانگیں مت لگاؤ۔ باہر کوئی پہریدار نہیں ہے نہ کوئی تمہاری کنپٹی پر پستول رکھ رہا ہے۔" نواب ٹن کے لہجے میں بہت بیزاری تھی۔ "دروازہ کھول کر باہر جاؤ اور دیکھ آؤ۔" جلالی نے کچھ نہیں کہا اور خاموشی سے بیٹھ گیا۔ اسے دیکھنا تھا اقتدار مافیا کی پٹاری میں سے آج اس کے لئے کیا نکلتا ہے۔

"ہم تم سے وہی کام لیں گے جو تم کرتے ہو۔ تم ابھی ابھی جو تجزیہ لکھ کر دے رہے تھے وہی لکھو گے۔ ہمیں ایک تجزیہ نگار کی ضرورت ہے اور تم سے اچھا تجزیہ نگار ہمیں نہیں ملے گا۔" جلالی کچھ نہیں بولا۔ اسی طرح دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا رہا۔

"ایجنسیوں کے ماہرین جو بریف بنا کر بھیجتے ہیں ہم ان سے تنگ آ گئے ہیں۔ تم امریکیوں کے بھیجے ہوئے تجزیئے پڑھو گے تو ہنس پڑو گے۔ ان تجزیوں نے ہم سے بار بار ریاض توصیف اور عامر نذیر کی غلطیاں کرائی ہیں۔ ہمیں ایک بے لاگ اور ایسا تجزیہ چاہئے جو صحیح سیاق و سباق میں لکھا گیا ہو۔ تمہارا تجزیہ چھپے گا نہیں لیکن اس کی پہنچ واشنگٹن کے ڈیٹا بیس Data base تک ہو گی۔ پیسے بھی اچھے ملیں گے۔"

"آپ کو پتہ ہے مجھے زیادہ پیسے کمانے کی کوئی خواہش نہیں ہے۔ وہ بھی ضمیر کا سودا کر کے۔"

"ضمیر کا سودا نہیں ہو رہا۔" نواب ٹن نے غصے سے کہا۔ "ہر ہفتے تمہارا کالم

چھپتا ہے جسے چور، اسمگلر، ڈاکو اور لٹیرے بھی پڑھتے ہیں۔ اس سے تمہارے ضمیر کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ تم سے کوئی یہ نہیں کہے گا کہ کیا لکھو یا کیا زاویہ لگاؤ۔ ہمیں صرف تمہارا دیانت دارانہ تجزیہ چاہئے جو پالیسی بنانے والوں کا ذہنی توازن درست رکھ سکے اور وہ بہتر فیصلے کر سکیں۔"

"آپ کے لوگوں کا ذہنی توازن کبھی ٹھیک نہیں ہو گا۔ وہ صرف اپنے مفادات کے پلڑے میں بیٹھے رہنے والے لوگ ہیں۔" جلالی آہستہ آہستہ اپنے غصے پر قابو پا رہا تھا۔ "آپ کے دوست تجزیے پڑھ کر فیصلے نہیں کرتے۔ انہیں تو دیوار پر لکھی ہوئی تحریر پڑھنا بھی نہیں آتی۔ ان کے فیصلے ان کے اپنے مفادات کے مطابق ہوں گے۔ انہیں ایسے تجزیے چاہئیں جو ان کے فیصلوں کی تصدیق کر سکیں۔ وہ بری خبر لانے والے کو گولی مار دینے والے لوگ ہیں۔"

"تمہیں کوئی گولی نہیں مار سکے گا۔ تم ہمارا ایک بے نام چہرہ ہو گے۔ تمہاری شناخت ہمارے گروپ کے کسی رکن پر ظاہر نہیں ہو گی۔" نواب ٹن نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "قریشی کی تجویز کو اکبر خان کی پوری تائید حاصل ہے۔ ہم تینوں کے علاوہ تمہارے بارے میں کسی کو پتہ نہیں ہو گا۔"

"مجھے اس ملک کو تباہی کے دہانے تک پہنچانے والوں کا کھلونا بننے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے" جلالی نے یقین کے ساتھ کہا۔ "مجھے اقتدار مافیا سے بے نام تعلق بھی پسند نہیں ہے۔ میں آپ کو منع کر رہا ہوں۔ صاف صاف اور دو ٹوک الفاظ میں۔ اس بارے میں اب پلیز مجھ سے کوئی بات نہ کریں۔" جلالی اپنے اعصاب کا تناؤ ختم کر کے بہت ہلکا پھلکا ہو گیا۔

"قریشی اگلے ہفتے آ رہا ہے۔" نواب ٹن نے جیسے جلالی کی بات سنی ہی نہیں۔ "تم اس سے ملنے کے بعد فیصلہ کرنا۔ لیکن ذہن کو بند کر کے نہیں کھلا رکھ کر سوچنا اور میری بات یاد رکھنا۔ اقتدار مافیا امید تک پہنچنے کا نسبتاً" آسان ذریعہ ہے۔ ہر دوسرا راستہ بہت پیچ دار اور بہت مشکل اور ناممکن ہے۔"

جلالی اگلے ہفتے نواب ٹن کے ڈرائنگ روم میں قریشی کے سامنے بیٹھا اسے

پائپ کا دھواں اڑاتے دیکھ رہا تھا۔

"نواب صاحب نے بتایا تھا آپ امید ڈھونڈ رہے ہیں۔" قریشی نے مسکراتے ہوئے گفتگو کا آغاز کیا۔ "اس تلاش میں آپ تنہا نہیں ہیں۔"

"جی ہاں۔ نواب صاحب نے بھی مجھ سے یہی کہا تھا۔" جلالی کو خود اپنی آواز بہت دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

"انہوں نے غلط نہیں کہا تھا۔ لیکن......." قریشی کچھ کہتے کہتے رک گیا اور جلالی کو غور سے دیکھنے لگا۔ "آپ اتنے تناؤ میں کیوں ہیں؟ دیکھئے ہم یہاں دلیلوں کی جنگ لڑنے یا جیتنے ہارنے نہیں آئے۔ آپ پر کوئی دباؤ نہیں ہے۔ آپ چاہیں تو میری بات سنے بغیر ابھی جا سکتے ہیں۔" جلالی نے کوئی حرکت نہیں کی۔ "!Be easy آپ دوستوں کے درمیان ہیں۔ نواب صاحب انہیں ڈرنک دیجئے اور ایک مجھے بھی۔" قریشی نے نواب ٹن کی طرف اپنا خالی گلاس بڑھاتے ہوئے کہا۔

جب تک نواب ٹن نے ان کے ہاتھوں میں گلاس دیئے قریشی خاموش بیٹھا اپنا پائپ بھرتا رہا۔ جلالی نے بھی دو گہرے گھونٹ لے کر سگریٹ سلگایا اور اپنے اعصاب ڈھیلے چھوڑ دیئے۔ قریشی صحیح کہہ رہا تھا۔ وہ خواہ مخواہ اس طرح بیٹھا تھا جیسے ہونے والے سسر کو انٹرویو دینے آیا ہو۔

"میں نے بہت پہلے ایک فرانسیسی ادیب کی کہانی پڑھی تھی۔ اس زمانے کی جب فرانس کا نیا ناول لکھا جانا شروع ہوا تھا۔ لکھنے والے کا نام اچھی طرح یاد نہیں۔ شاید مارسل آئم تھا یا کچھ اور۔" قریشی تازہ بھرے ہوئے گلاس اور پائپ کا مزا لیتے ہوئے صوفے پر اور پھیل کر بیٹھ گیا۔

"یہ پیرس کے شمال میں دریائے لوری کے کنارے رہنے والے ایک قصباتی کلرک کی بیوی کی کہانی ہے۔" اس نے کسی پیشہ ور داستان گو کی طرح کہانی شروع کی۔ "وہ ایک گھریلو عورت تھی۔ بے حد خوبصورت اور وفاشعار۔ اس کی پوری زندگی اپنے شوہر کے گرد گھومتی تھی۔ دن بھر گھر کے کاموں میں مصروف رہتی اور کہیں باہر

جاتی تو اپنے شوہر کے ساتھ۔ کبھی دریا کے پھیلے ہوئے باغ میں ٹہلنے یا کسی شام اپنے شوہر کے اس افسر کے گھر جس کی خوشنودی اس کے شوہر کی ترقی کے لئے بہت ضروری تھی۔

"اس عورت کو قدرت نے ایک عجیب طاقت دی تھی۔ وہ اپنے وجود سے کئی وجود پیدا کر سکتی تھی۔ اس کے وجود کا ہر حصہ بالکل اس کا اپنا عکس ہوتا تھا۔ بے حد خوبصورت۔ ایک جیتا جاگتا وجود۔ وہ خود اپنے گھر میں اور اپنے شوہر کے پاس ہوتی لیکن اس کا کوئی اور وجود کہیں بھی جا سکتا تھا۔ کہیں بھی رہ کر کچھ بھی کر سکتا تھا۔ اسے چاندنی رات میں دریا کے کنارے ٹھنڈی ریت پر لیٹنا بہت پسند تھا۔ رات کو جب وہ اپنے شوہر کی درد کرتی کمر کو گرم پانی کی بوتل سے سینکتی تو اس کا ایک وجود دریا کے کنارے ریت پر لوٹتا ہوا چاندنی رات کے مزے لیتا۔ پانی میں اٹھکیلیاں کرتے ہوئے چاند کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں تشنگی بھر جاتی۔ بستر پر اس کے برابر لیٹا ہوا اس کا شوہر برابر میں لیٹی ہوئی اپنی بیوی کا چہرہ دیکھتا تو حیران ہو کر سوچنے لگتا کہ اس کی آنکھیں کبھی کبھی اتنی خوبصورت کیوں ہو جاتی ہیں۔

"ایسی ہی ایک چاندنی رات میں اس کے اس دوسرے وجود کی ملاقات ایک خستہ حال نوجوان مصور سے ہو گئی جو شراب اور منشیات میں پناہ ڈھونڈ رہا تھا۔ اس کا وجود مصور کی محبت میں گرفتار ہو کر اسی کے ساتھ رہنے لگا۔ اس کے شوہر کو اپنے ساتھ لیٹی ہوئی بیوی کی آنکھیں کچھ اور حسین نظر آنے لگیں۔ لیکن وہ نوجوان مصور کسی بھی فرانسیسی کی طرح بے وفا نکلا۔ ایک رات مصور ایک ماڈل کی تصویر بنانے کی کوشش کر رہا تھا اور وہ دریا کے کنارے چاندنی کا غسل لے رہی تھی۔ بادلوں نے اچانک آ کر چاند کو چھپا لیا تو وہ وقت سے پہلے گھر آ گئی۔ گھر آ کر اس نے دیکھا کہ کینوس اسی طرح سادہ پڑا تھا اور ماڈل مصور کے ساتھ بستر میں تھی۔ اس کا دل ٹوٹ گیا اور وہ اسی وقت مصور کو چھوڑ کر چلی گئی۔ اس کا وجود اسی طرح دریا کے کنارے چاندنی راتوں میں بھٹک رہا تھا کہ انگلینڈ کا ایک معمر مگر بہت امیر جاگیردار اسے دیکھ کر اس پر عاشق ہو گیا اور شادی کر کے اسے اپنے ساتھ انگلینڈ لے گیا۔ اس کا وجود اب

ایک بہت عالیشان محل میں رہنے لگا تھا جہاں نوکروں کی فوج اور آرام و آسائش کا ہر سامان موجود تھا۔ دوسری طرف وہ خود فرانس کے اسی قصبے میں پہلے سے زیادہ تندہی سے گھر کے کام اور شوہر کی خدمت میں مصروف تھی۔

"انگلینڈ میں رہنے والا اس کا وجود ایک دن اپنے ڈر-لنگ روم میں کسی فیشن ہاؤس سے آنے والے نئے کپڑوں کے جوڑے پہن کر دیکھ رہا تھا۔ کپڑوں کے کئی جوڑے تھے اور اسے پہن کر دیکھنے کی بیتابی تھی۔ اس کے وجود نے چار نئے وجود پیدا کیئے اور وہ انہیں کپڑوں کے مختلف جوڑے پہنا کر دیکھنے لگی۔ اسی وقت بوڑھا لارڈ اندر داخل ہوا اور اپنی بیوی کے ساتھ چار ایسی عورتوں کو دیکھ کر حیران رہ گیا جو اس کی ہم شکل اور اسی کی طرح خوبصورت تھیں۔ اس کی بیوی نے بتایا وہ اس کی بہنیں ہیں جو اس سے ملنے فرانس سے آئی ہیں۔ وہ چاروں وجود بھی اس محل میں رہنے لگے اور جلد ہی اپنی خوبصورتی' خوش مزاجی اور خوش لباسی سے مقبول ہو گئے۔ چاروں نے وہیں شادیاں کیں اور بوڑھے جاگیرداروں کی دولت اور نوجوان خادموں کے ذریعے لذت اور آسودگی کے حصول کے کھیل میں شامل ہو گئیں۔"

قریشی نے خاموش ہو کر جلالی اور نواب ٹن کو دیکھا جو کچھ دلچسپی اور کچھ تجسس کے ساتھ اس کہانی کو سن رہے تھے۔

"یہ ایک طویل کہانی ہے لیکن میں اسے مختصر کر کے ختم کرتا ہوں۔" اس نے ایک بڑا سا گھونٹ لے کر پھر بولنا شروع کیا۔ "یہ وجود صرف پانچ نہیں رہے۔ وجود در وجود پھیلتے گئے اور ایک وقت آیا فرانس کے ایک قصبے میں رہنے والی خدمت گزار اور وفا شعار عورت کے ہزاروں وجود ہوس کا جال بن کر پوری دنیا میں پھیل گئے۔ کھیل کی قسمیں اور شکلیں الگ الگ تھیں لیکن مقصد سب کا ایک ہی تھا۔ مفاد' لذت اور آسودگی کا حصول۔ اپنے جیسے ہزاروں روپ پیدا کرنے والی بھی لذت اور آسودگی کے ہر احساس کا مزا لے رہی تھی۔ آسودگیاں اس کے نہ چاہتے ہوئے بھی اس تک پہنچتیں اور اسے لگتا جیسے وہ لذتوں کے ایک سمندر میں ڈوب گئی ہو۔ لیکن وہ خود ایک گھریلو عورت کی طرح اپنے بیمار شوہر کی خدمت میں مصروف تھی جسے اس

کے افسر نے ایک دن خوش ہو کر ترقی بھی دے دی تھی۔ اس کا شوہر کبھی کبھی نظریں اٹھا کر اپنی بیوی کو دیکھتا تو مبہوت ہو جاتا۔ اسے لگتا جیسے اس کی بیوی کے چہرے کے گرد پاکیزگی نے ایک ہالہ سا بنا دیا ہو اور آنکھوں میں پرانی شرابوں کے بیرل کھل گئے ہوں۔ دن اسی طرح گزرتے اور اسے آسودہ مگر اداس کرتے رہے۔ گناہ کا احساس اسے بے چین کرنے لگا تھا۔ وہ ایک نیک اور شوہر پرست عورت تھی جبکہ لذتوں کے حصول کا کھیل معاشرتی روایتوں اور اقدار کا پابند نہیں تھا۔ اس کا ہر وجود اپنے اپنے طور پر خود مختار اور نئے وجود بنانے پر قادر تھا۔ آخر اس نے ایک دن اس کھیل کو ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔"

قریشی نے خاموش ہو کر دونوں کو دیکھا جن کے چہروں پر تجسس بڑھ گیا تھا۔ جلالی کے اعصاب اس کہانی کے دوران اپنے معمول پر آ گئے تھے۔ نواب ٹن کی طرح وہ بھی کہانی میں گم تھا۔

"اس نے برائی کو جڑ سے ختم کرنے کا فیصلہ کیا اور ایک رات......." قریشی صوفے پر آگے کی طرف جھک آیا۔ "ایک رات وہ زہر کھا کر سو گئی۔ اس کے چہرے پر مرنے کے بعد بھی اتنا سکون اور آسودگی تھی کہ اس کے شوہر کو دن بھر پتہ نہیں چلا کہ وہ سوئی ہوئی ہے کہ مری ہوئی پڑی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کا ہر وجود مر گیا اور دنیا بھر میں پھیلا ہوا ہوس کا جال ٹوٹ گیا۔"

قریشی نے اپنی کمر دوبارہ صوفے کی پشت سے ٹکا دی اور بجھے ہوئے پائپ کو صاف کرنے لگا۔ جلالی خاموشی سے اسے دیکھتا ہوا سوچ رہا تھا کہ کہانی سنانے کا مقصد کیا تھا۔ کیا وہ اصل بات کرنے سے پہلے فضا کو سازگار بنانا چاہتا تھا؟

"نواب صاحب نے مجھے بتایا تھا کہ آپ نے ہمارے گروپ کو اقتدار مافیا کا نام دیا ہے۔" قریشی نے نصف صدی پرانے فرانس سے زمانہ حال میں واپس آ کر تازہ بھرے ہوئے پائپ کا کش لیا۔ "پسند آیا۔ یہ گروپ واقعی ایک مافیا بن گیا ہے۔ لیکن پہلے ایسا نہیں تھا۔ یہ آج کا نہیں چالیس سال پرانا گروپ ہے جو ہر پانچ دس سال میں اپنی شکل بدل لیتا ہے۔"

جلالی کے چہرے پر الجھن نمودار ہو گئی۔ پہلے ایک غیر متعلقہ کہانی اور اب اقتدار مافیا کی تاریخ۔ قریشی اپنا اور اس کا وقت کیوں ضائع کر رہا تھا۔

"مجھے پتہ ہے آپ کیا سوچ رہے ہیں۔" قریشی نے اس کا چہرہ پڑھتے ہوئے کہا۔ "۳۵ سال پہلے جب اس گروپ نے پہلی بار حکومت بدلی تھی تو یہ فرانس کی اسی خوبصورت' خدمت گزار اور شوہر پرست دیہاتی عورت کی طرح تھا۔ قومی مفاد کی درد کرتی ہوئی کمر کو ٹھیک کرنے والا۔ لیکن پھر قومی مفاد میں دوسرے اور دوسروں کے مفادات شامل ہوتے رہے۔ نئے نئے وجود بنتے اور ملک بھر میں پھیلتے رہے۔ سب لذت اور آسودگی کے کھیل میں شریک ہو گئے۔ ہوس کا ایک جال بن گیا۔ بے حد مضبوط۔ طاقتوں کا اصل منبع۔ میں بھی طاقت کے اس کھیل میں شامل ہو کر مفادات کے حصول کی دوڑ میں شریک ہو گیا۔ نہ ہوتا تو اپنے کئی دوستوں کی طرح کسی بیکار سی منسٹری کا ایک کمزور سیکریٹری بنا ریٹائرمنٹ کے دن گن رہا ہوتا۔"

قریشی خاموش ہو گیا اور ایک بار پھر صوفے پر آگے کی طرف جھک آیا۔

"جڑ کاٹے بغیر کچھ نہیں ہو گا۔ ہم نے اقتدار مافیا کو ہمیشہ کی نیند سلانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس کے مرتے ہی اس سے نکلا ہوا ہر وجود مر جائے گا۔ ہوس کا جال ٹوٹ جائے گا۔ اس کا ہر وجود بے اثر ہو جائے گا۔"

جلالی بے ساختہ ہنس پڑا۔ قریشی اور نواب ٹن اسے حیرت سے دیکھنے لگی۔

"قریشی صاحب! آپ نے خود اپنی کہانی سے کوئی سبق نہیں سیکھا۔" جلالی نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ "آپ منبع نہیں ہیں۔ خود ایک ثانوی وجود ہیں۔ آپ کے ختم کرنے سے کچھ ختم نہیں ہو گا۔ صرف آپ ختم ہو جائیں گے۔ نئے وجود اسی طرح پیدا ہوتے اور پھیلتے رہیں گے۔"

قریشی کچھ نہیں بولا بلکہ پائپ کا دھواں اڑاتے ہوئے نواب ٹن کی طرف دیکھنے لگا۔

"گروپ کا منبع اور جڑ اکبر خان ہیں۔ وہ ریٹائر ہو رہے ہیں۔" نواب ٹن نے اس کا اشارہ سمجھ کر کہا۔ "قریشی صاحب گروپ کے نئے سربراہ ہوں گے۔ ہر نیا وجود

اب انہیں کی کوکھ سے جنم لے گا۔ وہ چاہیں تو اسے زہر دے کر ہمیشہ کے لئے سلا دیں یا نئے سرے سے تشکیل دیں۔"

"لیکن کیسے؟"

نواب ٹن نے کچھ کہنا چاہا لیکن قریشی نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔

"آپ صحافی بن کر اپنے ذہن میں کوئی کہانی بنانے کی کوشش مت کیجئے۔" قریشی نے جلالی کو تیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہم نے آپ کو اعتماد میں لیا ہے' اس کی دو وجوہات ہیں۔ ایک تو یہ کہ آپ نے گروپ کا راز معلوم ہونے کے باوجود ہمارا اعتماد مجروح نہیں کیا۔ اور دوسرے یہ کہ ہمیں آپ کی ضرورت ہے۔"

"میری ضرورت؟ آخر کیوں؟"

"آپ کے ایک دوست نے آپ کی بہت پر زور سفارش کی ہے۔"

جلالی نواب ٹن کی طرف دیکھنے لگا جو مسکراتے ہوئے نفی میں سر ہلا رہا تھا۔

"نواب صاحب نے نہیں۔ ہمارے ایک بہت اہم کارندے فیاض منگی نے۔"

"فیاض منگی؟ وہ باسٹرڈ........" جلالی کو منگی کا نام سنتے ہی غصہ آ گیا۔

"وہ ٹھنڈے مزاج کا بہت فرض شناس افسر ہے۔" قریشی نے جلالی کا جملہ کاٹتے ہوئے کہا۔ "میں نے فیاض منگی اور میجر افتخار دونوں کی رپورٹیں پڑھی ہیں۔ آپ کے بارے میں میرا اور اکبر خان کا یقین غلط نہیں تھا۔"

جلالی جو گزرے ہوئے دنوں کو بھلا چکا تھا دوبارہ ہنگری پہنچ گیا۔ نواب ٹن ان کے خالی گلاس اٹھا کر دوبارہ بھرنے لگا۔

"مجھے بیس بائیس سال پہلے کا وہ نوجوان اب بھی یاد ہے جو گورنر ہاؤس کے ہجوم میں اس طرح گردن اکڑائے کھڑا تھا جیسے ہمیشہ انہیں اونچے ایوانوں میں رہتا آیا ہو۔ "قریشی بھی دور ماضی میں چلا گیا۔ "مجھے پتہ ہے اس رات تمہارے پاس ٹیکسی کا کرایہ دینے کے لئے پیسے نہیں تھے لیکن تم نے میری پیشکش ٹھکرا دی تھی اور بس کا انتظار کرنے کے لئے ایمپریس مارکیٹ اتر گئے تھے۔ مجھے خوشی ہے کہ تم نے اپنی انا اور خوابوں کو زندہ رکھا ہے۔"

"میری سمجھ میں اب بھی کچھ نہیں آیا۔" جلالی نے قریشی کی تحسین کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ اسے اپنی تعریف پسند نہیں تھی۔ اس کے خواب اس کے اپنے خواب تھے۔ ان میں کسی اور کو جھانکنے کا کیا حق تھا۔

"اکبر خان کو آخری عمر میں خدا یاد آیا ہے۔ انہوں نے مجھ سے وعدہ لیا ہے۔" قریشی کو شاید اپنا جواب ایک غیر متعلق جملے سے شروع کرنے کی عادت تھی۔ "آج سے بہت پہلے ایک وعدہ میں نے بھی اپنے آپ سے کیا تھا۔ اس وقت میں بھی خواب دیکھا کرتا تھا۔ لیکن مجھے پتہ تھا صرف خواب دیکھنے سے کچھ نہیں ہو گا۔ کچھ کرنے کے لئے کچھ کرنے کا اختیار حاصل کرنا ضروری ہے۔ بڑے کام کے لئے بڑے اختیار کی اور مکمل تبدیلی کے لئے مکمل اختیار کی ضرورت ہے۔ اب جب یہ اختیار مجھے ملنے والا ہے میں آپ کے اس اقتدار مافیا کو ختم کر کے ایک ایسا گروپ بناؤں گا جس کے کوئی روپ بہروپ نہ ہوں۔ جس کے وجود نئے وجود پیدا کر کے ہوس کا جال نہ پھیلا سکیں۔ اب ایک نئے پاکستان کی بنیاد رکھنی اور اس نئی بنیاد کی حفاظت کرنی ہے۔"

جلالی کو ایمان علی کا نیا پاکستان یاد آ گیا اور وہ دل ہی دل میں مسکرانے لگا۔ قریشی مکمل اختیار حاصل کرنے کا سپنا دیکھ رہا تھا اور ایمان علی نئے پاکستان کا خاکہ تیار کئے بیٹھا تھا۔ اگر دونوں کو ملا دیا جائے تو...... لیکن اس نے کچھ نہیں کہا اور اسی طرح سوالیہ نظروں سے قریشی کو دیکھنے لگا۔

"آپ نے سنا ہو گا نو تھیوری۔ نو ہسٹری!" قریشی نے ایک بار پھر ایک غیر متعلق جملہ پھینکا۔ "آپ کسی تاریخ دان سے اپنی پچاس سال کی تاریخ لکھنے کے لئے کہئے۔ وہ اپنے بال نوچنے لگے گا۔ لکھنے کے لئے کچھ نہیں ہے۔ کچھ نہیں۔ ہم مدار سے بھٹکے ہوئے سیارچے کی طرح خلا میں گم ہو گئے ہیں۔ ہماری نظریاتی بنیاد بہت کنفیوژن کا شکار ہے۔ ہمیں ایک سمت چاہئے۔ بہت واضح اور صاف جس طرف رخ کر کے ہم اپنے گھوڑے دوڑا سکیں۔"

"میں صرف ایک عام سا صحافی ہوں' رستوں کا سراغ لگانے والا فلسفی نہیں

ہوں۔" جلالی نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اس ملک میں کمی نہیں ہے۔ آپ اشارہ کیجئے آپ کا اصطبل دانشوروں سے بھر جائے گا۔"

"ان میں سے کوئی اصیل نسل کا گھوڑا نہیں ہے۔ سب باربرداری کا کام کرنے والے خچر یا نقارہ پیٹنے والے ڈھنڈورچی ہیں۔ وہ اپنے فلسفے کو خریدار کی ضرورت کے مطابق ڈھالنے کے ماہر ہیں۔ انہیں تو خود اپنی سمت کا پتہ نہیں۔ ایک ہی جست میں بائیں کو دایاں کر دیتے ہیں۔" قریشی کو شاید دانشوروں کا کوئی اچھا تجربہ نہیں تھا۔ وہ بہت تلخ ہو رہا تھا۔

"آپ نے یورپ اور امریکہ کے مہنگے بھارتی ریسٹورنٹ نہیں دیکھے۔" قریشی کی تقریر ابھی جاری تھی۔ "ہر ریسٹورنٹ میں ستار نواز کے علاوہ ایک ہاؤس پامسٹ ہوتا ہے جو گاہکوں کو ان کے اچھے مستقبل کی خبر دے کر ان کے ڈنر کو خوشگوار بناتا ہے۔ آپ کے دانشور بھی انہیں جیوتشیوں کی طرح ہیں۔ کوئی عامر نذیر کی دکان پر کام کرتا ہے اور کوئی ریاض توصیف کا ملازم ہے۔ کوئی مولویوں کا تنخواہ دار ہے اور کوئی انقلابیوں کا۔ جسے کسی دربار میں نوکری نہیں ملی وہ مایوسیوں کا پیمبر بن گیا۔ Prophet of Doom"۔

"آپ اپنی خطاؤں کو دوسروں کے سر منڈھ رہے ہیں۔" جلالی نے بھی دو ٹوک بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ "عقل و دانش کے ادارے کو تباہ کس نے کیا؟ آپ کا مافیا پہلی بار انقلاب کے نام پر جس حکومت کو لے کر آیا تھا جسے آپ فرانس کی وفا شعار، خدمت گزار اور شوہر پرست دیہاتی عورت جیسا قرار دے رہے تھے اس نے۔ آپ نے عقل و دانش، ادب، ثقافت سب کچھ نوکر شاہی کی تحویل میں دے دیا تھا۔ دانشوروں کو جیوتشیوں کی طرح بھرتی بھی آپ نے کیا تھا۔ آپ کو شکایت کرنے کا حق نہیں ہے۔ آپ کو تو شرمندہ ہونا چاہئے۔"

"میں شرمندہ ہو جاتا ہوں۔" قریشی نے ہنستے ہوئے کہا لیکن پھر سنجیدہ ہو گیا۔ "آپ کے دانشوروں کو کسی نے نوکر شاہی کی تحویل میں نہیں دیا تھا۔ آپ کے دانشوروں کو خود بیورو کریٹ بننے کا شوق ہے۔ آپ انہیں بینک کا وائس

پریذیڈنٹ بنا دیجئے وہ اپنے فلسفے کا کمال دکھا کر سینئر وائس پریذیڈنٹ بن جائیں گے اور ریٹائر ہو کر وزارت یا سفارت کے امیدوار۔ سرکاری گریڈ دانشوری کو ناپنے کا پیمانہ بن گئے ہیں۔ انیس سے بیس' بیس سے اکیس اور اکیس سے بائیس گریڈ میں آنے کے لئے انہوں نے مغل دور کے درباریوں کو مات کر دیا ہے۔"

"آپ زیادتی کر رہے ہیں۔ سب ایسے نہیں ہیں۔"

"سب ایسے نہیں ہیں لیکن زیادہ تر ایسے ہیں۔" قریشی نے اپنا لہجہ نرم کر لیا۔ "لیکن جو درسگاہوں میں سر چھپائے پڑے ہیں یا گوشہ نشین ہو گئے ہیں ان کی ایمانداری نے بھی کچھ نہیں دیا۔ انہوں نے ایسے فلسفے اگائے جن کے لئے اس ملک کی مٹی مناسب نہیں ہے۔ آپ مارکسی یا اسلامی انقلاب لانے والے کسی دانشور سے قومی ثقافت' قومی ادب اور قومی معیشت کی تشریح کرنے کے لئے کہئے' وہ آپ کو مارکسی اور اسلامی فلسفوں میں الجھا دے گا۔ ہم جن سرحدوں کی حفاظت کے لئے اپنا پیٹ کاٹ کر اپنے سارے وسائل دفاع پر خرچ کرتے ہیں آپ کے دانشور اب تک ان سرحدوں کو واضح فلسفیانہ بنیاد نہیں دے سکے۔"

"دے کر دیکھئے۔ فتوے آ جائیں گے آپ کے خلاف۔ آپ سولی پر چڑھا دیئے جائیں گے۔"

"اسی لئے یہ معاشرہ ایک معاشرہ نہیں رہا۔ باڑے میں رہنے والے مویشیوں کا ریوڑ بن گیا ہے۔ جس معاشرے کے دانشور سولی سے ڈر کر منافقت کرنے لگیں یا چپ رہیں اس معاشرے کا مستقبل بہت تاریک ہو گا۔ آپ نے کبھی سوچا ہے آپ کے کالجوں میں یونیورسٹیوں میں اب کھلے مباحث کیوں نہیں ہوتے صرف بندوقیں کیوں چلتی ہیں؟ پچھلے دس سالوں میں کوئی ایسی تحریک کیوں نہیں چلی جس کا جھنڈا طلبہ یا دانشوروں کے ہاتھوں میں ہو؟ آپ ایک مردہ معاشرے میں زندہ ہیں۔ یہاں امید ڈھونڈنا آسان نہیں ہے۔"

"آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔" جلالی نے زہریلی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔ "فرق یہ ہے جس نے قتل کیا وہی نوحہ گری بھی کر رہا ہے۔ آپ اپنا یہ اعتراف نامہ جلی

لفظوں میں تحریر کر کے نوکر شاہی کے ہر بازیگر کے گلے میں ڈال دیجئے۔"

قریشی کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا لیکن جلالی کو پرواہ نہیں تھی۔ قریشی نے تقریر شروع کی تھی تو اسے تقریر سننا بھی تھی۔

"معاملہ ترجیحات کا ہے۔" اس نے اپنا بیان جاری رکھا۔ "فوج آپ کی ترجیح ہے۔ اس پر آپ چالیس اور تعلیم پر ڈیڑھ فیصد خرچ کریں گے تو درسگاہوں میں تحریکوں کے پرچم نہیں کلاشنکوفیں اگیں گی۔ قبرستان جانے والا راستہ دانشوروں نے نہیں آپ کی حکمرانی کرنے والی نوکر شاہی نے چنا ہے۔"

"نوکر شاہی۔ نوکر شاہی۔" قریشی غرایا۔ "نوکر شاہی پاکستان کی ایجاد نہیں ہے۔ ساڑھے چار ہزار سال پہلے مصر کے فرعونوں نے اس کی بنیاد رکھی تھی۔"

"آپ اپنی اس بنیاد پر آج بھی قائم ہیں۔" جلالی نے قریشی کی بات درمیان سے اچک لی۔ "لیکن کئی ہزار سال پرانی فرعونوں کی نوکر شاہی دریائے نیل کے سیلاب کی سطح کا سالانہ حساب رکھتی تھی۔ باقاعدگی سے مردم شماری کرتی تھی۔ ہماری نوکر شاہی کو تو یہ بھی نہیں معلوم کہ ان کے باڑے میں کتنے مویشی ہیں۔"

جلالی خاموش ہو کر کچھ دیر قریشی کو دیکھتا رہا لیکن کچھ جواب نہ پا کر اس نے اپنی تقریر دوبارہ شروع کر دی۔

"دانشوروں کے سولی پر چڑھنے یا افلاطونی قلم ہلانے سے راتوں رات سرحدوں پر فلسفوں کی دیوار کھڑی نہیں ہو گی۔ قریشی صاحب' درخت آسمان سے اتر کر زمین پر نہیں لگتے۔ بیج بونے اور پودے اگا کر سینچنے پڑتے ہیں۔ سب کو مل کر آبیاری کرنا پڑتی ہے۔ پہلے زمین میں دور تک جڑیں پھیلتی ہیں تب کہیں درخت ہوا میں سر اٹھا پاتا ہے۔ لیکن جس جگہ پودے اگانے تھے وہاں آپ کی نوکر شاہی نے اپنے اختیار کی کرسی رکھ دی تھی۔ درخت کہاں سے اگیں گے۔ آپ کے سر پر دھوپ ہی دھوپ ہے۔ آپ دانشوروں کو مت الزام دیجئے۔"

"نہیں' نہیں میں کسی کو الزام نہیں دے رہا۔" قریشی نے ہنس کر ماحول کے تناؤ کو ختم کرنا چاہا اور پائپ کا گہرا کش لے کر اس کے گہرے دھوئیں میں اپنے چہرے

کے تاثرات چھپا لیے۔

"میں نوکر شاہی کا دفاع نہیں کر رہا۔ میں بھی یہی کہہ رہا ہوں کہ صرف نوکر شاہی کو الزام مت دیجئے۔" قریشی کا لہجہ نرم ہو گیا۔ "سول سروس کی ٹریننگ کے دوران ہمیں بیورو کریسی کی تعریف پڑھائی گئی تھی۔ آپ سنیں گے؟" جلالی نے سر ہلا دیا۔

"وہ وسیع، مربوط اور منظم گروہ جو درجاتی تقسیم عمل کے ساتھ ایک مرکزیت کے تابع رہ کر بڑے پیمانے کے انتظامی امور اور روزمرہ کے ریاستی یا سلطنتی کاروبار انجام دے اور جو درجہ بدرجہ اپنے اوپر والوں کی ہدایات اور احکامات کے مطابق حسن کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے حکمرانوں کی پالیسیوں کی تکمیل کا فریضہ ادا کرے۔" قریشی نے ایک ہی سانس میں رٹا ہوا سبق دہرانے کی اداکاری کی اور پھر کھانستے ہوئے خود ہی ہنسنے لگا۔ جلالی اور نواب ٹن بھی مسکرانے لگے۔

"اس تعریف میں کوئی سقم نہیں ہے۔ سب کچھ اسی طرح ہوتا ہے جس طرح بیان کیا گیا ہے۔ صرف ملکوں کے اپنے اپنے حالات کے مطابق حسن کارکردگی کے مظاہر بدلتے رہتے ہیں۔" قریشی ایک بڑا سا سانس لے کر خاموش ہو گیا۔

"آپ نے بیورو کریسی پر سیمینار شروع کر دیا ہے تو بیورو کریسی کی نئی تعریف بھی سن لیجئے۔" جلالی نے کہا۔ "بیورو کریسی کے نئے معنی ہیں حسن کارکردگی کی ضد۔ ایک ایسا انتظامی ادارہ جس نے غیر ضروری جم غفیر جمع کر کے اور قاعدوں کی پیچیدہ گتھیوں کا جال پھیلا کر کام کے طریقوں کو ست اور سرخ فیتے کی نذر کر دیا ہے۔ جس نے حکومت کرنے کے اصل اختیارات خود حاصل کر لئے ہیں، خود کو تمام مراعات کا حقدار بنا لیا ہے، عوام کی آزادیاں سلب کر لی ہیں اور حکمرانوں کو صرف نام کا حکمران بنا دیا ہے۔"

جلالی چیلنج کرنے والے انداز میں قریشی کو دیکھنے لگا جو بے نیازی سے ایک بار پھر اپنا پائپ تازہ کرنے لگا۔

"قریشی صاحب! یہ عفریت پاکستان آ کر زیادہ صحتمند ہو گئی ہے۔ سرطان کی

طرح اس ملک کے ریشے ریشے میں بس گئی ہے۔" جلالی کچھ اور کہنا چاہتا تھا لیکن پھر خاموش ہو کر اپنا سگریٹ سلگانے لگا۔

"آپ کا یہ خیال درست نہیں ہے۔ ہمارا جم غفیر دوسروں کے مقابلے میں بہت کم ہے۔" قریشی نے تازہ بھرے ہوئے پائپ کا کش لیا اور صوفے کی پشت سے کمر ٹکا کر مورچہ جما لیا۔ "ڈیڑھ سو سال پہلے فرانس میں نوکر شاہی کے کارندں کی تعداد ڈھائی لاکھ تھی۔ سو سال بعد چار گنا بڑھ کر دس لاکھ ہو گئی۔ آج یہ تعداد دوگنی ہو کر شاید بیس لاکھ ہو گئی ہو گی۔ برطانیہ میں ۱۹۵۰ء کی دہائی میں بیس لاکھ سے زیادہ سرکاری ملازم تھے۔ امریکہ کے بعض شہروں میں ہر پچاس افراد پر ایک کے تناسب سے سرکاری ملازم ہیں۔ ہم نے یہ تناسب حاصل کرنے کی کوشش کی تو ملک دیوالیہ ہو جائے گا۔"

"آپ سروں کو گن رہے ہیں۔ کارکردگی کو ناپ کر دیکھئے۔ آپ نے جن ملکوں کا نام لیا وہاں جو کام ایک فون کال کے ذریعے ہوتا ہے اسے کرنے کے لئے ہمیں کئی ہفتے خرچ کرنے، کئی جوتے گھسنے اور بہت سے نوٹ دینے پڑتے ہیں۔ بدعنوانی کاکروچوں کی طرح پھیلی ہوئی ہے۔"

"کاکروچ وہیں پھیلیں گے جہاں سیلن ہو گی۔" قریشی نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ "کم تنخواہ ہو، بدعنوانی کے مواقع ہوں اور احتساب کا نظام کمزور ہو تو یہ سیلن پھیلے گی۔" قریشی کا انداز اب لیکچر دینے والے پروفیسروں کا سا ہو گیا تھا۔

"ہم ایسٹ انڈیا کمپنی کے اس دور میں زندہ ہیں جب کمپنی نے اپنے اخراجات کم کرنے کے لئے تنخواہیں کم رکھی تھیں۔ بدعنوانیوں کے مواقع بہت تھے، افسر لوٹ مار میں شریک تھے اس لئے احتساب کا نظام بھی کمزور تھا۔ انگریزوں نے بنگال پر قبضہ کیا ہے تو یہ لوٹ مار اپنے عروج پر تھی۔ کلایو اور اس کے بعد کارنوالس نے آ کر صورتحال بدلی۔ تنخواہیں اور بونس بڑھا دیئے۔ افسروں کے اختیارات محدود کر دیئے اور ان کی بداعمالیوں پر سزائیں سخت کر دیں۔ چند سالوں میں بڑے پیمانے پر ہونے والا کرپشن بالکل ختم ہو گیا تھا۔"

قریشی نے پہلو بدلا اور اس کی آنکھیں جلالی کے چہرے سے ہٹ کر سامنے کی دیوار پر جم گئیں۔

"وزیراعظم اپنے وزیر کی بدعنوانی کی سرزنش نہیں کرتا اس کا دفاع کرتا ہے۔ وزیر کو بدعنوانی کے لئے میری ضرورت ہے اس لئے وہ میری بدعنوانی سے چشم پوشی کرتا ہے۔ میرے نیچے ایک دوسرے کی ٹانگ پکڑ کر لٹکے ہوئے لوگوں کی زنجیر ہے۔ سب کا مسئلہ وہی ہے جو میرا ہے۔ مجھے جو تنخواہ ملتی ہے وہ میرے باورچی خانے اور تمباکو کے خرچ اور پانچ بچوں کے لئے کافی نہیں ہے۔ ہم سب کلایو اور کارنوالس جیسے روشن دماغ حکمرانوں کو ڈھونڈ رہے ہیں۔"

"ہمارا فخر یہی ہے کہ ہمارے آقاؤں نے جو میراث دی تھی ہم اب تک اسے سینے سے لگائے اس کی حفاظت کر رہے ہیں۔" جلالی نے مسکرا کر چوٹ کی۔

"آپ کا یہ خیال بھی صحیح نہیں ہے۔" قریشی نے نگاہیں پھر جلالی کے چہرے پر گاڑ دیں۔ "یورپ کو نوکر شاہی کا ایک مربوط اور مرکزی ڈھانچہ انگریز نے نہیں فرانس نے دیا ہے۔ پندرہویں اور سولہویں صدی میں لوئز اور فرانس اول نے....."

"تاریخ میں جائیں گے تو آپ کو ہزاروں سال پہلے کے مصر، چین اور وادیٔ سندھ کا سفر کرنا پڑے گا۔" جلالی نے قریشی کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "میکاویلی سے سینکڑوں سال پہلے موریہ بادشاہوں کے دور کی ارتھ شاستر میں درباری اور محلاتی سازشیں کرنے، ان سے نمٹنے اور جاسوسی کا نظام قائم کرنے کا ہدایت نامہ درج تھا۔ اور اس سے بھی سینکڑوں سال پہلے چین میں نوکر شاہی کی تربیت کے لئے پہلی درسگاہ قائم ہوئی تھی۔ لیکن ہم نے چین کی تاریخ کے ورق پڑھے بغیر الٹ دیئے۔ ہم سیدھے مصری دور کے فرعونوں کی نوکر شاہی پر جا کر رک گئے ہیں۔" جلالی نے خاموش ہو کر قریشی کو دیکھا اور اس کی توجہ اپنی طرف مرکوز پا کر اپنی بات دوبارہ شروع کر دی۔

"چینی شہنشاہوں نے اپنی نوکر شاہی کی بنیاد علم، دانش اور ہنرمندی پر رکھی تھی۔ فرعونوں کی نوکر شاہی ان کے رشتے داروں، درباریوں، ان کی اولادوں، خادموں

اور غلاموں پر مشتمل تھی۔ ان کا کام صرف سورج کی کرنوں اور دریائے نیل کی اترتی چڑھتی موجوں کا حساب رکھنا نہیں تھا۔ وہ ٹیکس جمع کرتے، فوجوں کو پالتے، آقاؤں کی خدمت گزاری کے ساتھ ان کے کفن دفن کا انتظام کرتے اور ان کی لاشوں کو محفوظ کر کے عبرت کدے تعمیر کرتے تھے۔ نوکر شاہی کا یہ ہزاروں سال پرانا ماڈل ہمیں آج بھی پسند ہے۔"

قریشی اب بھی خاموشی سے اس کی تقریر سن رہا تھا۔

"مردہ تہذیبوں کا دفن رہنا ہی بہتر ہے۔" جلالی نے اختتامی بیان جاری کیا۔ "کلایو اور کارنوالس ہماری تاریخ کا حصہ نہیں ہیں۔ ہماری غلامی کے دور کی یادگار ہیں۔ ہمیں کسی کلایو اور کارنوالس کا انتظار کرنے کے بجائے خود اپنا مسیحا ڈھونڈنا چاہئے۔ خالص اپنا اور دیسی مسیحا۔"

"میں نے اپنے آپ سے اور اکبر خان سے یہی وعدہ کیا ہے۔" قریشی نے تمباکو کے چرمی تھیلے کی زپ بند کرتے ہوئے کہا۔ "اسی لئے آج کی یہ شام آپ کے نام تھی اور اسی لئے اتنی لمبی تقریریں کی اور سنی ہیں۔ لیکن تقریروں سے کچھ نہیں ہو گا۔ مسیحا ڈھونڈنا ہے تو سنجیدگی سے کوشش کرنا پڑے گی۔ آپ کو بھی اور ہمیں بھی۔" جلالی نے کچھ کہنا چاہا لیکن قریشی کو کھڑے ہوتے دیکھ کر خاموش ہو گیا۔

"مجھے اب جانا ہے۔" قریشی نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ جلالی اور نواب ٹن بھی اس کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔ "نواب صاحب آپ کو بتا چکے ہیں کہ آپ کو کیا کرنا ہے۔ آپ سامنے نہیں آئیں گے اور بے نام رہ کر ہمارے لئے ہر مہینے صورتحال کا تجزیہ لکھیں گے۔ آپ کے شبہات غلط نہیں ہیں۔ ہو سکتا ہے آپ کے تجزیوں کا کوئی اثر نہ ہو۔ لیکن آپ حکم کو حکم اور اینٹ کو اینٹ کہتے رہئے۔ اجالا پھیلا ہوا ہو تو اسے سیاہی قرار دینا آسان نہیں ہوتا۔ ہمارا یہ گروپ ایک سال اسی شکل میں قائم رہے گا۔ اس عرصے میں ہم مسیحائی کا کوئی راستہ ڈھونڈ لیں گے۔ ایک سال بعد یہ گروپ اقتدار مافیا یا مفاد پرستوں کا ٹولہ بن کر نہیں رہے گا۔ صرف محافظ فرشتے ہوں گے جو اس ملک کے مفاد کی نگہبانی کریں گے۔ یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔" جلالی نے

کچھ کہنا چاہا۔ لیکن قریشی نے اسے بولنے نہیں دیا۔

"نئی بحث شروع کرنے کا وقت نہیں ہے۔ نہ آپ کو فوری فیصلہ کرنے کی ضرورت ہے۔" قریشی نے رخصتی مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "آپ پر کوئی دباؤ بھی نہیں ہے۔ لیکن آپ کو کھیل کے اصول یاد رکھنے ہوں گے۔ آپ ہمارا ساتھ دیں یا نہ دیں' دونوں صورتوں میں آپ کی زبان بند رہے گی۔" قریشی اس سے ہاتھ ملا کر اور اپنی دھمکی کی گونج فضا میں چھوڑ کر چلا گیا۔ نواب ٹن اسے باہر تک چھوڑنے اس کے ساتھ گیا تھا۔

جلالی کچھ دیر اسی طرح کھڑا رہا پھر جا کر اپنی ڈرنک مکس کرنے لگا۔ اسے پتہ تھا نواب ٹن واپس آ کر نئے سرے سے بحث کا آغاز کرے گا۔ جلالی اب کسی معرکے کے موڈ میں نہیں تھا۔ قریشی نے اس کے ذہن کی چولیں ہلا دی تھیں۔ اس نے سوچا وہ نواب ٹن کو صاف صاف بتا دے گا اور پھر چلا جائے گا۔ کچھ عرصے کے لئے نواب ٹن کے پاس آنا جانا بھی بند کر دے گا۔ مرینہ سے شادی ہو جائے گی تو نہ آنے کا بہانہ بھی مل جائے گا۔ اسی وقت نواب ٹن واپس آ گیا۔ لیکن جلالی کی توقع کے برعکس وہ کچھ نہیں بولا اور صوفے پر بیٹھ کر کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ جلالی بھی خاموش بیٹھا چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتا رہا۔

"تمہاری الٹی کھوپڑی میں اس وقت کیا گھوم رہا ہے مجھے پتہ ہے۔ اس لئے کچھ مت کہو اور خاموشی سے میری بات سنو۔" نواب ٹن نے جلالی کو تیز نظروں سے گھورتے ہوئے خاموشی توڑی۔

"قریشی نے اتنا وقت بلاوجہ ضائع نہیں کیا۔ اس پر کچھ کرنے کا جنون سوار ہے۔ اسے تمہاری دیانت اور ذہانت پر بھروسہ ہو گیا ہے۔ تم آزمائے ہوئے ہو اور ایمان علی سے بھی تمہارا رابطہ ہے۔ اس پر کام کر سکتے ہو۔ ہو سکتا ہے ایمان علی کا پاکستان ہمارے خوابوں کی تعبیر' ہماری امید اور ہمارا مسیحا بن جائے۔ میں یہ امکانات ضائع نہیں ہونے دوں گا۔"

نواب ٹن اٹھ کھڑا ہوا اور اندر ایک تاریک گوشے کی طرف چل دیا۔

"آؤ۔" اس نے روشنی کرتے ہوئے کہا۔ جلالی حیرت سے ایک چھوٹے سے دروازے کو دیکھنے لگا۔ جلالی اس طرف کبھی نہیں گیا تھا۔ نواب ٹن نمبروں والے برقی تالے کے بٹن دبانے لگا۔ جلالی اندر بنے ہوئے چھوٹے سے اسٹوڈیو کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔

"اس راز سے واقف ہونے والے تم پہلے آدمی ہو۔ اقتدار مافیا کو معلوم ہو جائے تو جنرل سعید میری بوٹیاں کر کے کتوں کو کھلا دے گا۔ قریشی بھی نہیں بچا سکے گا۔ بلکہ پہلا وار وہی کرے گا۔" نواب ٹن نے جوتوں کا ایک ڈبہ اٹھا کر اس کا ڈھکنا کھولا۔ جلالی نے بڑھ کر دیکھا تو اس میں آڈیو کیسٹوں کا ایک ڈھیر تھا۔

"میں جان پر کھیل کر اقتدار مافیا کے اجلاسوں کی کارروائی ریکارڈ کرتا ہوں۔ اس ڈبے میں پچھلے پانچ سال کی ریکارڈنگ کیسٹوں میں جمع ہے۔ اس میں بارود ہی بارود ہے۔ یہ اس ملک کی وہ تاریخ ہے جو کبھی نہیں لکھی گئی۔ قریشی نے اگر ایک سال میں اپنا وعدہ پورا نہیں کیا تو میں یہ ملک چھوڑ کر برازیل چلا جاؤں گا جہاں جنرل سعید کے کتے میرا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔ تم ان کیسٹوں کو امریکہ لے جا کر کتاب چھپوا دینا۔ دنیا بھر میں تمہارا نام چمکے گا۔" جلالی نے ڈبہ لینے کے لئے ہاتھ بڑھایا لیکن نواب ٹن نے کچھ سوچ کر ہاتھ پیچھے کھینچ لئے۔

"اس میں میری زندگی کی چابی بند ہے۔" نواب ٹن کے ماتھے پر بہت سے بل آ گئے تھے۔ "تمہیں ان کی اپنی جان سے زیادہ حفاظت کرنا پڑے گی۔ یہ کیسٹ کسی کے ہاتھ لگ گئے تو نہ تم رہو گے اور نہ میں۔" نواب ٹن نے ڈبہ پھر جلالی کی طرف بڑھا دیا۔ جلالی نے اسے تیزی سے جھپٹ لیا۔ اسے ڈر تھا کہیں نواب ٹن اپنا فیصلہ بدل نہ دے۔ اس وقت وہ صرف ایک صحافی تھا۔ اسے کہانیوں کا خزانہ مل رہا تھا۔ وہ کہانیاں جو کبھی نہیں لکھی گئیں۔ وہ کہانیاں جو شاید کبھی نہ لکھی جائیں۔ جلالی نے اگلی کئی راتیں نواب ٹن کے دیئے ہوئے ٹیپ سننے میں گزار دیں۔ نواب ٹن نے غلط نہیں کہا تھا' بارود ہی بارود تھا۔ اس کے دماغ میں مستقل دھماکے ہوتے رہے۔

اگلے مہینے جلالی نواب کے ریکارڈنگ اسٹوڈیو میں بیٹھا اقتدار مافیا کے اجلاس

کی ریکارڈنگ کر رہا تھا جس میں پہلی بار اس کا لکھا ہوا تجزیہ بھی زیر بحث آنا تھا۔

جلالی نے گھر سے نکلنے سے پہلے کتابوں کی الماری میں کتابوں کے پیچھے چھپے ہوئے کیسٹوں کو دیکھا۔ پچھلے ایک سال میں یہ اس کی عادت ہو گئی تھی۔ ہر بار گھر سے نکلتے ہوئے اطمینان کر کے جاتا۔ ان کیسٹوں میں ہر اجلاس کے بعد ایک کیسٹ کا مزید اضافہ ہو جاتا۔ نواب ٹن نے ریکارڈنگ کی ذمے داری بھی جلالی کے سپرد کر دی تھی۔ مرینہ سے شادی کے بعد جلالی اور محتاط ہو گیا تھا۔ لیکن اسے اطمینان تھا کہ مرینہ اس طرف کبھی نہیں آئے گی۔ مرینہ کو کتابوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ جلالی نے گھڑی دیکھی تو وقت ہو گیا تھا۔ وہ فلیٹ بند کر کے تیزی سے باہر نکل گیا۔ اسے ڈر تھا کہیں دیر نہ ہو جائے۔ آج اقتدار مافیا کا آخری باب لکھا جانا تھا۔ اور اس کے بعد نیا پاکستان۔ انہوں نے ایک نئے پاکستان کی ابتدا کرنا تھی' نیا پاکستان جس کا خاکہ ایمان علی نے بنایا تھا اور جلالی جس کا ایک اہم کردار بن چکا تھا۔

جنرل منصف خان

دفتر میں اپنی میز کے پیچھے بیٹھے ہوئے جنرل منصف خان کی آنکھیں سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ کچھ دیر بعد اس نے ایک گہرا سانس لیا اور ٹھنڈی ہو جانے والی بغیر چینی کی سیاہ کڑوی کافی کا ایک گھونٹ لے کر برا سا منہ بنایا۔ اس کا اردلی اس کے کافی پینے کے اس انوکھے طریقے سے شروع میں بہت حیران ہوا تھا لیکن اب عادی ہو گیا تھا۔ جنرل کو گرم کافی چاہئے تھی۔ ٹھنڈی کافی اسے بالکل پسند نہیں تھی۔ لیکن وہ گرم کافی کا صرف ایک گھونٹ لیتا اور پھر کافی ٹھنڈی ہونے کا انتظار کرتا۔ یہ بھی ضروری تھا کہ کافی اتنی کڑوی ہو کہ اس کا منہ بن جائے۔ کافی پیتے ہوئے برا منہ نہ بنانے کا مطلب تھا کہ کافی جنرل کی پسند کی نہیں ہے۔ اردلی کوشش کرتا کہ جنرل کو کافی کا پہلا گھونٹ لیتا ہوا دیکھ لے۔ جنرل کا سپاٹ چہرہ دیکھتے ہی اسے پر لگ جاتے۔ کسی جن کی طرح سیکنڈوں میں کافی کا کپ بدل دیتا۔

جنرل کی کشادہ پیشانی پر تین گہری متوازی لکیریں پڑی ہوئی تھیں۔ ایک خوشامدی نے کہا تھا ایسی لکیریں صرف حکمرانوں کے ماتھوں پر اگتی ہیں۔ اونچے قد،

سرخ و سفید رنگ اور عقابی آنکھوں والا جنرل بہت کم گو تھا۔ اس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ زیادہ گفتگو اپنی آنکھوں سے کرتا ہے۔ جس شخص نے جنرل کے ماتھے پر حکمرانی کی تحریر پڑھی تھی وہ اس کے بعد بہت کوششوں کے باوجود جنرل سے نہیں مل پایا تھا۔ جنرل منصف فوجوں کی کمان سنبھالنے کے بعد ایک نجی تقریب میں مدعو تھا۔ ایک چرب زبان مگر ناکام سیاست دان نے جو پوری تقریب کے دوران جنرل کے گرد منڈلاتا اور خراب لہجے میں غلط انگریزی بول کر سب کو متاثر کرنے کی کوشش کر رہا تھا جنرل منصف کو خراج تحسین پیش کر کے خوش کرنا چاہا تھا۔

"سر! آپ کی شخصیت میں فیلڈ مارشل والا دبدبہ اور ماتھے پر حکمرانی کرنے کی بشارت تحریر ہے۔"

جنرل نے کوئی جواب دیئے بغیر خاموشی سے اپنی پشت اس کی طرف کر لی تھی اور کسی دوسرے مہمان کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد میزبان تعریف کرنے والے شخص کو کسی بہانے سے باہر لے گیا تھا جس کے بعد وہ نظر نہیں آیا تھا۔ میزبان نے شاید جنرل کے خاموش ہونٹوں پر لکھی ہوئی "بلاڈی سویلین!" کی تحریر پڑھ لی تھی اور اپنے شہری مہمان کو خاموشی سے رخصت کر دیا تھا۔ جنرل کو خوشامد کرنے کے سویلین انداز پسند تھے اور نہ سیاستدان اور ان کے حکمرانی کرنے کے انداز۔ اسے خود حکمرانی کرنے کا شوق بھی نہیں تھا۔ پھر بھی عجیب سا اضطراب اور بے اطمینانی تھی۔ کچھ کر گزرنے کی بے چینی۔ اسے پتہ تھا اس کی جیب میں ایک ماسٹر چابی ہے جس سے بہت سے دروازے کھل سکتے ہیں۔ اسے یہ بھی پتہ تھا کہ ہر دروازے کے پیچھے ایک اور دروازہ ہے۔ اور پھر ایک اور۔ ایک اور۔ بند دروازوں کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ تالے کھولتے کھولتے چابی کند ہو جائے گی اور دروازے دیوار بن جائیں گے۔ کوئی ایسا دروازہ ڈھونڈنا تھا جسے کھولتے ہی تازہ ہوا کے جھونکے آنے لگیں۔

جنرل کے ماتھے پر حکمرانی کی بشارت دینے والی تین لکیریں اس وقت اسی لئے ابھری ہوئی تھیں کہ ابھی ابھی نوجوان افسروں کا ایک وفد اس سے مل کر گیا تھا اور اس کی بے چینی بڑھا گیا تھا۔ پہلی بار جب ملاقات کی درخواست کی گئی تھی جنرل نے

منع کر دیا تھا۔ اسے "چین آف کمانڈ" توڑنا یا عبور کرنا پسند نہیں تھا۔ وہ اپنی شکایات اپنے اپنے کمانڈنگ آفیسرز کے سامنے بیان کر سکتے تھے۔ جنرل جب سالانہ کھانے پر ان کے میس میں جاتا تو وہاں سوالات کر سکتے تھے۔ لیکن ملاقات کی دوسری درخواست کمانڈنگ افسروں کی سفارش کے ساتھ آئی۔ جنرل نے یہ سوچ کر دس منٹ کا وقت دے دیا تھا کہ واقعی کوئی اہم معاملہ ہے۔ لیکن کوئی معاملہ نہیں تھا۔ وہ سب ملک کی صورت حال کا نوحہ پڑھنے آئے تھے۔ ملکی حالات نے نوجوانوں میں بے چینی پیدا کر دی تھی۔ وہ اپنے کام پر توجہ مرکوز نہیں کر سکتے تھے۔ جنرل نے انہیں بیٹھنے کے لئے نہیں کہا تھا اور خاموشی سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ نوجوانوں کے قائد نے جو سب سے زیادہ اور بہت جوشیلے انداز میں بول رہا تھا' آخری بیان جاری کر کے گفتگو ختم کی۔

"سر! ہم چھٹیوں پر گھر جاتے ہیں تو سب ہمیں اس طرح گھورتے ہیں جیسے ہم ان کی خیرات پر پل رہے ہوں۔ پہلے وہ بولتے نہیں تھے اب کھل کر کہنے لگے ہیں کہ ہم ملک کا سارا بجٹ کھا جاتے ہیں۔ ہماری وجہ سے حکومت کے پاس ہسپتال اور اسکول کھولنے کے پیسے نہیں بچتے۔ ہم نے سیاست دانوں کو لوٹ مار کی کھلی چھٹی دے دی ہے۔ سر! وہ غلط نہیں کہتے۔ ہم نے ملک میں لگی ہوئی آگ نہیں بجھائی تو ہم سرحدیں بھی نہیں بچا سکیں گے۔ نوجوانوں میں بہت بے چینی ہے سر! کچھ کرنے کی فوری ضرورت ہے۔"

"کیا کرنے کی؟" جنرل نے تیز نظروں سے باری باری سب کے چہروں کو دیکھتے ہوئے اپنی خاموشی توڑی۔ سب خاموش رہے۔

"آپ چاہتے ہیں کہ میں حکومت پر قبضہ کر کے ملک میں مارشل لاء لگا دوں اور آپ مارشل لاء افسر بن کر یہ سب کرنے کے لئے آزاد ہو جائیں۔" جنرل نے ایک فائل اٹھا کر ان کی طرف پھینکی۔ "آپ کو معلوم ہے اس فائل میں کیا ہے؟" جنرل نے ایک بار پھر باری باری ان کے چہروں کو دیکھا۔ "اس میں آپ کے افسروں اور نوجوانوں کی بے چینیاں بند ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے افسروں کے

خلاف ریپ اور لوٹ مار کی کتنی درخواستیں ہیں؟ آپ کے افسر بیچ اسلام آباد شہر میں شاپنگ سینٹر کے عملے کی پٹائی کرنے گئے تھے کیونکہ عملے نے قطار کے بغیر پیسے لینے سے انکار کر دیا تھا۔ آپ لوگ سمجھتے ہیں کہ وردی پہنتے ہی آپ سب سے افضل ہو گئے ہیں۔ قوم کا سارا درد آپ کے سینے میں بھر گیا ہے۔" جنرل نے خاموش ہو کر ان کے قائد کو گھور کر دیکھا۔

"Go back to your quarters!۔ حکومت کرنا جن کا کام ہے انہیں کرنے دیجئے۔ آپ اپنے کام پر توجہ دیجئے۔ پورے ڈسپلن کے ساتھ۔ مجھے اب کوئی درخواست ملی اور شکایت صحیح ثابت ہوئی تو فائرنگ اسکواڈ کی طرف سے پہلا فائر میں کروں گا۔ Now dissmiss" جنرل دہاڑا۔ سب نے ایک زوردار اٹینشن کے بعد سلوٹ کیا اور آہستہ آہستہ قدموں سے چلتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے۔ انہیں سخت حیرت ہوئی تھی۔ انہوں نے سنا تھا جنرل بہت کم گو اور میٹھی گفتگو کرنے والا شخص ہے۔ وہ تو ان کی چیر پھاڑ کرنے لگا تھا۔

جنرل نے وفد کو ڈانٹ کر نکال دیا تھا لیکن ان کی باتوں کی گونج اب تک سنائی دے رہی تھی۔ اسے پتہ تھا وہ غلط نہیں تھے۔ ایجنسیوں کی رپورٹوں کے ذریعے اضطراب کی لہریں پہلے بھی جنرل تک پہنچی تھیں۔ وزیراعظم عامر نذیر اور اس کی بیوی آصفہ جو کچھ کر رہے تھے اس کی ایک ایک تفصیل جنرل کی نظر سے گزری تھی۔ اس نے عامر نذیر کو خط لکھ کر اپنی تشویش سے آگاہ کر دیا تھا۔ اس سے زیادہ وہ کیا کر سکتا تھا؟ یا پھر وہی ریاض توصیف' رضا سروہی' ناصر بھٹی!

جنرل نے کافی کا ایک اور گھونٹ لے کر برا سا منہ بنایا اور کچھ سوچ کر میز پر اپنے دائیں ہاتھ کی مقفل دراز کو کھول کر فائل نکالی۔ "نیا پاکستان!" جنرل نے زیر لب دہرایا اور رپورٹ کی ورق گردانی کرنے لگا۔ ڈیفنس سیکریٹری قریشی نے یہ فائل ایک طویل گفتگو کے بعد اسے پچھلے ہفتے دی تھی۔ جنرل برلاس نے بھی ریٹائر ہونے کے بعد جنرل منصف سے کئی نجی ملاقاتیں کی تھیں۔ وہ جنرل پر اقتدار کا کھیل کھیلنے والے کسی گروپ میں شامل ہونے کے لئے زور ڈال رہا تھا۔ جنرل منصف کو اب کسی بھی

معاملے میں سبکدوش ہونے والے جنرل کی مداخلت پسند نہیں تھی۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا لیکن ملاقاتوں سے گریز کرنے لگا تھا۔ اس کا خیال تھا جنرل برلاس سمجھ جائے گا لیکن وہ باز نہیں آیا تھا۔ برلاس نے ڈیفنس سیکریٹری کا حوالہ دیا تھا اس لئے اسے قریشی سے بات کرنی پڑی تھی۔ وہ برلاس کا کھیل جاننا چاہتا تھا۔ قریشی نے سب کچھ کھل کر بتا دیا تھا۔ ہر بات صاف کر دی تھی۔ مستقبل کے منصوبے بتائے تھے۔ جنرل منصف جو نئے پاکستان کے منصوبے کو کئی بار پڑھ چکا تھا ایک بار پھر رپورٹ کی ورق گردانی کرنے لگا۔

جنرل منصف نے ایمان علی کے نئے پاکستان کی فائل دراز میں رکھ کر دوبارہ مقفل کر دی اور گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ ماتھے کے بل اور گہرے ہو گئے۔ کیا یہ سب کچھ ہو سکتا تھا؟ کاغذ پر سب کچھ اچھا لگ رہا تھا لیکن کیا یہ ممکن بھی تھا۔ اسے معلوم تھا کہ تاریخ سازی آسان کام نہیں ہے۔ لوگ آسانی سے نہیں مانیں گے۔ بہت سی رکاوٹیں آئیں گی۔ لیکن طاقت جنرل کے ہاتھ میں تھی۔ رکاوٹیں دور کرنا بھی اسی کا کام تھا۔ اسے رکاوٹوں کی پرواہ نہیں تھی۔ وہ جلد یا بدیر رکاوٹیں دور کر سکتا تھا۔ وہ میدان جنگ کی حکمت عملی کا ماہر جنرل تھا۔ اسے معلوم تھا اسے کب صرف آگے بڑھنا ہے اور کب آگے بڑھنے کے لئے پیچھے ہٹنا ہے۔ لیکن سب سے پہلے اسے اپنے آپ کو مطمئن کرنا تھا۔ جنرل نے میز پر رکھے ہوئے پیڈ پر چند نام لکھے۔ ان میں سے کئی کاٹ دیئے۔ صرف تین نام رہ گئے تھے۔ اس نے سوچا ایمان علی کے نئے پاکستان کا فیصلہ آج ہو جائے گا۔ اسی وقت انٹرکام کی گھنٹی بج اٹھی۔ جنرل نے گھڑی دیکھی۔ اسے معلوم تھا یہ جنرل برلاس ہو گا۔ اس نے برلاس کے بہت اصرار کے بعد اسے آج کا وقت دیا تھا۔ اسے امید تھی برلاس سے اس کی یہ آخری ملاقات ہو گی۔

ریٹائرڈ ہونے والے بڈھے جنرل نے بہت لپک کر جنرل منصف سے ہاتھ ملایا۔ لیکن اندر ہی اندر وہ پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اس کمرے میں اس نے کئی سال گزارے تھے۔ جنرل منصف نے آ کر کمرے کی ترتیب بالکل بدل دی تھی۔ جنرل برلاس سے وابستہ ہر نشانی ختم کر دی تھی۔ دونوں کچھ دیر چائے اور کافی پیتے ہوئے رسمی باتوں کا

تبادلہ کرتے رہے۔

''جمعرات کو اہم فیصلے کرنے ہیں۔ اجلاس میں آپ کی شرکت ضروری ہے۔'' جنرل برلاس نے کچھ دیر بعد براہ راست مطلب پر آتے ہوئے کہا۔

''اجلاس میں؟ کس اجلاس میں؟'' جنرل بالکل انجان بن گیا۔

''گروپ کا اجلاس جس کے بارے میں آپ کو میں نے پچھلی بار بتایا تھا۔ ہم مہینے کی ہر پہلی جمعرات کو کراچی میں ملتے ہیں۔ سب آ رہے ہیں۔ واشنگٹن والے بھی اور.........''

''جنرل صاحب پلیز! کچھ اور مت بتایئے۔ میرے عہدے کی جو حدود ہیں میں ان میں رہ کر کام کرتا ہوں۔ ان حدود سے باہر جو گروپ' ادارے اور تنظیمیں کام کرتی ہیں میرا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں ان کے بارے میں جاننا بھی نہیں چاہتا۔''

''آپ کی حد جی ایچ کیو کی یہ چہار دیواری نہیں ہے۔'' جنرل برلاس کو غصہ آ گیا۔ جنرل منصف جس کرسی پر بیٹھا اسے حدود و قیود کے سبق پڑھا رہا تھا اس پر وہ تین سال تک بیٹھا رہا تھا۔ ''اس ملک کی حفاظت کرنا آپ کی ذمہ داری ہے۔'' جنرل برلاس غرایا۔ ''عامر نذیر اور آصفہ اس ملک کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے بیچ رہے ہیں' انہیں روکنا آپ کی ذمہ داری ہے۔ ہم سب کی ذمہ داری ہے۔''

''میں اپنی ذمے داریاں پہچانتا ہوں۔'' جنرل منصف نے بہت سرد لہجے میں کہا۔ ''مجھے اپنی ذمے داریاں انجام دینے کے لئے باہر کے مشوروں یا اجلاسوں کی ضرورت نہیں ہے۔''

''میرا یہ مطلب نہیں تھا۔'' جنرل برلاس کا لہجہ ایک دم مدہم ہو گیا۔ جنرل منصف کے لہجے کی ٹھنڈک نے اس کی گرم مزاجی پر برف رکھ دی تھی۔ وہ یہ بھول گیا تھا کہ جنرل منصف اب اس کا ماتحت نہیں تھا۔

''آپ نے شاید ڈیفنس سیکریٹری سے بات نہیں کی۔ انہیں بلا کر پوچھئے۔ وہ آپ کو بتائیں گے کہ کیا ہو رہا ہے۔'' جنرل برلاس نے بہت نرمی سے کہا۔

"ڈیفنس سیکریٹری میرے ماتحت نہیں ہیں۔ لیکن اگر وہ اپنے دائرہ اختیار سے باہر جا کر کسی سیاسی سرگرمی میں ملوث ہیں تو پھر انہیں ڈیفنس منسٹری چھوڑنا پڑے گی۔ میں وزیراعظم سے تحریری درخواست کروں گا۔"

"آپ وزیراعظم سے کچھ نہیں کہیں گے۔" جنرل برلاس اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ لہجے کی نرمی پھر غائب ہو گئی۔

"آپ شاید بھول رہے ہیں کہ آپ ریٹائر ہو چکے ہیں۔" جنرل منصف بھی کھڑے ہو کر سمجھانے والے انداز میں کہنے لگا۔ "جنرل صاحب! میرا مشورہ ہے کہ ریٹائرڈ زندگی کو ریٹائرڈ زندگی کی طرح گزاریئے۔ گالف کھیلئے۔ دنیا گھومئے۔ جو کچھ ہو رہا ہے اس سے انہیں نمٹنے دیجئے جن کا یہ کام ہے۔ آیئے' آپ کو میں باہر تک چھوڑ آؤں۔" جنرل منصف نے دروازے کی طرف جنرل برلاس کی رہنمائی کرتے ہوئے کہا۔

"میں اپنے عہدے سے ریٹائر ہوا ہوں' اپنی ذمہ داریوں سے نہیں۔" جنرل برلاس نے باہر کی طرف چلتے ہوئے کہا۔ "میں ایک ماہ بعد آپ سے رابطہ کروں گا۔ اس وقت تک آپ خود دیکھ لیں گے کہ کیا ہو رہا ہے۔ مجھے یقین ہے اس کے بعد آپ انکار نہیں کریں گے۔" جنرل منصف نے کوئی جواب نہیں دیا' صرف مسکرا کر جنرل برلاس کو خدا حافظ کہنے لگا۔ واپس اپنی میز پر آیا تو مسکراہٹ غائب ہو گئی تھی۔ اس نے بہت تیزی سے قریشی کے نمبر ڈائل کئے۔

"آپ لوگ جمعرات کو کیا کرنے والے ہیں؟" اس نے قریشی کی آواز سن کر گرجدار آواز میں کہا۔ "جنرل برلاس مجھے دعوت دینے آیا تھا۔"

"بلاڈی اولڈ فول!" قریشی کی تشویش میں بھری آواز ابھری۔

"وہ میری کمر پر سواری کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اسے اتاریئے' میں اب برداشت نہیں کر سکتا۔" جنرل منصف کی آواز میں غصہ تھا۔

"آئی ایم ساری۔ وہ آئندہ اس موضوع پر آپ سے بات نہیں کرے گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔"

"آپ جلد از جلد اپنی صفیں درست کیجئے ورنہ .....Count me out" جنرل منصف نے قریشی کا جواب سنے بغیر فون بند کر دیا۔ اس نے کچھ دیر پہلے پیڈ پر جو نام لکھے تھے انہیں دیکھ کر فون کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔

جلالی گھر سے وقت پر نکل گیا تھا لیکن پھر بھی اسے دیر ہو گئی۔ اس رات سڑکیں اور ان پر چلنے والی ٹریفک زیادہ ہی مصروف تھی۔ بہت دیر تک کوئی ٹیکسی نہیں مل سکی تھی۔ اسے مجبوراً" ایک آٹو رکشہ روکنا پڑا۔ رکشہ میں بیٹھنا اسے بالکل پسند نہیں تھا۔ آواز سے کانوں کے پردے پھٹ جاتے اور جھٹکوں سے معدہ حلق میں آنے لگتا۔ لیکن آج اسے پرواہ نہیں تھی۔ آج اسے اقتدار مافیا کے تاریخی اجلاس کی کارروائی سننا تھی۔ اجلاس کے بعد اسے قریشی سے ملنا تھا جو اسے بتانے والا تھا کہ وہ جنرل منصف کو ایمان علی کا نیا پاکستان بیچ سکا ہے یا نہیں۔

جلالی رکشے کو گلی کے اندر لے کر نہیں گیا۔ اسے پتہ تھا چوکیدار چوکنے ہو جائیں گے۔ ہر اجلاس کے لئے پہرے دار بدل جاتے تھے اس لئے جلالی کو پہچاننے والا کوئی نہیں تھا۔ گل خان کی وجہ سے نواب ٹن کے بنگلے کے پھاٹک کے اندر متعین پہرے دار بھی اسے صرف گھور کر رہ گیا۔ جلالی تیزی سے اندر جا کر ریکارڈنگ روم میں گیا اور باہر کی بتیاں بجھا کر اور دروازہ اندر سے اچھی طرح بند کر کے سسٹم آن کرنے لگا۔ کانوں پر **کلیمپ** لگا کر بیٹھا تو ایک ایک کر کے آوازیں ابھرنے لگیں۔ اجلاس شروع ہو چکا تھا لیکن صرف ابتدائی باتوں کا دور مکمل ہوا تھا۔ کام کی باتیں اب شروع ہوئی تھیں۔ جلالی سوچ رہا تھا کاش وہ چہرے بھی دیکھ سکتا۔

"عامر نذیر کی حکومت ختم کرنے پر ہم سب متفق ہیں۔" قریشی کہہ رہا تھا۔ "اس مسئلے پر اب مزید بات نہیں ہو گی۔ آج ہمیں ایک زیادہ اہم معاملہ طے کرنا ہے۔ آج ہم........"

"کون سا معاملہ؟" جنرل برلاس قریشی کی بات کاٹ کر دہاڑا۔ "عامر نذیر سے زیادہ اہم معاملہ کوئی اور نہیں ہے۔ اگر ہے بھی تو اسے انتظار کرنا ہو گا۔ ہمیں عامر

نذیر کے بارے میں حکمت عملی کو آخری شکل دینی ہے۔ ناصر بھٹی نے اپنے لوگوں کو تیار کر لیا ہے۔ اس نے ریاض توصیف سے بھی معاملہ طے کر لیا ہے۔ عدم اعتماد کی تحریک کا نوٹس دینے کے لئے وہ ہمارے اشارے کا انتظار کر رہا ہے۔ ہم دیر نہیں کر سکتے۔"

"جنرل برلاس! ہمارا گروپ سیاسی چالیں چلنے والے بازیگروں کا جتھہ نہیں ہے۔" قریشی نے پڑھنے والا چشمہ ناک سے اتار کر کہا۔ "یہ اس ملک کی منزلوں کا تعین کرنے والے بااختیار لوگوں کا گروپ ہے۔ ہم اپنے فیصلوں پر عمل کرانے کے لئے ناصر بھٹی یا رضا سروہی جیسے کارندوں پر انحصار نہیں کرتے۔"

"لیکن......" جنرل برلاس نے کچھ کہنا چاہا تو قریشی نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔ وہ اس وقت گروپ کا سربراہ تھا۔ اس کے انداز میں ہی نہیں لہجے میں بھی سربراہوں والا تحکمانہ رنگ غالب تھا۔

"وقت آ گیا ہے کہ گروپ کی تشکیل نو کی جائے۔ عامر نذیر کی حکومت کو دفن کرنے کا کام نیا گروپ انجام دے گا....."

"لیکن......" جنرل برلاس نے پھر کچھ کہنا چاہا مگر قریشی نے گھور کر دیکھا تو ایک بار پھر جملہ پورا کئے بغیر خاموش ہو گیا۔

"ہمارا گروپ بے دانت کے ریٹائرڈ لوگوں کا سوشل کلب بن گیا ہے جس میں جنرل کانی کے علاوہ کسی کو دلچسپی نہیں ہے۔" فلک پیر نے مسکرا کر اختیار رضوی کو دیکھا جو بہت غور سے قریشی کو دیکھ رہا تھا۔ قریشی نے مسکرائے بغیر اپنی بات جاری رکھی۔

"اکبر خان کے بعد ایوان صدر پر ہمارا اختیار ختم ہو گیا ہے۔ جنرل برلاس کے ریٹائر ہو جانے کے بعد ہم فوجی طاقت استعمال نہیں کر سکتے۔ رضوی صاحب کے ریٹائرمنٹ کی وجہ سے نوکر شاہی کے سینئر لوگوں سے ہمارے تعلق کی ڈور بھی ٹوٹ گئی ہے۔ سندھ میں پیر صاحب کا اثر بہت کم ہو گیا ہے۔ جنرل سعید ملک اپنا زیادہ وقت تبلیغی کاموں پر صرف کرنا چاہتے ہیں۔ عارف علی اپنا کاروبار سمیٹ کر گلف جا رہے

ہیں۔ شفیع رضا کا لینگلی سے تعلق ختم ہو گیا ہے اور وہ اپنی نجی حیثیت میں آئے ہوئے ہیں۔ واشنگٹن کو ریٹائرڈ لوگوں کے اس گروپ میں فی الحال کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ان کی توجہ حاصل کرنے اور گروپ کی بقا کے لئے ہمیں اپنا بااختیار ہونا ثابت کرنا پڑے گا۔"

قریشی نے خاموش ہو کر سب کو باری باری دیکھا۔ سب خاموش تھے۔ جلالی کو لگا شاید اس کے سسٹم نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے۔ وہ نابز کے کان مروڑنا ہی چاہتا تھا کہ ہیڈ فون میں قریشی کی آواز دوبارہ ابھرنے لگی۔

"یہ گروپ پچھلے چھ سال سے کام کر رہا ہے۔ اس سے پہلے کسی اور گروپ نے اتنی مدت نہیں گزاری نہ ہی کسی گروپ کو حکومتوں کی تبدیلی کے اتنے بحرانوں سے نمٹنا پڑا۔ آج اس گروپ کا آخری اجلاس ہے۔ روایت کے مطابق آپ میں سے جس کو اگلے اجلاس کی دعوت نہیں ملے گی وہ گروپ میں شامل نہیں رہے گا۔"

"جو شامل نہیں رہیں گے انہیں اپنا حلف یاد رکھنا ہو گا۔" جنرل سعید ملک نے سب کو اپنی عقابی نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ "کسی نے رازداری کی شرط توڑی تو وہ زندہ نہیں رہے گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔" کچھ دیر کے لئے ایک بار پھر سناٹا چھا گیا۔

"قریشی! تم جلد بازی سے کام لے رہے ہو۔" کچھ دیر بعد اختیار حیدر رضوی کی آواز ابھری۔ اس کا لہجہ نرم تھا۔ "عامر نذیر کے قصے کے درمیان گروپ کی تشکیل نو کا کام صحیح نہیں ہے۔ ہمیں پہلے یہ قصہ تمام کرنا چاہئے۔ ہم ابھی اتنے بے اختیار بھی نہیں ہیں۔ نوکر شاہی پر ہمارا اب بھی کنٹرول ہے۔ جنرل برلاس نے جنرل منصف سے بات کی ہے۔"

"جنرل منصف نے صاف انکار کر دیا ہے۔" قریشی نے کہا۔

"صاف انکار نہیں کیا۔" جنرل برلاس کا لہجہ رضوی کی طرح نرم نہیں تھا۔ "وہ ہماری کارکردگی دیکھنا چاہتا ہے۔ ہم نے عامر نذیر کو ہٹا دیا تو جنرل منصف بھی ہمارے ساتھ آجائے گا۔ میں نے اسے ایک مہینے کا وقت دیا ہے۔"

"جنرل منصف کے آ جانے کے بعد گروپ کی تشکیل نو کی ضرورت نہیں ہو گی۔" اختیار رضوی نے قریشی کو دیکھتے ہوئے دوبارہ کہا۔ اس کے لہجے میں بدستور نرمی تھی۔ "جنرل بھی دیکھ لے گا کہ ہم اس کے بغیر بھی حکومت بدل سکتے ہیں۔ ناصر بھٹی کے آنے سے سندھ میں پیر صاحب کا سیاسی اثر بحال ہو جائے گا۔ ایوان صدر میں فیاض منگی بیٹھا ہے۔ سردار پوری طرح اس کے شکنجے میں ہے۔ منگی کو ترقی دے کر ہم اپنے ساتھ بٹھا سکتے ہیں۔"

"تم سویلین ہو اور سویلین ہی رہو گے۔" جنرل سعید ملک نے اختیار رضوی کو دیکھ کر اپنی گرجدار آواز میں کہا۔ "میدان میں لڑنے والا سپاہی کتنا بھی بہادر ہو وہ پالیسی بنانے والا جنرل نہیں بنتا۔ بن ہی نہیں سکتا۔ فیاض منگی فیلڈ آپریٹر ہے اور فیلڈ آپریٹر ہی رہے گا۔"

"مجھے اپنا سیاسی اثر بحال کرنے کے لئے کسی بھٹی کی ضرورت نہیں ہے۔" فلک پیر نے بھی سگار کا کثیف دھواں چھوڑتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔ اس کی آنکھوں میں غصے کی چمک جاگی ہوئی تھی۔

"ناصر بھٹی کے وزیراعظم بننے کا سب سے زیادہ فائدہ آپ کو پہنچے گا۔ یہ آپ کو بھی پتہ ہے۔" اختیار رضوی نے فلک پیر کو گھورتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے کی نرمی غائب ہو گئی تھی۔

"ناصر بھٹی وزیراعظم نہیں بنے گا۔" قریشی نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا اور ایسا لگا جیسے رضوی اور برلاس کو بجلی کا کرنٹ لگ گیا ہو۔

"کیا مطلب ہے نہیں بنے گا؟" جنرل برلاس غرایا۔

"آپ نے اس مہینے کی تجزیاتی رپورٹ نہیں پڑھی۔ ہمیں سنجیدگی سے....."

"پڑھی ہے۔" جنرل نے قریشی کی بات کاٹ کر غصے سے کہا۔ "اور مجھے معلوم کرنا ہے کہ اسے لکھنے والا کون ہے۔ وہ پاکستانی نہیں ہو سکتا۔ وہ یقیناً بھارتی ایجنٹ ہے۔ مایوسیاں پھیلانے اور ملک کو کمزور بنانے کی سازش کرنے والا۔ وہ کہتا ہے حکومت اس یہودی ایجنٹ ایمان علی کو دے دی جائے۔ over my dead body۔"

”جنرل برلاس! یہ جذباتی تقریریں کرنے کا وقت نہیں ہے۔ ملک دیوالیہ ہونے کے قریب ہے۔ ہم ناصر بھٹی‘ عامر نذیر‘ ریاض توصیف‘ رضا سروہی سب کو باری باری آزما چکے ہیں۔ یہ لوگ جو کچھ بچا ہے اسے بھی کھا جائیں گے۔ ہم اگر اپنی پرانی غلطیوں کو دہراتے رہے تو اس ملک میں جسے آپ بچانا چاہتے ہیں بچانے کے لئے کچھ نہیں بچے گا۔“ قریشی نے اتنی دیر میں پہلی بار اپنا پائپ سلگایا تھا۔

”ایمان علی کا نیا پاکستان! اس کے بارے میں کیا رائے ہے۔“ شفیع رضا نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے پوچھا۔

”آج رات اجلاس کے بعد ایمان علی سے میٹنگ ہے۔ بہت سی وضاحتیں چاہئیں۔ وہ اگر مطمئن کرنے میں کامیاب ہو گیا تو.......“ قریشی جنرل برلاس کو دیکھ کر مزید کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ جنرل برلاس کا چہرہ آگ کی طرح دہکنے لگا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”تم یہودی ایجنٹ کو وزیراعظم بنوانا چاہتے ہو۔ میں یہ سازش کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔“ جنرل برلاس چیخ کر بولا۔ ”میں سمجھ گیا تم مجھ سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کیوں کر رہے ہو۔ تمہیں پتہ ہے میرے ہوتے ہوئے تمہاری سازش کامیاب نہیں ہو گی۔ شفیع رضا‘ تم اپنے آقاؤں کو بتا دینا گلف کی طرح پاکستان کو بھی اسرائیل کے حوالے نہیں کرنے دیا جائے گا۔ قریشی‘ تم نے ایمان علی سے کتنے پیسے لئے ہیں؟ ایک ملین‘ دو ملین‘ تین ملین؟ تم اس گروپ کو غداروں کا ٹولہ بنانا چاہتے ہو۔ میں تمہیں برطرف کرتا ہوں‘ You are dismissed۔“

سب خاموش تھے۔ شفیع رضا کوئی جواب دیئے بغیر خاموشی سے مسکرا رہا تھا۔ پیر فلک کے ہونٹوں پر بھی مضحکہ اڑانے والی مسکراہٹ تھی۔ قریشی کوئی تاثر ظاہر کئے بغیر پائپ کے کش لے رہا تھا۔ اسے جنرل برلاس کے اس ردعمل کی پہلے سے توقع تھی۔ ان سب کے اطمینان اور سکون کو دیکھ کر جنرل برلاس کا غصہ پہلے سے زیادہ تیز ہو گیا۔

”میں تم سب کو ڈسمس کرتا ہوں۔ اب نیا گروپ میں تشکیل دوں گا۔ رضوی‘

عارف علی، اٹھو۔ ہم غداروں کے ساتھ نہیں بیٹھیں گے۔"

"Sit down you old fool!" جنرل ملک نے دوستانہ لہجے میں کہا۔ "یہاں کوئی غدار نہیں ہے۔ ایمان علی بھی کسی کا ایجنٹ نہیں ہے نہ یہاں کوئی سازش ہو رہی ہے۔ ہم سب اب اپنے اپنے گھر جا کر آرام کریں گے اور اب جو کچھ بھی فیصلہ ہو گا وہ نیا گروپ کرے گا۔ یہ حقیقت جذب کرنے کی کوشش کرو کہ اب ہمارا اور تمہارا وقت ختم ہو گیا ہے۔"

"میرا نہیں صرف تمہارا!" جنرل برلاس نے توپوں کا رخ جنرل ملک کی طرف کر دیا۔ "تم اپنے اسلامی انقلاب کو یہودیوں کے پاس گروی رکھ سکتے ہو، میں اس ملک کا سودا نہیں ہونے دوں گا۔"

"شٹ اپ اینڈ گٹ آؤٹ۔" جنرل ملک کھڑے ہو کر غصہ سے چلایا لیکن پھر اپنے غصے پر قابو پا کر بیٹھ گیا اور دروازے کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا۔ "جنرل برلاس، تمہیں علاج کی ضرورت ہے۔ جاؤ کسی ماہر نفسیات سے مدد لو۔"

جنرل برلاس کچھ کہے بغیر باہر کی طرف جانے لگا۔ رضوی اس کے پیچھے تھا۔ لیکن عارف علی اسی طرح بے تعلق بیٹھا ہوا اپنی انگلیوں سے بالوں میں کنگھی کر رہا تھا۔ جنرل برلاس چند قدم چل کر رک گیا اور پلٹ کر عارف علی کو دیکھنے لگا۔

"عارف چلئے ہم اب ان کے ساتھ نہیں بیٹھیں گے۔"

"جنرل صاحب! میں ایمان علی کے مسئلے پر آپ سے متفق نہیں ہوں۔ ہمیں ایمان علی کے امکان کو نظرانداز نہیں کرنا چاہئے۔" عارف علی نے جنرل برلاس سے نظریں ملائے بغیر کہا۔ پہلی بار جنرل برلاس کے چہرے پر غصے کی جگہ حیرت اور صدمے کی کیفیت نمودار ہوئی۔

"تم...... تم بھی......" جنرل برلاس نے کچھ کہنا چاہا لیکن پھر خاموش ہو کر پلٹا اور تیزی کے ساتھ کمرے سے نکل گیا۔ رضوی بھی کمرے سے باہر کی طرف چل دیا لیکن اس کے قدم بہت آہستہ آہستہ اٹھ رہے تھے۔ اس نے ایک دفعہ پلٹ کر کمرے میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی طرف دیکھا جیسے اسے توقع ہو کہ کوئی رکنے کے لئے کہے گا۔

لیکن کوئی ردعمل نہ پا کر وہ بھی باہر نکلا اور تاریک راہداری میں گم ہو گیا۔
"بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے۔" فلک پیر نے مصرعہ پڑھا لیکن کسی کے چہرے پر مسکراہٹ نہیں ابھری۔
"جنرل برلاس سیکورٹی رسک بن سکتا ہے۔" شفیع رضا نے جنرل ملک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"نہیں۔ وہ پاگل ضرور ہے لیکن احمق نہیں ہے۔" جنرل ملک نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "اختیار رضوی اس کے ساتھ ہے وہ اسے ٹھنڈا کر دے گا۔ جنرل برلاس کو خود بھی اپنی حدود معلوم ہیں اور وہ مجھ سے بھی اچھی طرح واقف ہے۔ جنرل منصف نے فوج میں اسے پہلے ہی بلیک بال کر دیا ہے۔"
"میں جنرل ملک سے متفق ہوں۔" قریشی نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "جنرل برلاس اور رضوی کے پاس صرف ایک مہرہ بچا ہے۔ ناصر بھٹی۔ اگر وہ پیسوں کا انتظام کر سکے تو عدم اعتماد والا پلان آزما کر بھٹی کو وزیراعظم بنوانے کی کوشش کریں گے۔"
"وہ مارکیٹ سے بیس تیس کروڑ اٹھا سکتے ہیں۔ ان کی ابھی اتنی ساکھ باقی ہے۔ لیکن ضرورت ہو تو اس کی روک تھام ہو سکتی ہے۔" عارف علی نے کہا۔
"کیوں جنرل کانی کے پیٹ پر لات مارتے ہو۔" فلک پیر نے کہا تو سب ہنس پڑے۔ "ویسے بھی نہ رہے گا بانس اور نہ بجے گی بانسری۔ کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" سب فلک پیر کو حیرت سے دیکھنے لگے۔
"پارلیمنٹ ہی نہیں رہے گی تو عدم اعتماد کہاں آئے گا۔" پیر نے مسکراتے ہوئے وضاحت کی۔
"نواب صاحب! باہر جا کر دیکھئے کہ جنرل برلاس اور رضوی چلے گئے یا ابھی اندر ہیں۔ پہرے داروں کو بھی خبردار کر دیجئے گا۔" قریشی کی ہدایت سنتے ہی نواب ٹن کچھ کہے بغیر اٹھ کر تیزی سے باہر چلا گیا۔
"برلاس اور رضوی کی اس طرح رخصتی اچھی نہیں لگی۔" شفیع رضا نے اپنے شفاف سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھوں میں ہلکی سی اداسی آ گئی

تھی۔ وہ سوچنے لگا کہ وہ واقعی بوڑھا ہو گیا ہے۔

"کوئی اور چارہ نہیں تھا۔" قریشی کا لہجہ گہری سنجیدگی لئے ہوئے تھا۔ "وہ ایک بھاری بوجھ بن گئے تھے۔ ریٹائر ہونے کے بعد اختیار حاصل کرنے کی ہوس میں مستقل بے وقوفیاں کر رہے تھے۔ پوچھے بغیر خود ہی ناصر بھٹی کو وزیراعظم بنانے کا وعدہ کر لیا۔ فیاض منگی سے اسے ترقی دینے کی بات کر لی۔ جنرل منصف کے سی این سی بنتے ہی اس پر گروپ کا راز ظاہر کر دیا اور اس کے اعصاب پر سوار ہو گئے۔ جنرل منصف کو برلاس سے سخت الرجی ہے۔ برلاس کے ہوتے ہوئے وہ ہم سے کبھی تعاون نہیں کرے گا۔ جنرل منصف کے بغیر ہم ادھورے ہیں۔ ہمارا ایجنڈا بھی ادھورا رہے گا۔"

"جنرل منصف ایمان علی کے نئے پاکستان کو ہضم کر سکے گا؟" عارف علی کے لہجے میں تشویش تھی۔

"جنرل منصف ایک پٹڑی پر چلنے والا روایتی فوجی نہیں ہے۔ وہ بہت ٹھنڈے مزاج کا اور سوجھ بوجھ رکھنے والا جنرل ہے۔ اس کا کوئی ذاتی ایجنڈا بھی نہیں ہے۔ اسے پتہ ہے ملک کو سرحدوں پر کھڑے ہوئے دشمنوں سے زیادہ اندر بیٹھے ہوئے دوستوں سے خطرہ ہے۔ ان سے نمٹے بغیر یہ ملک نہیں بچے گا۔" جنرل منصف نے مجھ سے صاف صاف کہا ہے کہ وہ ملک بچانے کے لئے دوست اور دشمن کی تمیز نہیں کرے گا۔ وہ اسی لئے ایمان علی کے نئے پاکستان پر غور کرنے کے لئے تیار ہوا ہے۔"

"کیا جنرل منصف واقعی مان گیا ہے؟" عارف علی نے حیرت سے پوچھا۔ اس کے لہجے میں دبا دبا سا جوش تھا۔ ایمان علی کے نئے پاکستان میں عارف علی کی دلچسپی پچھلے ہفتے اس وقت پیدا ہوئی تھی جب شیخ علی نے اسے نئے پاکستان کا مسودہ دیا تھا۔ شیخ علی اپنی بیوی مسز چنائے کو بتائے بغیر اس کے سیاسی پروگرام میں اس کی مدد کرنا چاہتا تھا۔ وہ عارف علی کی پہنچ جانتا تھا۔ ساتھ ہی دو چار ملین خرچ کرنے کے لئے بھی تیار تھا۔ نئے پاکستان میں کیا تھا؟ نہ شیخ علی نے پڑھا تھا اور نہ عارف علی نے جس کے لئے یہ ایک سودا تھا۔ اس نے قریشی سے بات کی تھی اور "نیا پاکستان" اس کے

حوالے کر دیا تھا۔

قریشی عارف علی سے مسودہ لے کر دل ہی دل میں مسکرایا تھا۔ اسے ملنے والا نئے پاکستان کا یہ چوتھا مسودہ تھا۔ جلالی، مسز چناۓ اور عارف علی کے علاوہ شفیع رضا نے بھی آج صبح پر زور سفارش کے ساتھ اسے ایمان علی کا "نیا پاکستان" دیا تھا۔ شفیع رضا کو یہ مسودہ امریکہ کی ایک بااثر شخصیت سے ملا تھا جو ایمان علی سے بہت متاثر تھی اور ایمان علی کو بتائے بغیر اس کی مدد کرنا چاہتی تھی۔ خود ایمان علی کو قریشی تک پہنچنے والے نئے پاکستان کے صرف اس مسودے کا علم تھا جو اس نے جلالی کے ذریعے قریشی تک پہنچایا تھا اور جو اب جنرل منصف کی دراز میں بند تھا۔

"جنرل منصف تقریباً" مان گیا ہے۔" قریشی عارف علی کو بتا رہا تھا۔ "اسے کچھ وضاحتیں چاہئیں۔ میں ایمان علی سے آج رات ہی مل رہا ہوں۔ ایمان علی نے اگر مثبت جواب دیئے تو پھر میں اور جنرل سعید ملک ایمان علی کو لے کر جنرل منصف سے ملیں گے۔ اگر ضرورت ہوئی تو جنرل اور ایمان علی ون ٹو ون بھی مل سکتے ہیں۔"

"یہ ملاقاتیں چھپی نہیں رہیں گی۔ مارکیٹ میں افواہیں پھیل جائیں گی۔" عارف علی نے خدشہ ظاہر کیا۔

"یہ کام نواب صاحب کا ہے۔ وہ جنرل ملک کی مدد سے کوئی فول پروف انتظام کریں گے۔" قریشی نے کہا۔ اسی وقت نواب ٹن بھی کمرے میں واپس آ گیا۔ جنرل سعید ملک نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ نواب ٹن نے سر ہلا دیا اور خاموشی سے اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔ جنرل ملک کے ماتھے سے بل غائب ہو گئے اور اس نے جیب سے تسبیح نکال کر اس کے دانے گننے شروع کر دیئے۔

"قریشی! تم نے بھی خواب دیکھنے شروع کر دیئے ہیں۔" فلک پیر نے سنجیدگی سے قریشی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم جی ایچ کیو میں بیٹھے ہو لیکن تم جی ایچ کیو کو مجھ سے زیادہ نہیں جانتے۔ جنرل منصف چاہتے ہوئے بھی کچھ نہیں کر سکے گا۔ وہ کور کمانڈروں کو ہمنوا بنائے بغیر کچھ نہیں کر سکتا۔ تمہارا جو چھاپہ مار ہے اس نے اپنے تجزیئے میں ایمان علی کے نئے پاکستان کا جو خاکہ کھینچا ہے اسے فوج کبھی قبول نہیں

کرے گی۔ میری بات لکھ لو۔ یہ ستاروں کا نہیں میرا فرمان ہے۔"

"فوج کے پاس ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہو گا۔" قریشی نے پائپ نیچے رکھ کر کہنا شروع کیا۔ "یہ ان کے بچاؤ کی آخری صورت ہے۔ اقتصادی بدحالی نے فوج پر دباؤ بہت بڑھا دیا ہے۔ نیا انتظامی اور سیاسی ڈھانچہ بنائے بغیر نہ آمدنی بڑھے گی نہ ساکھ بہتر ہو گی۔ قرضے لے کر قرض دینے اور چھاپے خانوں میں نوٹ چھاپ کر آج تو گزارا ہو جائے گا۔ کل کیا ہو گا؟ یہی صورت رہی تو دو چار سال میں ملک کا پورا بجٹ فوج کا پیٹ نہیں بھر سکے گا۔"

"آپ کا خیال ہے کہ ایمان علی دو سال میں اس صورت حال کو بدلنے کا معجزہ دکھا کر نیا پاکستان کھڑا کر دے گا۔" فلک پیر نے ہونٹوں پر زہریلی سی مسکراہٹ لا کر طنزیہ لہجے میں کہا۔

"یقیناً"! اگر ہم سب نے ساتھ دیا تو وہ یہ معجزہ کر دکھائے گا۔" قریشی کا لہجہ یقین سے پر تھا۔

"اور اس معجزے کے رونما ہونے کے لئے ہمیں اپنے دفاع کی قربانی دینی ہو گی؟" فلک پیر نے سگار کا ایک گہرا کش لے کر کہا۔ دھوئیں میں مونچھوں کے نیچے سے جھانکتی ہوئی زہریلی مسکراہٹ چھپ گئی تھی۔

"ایمان علی سے دفاع کو خطرہ ہوتا تو جنرل ملک یہاں نہ بیٹھے ہوتے اور جنرل منصف نئے پاکستان کی رپورٹ پڑھتے ہی میرے منہ پر دے مارتا۔" قریشی جنرل سعید ملک کی طرف دیکھ کر کہنے لگا جس کی انگلیاں اور تیزی سے تسبیح کے دانوں پر گردش کرنے لگی تھیں۔

"ہم اتنے برسوں سے دفاعی بجٹ کا دفاع کرنے کے لئے حکومتیں بدلنے کا کھیل، کھیل رہے ہیں۔ لیکن یہ دفاع اب ناممکن ہو گیا ہے۔" قریشی صوفے سے اپنی پشت ٹکا کر ایک بار پھر سیاست پڑھانے والا استاد بن گیا۔

"بھارت دفاع پر قومی آمدنی کا تین فیصد سے بھی کم خرچ کرتا ہے وہ بھی دس بلین ڈالر کے برابر۔ ہم چھ فیصد سے زیادہ خرچ کرتے ہیں جو ڈیڑھ بلین سے زیادہ

نہیں ہے۔ ہم یہ دوڑ نہیں جیت سکتے۔ سوویت یونین نے امریکہ کے مقابلے میں اسلحے کی دوڑ لگانے کی غلطی کی تھی۔ امریکہ نے ایک گولی چلائے بغیر سوویت یونین کی پوری سلطنت تباہ کر کے یہ جنگ جیت لی۔" قریشی خاموش ہو کر دوبارہ اپنا پائپ بھرنے لگا۔

"آپ نے "نئے پاکستان" کی رپورٹ نہیں پڑھی۔" شفیع رضا فلک پیر کو دیکھ کر بڑی سی جماہی لیتے ہوئے کہنے لگا۔ "غور سے پڑھیے' آپ کے تمام سوالوں کے جوابات مل جائیں گے۔"

"مجھے رپورٹوں اور تجزیوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ مجھے سیدھے سیدھے دو ٹوک جواب چاہئیں جو آسانی سے میرے دماغ میں بیٹھ سکیں۔" فلک پیر خلاف عادت بہت سنجیدہ تھا۔

"ہمیں فلوریڈا سے ضمانت ملی ہوئی ہے۔" قریشی نے سنبھل کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "ہم آر ڈی ایف کا ایک لازمی جزو ہیں۔ امریکہ نے سلامتی کی جو زنجیر بنائی ہے اس میں سے ہماری کڑی کو الگ کرنا ممکن نہیں ہو گا۔"

"ہم ایسی زنجیروں میں پہلے بھی بندھے رہے ہیں پھر بھی ہم نے آدھا ملک گنوا دیا۔"

"اس آدھے حصے کو الگ ہونا ہی تھا۔ وہ پاکستان کا ایک غیر فطری حصہ تھا۔ ایک غیر ضروری اپنڈکس۔" شفیع رضا نے فلک پیر کو گھورتے ہوئے سنجیدہ ہو کر کہا۔ "آپ اگر سلامتی کی اس عالمی زنجیر میں نہ بندھے ہوتے تو جس پاکستان میں بیٹھے ہیں وہ بھی نہیں رہتا۔"

"ماضی کو کریدنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔" قریشی فلک پیر کے کچھ کہنے سے پہلے بول پڑا۔ "پیر صاحب دو ٹوک حقائق یہ ہیں کہ بھارت نے پاکستان کو فتح کرنا چاہا تو وہ خود عدم استحکام کا شکار ہو جائے گا۔ اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ امریکہ اور چین اسے ایسا کرنے بھی نہیں دیں گے۔ ہمارے لئے نہیں بلکہ خود اپنے مفادات کے لئے۔ بھارت گلف کے دہانے پر بیٹھی ہوئی ایک ایسی بڑی طاقت بن جائے گا جو امریکہ کو بلیک میل کر سکتا ہے۔ چین کو بھی اپنے سر پر بیٹھا ہوا اتنا طاقتور پڑوسی پسند

نہیں آئے گا۔ یہ ضمانتیں نہ ہوں پھر بھی ہماری ایٹمی اہلیت سب سے بڑی ضمانت ہے۔ لیکن ہمارے معاشی حالات بہتر نہ ہوئے تو ہمیں قرضے دینے والی طاقتیں ہم سے یہ آپشن بھی چھین لیں گی۔"

"ہوں! تو فوج رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے؟" فلک پیر ابھی تک مطمئن نہیں تھا۔

"ایمان علی فوج کا ایک سپاہی بھی کم نہیں کرے گا۔ وہ صرف ہارڈویئر کے بجٹ میں کٹوتی چاہتا ہے۔" قریشی نے بہت پرسکون لہجے میں کہا۔ "وہ فوج کو ترقیاتی کاموں کے لئے استعمال کرے گا۔ ایسی دیوار بنا دے گا کہ ملک میں ایک پستول تک داخل نہ ہو سکے۔ زمین کا چپہ چپہ کھدوا کر ناجائز اسلحہ باہر نکلوائے گا۔ وہ فوج کے ذریعے ایک بے رحمانہ آپریشن کرنا چاہتا ہے۔"

"تاکہ گالیاں پھر فوج کو پڑیں اور......."

"یہ پبلک ریلیشنز کی ایکسر سائز یا تعلقات عامہ کی کوئی ورزش نہیں ہے۔" قریشی نے فلک پیر کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "جراحت کا عمل بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ اس میں خون بھی بہت بہتا ہے۔"

قریشی کے لہجے میں سفاکی تھی۔ وہ خاموش ہو کر اپنا بجھا ہوا پائپ صاف کرنے لگا۔ فلک پیر خاموش ہو گیا تھا۔ آنکھیں کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ لیکن جب شفیع رضا نے جماہی لینے کے لئے ایک بار پھر ہاتھ اٹھائے تو فلک پیر کا پرانا موڈ بحال ہو گیا۔

"انگڑائیوں کا کوئی فائدہ نہیں۔ آج جنرل کانی چھٹی پر ہے۔"

"ایسا مت کہو۔ مجھے دل کا دورہ پڑ جائے گا۔" شفیع رضا انگڑائی درمیان میں توڑ کر اور دل پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگا۔ "مجھے پتہ ہے یہ جنرل ملک کی سازش ہے۔ پہلے فلم بند کروائی۔ اور اب یہ جنرل کانی۔ میں اگلے اجلاس میں نہیں آؤں گا۔" سب ہنس پڑے۔ جنرل سعید ملک بھی تسبیح جیب میں رکھ کر مسکرانے لگا۔

"آئندہ چند روز بہت اہم ہوں گے۔ بہت الرٹ رہنے کی ضرورت ہے۔"

قریشی نے ماحول کو سنجیدہ کرتے ہوئے ہدایات جاری کرنا شروع کریں۔ "شفیع رضا' نئے پاکستان کا پہیہ چلنے تک آپ کو پاکستان میں ہی رہنا ہو گا۔ آپ اپنے سفیر سے ایمان علی کی ملاقات کا انتظام کرائیے۔ ایمان علی کو کچھ ضروری ضمانتیں چاہئیں۔ پیر صاحب' ایمان علی آپ کے طبقے پر کڑی ضرب لگائے گا۔ جاگیردار آسانی سے ٹیکس دینے پر تیار نہیں ہوں گے۔ سندھ میں وہ ایک بار پھر ڈاکوؤں کا ہوا کھڑا کر سکتے ہیں۔ آپ کو اپنے مریدوں کو چوکنا کرنا ہو گا۔ جنرل ملک' ایمان علی اور جنرل منصف سے ملاقات میں آپ میرے ساتھ ہوں گے۔ نواب صاحب' آپ کو پتہ ہے کہ ان ملاقات کو خفیہ رکھنے کے لئے آپ نے کیا کرنا ہے۔ ایمان علی غیرملکی سرمایہ کاروں کو پاکستان لانے کی مہم شروع کرے گا۔ اس کے عالمی رابطے بہت مضبوط ہیں۔ عارف علی اس سلسلے میں آپ کو اپنے تعلقات بھی استعمال کرنے ہوں گے۔ شفیع رضا آپ بھی......"

جلالی نے ریکارڈنگ بند کر کے ٹیپ مشین سے باہر نکال کر جیب میں رکھا اور ایک گہری سانس لی۔ تھوڑی دیر تک وہ اسی طرح بیٹھا خالی ریکارڈنگ کے آلات دیکھتا رہا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ قریشی نے بہت اعتماد کے ساتھ ایمان علی کے نئے پاکستان کے پہیئے کو دھکا دے کر متحرک کر دیا تھا۔ جلالی کو یقین تھا جنرل منصف بھی مان جائے گا۔ جنرل منصف سچ مچ سنجیدہ لگتا تھا۔ جنرل منصف کو جو شبہات رہے ہوں گے وہ آج رات قریشی اور ایمان علی کی ملاقات میں طے کر لئے جائیں گے۔ قریشی نے جلالی سے ایمان علی کے ساتھ ہونے والی اس ملاقات میں شریک ہونے کے لئے کہا تھا لیکن جلالی نے منع کر دیا تھا۔ ایمان علی نے بھی آنسرنگ مشین پر پیغام چھوڑا تھا۔ لیکن جلالی نے جوابی فون نہیں کیا تھا۔ اسے اپنی حدود سے نکل کر بادشاہ گری کے عمل کا سرگرم کردار بننا پسند نہیں تھا۔ وہ یہ سوچ کر مسکرایا کہ اگر مرینہ کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس نے وزیر بننے کا سنہری موقع ضائع کر دیا ہے تو کس قدر ناراض ہو گی۔ جلالی جانتا تھا اسے وزیر یا سفیر کی بیوی بننا کتنا پسند تھا۔ ایک دن وہ بہت موڈ میں تھی تو اس نے جلالی کے گلے میں بانہیں ڈال کر اپنی خواہش کا اظہار کر دیا تھا۔

"مجھے چھو جانے والا وزیر بنے نہیں رہتا۔ دیکھنا تمہیں بھی ایک دن وزیر بنوا کر رہوں گی۔" جلالی نے کچھ نہیں کہا تھا۔ اسے پتہ تھا مرینہ جس حلقے میں گردش کرتی تھی اس میں صرف ایک صحافی کی بیوی ہونا بہت ہتک کی بات تھی۔

جلالی نے ایک گہری سانس لی اور خیالوں کی دنیا سے باہر نکل کر اٹھ کھڑا ہوا۔ کمرہ بند کر کے باہر نکلا تو ابھی صرف نو بجے تھے۔ اسے پتہ تھا آج نواب ٹن جلدی واپس نہیں آئے گا اس لئے اس کا انتظار کرنا بے کار تھا۔ مرینہ بھی ابھی ڈنر سے واپس نہیں آئی ہو گی۔ اس نے سوچا پریس کلب جا کر کھانا کھائے گا اور دیکھے گا کہ خبروں کی نبض پر ہاتھ رکھنے والوں کو بھی کوئی سن گن ہے یا نہیں۔ پریس کلب پہنچا تو وہ سنسان پڑا تھا۔ کوئی ایسا نہیں تھا جس کے ساتھ بیٹھ کر بحث کرتا۔ کھانا بھی ختم ہو گیا تھا۔ جلدی جلدی کافی کے ساتھ انڈوں کا ایک سینڈوچ نگل کر بے مقصد ٹہلتا ہوا پی آئی ڈی سی کی طرف چلا گیا۔ لیکن آج بشیر بھی دکان پر نہیں تھا اس لئے جلالی خاموشی سے سگریٹ کے دو پیکٹ لے کر اور منہ میں پان کی ایک گلوری دبا کر گھر جانے کے لئے ٹیکسی تلاش کرنے لگا۔

گھر پہنچا تو مرینہ کو ڈرائنگ روم میں دیکھ کر حیرت ہوئی۔ وہ بیٹھی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔

"تم اور کتاب؟ خیریت تو ہے، تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟" جلالی نے مرینہ کے سامنے صوفے پر بیٹھ کر اور کافی ٹیبل پر اپنے پیر پھیلا کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"تم کتنے غیر رومینٹک ہو گئے ہو۔ نہ پیار کیا نہ گلے لگایا، بس پاؤں پھیلا کر بیٹھ گئے۔ جنگلی!"

"تمہیں تو جنگلی مرد بہت پسند تھے۔"

"اب تم اتنے جنگلی بھی نہیں ہو۔" مرینہ اٹھلائی لیکن پھر سنجیدہ ہو کر کہنے لگی۔ "میں کتاب پڑھ کر نیند بھگانے کی کوشش کر رہی تھی۔ مجھے آج تم سے بہت ضروری باتیں کرنی ہیں۔"

"تمہیں پتہ ہے مجھے تمہارے سوشل کلب کی گپ شپ سے کوئی دلچسپی نہیں

ہے۔"

"یہ سوشل کلب کی گپ شپ نہیں ہے۔ ہر طرف چرچا ہے کہ ایمان علی وزیراعظم بننے والا ہے۔" مرینہ سسپنس پیدا کرنے کے لئے چند لمحوں کا وقفہ لے کر کہنے لگی۔ "لیکن یہ کل کی خبر ہے۔ آج کی خبر یہ ہے کہ ایمان علی کو وزیراعظم بنانے میں تم اس کی مدد کر رہے ہو۔"

"یہ بے پر کی خبر تم نے کس سے سنی؟"

"From the horse's mouth- گھوڑے کے منہ سے۔"

"پہیلیاں مت بجھواؤ۔ مجھے بتاؤ تمہاری دوستوں میں میرا دشمن کون ہے جو میرے بارے میں ہوائیاں اڑا رہا ہے۔"

"اداکاری مت کرو۔" مرینہ چلائی۔ "مجھے ایمان علی نے بتایا ہے۔ خود ایمان علی نے۔ ڈنر کے بعد ہم کافی پینے میریٹ گئے تھے۔ وہ دروازے سے باہر نکلتے ہوئے ملا تھا۔" مرینہ کے لہجے سے غصہ اچانک ہی غائب ہو گیا اور آنکھوں میں چمک آ گئی۔

"اس نے میرے ساتھ کھڑی ہوئی مسز خان، مسز علی اور بیگم دلبر کو دیکھا تک نہیں۔ میرا بازو پکڑ کر کونے میں لے گیا۔ تینوں جل کر کباب ہو گئیں۔ مجھ سے ڈینگیں مارتی تھیں کہ ایمان علی سے ان کے خاندانی تعلقات ہیں۔ مسز خان تو اسے اپنا رشتہ دار بتاتی تھی۔ شاید کسی پریس فوٹو گرافر نے ایمان علی کے ساتھ میری تصویر بھی کھینچی ہے۔ مجھے یقین ہے وہ فلیش لائٹ کا ہی جھاکا تھا۔ کل اخبار میں تصویر چھپے گی تو سب اور جل جائیں گے۔ I love you for that۔ I love you۔" مرینہ گزرے ہوئے اس لمحے کا مزا لے رہی تھی۔ جلالی خاموش رہا۔ لیکن اس نے پاؤں سکیڑ کر نیچے زمین پر رکھ لئے اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ مرینہ چند سیکنڈ خاموش رہنے کے بعد بولی تو لہجے میں ایک بار پھر شکایت بھر گئی۔

"ایمان علی بہت پرجوش ہو کر تمہارے بارے میں بتا رہا تھا اور پوچھ رہا تھا کہ تم آج کے اجلاس میں آ رہے ہو یا نہیں۔ میں صرف ہوں ہاں کرتی رہی۔ اگر اسے بتا دیتی کہ مجھے کچھ نہیں معلوم، تم نے مجھے کچھ نہیں بتایا تو اسے یقین نہیں آتا اور

میری عزت دو پیسے کی بھی نہیں رہتی۔ تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا۔ بولو۔ اتنی اہم بات مجھ سے کیوں چھپائی؟؟"

"ان باتوں کا تم سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ ایمان علی کو بھی تم سے بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔" جلالی کے لہجے میں گہری سنجیدگی تھی۔ چہرے کے عضلات تن گئے تھے۔

"یہ مت بھولو کہ ایمان علی کو تم سے میں نے ہی ملوایا تھا۔" مرینہ غصے سے بولی۔ "یہ باتیں میرے لئے نئی بھی نہیں ہیں۔ انیس شمشاد مجھے ایک ایک بات بتاتا تھا۔ کابینہ کے اجلاس میں کیا ہوا۔ وزیراعظم نے کیا کہا۔ کس کی گڈی چڑھی ہوئی ہے۔ کس کا ڈبہ گول ہونے والا ہے۔ ایک ایک بات۔"

"اسی لئے اس کا اور اس کے وزیراعظم کا حشر اچھا نہیں ہوا۔" جلالی نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اور تمہیں یہ بھی پتہ ہے کہ میں انیس شمشاد نہیں ہوں۔"

"آئی ایم ساری ڈارلنگ۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" مرینہ اپنی جگہ سے اٹھ کر جلالی کے پاس آئی اور اس کے ہونٹوں پر بوسہ دے کر اور گلے میں بانہیں ڈال کر اس کے پاس بیٹھ گئی۔

"انیس شمشاد تمہاری جوتی کے برابر بھی نہیں ہے۔" وہ جلالی کے سینے پر سر رکھ کر اور اس کے سینے کے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے کہنے لگی۔ "مجھے پتہ ہے تم بہت شرمیلے ہو۔ اپنے منہ سے کبھی نہیں کہو گے۔ اسی لئے میں نے ایمان علی سے صاف صاف بات کی ہے۔ اس سے وعدہ لے لیا ہے۔ کہتا ہے تمہیں کابینہ میں لے کر اسے بہت خوشی ہو گی۔ اسے اپنی کابینہ میں تم جیسے ہی لوگ چاہئیں۔ لیکن وہ کہتا تھا کہ تم تیار نہیں ہو۔ میں نے اس سے وعدہ کیا ہے کہ تم انکار نہیں کرو گے۔ بولو۔ وعدہ کرو تم انکار نہیں کرو گے۔" مرینہ نے چہرہ اٹھا کر اپنی نشیلی آنکھیں جلالی پر گاڑ دیں۔ جلالی کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔

"تم نے بہت برا کیا۔ مجھے ایمان علی کی نظروں میں ذلیل کر دیا۔ وہ سمجھتا ہو گا

کہ میں بھی وزیر بننے کے لئے یہ سب کچھ کر رہا تھا۔ مجھے اب اسے فون کر کے اس کی غلط فہمی دور کرنی پڑے گی۔" جلالی نے مرینہ کو اپنے آپ سے الگ کرتے ہوئے بہت سخت لہجے میں کہا۔

"نہیں تم ایسا نہیں کرو گے۔" مرینہ اسے شعلہ بار نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

"میں ان بڈھی میموں کا سر جھکانا چاہتی ہوں۔ بیگم دلبر آج پارٹی میں کالمسٹ کی بیوی کہہ کر میرا اس طرح تعارف کرا رہی تھی جیسے مذاق اڑا رہی ہو۔ مجھے پتہ ہے وہ سب میرے پیچھے مجھے "بے چارے صحافی کی بیوی" کہہ کر کس طرح مجھ پر ترس کھاتی ہیں۔ تم وزیر بنو گے تو سب مل کر میری جوتیاں سیدھی کریں گی۔ جلالی پلیز۔ میری خاطر۔ یہ موقع ہاتھ سے نہ جانے دو۔"

جلالی صوفے سے اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ وہ اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے سخت صدمہ پہنچا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ انیس شمشاد کے ساتھ ہی مرینہ کے سر سے وزیر کی بیوی بننے کا بھوت اتر گیا ہو گا۔ مرینہ پچھلے پورے ایک سال میں شکایت کا ایک لفظ زبان پر نہیں لائی تھی۔ جلالی کو یقین آ گیا تھا کہ وہ موجودہ صورت حال سے مطمئن ہے۔ لیکن اس کا خیال غلط تھا۔ شاید انیس شمشاد کے ساتھ گزارا ہوا وقت مرینہ کے اندر بہت گہری دراڑیں چھوڑ گیا تھا۔

"تم سطحی عورتوں کے اس گروپ سے باہر نکل آؤ اور ایسا حلقہ تلاش کرو جس میں سماجی رتبہ دوستی کی پہچان نہ ہو۔" جلالی مرینہ کے سامنے اس صوفے پر بیٹھ گیا جس پر پہلے مرینہ بیٹھی تھی۔ اس کا لہجہ بہت نرم تھا۔ لیکن مرینہ پر اس کے نرم لہجے کا کوئی اثر نہیں ہوا۔

"تم صرف خوابوں کی دنیا میں رہتے ہو۔ یہاں سماجی رتبہ ہی سب کچھ ہے۔ باقی سب آئیڈیلزم ہے۔ اونچے اونچے خلاؤں میں بھٹکنے والوں کی ہوائی باتیں۔ آگے بڑھنے سے ڈرنے والوں کی باتیں۔"

"ایک بات اچھی طرح اور آخری بار سن لو۔" جلالی نے اس کی بات ان سنی

کر کے آگے کی طرف جھکتے اور مرینہ کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔ لہجے میں بہت کوشش سے جو نرمی لایا تھا وہ پھر غائب ہو گئی تھی۔ "مجھے وزیر بننے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں وزیر کبھی نہیں بنوں گا۔ تم ہمیشہ ایک صحافی کی بے چاری بیوی بن کر رہو گی اور بس۔ اس مسئلے پر اب کوئی بات نہیں ہو گی۔ جاؤ اور جا کر سو جاؤ۔"

مرینہ نے کچھ کہنا چاہا لیکن جلالی اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور مرینہ کی طرف پیٹھ موڑ کر کتابوں کے شیلف کا جائزہ لینے لگا۔ کتاب نکال کر صوفے پر بیٹھا تو مرینہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا چہرہ بالکل سپاٹ اور ہر طرح کے جذبات سے عاری تھا۔ وہ جو کتاب پڑھ رہی تھی اسے میز سے اٹھا کر الماری میں رکھنے کے لئے بک شیلف کی طرف بڑھی تو جلالی کی سانس ایک لمحے کے لئے تھم گئی۔ لیکن مرینہ اس شیلف کی طرف نہیں گئی جہاں کتابوں کے پیچھے ان کیسٹوں کا ذخیرہ چھپا تھا جن میں اقتدار مافیا کے اجلاسوں کی کارروائیاں ریکارڈ تھیں۔

مرینہ کتاب الماری میں رکھ کر اور جلالی کو دیکھے یا گڈ نائٹ کہے بغیر سونے کے کمرے میں چلی گئی۔ اس کے پیچھے دروازہ اس زور سے بند ہوا تھا جیسے اب کبھی نہیں کھلے گا۔ جلالی کے کانوں میں دیر تک بند دروازے کی آواز گونجتی رہی۔ جلالی کو پتہ تھا اس وقت مرینہ کے پاس جانا بے کار تھا۔ منانے کی کوشش پھر وہی بحث چھیڑ دے گی۔ صبح تک وزارت کا خمار اتر جائے گا تو اسے منائے گا۔ لیکن کیسے؟ مرینہ ایک سال کی شادی کے اس دور میں ایک بار بھی ناراض نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے منانے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔ لیکن منانا ضروری تھا۔ جلالی کو کل اسلام آباد جانا تھا۔ قریشی نے اسے تبدیلی کا ٹائم ٹیبل بتایا تھا۔ پاکستان کی سیاسی تاریخ کا جو باب رقم ہونے والا تھا' جلالی اس کا عینی شاہد بننا چاہتا تھا۔ وہ دیر تک خالی الذہنی کی کیفیت میں کتاب کے ورق پلٹتا رہا۔ اسے یقین تھا مرینہ اب تک سو گئی ہو گی۔ نیند آنکھوں میں آئی تو وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا اور کتاب الماری میں رکھنے کے بعد اقتدار مافیا کے آج کے اجلاس کا ٹیپ جیب سے نکال کر کتابوں کے پیچھے رکھنے لگا۔ واپس پلٹا تو مرینہ کمرے کا دروازہ کھول کر باہر آ رہی تھی۔ جلالی کا سانس ایک لمحے کے لئے رک گیا۔ مرینہ نے اسے

ٹیپ چھپاتے ہوئے تو نہیں دیکھا لیکن مرینہ کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ وہ جلالی کی طرف دیکھ بھی نہیں رہی تھی۔ وہ روبوٹ کی طرح چلتی ہوئی کچن کی طرف بڑھ گئی۔ شاید پانی پینے اٹھی تھی۔ جلالی سوچنے لگا اسلام آباد سے واپس آکر کیسٹوں کو کسی اور محفوظ مقام پر منتقل کر دے گا۔

جنرل منصف نے ٹھنڈی کافی کا آخری گھونٹ لے کر برا سا منہ بنایا اور بجھے ہوئے سگار کا کنارا منہ میں لے کر اسے چبانے لگا۔ تمباکو کے ذروں نے منہ اور کڑوا کر دیا تو اس نے سگار کو ایش ٹرے میں رکھ دیا۔ وہ دن بھر میں صرف ایک سگار پیتا تھا۔ آدھے سے زیادہ سگار پی چکا تھا اور ابھی صرف بارہ بجے تھے۔ پورا دن باقی تھا۔ ذہن پر دباؤ بڑھ گیا تھا اس لئے جلائے بغیر سگار کا مزا لے رہا تھا۔ ماتھے پر وہی تین گہری لکیریں تھیں جو اس کی پہچان تھیں۔

اس وقت پریشانی کی وجہ خفیہ ایجنسی کی ایک رپورٹ تھی جس کے مطابق صدر نے کور کمانڈروں سے براہ راست رابطے کئے تھے۔ جنرل منصف نے عامر نذیر کے خلاف آپریشن کی منظوری دینے سے پہلے کور کمانڈروں کا اجلاس بلایا تھا۔ اسے خفیہ ایجنسی کی رپورٹ پڑھ کر اب اندازہ ہوا کہ اجلاس میں ایمان علی کے نئے پاکستان پر کور کمانڈروں نے سرد رویئے کا مظاہرہ کیوں کیا تھا۔ کور کمانڈروں کو پتہ تھا کہ ان کا چیف ایمان علی کو حکومت دینے کے حق میں ہے اس لئے انہوں نے کھل کر مخالفت نہیں کی تھی لیکن دبے دبے لہجے میں اپنے شبہات اور تحفظات کا اظہار کیا تھا۔ عامر نذیر کی حکومت ختم کرنے کے مسئلے پر سب متفق تھے۔ آپریشن شروع کرنے کے لئے سب نے خاموشی سے اپنے یونٹوں کو متحرک بھی کر دیا تھا۔ جنرل منصف نے ایجنسی کی رپورٹ پڑھ کر غصے میں سوچا تھا کہ آپریشن کا پہیہ جام کرنے کا حکم جاری کر دے۔ سردار فوج کی حمایت کے بغیر حکومت اور اسمبلیاں توڑنے کا صدارتی حکم جاری نہیں کر سکے گا۔ اس کے بعد عامر نذیر خود سردار سے نمٹ لے گا۔ لیکن جنرل منصف رک گیا۔ اسے بہت احتیاط سے اپنی حکمت عملی تیار کرنی تھی۔ فیصلہ کرنا تھا کہ چھوٹی

برائی کون سی ہے۔ سردار یا عامر نذیر؟ پہلے کس کی باری ہے؟

جنرل منصف نے بے خیالی میں سگار اٹھا کر سلگا لیا۔ ذہن کے خلیوں کو پوری طرح متحرک کرنے کے لئے نکوٹین کی فوری ضرورت تھی۔ دو تین کش لینے کے بعد وہ ایک بار پھر ایجنسی کی بھیجی ہوئی خفیہ رپورٹ پڑھنے لگا۔ جنرل کے ماتھے کی لکیریں اور گہری ہو گئیں۔ اس کے پچھلے دو ہفتے بہت مصروف گزرے تھے۔ قریشی اور جنرل ملک کے ساتھ اس نے ایمان علی سے تفصیلی ملاقات کی تھی' دفاعی معاملات پر اپنے خدشات دور کئے تھے اور صدر کو ایمان علی کے نئے پاکستان کی فائل بھجوا دی تھی۔ سردار نے جواب میں اسے آئین کی باریکیاں سمجھائی تھیں' بدعنوانیاں ختم کرنے کا اپنا منصوبہ اور نگراں کابینہ کے نام بھیج دیئے تھے۔ جنرل کو زیادہ غصہ اس پر تھا کہ اس نے صدر کو نئے پاکستان کی فائل "ٹاپ سیکریٹ" مارک کر کے بھیجی تھی۔ سردار کو اس کے اندراجات خفیہ رکھنے تھے۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا تھا۔ سردار نے ملک کا آئینی سربراہ رہنے کا حق کھو دیا تھا۔ جنرل منصف آئین کو سرد خانے میں ڈال کر حکومت اور اسمبلیوں کے ساتھ سردار کی بھی چھٹی کر سکتا تھا۔ لیکن اسے حکومت کی باگ دوڑ خود سنبھالنی پڑتی۔ یہ اسے پسند نہیں تھا۔

سگار کے مکمل راکھ بننے تک جنرل منصف کی پیشانی کی تینوں لکیریں آہستہ آہستہ پیشانی کی کشادگی میں معدوم ہو گئیں۔ اس نے ایک گہری سانس لی۔ ذہن بالکل صاف ہو گیا۔ اس نے اپنی حکمت عملی کا جو خاکہ بنایا تھا وہ اس کا ایک بار پھر جائزہ لینے لگا۔ ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ بھی آ گئی۔ اس نے سوچا شاید اچھا ہی ہوا تھا۔ جلد بازی میں اتنا بڑا قدم اٹھانے کی کوشش نقصان دہ ہو سکتی تھی۔ اس کے پاس ابھی بہت وقت تھا۔ وہ اپنی بساط نئے سرے سے بچھائے گا۔ بہت احتیاط سے مہرے بدلے گا۔ ایمان علی کی شیڈو حکومت چھ مہینے سال بھر کی مدت میں تپ کر اور کندن بن جائے گی۔ جو صرف وزیر بننے آئے تھے الگ ہو جائیں گے۔ وہی بچیں گے جو True believers ہیں۔ نئے پاکستان پر سچا اعتقاد رکھنے والے ہیں۔ ایمان علی کا نیا پاکستان اب صرف ایمان علی کا نہیں رہا تھا' یہ جنرل منصف کا نیا پاکستان تھا۔

جنرل منصف نے گھڑی دیکھی۔ کچھ ہی دیر میں اس کی مصروفیات شروع ہونے والی تھیں۔ ٹمپا فلوریڈا سے آئے ہوئے فوجی وفد کو اس نے لنچ پر بلایا تھا۔ لنچ کے بعد جنرل پریسٹن سے ون ٹو ون میٹنگ تھی۔ اس کے بعد ایوان صدر جانے سے پہلے کور کمانڈروں کے اجلاس میں آج رات کے آپریشن کی تیاریوں کا جائزہ لینا تھا۔ لیکن سب سے پہلے اسے قریشی سے بات کرنی تھی اور اسے نئے پاکستان کے آغاز کا نیا ٹائم فریم دینا تھا۔ قریشی کو بتانا تھا کہ کچھ عرصے کے لئے وہ بھی اپنے گروپ کو شیڈو میں لے جائے۔ جنرل برلاس کی نگاہوں سے کہیں دور۔ کسی انجانی گپھا میں۔

جنرل منصف نے ریسیور اٹھا کر قریشی کا فون نمبر ڈائل کرنا شروع کر دیا۔

حصہ سوئم

ٹیلی فون آنے کے بعد...

ایمان علی

ایمان علی نے فون رکھا اور اپنے پاؤں سمیٹ کر دوبارہ زمین پر لگا دیئے۔ اس کا چہرہ سرخ ہو کر تمتما رہا تھا۔ میز کے گرد بیٹھے ہوئے لوگوں کو ایمان علی سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ جواب اس کے چہرے پر لکھا تھا۔ کچھ دیر کے لئے سب خاموش اور ساکت ہو گئے تھے۔ شمسہ جہانزیب' وائی اے سبحان' مسز چنائے اپنے اپنے سگریٹ کا' جسٹس صدیق واحد سگار کا اور ڈاکٹر حبیب الحق پائپ کا کش لینا بھول گئے تھے۔ آغا شاہ رخ نے بھی تھرماس سے توجہ ہٹالی تھی اور سردار قاہر کا مونچھوں کو تاؤ دینے والا ہاتھ اس وقت میز پر رکھا تھا۔ جنرل گل کی آنکھیں ایمان علی کے چہرے پر اس طرح گڑی تھیں جیسے حرکت کرنا بھول گئی ہوں۔

"مجھے پہلے ہی معلوم تھا۔" اعجاز محمد خان کی دہاڑ نے خاموشی کا طلسم توڑ دیا۔ "فوج لوٹنے والوں کے ساتھ ہے وہ ہمارا ساتھ نہیں دے گی۔ ہمیں جنرل منصف پر یقین نہیں کرنا چاہئے تھا۔" اعجاز محمد خان کی غصیلی تقریر نے سب میں زندگی کی لہر دوڑا دی۔ تمباکو نوشوں نے دھوئیں کا تازہ اسٹاک اگلنا شروع کر دیا۔ سب کے ہونٹ

کچھ نہ کچھ کہنے کے لئے پھڑپھڑائے۔ لیکن اسی وقت فون کی گھنٹی ایک بار پھر شور مچانے لگی۔ سب ایک بار پھر ساکت ہو گئے۔ ایمان علی نے ریسیور اٹھا کر کانوں سے لگایا اور کچھ کہے بغیر صرف ہاں ہوں کرتے ہوئے فون کرنے والے کی باتیں سنتا رہا۔ اس کے چہرے سے غصے کی سرخی آہستہ آہستہ غائب ہو رہی تھی۔ کافی دیر کی گفتگو کے بعد اس نے ''اوکے'' کہہ کر فون بند کیا تو چہرے پر اطمینان جھلک رہا تھا۔ یہ اطمینان جلالی کو سب سے زیادہ ڈاکٹر شفا کے چہرے پر چمکتا ہوا محسوس ہوا۔ ایسا لگتا تھا جیسے سر پر آنے والی کوئی مصیبت ٹل گئی ہو۔

''کرم قریشی تھا اور اس سے پہلے جنرل منصف۔ دونوں بتا رہے تھے کہ ہمیں حکومت کیوں نہیں ملی۔'' ایمان علی انہیں بتانے لگا۔ ''سردار کہتا ہے اس کے ہاتھ آئینی طور پر بندھے ہوئے ہیں۔ وہ دو سال کے لئے ہمیں حکومت نہیں دے سکتا نہ سپریم کورٹ کو ریفرنس بھیجے گا۔''

''سب بہانے بازیاں ہیں۔ صدر کی ہمت کہ فوج کو منع کر دے۔ مجھے پہلے ہی.....'' ایمان علی نے ہاتھ اٹھا کر اعجاز محمد خان کو مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔

''میں سردار کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ اسے بااختیار ہونے کا مرض ہے۔ ہم اس کے ساتھ نہیں چل سکتے تھے۔ جنرل منصف نے بتایا ہے کہ ہمارے درمیان جو کچھ طے ہوا تھا اسی طرح ہو گا۔ صرف ٹائم فریم بدل گیا ہے۔''

''مجھے جنرل کی کسی بات پر یقین نہیں ہے۔'' اعجاز محمد خان نے ایک بار پھر غصیلے لہجے میں کہا۔

''جنرل منصف اور قریشی دونوں نے کہا ہے کہ اگر ایک سال کے اندر اندر وہ نئے پاکستان کو پٹڑی پر نہیں چڑھا سکے تو اپنے اپنے عہدے سے مستعفی ہو کر ہماری تحریک میں شامل ہو جائیں گے۔'' ایمان علی کے اس اعلان کو سن کر اعجاز محمد خان کے چہرے پر چھایا ہوا غصہ حیرت میں بدلنے لگا۔

''مجھے جنرل منصف پر پورا بھروسہ ہے۔ وہ غلط نہیں کہہ سکتا۔'' جنرل عالم گل نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ ''وہ میری کمان میں کام کر چکا ہے اور بہت

ٹھنڈا دماغ رکھنے والا افسر ہے۔ اس پر کور کمانڈروں کا دباؤ ہو گا۔ اب وہ آہستہ آہستہ کمان میں تبدیلی کرے گا۔ سردار بھی زیادہ دن صدر نہیں رہ سکے گا۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" ایمان علی نے غیر جذباتی لہجے میں کہا۔ "رفی نے غلط نہیں کہا تھا۔ ہم قبل از وقت حکومت لینے کے لئے تیار ہو گئے تھے۔ ہمیں تیاریاں کرنے کا ایک اور موقع ملا ہے۔" ایمان علی نے خاموش ہو کر سب کے چہروں پر نظریں دوڑائیں اور پھر نپے تلے الفاظ میں کہنے لگا۔

"میں آپ سب کو تنظیم میں شامل ہونے کی دعوت دیتا ہوں۔ ہم سب شیڈو کابینہ کی حیثیت سے اسی طرح کام کرتے رہیں گے۔ ساتھ ہی ساتھ اپنی تنظیم کو مضبوط کریں گے۔ لیکن آپ میں سے کوئی چھوڑ کر جانا چاہے تو مجھے شکایت نہیں ہو گی۔ فیصلہ ابھی اور اسی وقت کرنا ہو گا۔ ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔"

ایمان علی نے ایک بار پھر باری باری سب کو دیکھا۔ کوئی اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔ صرف وائی اے سبحان اور شمسہ جہانزیب ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ شمسہ نے سبحان کی آنکھوں میں پیغام پڑھ کر سر ہلایا تو سبحان اٹھ کھڑا ہوا۔

"شمسہ اور میں ایک ایسے ادارے کے لئے کام کرتے ہیں جس میں رہتے ہوئے ہمارا کسی سیاسی تنظیم سے وابستہ ہونا مناسب نہیں ہو گا۔ لیکن اپنی اپنی ذاتی حیثیت میں ہم آپ سے تعاون کرتے رہیں گے۔" شمسہ نے سر ہلا کر سبحان کے بیان کی تائید کی۔

"میں سمجھتا ہوں۔" ایمان علی نے کہا اور کھڑے ہو کر سبحان اور شمسہ کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ دونوں ایمان علی اور اس کے بعد میز کے گرد بیٹھے ہوئے دوسرے لوگوں سے ہاتھ ملا کر چلے گئے تو جلالی بھی اس کونے کی طرف آ گیا جہاں اس کی میز لگی تھی۔ اس کا سفری بیگ پہلے سے تیار تھا' صرف میز پر رکھے ہوئے کاغذات سمیٹنے تھے۔ اس کا جانا طے شدہ تھا۔ فلائٹ پہلے سے بک تھی۔ ایمان علی کو حکومت مل جاتی تب بھی جلالی اسی فلائٹ سے کراچی واپس جاتا۔

جلالی نے لیپ ٹاپ بند کر کے کاغذوں کو سمیٹتے ہوئے دیکھا تو میز کے گرد بیٹھی

ہوئی ایمان علی کے نئے پاکستان کی کابینہ بہت پرجوش انداز میں اپنے آئندہ منصوبوں پر بحث کر رہی تھی۔ اعجاز محمد خان سب سے پیش پیش تھا۔ آغا شاہ رخ جیسا شرمیلا اور کم گو شخص بھی گفتگو میں برابر کا شریک تھا۔ جلالی کے سینے سے اطمینان کی سانس خارج ہو گئی۔ امید ابھی زندہ تھی۔ یہ لوگ وزارتوں کی تلاش میں یہاں نہیں آئے تھے۔ یہ سچ مچ نئے پاکستان کی تعمیر کے لئے جمع ہوئے تھے۔

جلالی بیگ کندھے پر اور کمپیوٹر ہاتھ میں لٹکا کر رخصت لینے ان کی طرف بڑھا تو ایمان علی اسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ سب خاموش ہو کر جلالی کو دیکھنے لگے تھے۔

''تھینک یو جلالی' Thank you very much۔'' ایمان علی نے ہاتھ بڑھا کر بہت خلوص بھرے لہجے میں کہا۔

''Any time.'' جلالی نے کہا اور باقی لوگوں سے رخصتی مصافحہ کرنے لگا۔ مسز چنائے اسے دروازے تک چھوڑنے آئی۔

''ڈرائیور اپنی کوٹھری میں سو رہا ہو گا اسے جگا لینا۔ تمہیں ایئرپورٹ چھوڑ آئے گا۔'' رفی کی پیشکش پر جلالی نے کچھ نہیں کہا صرف مسکرا کر ہاتھ بڑھا دیا۔ وہ سوچ رہا تھا مسز چنائے کی نظر اس میز پر نہ پڑ جائے جہاں وہ بیٹھا تھا اور جس پر وہ مسز چنائے کا دیا ہوا سنہری لائٹر چھوڑ آیا تھا۔ مسز چنائے نے ہاتھ ملایا اور گال پر الوداعی بوسہ ثبت کر کے جلالی کے چہرے پر قوس و قزح بکھیر دی۔

جلالی کا سوئے ہوئے ڈرائیور کو جگانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ گیٹ سے باہر نکل کر بڑی سڑک کی طرف چل پڑا۔ اسے معلوم تھا کہ اس وقت خالی ٹیکسی ملنا مشکل نہیں ہو گی۔ لیکن اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو ٹھٹک کر رہ گیا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ رینگ گئی۔ جیب میں پیسے آج بھی نہیں تھے۔ اسے یاد آیا کہ اس نے جیب کے سب پیسے سگریٹ منگوانے کے لئے نوکر کو دے دیئے تھے اور سوچا تھا کہ بینک جا کر پیسے نکلوائے گا لیکن پھر بھول گیا تھا۔ وہ ابھی سڑک کے کنارے کھڑا یہ سوچ ہی رہا تھا کہ واپس جا کر مسز چنائے کے ڈرائیور کو جگائے یا کیا کرے کہ سامنے سے آتی ہوئی ایک کار اس کے پاس آ کر رک گئی۔ گاڑی کا دروازہ کھلا اور کار کے

اندر روشنی ہوئی تو ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص کی شکل جانی پہچانی لگی۔ جلالی نے پچھلی سیٹ پر دیکھا تو ہر وقت نشے میں دھت رہنے والے اس کے بزرگ صحافی دوست چودھری صاحب جھونکے کھا رہے تھے۔ جلالی گاڑی چلانے والے کو بھی پہچان گیا۔ جلالی نے اسے چودھری صاحب کے ساتھ بھوربن کے انٹرکان میں اس دن دیکھا تھا جب مرینہ اسے وہاں لنچ کھلانے لے گئی تھی۔

"جلالی صاحب بیٹھئے ہم آپ کو چھوڑ دیں۔" چودھری صاحب کے دوست نے بہت مودب انداز میں پیش کش کی۔

"نہیں نہیں آپ کو دور پڑے گا۔ مجھے ایئرپورٹ جانا ہے۔ آپ....."

"ہم راولپنڈی جا رہے ہیں آپ کو ایئرپورٹ اتارتے جائیں گے۔ اپنا سامان ڈکی میں رکھ دیجئے۔" اس نے گاڑی کا بونٹ کھولنے کے لئے لیور دبایا۔ جلالی سامان رکھ کر گاڑی میں بیٹھا تو چودھری صاحب کی آنکھ بھی کھل گئی۔

"اوئے جلالی تو ہر جگہ مل جاتا ہے۔ ادھر اندھیرے میں کیا کر رہا ہے۔ کیا پھر امید ڈھونڈ رہا ہے۔ وہ نکی کدھر گئی؟" چودھری صاحب نے ایک طرف سرک کر جلالی کو جگہ دیتے ہوئے کہا۔ گاڑی چل پڑی تھی۔

"میں گھر جانے کے لئے ائرپورٹ جا رہا ہوں۔" جلالی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"نہ جا پتر نہ جا۔ گھر لٹ گیا۔ تیرے شہر کا ہر گھر لٹ گیا۔ مت جا۔ ادھر کچھ نہیں بچا۔ کچھ نہیں بچا..... کچھ نہیں....." چودھری صاحب اسی طرح بڑبڑاتے ہوئے ایک بار پھر سو گئے۔

رضا سروہی

رضا سروہی نے فون رکھا تو اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی مایوسی نے سب کو بتا دیا تھا کہ ان کے خواب ادھورے رہ گئے ہیں۔ پیر حقہ نے جو فون پر ہونے والی گفتگو کے دوران کش لئے بغیر حقہ کی نے منہ میں دبائے رضا سروہی کو تک رہا تھا آنکھیں بند کر کے دوبارہ حقہ گڑگڑانا شروع کر دیا تھا۔ شیر پنجاب کھڑے ہو کر کندھے پر پڑی ہوئی شال ٹھیک کرنے لگا تھا۔ مولانا ٹوپی نے سر سے ٹوپی اتار کر اپنی گود میں رکھ لی تھی اور دوسرے ہاتھ سے سر کھجا رہا تھا۔ رئیسہ بشیر نے رضا سروہی کی کرسی کے پیچھے کھڑے ہو کر اپنی پوزیشن دوبارہ سنبھال لی اور آہستہ آہستہ رضا سروہی کے سر کی مالش کرنے لگی۔

"سردار صاحب تھے؟ کیا کہہ رہے تھے؟" وحیدہ شمشاد کو ابھی تک یقین نہیں آیا تھا۔ وہ رضا سروہی کی زبانی سننا چاہتی تھی۔

"فیاض منگی تھا۔ سردار کا مشیر۔" رضا سروہی نے برا سا منہ بنا کر کہا۔ "کہہ رہا تھا کہ مجھے سن کر خوشی ہو گی کہ صدر نے سراج زاہد جیسے شریف آدمی کو نگراں

وزیراعظم بنا دیا ہے۔"

"شریف آدمی؟" شیر پنجاب چنگھاڑا۔ "اسے حکومت چلانی ہے کہ لڑکی بیاہنی ہے؟"

"لڑکا شریف ہے بس پیاز کھاتا ہے۔" پیر حقہ نے آنکھیں کھول کر مسکراتے ہوئے کہا اور شعر پڑھنے لگا

میر کیا سادہ ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب
اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں

"پیر صاحب صحیح شعر پڑھو۔" شیر پنجاب نے اپنا موڈ ٹھیک کر کے ہنستے ہوئے کہا۔ "دوا نہیں لیتے۔ دبا لیتے ہیں۔" سب ہنس پڑے۔ صرف ملا ٹوپی لاحول پڑھنے لگا تھا۔

"چلو مولانا اب اس در سے کچھ نہیں ملنے والا۔" پیر حقہ نے کھڑے ہو کر اپنا حقہ سنبھالتے ہوئے کہا۔ مولانا نے بھی آخری بار سر کھجایا اور ٹوپی سر پر رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں بھی چلتی ہوں۔ یہاں میرا دم گھٹنے لگا ہے۔" وحیدہ نے سر پر اوڑھا ہوا دوپٹہ اتار کر پھینکتے اور رئیسہ بشیر کی طرف کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"تو کہاں جائے گی کچھ اپنا ٹھکانہ کر لے۔" پیر حقہ نے پھر ایک مصرعہ گنگنایا۔

"میرے لئے ٹھکانوں کی کمی نہیں ہے۔ تم اپنی فکر کرو پیر صاحب۔ تمہارا کشمیر ہاؤس بھی مقبوضہ کشمیر ہو گیا ہے۔" وحیدہ شمشاد نے جوابی حملہ کیا۔

"آپ میرے ساتھ چلئے۔ میں آپ کو جہاں کہیں گی چھوڑ دوں گا۔" مولانا ٹوپی نے پیشکش کی۔

"میریٹ۔" وحیدہ نے کہا اور باہر کی طرف چل دی۔

"مولانا۔ سینڈوچ......" شیر پنجاب نے شرارتی لہجے میں آہستہ سے کہا اور جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"لاحول ولا......" مولانا تیزی سے وحیدہ شمشاد کے پیچھے پیچھے باہر نکل گیا۔ پیر

حقہ اور شیر پنجاب بھی رضا سروہی سے ہاتھ ملا کر چلے گئے۔ رضا سروہی نے اطمینان کی سانس لی۔ اسے امید نہیں تھی کہ سب اتنی آسانی سے چلے جائیں گے۔ رئیسہ بشیر کے چہرے پر بہت اطمینان تھا۔ سائیں اگر وزیراعظم بن جاتا تو اس سے چھن جاتا۔ اب وہ صرف اس کا تھا۔ اس کے ہاتھ اور تیزی سے رضا سروہی کے سر کی مالش کرنے لگے۔

ناصر بھٹی

ناصر بھٹی نے فون بند کر کے ایک بڑی سی جماہی لی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے لگا جیسے کندھوں سے ایک بوجھ اتر گیا ہو۔ اس نے سوچا اچھا ہی ہوا تھا۔ وزیراعظم بن کر زندگی کتنی دو بھر ہو جاتی۔ اطمینان کا ایک سانس لینا مشکل ہو جاتا۔ بیوی بھی شیخوپورہ سے نکل کر وزیراعظم ہاؤس آ بیٹھتی اور فیروزہ ٹی وی کی ایم ڈی بن کر اپنے کھیل کھیلنے کے لئے آزاد ہو جاتی۔ اسے اب فیروزہ کو لے کر بیڈ روم میں جانے کی جلدی تھی۔ وہ ان سب کی طرف دیکھنے لگا جن کی نظریں اس پر گڑی ہوئی تھیں۔ سوائے جنرل کانی کے۔ جنرل کانی نے اپنی مصنوعی آنکھ لگا کر صرف ایک نظر اس کی طرف ڈالی تھی اور سمجھ گئی تھی کہ ناصر بھٹی کی بازی مات ہو گئی ہے۔ جنرل برلاس اور اختیار رضوی کو بھی ناصر بھٹی کی خاموشی سے اندازہ ہو گیا تھا لیکن فیروزہ اور رحمت بھٹی کو ابھی تک یقین نہیں تھا کہ کیا ہوا ہے۔

"صدر نے اندرونی تبدیلی کے بجائے اسمبلی توڑنے کا فیصلہ کیا ہے۔ سراج زاہد نگراں وزیراعظم ہو گا۔" ناصر بھٹی نے ایک ہی سانس میں ایوان صدر سے آنے

والے فون کی گفتگو کا خلاصہ سنا دیا۔

"سراج زاہد؟" فیروزہ اسلم نے حیرت سے کہا۔ "وہ ایک بیمار اور اکیلا آدمی ہے۔ اس کے پیچھے کون ہے؟"

"اس کے پیچھے خود صدر ہے۔ سردار اب اس کے کندھے پر بندوق رکھ کر شکار کرے گا۔ صدر بھی وہی ہو گا اور وزیراعظم بھی وہی!" ناصر بھٹی نے تلخ لہجے میں کہا۔

"باسٹرڈ۔ ڈبل کراس۔ دغا باز!!" جنرل برلاس سخت جھلائے ہوئے انداز میں گالیاں بکتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

"کون؟" اس دفعہ ناصر بھٹی کے بھانجے رحمت بھٹی نے پوچھا۔

"فیاض منگی۔ صدر کا مشیر۔ اس نے یقین دلایا تھا کہ سب کچھ ٹھیک ہے۔ سردار قابو میں ہے۔ وہی کرے گا جو ہم کہیں گے۔ لیکن وہ سردار سے مل کر اس کے کھیل میں شامل ہو گیا ہے۔ میں اسے چھوڑوں گا نہیں۔ وہ میرا پالا ہوا کتا ہے۔ کل میرے ہی پاؤں میں آ کر لوٹے گا۔ تم دیکھنا......"

اسی وقت فون کی گھنٹی بج اٹھی اور جنرل برلاس غصے میں جو ہذیان بک رہا تھا وہ ادھورا رہ گیا۔ ناصر بھٹی نے فون سن کر ریسیور جنرل برلاس کی طرف بڑھا دیا۔

"آپ کے لئے ہے۔"

"کون ہے؟" جنرل نے حیرت سے پوچھا۔

"وہی' آپ کا پالا ہوا کتا!" ناصر بھٹی نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھے بغیر لاپرواہی سے کہا اور ریسیور جنرل برلاس کے ہاتھ میں دے دیا۔ جنرل برلاس خاموشی سے فون سنتا رہا۔ اس کے چہرے سے غصہ غائب ہو گیا تھا۔ اس کی جگہ خوشی اور حیرت نے لے لی تھی۔ اس نے فون بند کیا تو بہت پرجوش ہو رہا تھا۔

"ہمارا کھیل ختم نہیں ہوا۔ کھیل اب شروع ہوا ہے۔" جنرل برلاس نے اختیار رضوی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اختیار رضوی کے چہرے پر حیرت تھی لیکن اس نے کچھ پوچھا نہیں اور جنرل برلاس نوٹوں سے بھرا ہوا بریف کیس اٹھا کر چلنے لگا

تو وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ رحمت بھٹی نے تیزی سے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھوں سے بریف کیس لینا چاہا۔

"جنرل صاحب مجھے دیجئے میں گاڑی تک چھوڑ آؤں۔"

"نہیں برخوردار میرے بازوؤں میں ابھی بہت دم ہے۔"

"اس میں سے کچھ نکال کر پارٹی کو چندہ ہی دے جائیے۔" رحمت بھٹی نے ایک اور کوشش کی۔

"یہ چندہ اس پارٹی کو جائے گا جو میں بنانے والا ہوں۔" جنرل برلاس نے مسکراتے ہوئے کہا اور اختیار رضوی کے ساتھ تیزی سے باہر نکلتا چلا گیا۔ رحمت بھٹی نوٹوں سے بھرے ہوئے بریف کیس کو حسرت سے دیکھتا رہ گیا۔ اسے لگا جیسے اس کے پیٹرول پمپ پر کوئی اور ڈاکہ ڈال گیا ہو۔

"آؤ فیروزہ اوپر چلیں مجھے نیند آ رہی ہے۔" ناصر بھٹی نے قدم اٹھاتے ہوئے کہا۔ اسے فیروزہ کی ماں اور اپنے بھانجے کے سامنے جھجکنے کی ضرورت نہیں تھی۔ فیروزہ سے اس کے تعلقات کی کہانی ان در و دیوار کے اندر ہی نہیں باہر بھی زبان زد عام تھی۔

"رحمت نے مجھے آئس کریم کھلانے کا وعدہ کیا ہے۔" فیروزہ نے اٹھلاتے ہوئے کہا اور رحمت بھٹی کی طرف نشیلی نظروں سے دیکھنے لگی۔ ٹی وی کے ایم ڈی کے دروازے پر لگی ہوئی اس کے نام کی پیتل کی تختی گر کر ٹوٹ گئی تھی۔ اس کا انتقام وہ ناصر بھٹی سے ہی لے سکتی تھی۔

"بیٹی مجھے بھی رستے میں آپا شمیم کے گھر اتار دینا۔" جنرل کانی نے اپنی پتھر کی آنکھ والی ڈبیا پرس میں ڈال کر اٹھتے ہوئے کہا۔ جنرل کانی کو اب اس چہار دیواری میں وقت گزارنے سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ ناصر بھٹی کل کی کہانی ہو چکا تھا۔ اسے آنے والے کل کی کہانی کا ہیرو تلاش کرنا تھا۔ فیروزہ اور جنرل کانی ناصر بھٹی کو دیکھے بغیر باہر نکلے تو رحمت بھٹی نے ایک بار پلٹ کر اپنے ماموں کو دیکھا اور پھر کندھے جھٹک کر وہ بھی ماں بیٹی کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا باہر نکل گیا۔

ناصر بھی دوبارہ اپنی کرسی پر گر گیا۔ اس نے سامنے لگے ہوئے اپنے قد آدم پورٹریٹ کو دیکھا جس میں وہ توپ پر ہاتھ رکھے کھڑا تھا۔ اس نے سوچا کاش اس وقت سچ مچ کی توپ اس کے پاس ہوتی جس کے دہانے سے جنرل کانی، فیروزہ اور اپنے بھانجے کو باندھتا اور تینوں کو گولے سے اڑا دیتا۔

ریاض توصیف

ریاض توصیف کے قلعے جیسے گھر میں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ فون سننے کے بعد ریاض توصیف اور ایاز توصیف نے اطمینان کی سانس لی تھی' ایک دوسرے کی طرف مسکرا کر دیکھا تھا اور اپنے اپنے بیڈ روم کی طرف چلے گئے تھے۔ آج ان کے جاگنے کی رات نہیں تھی۔ ان کے جاگنے کی رات تین مہینے بعد آئے گی۔ لیکن ایاز توصیف نے کہا تھا وہ کل ہی سے دیگیں چڑھوا دے گا۔ کل صبح سے ان کے گھر میں اسمبلیوں کی ممبری' وزارتوں اور گورنری کے امیدواروں کا ہجوم شروع ہو جائے گا۔

اس نے سونے کی کوشش کی لیکن نیند نہیں آئی۔ اس کی بیوی بے خبر سو رہی تھی۔ ریاض توصیف کو پتہ تھا کہ ایاز اپنے بیڈ روم میں نہیں بلکہ باہر گیا ہوا ہو گا۔ جانے آج کس کی باری ہو گی۔ ریاض توصیف کو ایاز کے بارے میں تشویش تھی۔ اسے ایاز کا مسئلہ معلوم تھا۔ لیکن اب چہ مہ گوئیاں باہر نکلنے لگی تھیں۔ اس نے سوچا میاں صاحب عمرے سے واپس آئیں گے تو ان سے بات کر کے ایاز توصیف کے مسئلے کا مستقل حل تلاش کرے گا۔ اسے بھی نہ جانے کیوں اس وقت کشمیر کی کلی یاد

آ گئی۔ لیکن پھر اس نے ذہن کو جھٹک دیا۔ اب کسی صراحی دار گردن یا کسی کلی کے بارے میں سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ لیکن پھر بھی یاد آئی تو آتی چلی گئی جس کے ساتھ ہی اسے بھوک بھی لگنے لگی۔

وہ گاؤن پہن کر آہستہ آہستہ قدموں سے چلتا ہوا کمرے سے باہر آیا۔ کچن جا کر ریفریجریٹر کھولا تو اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کس نعمت کو ٹھکرائے اور کسے اپنے شکم کی نذر کرے۔ چاولوں کی قاب نظر آئی تو اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ ایک زمانے تک ناشتے میں رات کے بچے ہوئے ٹھنڈے چاول اس کا سب سے من پسند کھاجا تھے۔ پلیٹ چاولوں سے بھر کر وہ ڈرائنگ روم میں آیا جہاں کچھ دیر پہلے ہی وہ ایاز کے ساتھ بیٹھا تھا۔ وہ چاول کا بڑا سا نوالہ منہ میں ڈالتے ہوئے مسکرایا۔ اسے یاد آیا کہ وہ کچھ دیر پہلے ہی کھانے کے مینو میں تبدیلی کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس کے ڈاکٹر نے پچھلے ہفتے صرف ایک وقت بھاری اور ایک وقت بہت ہلکا کھانے کا مشورہ دیا تھا تو وہ بہت ہنسا تھا۔ وہ سب کچھ چھوڑ سکتا تھا لیکن کھانا نہیں۔ ڈاکٹر نے اسے ہالی ووڈ کے ان اداکاروں کے بارے میں بتایا جو کھانے کا مزا لینے کے بعد حلق میں انگلیاں ڈال کر سب کچھ باہر نکال دیتے تھے۔ ریاض توصیف کو ابکائی آ گئی تھی۔ یہ ڈاکٹر بے وقوفی کی باتیں کیوں کرنے لگا تھا؟ اس نے سوچا۔

چاول کی پلیٹ صاف کر کے اس نے سائڈ کی میز پر رکھی اور انگلیاں چاٹتا ہوا اٹھ کر ٹی وی کھولنے لگا۔ اسپورٹس چینل لگایا تو آنکھیں چمک اٹھیں۔ آسٹریلیا اور پاکستان کے میچ کی جھلکیاں آ رہی تھیں۔ وہ صوفے پر پھیل کر بیٹھ گیا اور نظریں ٹی وی اسکرین پر جما دیں۔ اس نے سوچا اس بار وزیراعظم بننے کے بعد دولت مشترکہ کانفرنس میں ضرور جائے گا اور کرکٹ کا میچ کھیلنے پر اصرار کرے گا۔ پچھلی بار اس نے سب سے زیادہ رنز بنا کر برطانوی وزیراعظم کو حیران کر دیا تھا۔ اس نے سوچا بھارتی وزیراعظم کو اس بار باؤنسر مار کر اس کا جبڑا توڑ دے گا اور کشمیر پر ہونے والی فائرنگ کا انتقام لے گا۔ آہستہ آہستہ اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ سر صوفے کی پشت سے ٹک گیا اور کمرے میں اس کے زوردار خراٹے گونجنے لگے۔

عامر نذیر

"تمہارے باپ دادا بھی غدار تھے اور انگریزوں کی غلامی کرتے تھے۔ لیکن تم ان سب سے بڑے غدار ہو۔" عامر نذیر فون پر گرج رہا تھا۔ صدر نے بہت ادب سے فون پر گفتگو شروع کی تھی۔ اسمبلی توڑنے اور اسے حکومت سے برطرف کرنے کی اطلاع دی تھی لیکن عامر نذیر نے سردار کی بات بیچ سے کاٹ دی تھی۔

"میرے باپ نے تمہیں سیاست دان بنایا' میں نے تمہیں ایوان صدر میں بٹھایا۔ تم نے اس کا یہ صلہ دیا ہے۔ اس کا انجام اچھا نہیں ہو گا۔ بہت برا ہو گا۔ بہت برا۔ یہ میرا فرمان ہے۔ عامر نذیر کا فرمان۔ اسے ہمیشہ یاد رکھنا۔" عامر نذیر نے دوسری طرف سے کوئی جواب سنے بغیر ریسیور کریڈل میں پٹخ کر فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ اس کے چہرے پر ایک اطمینان بھری مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ لگتا تھا اس کی حکومت نہیں گئی بلکہ اس نے ابھی ابھی کوئی قلعہ فتح کیا ہے۔ اسے پتہ تھا صدر حکومت ختم کرنے کے بعد اب اس سے زیادہ اور کیا کر سکتا تھا۔

عامر نذیر نے ان سب کی طرف بھی داد طلب نظروں سے دیکھا۔اس کی بیوی

آصفہ خوشی سے چھلانگ لگا کر اس کے پاس آئی اور اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر اس کی پیشانی کو بوسہ دینے لگی۔ رخشندہ انہیں تشویش بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے سوچا عامر نذیر نے اچھا نہیں کیا۔ اسے مصلحت سے کام لے کر صدر سے بات کرتے وقت مصالحانہ انداز اختیار کرنا چاہئے تھا۔ عامر نذیر کے باپ نے بھی آج ہی جیسی ایک رات اسی طرح کی غلطی کی تھی اور سزا بھگتی تھی۔ عامر نذیر نے بھی اپنا ہر راستہ خود ہی بند کر لیا تھا۔ رخشندہ نے سوچا بہت مشکل وقت آنے والا ہے اور شاید اس دفعہ یہ وقت بہت طویل ہو گا۔ کاش اس وقت وہ ایک فون کال کر سکتی۔ لیکن اسے پتہ تھا کہ فون کی ہر لائن کٹی ہوئی ہے۔ یہاں سے باہر نکل کر ہی فون کرنا ممکن تھا۔ لیکن اگر اس سے پہلے گرفتار کر لی گئی تو؟ اس کی تشویش اور بڑھ گئی۔ اسے اپنا مستقبل ہر قیمت پر محفوظ کرنا تھا۔ رخشندہ نے نظر اٹھا کر پیر کرامت کی طرف دیکھا جو اسی کی کشتی کا سوار تھا لیکن اس وقت آنکھیں بند کئے اور تسبیح کے دانوں پر تیز تیز انگلیاں چلاتے ہوئے منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا رہا تھا۔

"پیر صاحب! کیا ماں کا نام معلوم کئے بغیر صدر کی بربادی کا تعویذ نہیں بن سکتا؟" آصفہ نے پیر کرامت کی بند آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا لیکن پیر کرامت کے انداز میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہیں۔ عامر نذیر نے آصفہ کو گھور کر دیکھا اور ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

پیر کرامت نے تسبیح کے دانوں پر تیزی سے چلتی ہوئی انگلیوں کو ایک بار اس زور کا جھٹکا دیا کہ تسبیح ٹوٹ گئی اور اس کے دانے قالین پر بکھر گئے۔ پیر کرامت اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ آنکھیں کھولیں تو لال انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔

"نہیں رہے گا۔ نہیں بچے گا۔ ٹوٹ کر بکھر جائے گا۔ بھسم ہو جائے گا۔ اب نہیں بچے گا۔" وہ دیوانوں کے سے انداز میں اس طرح بڑبڑا رہا تھا جیسے اونچی آواز میں سرگوشی کر رہا ہو۔

"کون پیر صاحب۔ کون نہیں رہے گا؟" آصفہ نے بہت ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"وہی جس نے ستاروں کے کھیل میں دخل دیا ہے۔" پیر کرامت نے ایوان

صدر کی سمت میں ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "اب وہ نہیں بچے گا۔ نہیں بچے گا۔ یہ تمہارا نہیں میرا فرمان ہے پیر کرامت کا فرمان۔"

عامر نذیر اور آصفہ دونوں کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ پیر کرامت جھک کر ٹوٹی ہوئی تسبیح کے دانے جمع کرنے لگا تو عامر نذیر اور آصفہ بھی گھٹنوں کے بل چلتے ہوئے تسبیح کے دانے ڈھونڈنے لگے۔ رخشندہ اسی طرح اپنی نشست پر جمی رہی۔ تسبیح کے تمام دانے اکٹھے ہو گئے تو پیر کرامت نے کچھ پڑھ کر ان پر دم کیا اور پھر دانوں کو ٹرالی میں رکھے ہوئے ایک پیالے میں ڈال کر عامر نذیر کے حوالے کر دیا۔

"ہر روز سورج غروب ہونے کے فوراً بعد ایک دانہ ایوان صدر پر اس طرح مارنا کہ وہ صدر کے بیٹھنے' سونے یا رہنے کی جگہ کے زیادہ سے زیادہ قریب جا کر گرے۔ جس دن تمام دانے ختم ہو جائیں اس روز اس رسی کو جلا کر اس کی راکھ دریا میں بہا دینا۔" پیر کرامت نے تسبیح کا ٹوٹا ہوا دھاگہ عامر نذیر کو دیتے ہوئے کہا۔

عامر نذیر نے دل ہی دل میں حساب کیا۔ ننانوے دانے۔ یعنی تین مہینے نو دن۔ اس کی آنکھوں کی چمک اور بڑھ گئی۔ تین مہینے کے اندر اندر نئے انتخابات ہوں گے۔ وہ جیتے گا اور سردار سے استعفیٰ دینے کا مطالبہ کرے گا۔ نہیں تو نو دن کے اندر اسمبلی کا اجلاس بلا کر صدر کا مواخذہ کر کے اسے چلتا کر دے گا۔ عامر نذیر کے دل میں پیر کرامت کا احترام اور بڑھ گیا۔ کتنا موثر وظیفہ اور کتنا پکا حساب تھا پیر صاحب کا۔ لیکن کچھ سوچ کر اس کی آنکھوں کی چمک معدوم ہونے لگی۔

"اتنا چھوٹا دانہ ایوان صدر کے اندر تک کیسے پھینکا جائے گا؟" اس نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

"ہوائی جہاز سے گراؤ یا ہیلی کاپٹر سے۔ توپ کے ذریعے پھینکو یا کنکر کی طرح مارو۔ یہ تمہارا مسئلہ ہے۔ وزیراعظم تمہیں بننا ہے یہ کام بھی تمہیں کرنا ہو گا۔" پیر کرامت کو ایک بار پھر جلال آ گیا۔

"پیر صاحب آپ فکر مت کریں۔ یہ کام میں کروں گی۔ ایک ایک دانہ صحیح نشانے پر جائے گا۔" آصفہ نے آگے بڑھ کر تسبیح کے دانوں والا پیالہ عامر نذیر کے

ہاتھوں سے لے لیا۔ عامر نذیر کو ایسا لگا جیسے وزارت عظمیٰ اس کے ہاتھوں سے ایک بار پھر نکلی جا رہی ہو۔ پیر کرامت نے ٹرالی پر رکھی ہوئی مٹھائی کی پلیٹ سے کپڑا ہٹایا۔ مٹھائی ابھی بچی ہوئی تھی۔ اس نے قلاقند کے بڑے سے ٹکڑے کا ایک کونا توڑ کر عامر نذیر کو اور ایک آصفہ فریال کو دیا اور باقی بچا ہوا ٹکڑا اپنے منہ میں ڈال کر صوفے پر اس جگہ بیٹھ گیا جہاں وزیراعظم سے ملنے کے لئے آنے والے معزز مہمان بیٹھا کرتے تھے۔ اس نے رخشندہ کو بالکل نظر انداز کر دیا تھا جو اسے دلچسپ نظروں سے دیکھتی ہوئی سوچ رہی تھی کہ کھیل ختم ہو چکا ہے پھر بھی پیر کرامت نئے ڈرامے کیوں دکھا رہا ہے۔

''پیر صاحب! آپ کو یقین ہے کہ ہم واپس آ جائیں گے۔'' عامر نذیر نے ایک بار پھر یقین دہانی حاصل کرنی چاہی۔

''ہمیں کون روکے گا؟ یہ ہمارا گھر ہے' ہمیں اپنے گھر لوٹنا ہی ہو گا۔'' پیر کرامت نے جیب سے نئی تسبیح نکال لی۔ ''بری امام نے غلط نہیں کہا تھا۔ آج کی رات بہت جلالی رات ہے۔ آج کا وظیفہ بھی جلالی ہو گا۔ اللہ ہو۔'' پیر کرامت نے ایک بار پھر آنکھیں بند کر کے تسبیح کے دانوں کی گنتی شروع کر دی۔ عامر نذیر اور آصفہ بھی اپنی اپنی تسبیح ہاتھوں میں لئے صوفے سے اتر کر زمین پر بیٹھ گئے۔ آصفہ نے سر پر دوپٹہ ڈال کر وظیفہ شروع کرنے کے لئے آنکھیں بند کرنے سے پہلے رخشندہ کو تنبیہی نظروں سے دیکھا تھا۔

رخشندہ نے ایک گہرا سانس لیا۔ بند آنکھوں کی تین جوڑیاں اسے گھورتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ اسے پتہ تھا احترام میں اسے بھی نیچے اتر کر بیٹھنا ہے۔ کولھے کی ہڈیاں ایک بار پھر کیلیں بن کر فرش میں گڑ جائیں گی۔ صبح ابھی بہت دور تھی۔ زمین پر بیٹھنے سے پہلے وہ پرس اٹھا کر تیزی سے باتھ روم کی طرف چلی گئی اور پرس میں رکھی ہوئی ڈرائی مارٹینی کی شیشی حلق میں خالی کر کے صبح تک جاگ کر وظیفہ کھینچنے کی تیاری کرنے لگی۔

ذہین جلالی' نواب ٹن اور مرینہ شاہ

جلالی ایئرپورٹ سے گھر جاتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ مرینہ کو کس طرح منائے گا۔ اسے اسلام آباد جانے سے پہلے مرینہ کی ناراضی دور کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ مرینہ نے اسے خود ہی موقع نہیں دیا تھا۔ وہ صبح جلالی کے اٹھنے سے پہلے کچھ کہے بغیر کہیں چلی گئی تھی۔ جلالی نے ایئرپورٹ جانے سے پہلے ہر اس جگہ فون کیا تھا جہاں مرینہ کے ملنے کی امید تھی اور پھر مایوس ہو کر ایئرپورٹ چلا گیا تھا۔ اسے جانے کیوں یقین تھا کہ مرینہ اب تک نارمل ہو گئی ہو گی۔ اسے جب پتہ چلے گا کہ اگر وہ مرینہ کی بات مان لیتا تب بھی وزیر نہیں بن پاتا تو وزیر کی بیوی نہ بننے کا غم ہلکا ہو جائے گا۔ اس نے اسلام آباد سے ہر روز ہی مرینہ کو فون کیا تھا' لیکن وہ نہیں ملی تھی۔ آنسرنگ مشین بھی کھلی نہیں تھی اس لئے وہ اسلام آباد کا نمبر بھی نہیں چھوڑ سکا تھا۔ جلالی کو یقین تھا مرینہ بھی اس کے لئے اتنی ہی پریشان ہو گی جتنا جلالی مرینہ کے لئے تھا۔

ایئرپورٹ سے گھر پہنچتے پہنچتے رات کا ایک بج گیا۔ جلالی اپنے فلیٹ کے سامنے کھڑا جیب میں دروازے کی چابی تلاش کرتا رہا۔ وہ چابی شاید اسلام آباد بھول آیا تھا۔

مرینہ اس کی چیزیں چھوڑنے اور بھولنے کی عادت سے بہت تنگ تھی۔ یہ پہلی بار نہیں ہوا تھا۔ چابیاں، بٹوہ، قلم، بریف کیس اور ایک دفعہ تو لیپ ٹاپ تک بھول آیا تھا۔ جلالی گھنٹی بجا کر سوچنے لگا مرینہ کی پہلی تقریر اس کی بھول جانے کی عادت پر ہو گی۔ جلالی کافی دیر تک گھنٹی بجاتا رہا لیکن اندر سے صرف گھنٹی بجنے کی آواز آتی رہی۔ مرینہ کے آنے کی چاپ سنائی نہیں دی۔ جلالی کو پتہ تھا وہ سو رہی ہو گی لیکن مرینہ کی آنکھ ہلکے سے کھٹکے سے بھی کھل جاتی تھی۔ ان کے فلیٹ کی گھنٹی کی تیز آواز تو مردوں کو اٹھانے کے لئے بھی کافی تھی۔ جلالی کے دماغ میں خون چڑھنے لگا۔ ذہن میں طرح طرح کے شبہات گھر کر رہے تھے۔ وہ رات کے ایک بجے تک گھر نہیں آئی تھی تو کہاں تھی۔ کس کے پاس، کس کے ساتھ؟

جلالی نے شدید غصے کی حالت میں پوری طاقت سے گھنٹی کا بٹن دبایا اور دیر تک دبائے رکھا لیکن صرف اندر بجنے والی گھنٹی کی بازگشت سنائی دیتی رہی۔ "میں آج اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا!" جلالی نے اپنے آپ سے وعدہ کیا۔ اندر گھنٹی بجنے کی آواز پھر گونجی۔ جلالی نے حیرت سے دیکھا۔ اس کا ہاتھ تو بٹن پر نہیں تھا۔ غور سے سنا تو وہ فون کی گھنٹی تھی۔ کچھ دیر بج کر گھنٹی بند ہوئی اور تھوڑی دیر بعد پھر بجنے لگی۔ جلالی دانت پیستا ہوا گھر کے اندر بجنے والی فون کی گھنٹیاں سنتا رہا۔ اتنی رات گئے کوئی اہم فون ہی ہو سکتا تھا۔ "شاید مرینہ ہو اور اسے فون کر رہی ہو۔"

سوچتے سوچتے اچانک اسے وہ جگہ یاد آئی جہاں مرینہ دروازے کی ایک چابی چھپا کر رکھتی تھی۔ پنجوں کے بل اچک کر اس نے دروازے کے اوپر منڈیر پر انگلیوں سے ٹٹولا تو اس کی دعا قبول ہو گئی۔ انگلیاں کنارے پر رکھی ہوئی چابی سے ٹکرائی تھیں۔ چابی گرد میں اٹی ہوئی تھی۔ اس نے پھونک مار کر چابی کی دھول اڑائی اور اسے دروازے کے قفل میں گھمایا تو تالہ کھلنے کی مانوس کلک سنائی دی۔ اپنے ہی گھر میں قدم رکھتے ہوئے جانے کیوں اسے ایک انجانا سا خوف محسوس ہوا۔ اندر پھیلے ہوئے گہرے اندھیرے نے یہ خوف اور بڑھا دیا تھا۔ جلالی نے دیوار پر ٹٹول کر سوئچ آن کیا تو کمرے میں تیز روشنی پھیل گئی لیکن کمرے کا منظر دیکھ کر جلالی کو ایسا لگا جیسے

اندھیرے گہرے ہو کر اس کے جسم میں اتر گئے ہوں۔ دل اچانک بیٹھنے لگا تھا۔

جلالی پاگلوں کی طرح دوڑتا ہوا کتابوں کی الماری کی طرف گیا۔ پورا شیلف خالی تھا۔ اس سے نکلی ہوئی کتابیں بے ترتیبی سے زمین پر پڑی تھیں۔ شیلف سے وہ تمام کیسٹ غائب تھے جن میں اقتدار مافیا کے اجلاسوں کی کارروائیاں ریکارڈ تھیں۔

مرینہ اسلام آباد میں تھی۔ وہ جلالی کے کراچی آنے سے ایک روز پہلے ہی اسلام آباد پہنچی تھی اور اس وقت انیس شمشاد کے گھر میں اپنی پرانی کرسی پر بیٹھی آرنج جوس کی چسکیاں لے رہی تھی۔ امیتابھ بچن والا ٹیپ چل رہا تھا "کبھی کبھی میرے دل میں خیال آتا ہے....." ٹیپ ریکارڈ کے پاس زمین پر کیسٹوں کا ایک ڈھیر پڑا تھا۔ یہ اقتدار مافیا کے اجلاسوں کی ریکارڈنگ تھی جو اتفاقاً" دریافت ہو گئی تھی۔ وہ جلالی کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھا کر کئی دن تک کیسٹوں کو سنتی رہی تھی۔ جلالی کے خلاف اس کا غصہ اور بڑھ گیا تھا۔ اقتدار کی چابی جیب میں تھی لیکن وہ کالم نگاری میں وقت ضائع کر رہا تھا۔ مرینہ کو پتہ تھا ان کیسٹوں سے صرف ایک شخص فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ انیس شمشاد یاد آیا تو اس کی محبت کی چنگاری جسے اس نے بہت مشکل سے بجھایا ہوا تھا ایک بار پھر بھڑک اٹھی۔ وہ پورے دن بستر پر پڑی سوچتی رہی۔ دل اور دماغ دونوں کا ایک ہی فیصلہ تھا۔ اس نے انیس شمشاد کو فون کیا اور فلائٹ پکڑ کر اسلام آباد پہنچ گئی جہاں انیس شمشاد نے اسے اپنے دونوں بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ مرینہ کو لگا جیسے وہ سچ مچ اپنے گھر آ گئی ہو۔ انیس شمشاد نے بھی دن بھر اور رات بھر جاگ کر اقتدار مافیا کے کیسٹ سنے۔ تمام ٹیپ سننے کے بعد انیس شمشاد نے اسے بے اختیار چمٹا لیا تھا اور دیوانوں کی طرح پیار کیا تھا۔ مرینہ نے سوچا تھا کہ اتنی گرمجوشی تو اس نے اپنے پہلے پہلے دنوں کے پیار میں اس وقت بھی نہیں دکھائی تھی جب وہ آج سے زیادہ جوان تھا۔ مرینہ نے قربان ہو جانے والی نظروں سے انیس شمشاد کو دیکھ کر سوچا کہ وہ اتنے دنوں اس کے بغیر کیسے رہ سکی تھی۔

اس وقت انیس شمشاد کے چہرے پر بے چینی نمایاں تھی۔ وہ بار بار اپنے پاس

رکھے ہوئے فون کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کئی بار ایوان صدر فون کر کے پیغام چھوڑ چکا تھا لیکن اب تک جواب نہیں آیا تھا۔ اس نے ہاتھ میں تھاما ہوا گلاس ایک ہی گھونٹ میں خالی کر دیا۔ مرینہ نے ہمیشہ کی طرح اٹھ کر اس کے ہاتھوں سے گلاس لیا اور نئی ڈرنک بنانے لگی۔ یہ اس کی پرانی ڈیوٹی تھی۔ انیس شمشاد گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تیزی سے جام پہ جام خالی کرتا اور مرینہ خالی گلاس کو فوراً بھر کر دوبارہ اس کے ہاتھ میں دے دیتی۔ وہ کہا کرتا تھا اس کے لئے مرینہ سے اچھا جام کوئی نہیں بنا سکتا۔ برف کے دو بڑے اور ایک چھوٹا کیوب۔ دو انگل شراب اور پون گلاس پانی۔

"صدر صاحب نے اب تک فون نہیں کیا۔" مرینہ نے اسے گلاس دیتے ہوئے خیالوں سے چونکا دیا۔

"سردار پرانا بدلہ چکا رہا ہے۔" انیس شمشاد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ایک وقت تھا جب ہم دونوں کابینہ میں تھے اور میں اس سے زیادہ طاقتور تھا۔ سردار کو پانی بجلی کی وزارت چاہئے تھی جو اسے میں ہی دلوا سکتا تھا۔ اس نے بھی کئی گھنٹے میرے جوابی فون کا انتظار کیا تھا۔" انیس شمشاد نے ایک چھوٹا سا گھونٹ لیا اور مرینہ کی طرف دیکھے بغیر بولا تو ایسا لگا جیسے وہ خود اپنے آپ کو تسلی دے رہا ہے۔

"سیاست دوستی کا کھیل نہیں ہے' یہ لین دین کا سودا ہے۔ آج کی رات سردار طاقت کا نیا کھیل' کھیل رہا ہے۔ آج کی رات اس کے پاس دوستی نباہنے کا وقت نہیں ہو گا۔ مجھے کسی طرح اس تک صرف یہ پیغام پہنچانا ہے کہ میرے پاس کیا ہے۔ اس کے بعد وہ خود دوڑا آئے گا۔"

"کابینہ میں شاید وزیر کی جگہ خالی نہ بچی ہو۔"

"تمہارا خیال ہے میں وزیر بننا چاہتا ہوں؟" انیس شمشاد نے مرینہ کی طرف نظریں موڑ کر کہا تو مرینہ کی سانس ایک لمحے کے لئے رک گئی۔ کیا انیس پر بھی جلالی کا اثر ہو گیا ہے؟ لیکن انیس شمشاد کے اگلے جملے نے اس کا تنفس بحال کر دیا۔

"ان کیسٹوں کی قیمت وزارت نہیں گورنری ہے۔ میں گورنر سے کم پر راضی نہیں ہوں گا۔ تمہارے لائے ہوئے یہ ٹیپ حاصل کر کے سردار اس ملک کی تاریخ کا

سب سے طاقتور صدر بن جائے گا۔ اسے سندھ میں مجھ سے اچھا گورنر نہیں ملے گا بھی نہیں۔"

"اپنا وعدہ یاد رکھنا۔ یہ نہ بتانا کہ تمہیں ٹیپ کہاں سے ملے ہیں۔" مرینہ کی آنکھوں میں جلالی کا چہرہ گھوم گیا۔ دل میں ایک کیل سی چبھ گئی۔

"Don't Worry! - سردار کو آم کھانے ہیں۔ پیڑ نہیں گننے۔ وہ پوچھے گا بھی نہیں۔ میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔"

انیس شمشاد نے گھڑی دیکھی تو آخری بار فون کیے ہوئے اسے آدھا گھنٹہ گزر چکا تھا۔ اس کی بے چینی بڑھ گئی۔ اس نے گلاس ساتھ رکھی ہوئی چھوٹی میز پر رکھا اور ایک بار پھر ایوان صدر کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔ دوسری طرف جس نے فون اٹھایا تھا اس سے اس بار انیس شمشاد نے سختی سے بات کی۔ اس کی کال کسی اور کو منتقل کر دی گئی' اس کے بعد کسی اور کو اور پھر ایک تیسرے شخص کو۔ ہر بار انیس شمشاد کا لہجہ پہلے سے زیادہ سخت تھا۔ آخری بار اسے ہولڈ کرنے کے لئے کہا گیا تو کئی منٹ تک کسی کی آواز نہیں آئی۔ کچھ دیر بعد آواز آئی تو انیس شمشاد ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"انیس تمہیں پتہ ہے آج کی رات کیا ہونے والا ہے؟ میرے پاس ایک منٹ کا وقت نہیں ہے۔ تم اگلے ہفتے فون کرو۔ بلکہ سیکریٹری سے وقت لے کر آ جانا۔ میں کہہ دوں گا۔" صدر کی آواز میں غصہ دبا ہوا تھا۔ انیس کو لگا جیسے وہ اس کی آواز سنے بغیر فون بند کرنے والا ہو۔

"مجھے پتہ ہے آج رات کیا ہونے والا ہے۔" انیس شمشاد نے جلدی سے کہا۔ "میرے پاس جو کچھ ہے اس کا تم تک پہنچنا ضروری ہے۔ کوئی اہم فیصلہ کرنے سے پہلے تمہارا مجھ سے ملنا ضروری ہے۔ بے حد ضروری۔ تمہیں اندازہ نہیں کہ...."

"انیس میں اس وقت ایک اہم میٹنگ میں ہوں۔ تمہیں جو کچھ بتانا ہے فیاض منگی سے کہو میں اسے فون دیتا ہوں۔ یہ سمجھ کر بات کرو کہ تم مجھ سے بات کر رہے ہو۔" صدر نے انیس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"فیاض منگی؟ لیکن..... لیکن وہ تو شاید ایجنسی کا آدمی ہے۔"

"وہ کسی کا نہیں' صرف میرا آدمی ہے۔"

"سردار لیکن....." صدر نے انیس شمشاد کا اگلا جملہ سنے بغیر فون کسی اور کو دے دیا تھا۔ انیس شمشاد کے ماتھے پر پسینے کے قطرے رینگنے لگے۔ اسے پتہ تھا سردار کو اس کا تم کہنا پسند نہیں آیا ہو گا۔ وہ صدر تھا اس لئے اسے احترام سے مخاطب کرنا چاہئے تھا۔ لیکن بیس پچیس سالوں سے سردار کو تم کہنے کی عادت تھی۔ وہ اسے اچانک کیسے بدلتا۔

"سر! میں فیاض منگی ہوں۔ ایڈوائزر ٹو پریذیڈنٹ۔" فون پر آواز آئی تو انیس شمشاد اپنے خیالوں سے چونک پڑا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ فیاض منگی سے بات کرے یا نہیں۔ لیکن وقت نہیں تھا' جو کچھ ہونا تھا آج رات ہونا تھا' یہ اس کی سیاسی زندگی کی بحالی کا آخری موقع تھا۔ آج رات وہ فیصلوں میں شامل نہ ہو سکا تو پھر کبھی نہیں ہو سکے گا۔ اس نے آہستہ آہستہ فیاض منگی کو کیسٹوں کے بارے میں بتانا شروع کیا۔ اقتدار مافیا' کون کون اس میں شامل تھا' آخری اجلاس' لیکن یہ نہیں بتایا کہ اجلاس میں کیا بات ہوئی۔ یہ وہ سردار کو خود بتائے گا۔ بلکہ اپنے سامنے کیسٹ سنوائے گا۔ انیس شمشاد خاموش ہوا تو دوسری طرف سناٹا چھایا رہا۔ چند لمحوں بعد فیاض منگی کی آواز ابھری تو وہ بہت جلدی میں لگتا تھا۔

"سر! صدر محترم جیسے ہی اجلاس ختم کریں گے میں انہیں بتاؤں گا۔ مجھے یقین ہے وہ آپ سے فوری ملنا چاہیں گے۔ آپ تیار رہئے میں گاڑی بھجواتا ہوں۔"

"مجھے ایوان صدر کا راستہ پتہ ہے۔" انیس شمشاد نے ہنستے ہوئے کہا۔ "تم گیٹ پر کہہ دو' میں اپنی گاڑی میں خود آتا ہوں۔"

"نہیں سر۔ پورا علاقہ فوج کے کڑے پہرے میں ہے۔ کسی پرائیویٹ گاڑی کو آنے کی اجازت نہیں ہے۔ میں آپ کے لئے پریذیڈنٹ ہاؤس کی گاڑی بھجواتا ہوں۔ مجھے پتہ لکھوائیے۔"

"سردار کو بتانا کہ میں سندھ کی گورنری میں انٹرسٹڈ ہوں۔" انیس شمشاد نے

اپنا پتہ بتاتے ہوئے کہا۔

"یس سر!" فیاض منگی نے بہت ادب سے کہا اور فون بند کر دیا۔

"تم بہت جلد گورنر کی بیوی بننے والی ہو۔" انیس شمشاد نے فون رکھ کر گلاس ہاتھ میں اٹھاتے ہوئے مرینہ سے مخاطب ہو کر کہا۔ مرینہ کے چہرے پر عجیب طرح کی خوشی پھیل گئی۔

جلالی نے پوری رات جاگ کر اور سگریٹ پھونکتے ہوئے گزاری۔ ذہن میں آندھیاں چل رہی تھیں لیکن سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ کیسٹ کسی اور کے ہاتھوں میں چلے گئے تو کیا ہو گا؟ مرینہ کو اندازہ نہیں تھا کہ کتنی زندگیاں خطرے میں پڑ جائیں گی۔ لیکن اسے پھر یہ سوچ کر اطمینان ہوا کہ مرینہ بے وقوف نہیں تھی۔ اس نے کیسٹ سنے ہوں گے تو اندازہ کر لیا ہو گا کہ ان کے اندر کیا بارود چھپا ہے۔ وہ یقیناً جلالی کو تنگ کرنے کے لئے کیسٹوں کے ساتھ کہیں چھپ گئی تھی۔ ایک دم نمودار ہو گی اور کیسٹوں کے ذریعے اسے طاقت کے کھیل میں شریک ہونے پر مجبور کرے گی۔

جلالی نے سوچا وہ اب مرینہ سے سختی کے ساتھ پیش آئے گا۔ یہ کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ لیکن پھر اس نے سوچا سختی کی تو وہ بھپر سکتی ہے۔ اقتدار مافیا کا راز جان چکی ہے 'سیکورٹی رسک بن جائے گی۔ جلالی کو اپنی سوچ پر ہنسی آ گئی۔ وہ بھی اقتدار مافیا کے انداز میں سوچنے لگا تھا۔ "سیکورٹی رسک!" اس نے ایک بار پھر دہرایا اور ہنس پڑا۔ لیکن سوال یہ تھا کہ وہ تھی کہاں۔ کس کے پاس جا کر چھپی تھی۔ رات کو ایک بجے فون کر کے کسی سے اپنی بیوی کے بارے میں پوچھنے کا مطلب یہ تھا کہ شہر میں اپنی بدنامی کے اشتہار خود بانٹے جائیں۔ اس لئے بار بار فون کی طرف بڑھتا ہوا ہاتھ واپس آ جاتا۔

رات گئے کسی وقت صوفے پر بیٹھے بیٹھے اسے نیند کا جھونکا آ گیا۔ ہڑبڑا کر اٹھا

تو صبح کے سات بج رہے تھے۔ نہا دھو کر تیار ہوا اور ناشتہ کرتے وقت بار بار دروازے کی طرف دیکھتا رہا۔ اسے امید تھی کہ مرینہ کسی بھی وقت دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گی اور اس سے لپٹ کر اس کے سینے کے بالوں میں اپنی انگلیوں سے کنگھی کرنے لگے گی۔ ناشتہ کر کے اس نے سوچا بیگم دلبر' مسز خان اور مسز علی کو یا کلب میں فون کر کے تلاش کرائے۔ وہاں سے پتہ نہ چلا تو پھر مرینہ کے والدین کو پشاور فون کر کے معلوم کرائے گا۔ لیکن پھر اس نے فون کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور فلیٹ سے نکل پڑا۔ اس نے سوچا وہ خود جاکر معلوم کرے گا۔

فلیٹ سے نکل کر باہر جانے کے لئے سیڑھیاں اترنے لگا تو فلیٹ میں فون کی گھنٹی بجنے لگی تھی۔ لیکن جلالی کو سنائی نہیں دی۔ وہ اپنے خیالوں میں کھویا ہوا بلڈنگ سے باہر نکل کر ٹیکسی کو رکنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ اسے سب سے پہلے نواب ٹن کے پاس جانا تھا اور اسے بتانا تھا۔ نواب ٹن کے گھر پہنچ کر وہ بہت دیر تک گھنٹی بجاتا اور پھاٹک کھٹکھٹاتا رہا۔ لیکن کوئی کھولنے نہیں آیا۔ اسے پتہ تھا نواب ٹن ابھی سو رہا ہو گا۔ لیکن گل خان اور رحمٰن کو کیا ہوا؟

جلالی واپس جانے کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ گیٹ کا چھوٹا دروازہ کھلا اور اس سے ایک اجنبی شکل جھانکتی ہوئی دکھائی دی۔ وہ ایک صحت مند اور دراز قامت شخص تھا جو جلالی کو سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"میں نواب صاحب کا دوست ہوں جلالی۔ گل خان یا رحمٰن ہوں تو انہیں بتائیے وہ مجھے پہچانتے ہیں۔"

"آیئے آیئے اندر آیئے۔ گھر میں کوئی نہیں ہے۔ صرف میں ہوں۔" اجنبی جلالی کو اندر آنے کی جگہ دیتا ہوا کہنے لگا۔ "گل خان' رحمٰن اور خانساماں تینوں چھٹی پر اپنے اپنے گاؤں گئے ہوئے ہیں۔"

"نواب صاحب کو اٹھا دیجئے۔ میرا نام لیجئے وہ ناراض نہیں ہوں گے۔" جلالی نے اندر رزم گاہ کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ اجنبی اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔

"نواب صاحب کل رات ملک سے باہر چلے گئے ہیں۔"

"باہر؟ کہاں؟؟"

"برازیل!"

"برازیل؟" جلالی حیرت سے چلایا اور تیزی سے رزم گاہ میں داخل ہوا۔ تمام نوادرات غائب تھے۔ فرش پر صرف وہ تکیئے پڑے تھے جن کے سندھی کام کے غلافوں کے ٹانکوں کو نواب ٹن تھر کی کنواریوں کی پلکوں کے برابر قرار دے کر رویا کرتا تھا۔

"نواب صاحب بہت دنوں کے لئے گئے ہیں اس لئے سب سامان ساتھ لے گئے ہیں۔" اجنبی نے حیرت زدہ جلالی کو بتایا۔ "میں ان کا دور کا رشتے دار ہوں۔ وہ مجھے دیکھ بھال کے لئے چھوڑ گئے ہیں۔"

جلالی سر ہلاتا ہوا رزم گاہ سے باہر نکلا اور ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گیا۔

"آپ بیٹھئے میں آپ کے لئے چائے لے کر آتا ہوں۔" اجنبی جلالی کو ڈرائنگ روم میں چھوڑ کر اندر کچن میں چلا گیا۔ جلالی اپنے خیالوں میں گم تھا وہ اسے منع نہیں کر سکا۔ جلالی کے قدم بے اختیار اس کونے کی طرف اٹھ گئے جہاں نواب ٹن نے وہ چھوٹا سا اسٹوڈیو بنایا تھا جہاں اقتدار مافیا کے اجلاس کی کارروائیاں ریکارڈ ہوتی تھیں۔ جلالی کے دماغ پر ایک اور گھونسا پڑا۔ جہاں کبھی دروازہ تھا وہاں دیوار چنی ہوئی تھی۔ فضا میں تازہ پینٹ کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

جلالی لڑکھڑاتے قدموں سے آکر صوفے پر بیٹھ گیا۔ برازیل موت کا استعارہ تھا یا نواب ٹن واقعی برازیل بھاگنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ جلالی کے ذہن میں سوالوں کے گولے چل رہے تھے۔ مرینہ کے کیسٹ یقیناً" اقتدار مافیا کے ہاتھ لگ گئے تھے۔ لیکن مرینہ کہاں تھی؟ کیا وہ بھی...... جلالی کی نظریں سامنے میز پر رکھے ہوئے آج کے تازہ اخبار پر پڑیں۔ اخبار حکومت اور اسمبلی ٹوٹنے کی خبروں سے بھرا ہوا تھا۔ جلالی نے بے دلی سے اخبار اٹھایا۔ اس کے لئے کوئی خبر تازہ نہیں تھی۔ اس نے صفحہ اول پر ایک نظر ڈال کر اخبار الٹا تو پچھلے صفحے پر انیس شمشاد کی تصویر نظر آئی۔ تو کیا وہ بھی نئی حکومت میں...... خبر پڑھی تو دماغ میں ایک زور کا دھماکہ ہوا۔ اعصاب جھن جھنائے اور پھر سن ہو گئے۔ چیختی ہوئی سرخی کے نیچے جو خبر تھی وہ اسے بہ مشکل پڑھ

سکا۔

اسلام آباد ۔ ممتاز سیاست دان اور سابق وفاقی وزیر انیس شمشاد اپنے گھر ڈاکہ ڈالنے کے لئے آنے والوں کی گولیوں کا نشانہ بن کر ہلاک ہو گئے۔ انہوں نے ڈاکوؤں کی مزاحمت کرنے کی کوشش کی تھی۔ ان کی سابقہ بیوی مرینہ شاہ جو ان سے ملنے آئی ہوئی تھیں وہ بھی گولیوں کا نشانہ بن کر ہلاک ہو گئیں۔ ڈاکو گھر کا تمام قیمتی سامان لے جانے میں کامیاب ہو گئے۔ پولیس کا کہنا ہے.....

جلالی کے ہاتھ سے اخبار چھوٹ کر زمین پر گر گیا۔

نیا مافیا

اسلام آباد کی ایک خنک رات میں جب مٹی اور سوکھے پتے موسم خزاں کی ٹھنڈی اور خشک ہوا میں بھنور بن کر چکرا رہے تھے' کم آباد علاقے کے ایک حویلی نما بڑے سے مکان میں ایک ایک کر کے کئی گاڑیاں مسافروں کو اتار اتار کر تاریکی میں گم ہو رہی تھیں۔ آس پاس کے مکان غیر آباد تھے اس لئے گاڑیوں کی پراسرار نقل و حرکت پر نظر رکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ نچلی منزل کے ایک بڑے سے کمرے کے آتش دان میں گیس دہک رہی تھی۔ چاروں طرف آرام دہ چرمی صوفے تھے جو تقریباً" بھرے ہوئے تھے۔ ایک لمبی پشت کی بہت آرام دہ کرسی جو عموماً" اجلاس میں صدر نشین کے لئے ہوتی ہے خالی تھی۔ ایک صوفے پر اختیار رضوی کے ساتھ پھیل کر بیٹھا ہوا جنرل اسلم برلاس خطابت کے جادو جگا رہا تھا۔

"پرانا گروپ دشمنوں کے ہاتھوں بک گیا تھا۔ وہ ملک کو یہودیوں کے ہاتھوں فروخت کر رہا تھا۔ انہوں نے فوج کے سربراہ کو بھی ساتھ ملا لیا تھا۔ ہم نے بروقت اس سازش کو ناکام بنادیا ہے۔ جنرل منصف کو بتا دیا ہے کہ وہ ملک کے سیاسی معاملات

میں مداخلت نہیں کر سکتا۔ فوج کو مداخلت کرنی ہوتی تو آج اس ملک کا صدر میں ہوتا۔ لیکن میں نے اس ملک کے عوام کو جمہوریت کا تحفہ دیا ہے۔ اب کوئی فوجی مارشل لاء نہیں لگائے گا۔ سیاسی معاملوں میں مداخلت نہیں کرے گا۔ نہیں کرے گا۔"

جنرل برلاس جب سے سیاست دان بنا تھا اسے سیاست دانوں کی طرح تقریر کرنے کا فن بھی آگیا تھا۔ رخشندہ خان نے بڈھے جنرل کی تقریر کرنے کے انداز پر ہنسی روکنے کے لئے تمام توجہ اپنے کولہوں کی تکلیف پر مرکوز کر دی۔ جانے کیوں اتنے نرم صوفے پر بھی اس کے کولہے کی نکیلی ہڈیاں دکھ رہی تھیں۔ فیاض منگی نے مسکراتی ہوئی نظروں سے رخشندہ خان کو دیکھا۔ گروپ میں رخشندہ خان کی بھرتی کو فیاض منگی کا سب سے بڑا کارنامہ قرار دیا گیا تھا۔ فیاض منگی نے اپنا وعدہ پورا کیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ عامر نذیر کے سر پر ایسا ٹرانسمیٹر لگائے گا کہ اس کے سانسوں کی آواز بھی سنائی دے گی۔ رخشندہ ایک ایسا ہی ٹرانسمیٹر تھی۔ رخشندہ نے فیاض منگی کی مسکراہٹ سے جواب دے کر سوچا وہ کب تک اور کس کس سے بلیک میل ہوتی رہے گی۔

"فیاض منگی آج سے اس نئے گروپ کے کوآرڈی نیٹر ہوں گے۔" جنرل برلاس کی تقریر جاری تھی۔ "قریشی کو ڈیفنس سیکریٹری کے عہدے سے ہٹا کر او ایس ڈی بنا دیا گیا ہے۔ اس کے خلاف بدعنوانیوں کے الزامات کی تحقیق ہو گی۔ اس کا ساتھی نواب ٹن ملک چھوڑ کر بھاگ گیا ہے۔ لیکن وہ میرے ہاتھوں سے بچے گا نہیں۔ نواب ٹن کی جگہ اجلاس کا انتظام اب کرنل جانی کیا کریں گی....."

اختیار رضوی نے فیروزہ اسلم کو مسکرا کر دیکھا۔ وہ پہلی بار اس طرح کے اجلاس میں بیٹھی تھی اس لئے نروس تھی۔ جنرل کانی نے ریٹائرمنٹ لے لی تھی اور اپنی جگہ اپنی بیٹی کو دلوا دی تھی۔ فیروزہ اسلم نے شرط رکھی تھی کہ وہ صرف تفریح فراہم کرنے کا ذریعہ نہیں ہو گی' اجلاس کے اندر بیٹھے گی۔ وہ صحافی تھی اور سیاسی معاملات کا تجزیہ کر سکتی تھی۔ اختیار رضوی کے کہنے پر فیاض منگی مان گیا تھا۔ لیکن فیاض منگی نے فیروزہ اسلم کو ٹی وی کا ایم ڈی بنانے کی فرمائش ٹال دی تھی۔ اختیار

رضوی نے فیروزہ کو کرنل جانی کا خطاب دیا تھا اور وعدہ کیا تھا جلد ہی اسے ترقی دے کر اس کی ماں کی طرح جنرل بنا دیا جائے گا۔

"اختیار رضوی کو وزیراعظم کا مشیر مقرر کیا گیا ہے۔" برلاس نے نامزدگیاں شروع کیں۔ "جنرل سعید ملک کل وقتی تبلیغی ہو گیا ہے۔ اس کی جگہ گروپ کی طرف سے سیکورٹی کے معاملات میں دیکھوں گا۔ دفاعی خریداری کے معاملات بھی میری نگرانی میں طے پائیں گے۔ ہم اپنی سیکورٹی کے سلسلے میں کوئی مصالحت نہیں کر سکتے۔"

رضا سروہی نے دل میں سوچا بڈھا ہوشیار ہے' ساری بالائی خود کھانا چاہتا ہے۔ اس نے سگار کا ایک گہرا کش لیا اور سوچا جنرل برلاس سے دوستی بڑھانی پڑے گی۔ رضا سروہی کو آبدوزوں کے سودے میں ریاض توصیف کو مات دینی تھی۔ اسی لئے جب برلاس نے فلک پیر کی جگہ رضا سروہی کو گروپ میں شامل کرنے کی پیشکش کی تو اس نے انکار نہیں کیا تھا۔ رضا سروہی کو رخشندہ خان اور چوہدری شفاعت کو دیکھ کر بہت حیرت ہوئی تھی۔ چوہدری شفاعت ریاض توصیف کا سب سے اہم آدمی تھا۔ اسے یقین تھا کہ یہ بھی فیاض منگی کا کارنامہ ہو گا۔ رضا سروہی کو یاد تھا اگر پچھلی بار چودہری نے ریاض توصیف کی جگہ اس کا ساتھ دیا ہوتا تو ریاض توصیف کی جگہ رضا سروہی وزیراعظم ہوتا۔ اور آج بھی وہی وزیراعظم ہوتا۔ اس کے سینے سے ایک خاموش آہ نکلی اور وہ ایک بار پھر جنرل برلاس کی لن ترانیوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"ہمارے ملک میں غداروں کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ یہ گروپ اس بات کو یقینی بنائے گا کہ ملک کی باگ ڈور ان ہاتھوں میں نہ جائے جو ملک کی سلامتی کا سودا کرنے لگیں۔ میں اس کی گردن مروڑ دوں گا جو..........."

فیاض منگی نے ہاتھ اٹھا کر جذباتی ہو جانے والے جنرل برلاس کی تقریر روک دی اور کھڑا ہو کر کمرے کے اندر کے بند دروازے کی طرف دیکھ کر کہنے لگا۔

"یہ اس ملک کے مفادات کی نگرانی کرنے والا سب سے بااختیار گروپ ہے۔ آپ سب کو خوشی ہو گی کہ آپ کے اس گروپ کی سربراہی اس ملک کی سب سے بااختیار شخصیت نے قبول کر لی ہے۔ تشریف لاتے ہیں------ صدر محترم!"

اندر کے دروازے کو کھول کر سردار کمرے میں داخل ہوا تو سب تالیاں بجاتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ سردار آہستہ قدموں سے چلتا ہوا آیا اور لمبی پشت والی آرام دہ کرسی پر اکڑ کر بیٹھ گیا۔

(جاری ہے)

اشرف شاد کے بیباک قلم سے

وزیراعظم کے سلسلے کا آئندہ ناول

صدر محترم

۲۰۰۰ء میں منظر عام پر آئے گا

دوست پبلی کیشنز۔ اسلام آباد

۱۹۹۷ء کے بہترین ناول کا

"وزیراعظم ادبی" ایوارڈ حاصل کرنے والا

اشرف شاد کا پہلا ناول

بے وطن

"اشرف شاد کی بے وطن ایک ایسی کتاب ہے جسے پڑھ کر میں نے محسوس کیا کہ میرے علم میں اضافہ ہوا ہے ـــــ" شوکت صدیقی

"اشرف شاد نے بے وطن میں ایک ناول کی تکمیل کی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ ان میں ایک اہم ناول نگار چھپا ہوا تھا جو اپنے تخلیقی کرب کے حوالے سے خود ہی ظاہر ہوا اور اپنی صلاحیتوں کو منوالے گیا۔" پروفیسر سحر انصاری

"بے وطن اتنا دلچسپ ناول ہے کہ اسے ایک نشست میں ختم کرنا ضروری ہو جائے گا۔" عبیداللہ بیگ

دوست پبلی کیشنز۔ اسلام آباد
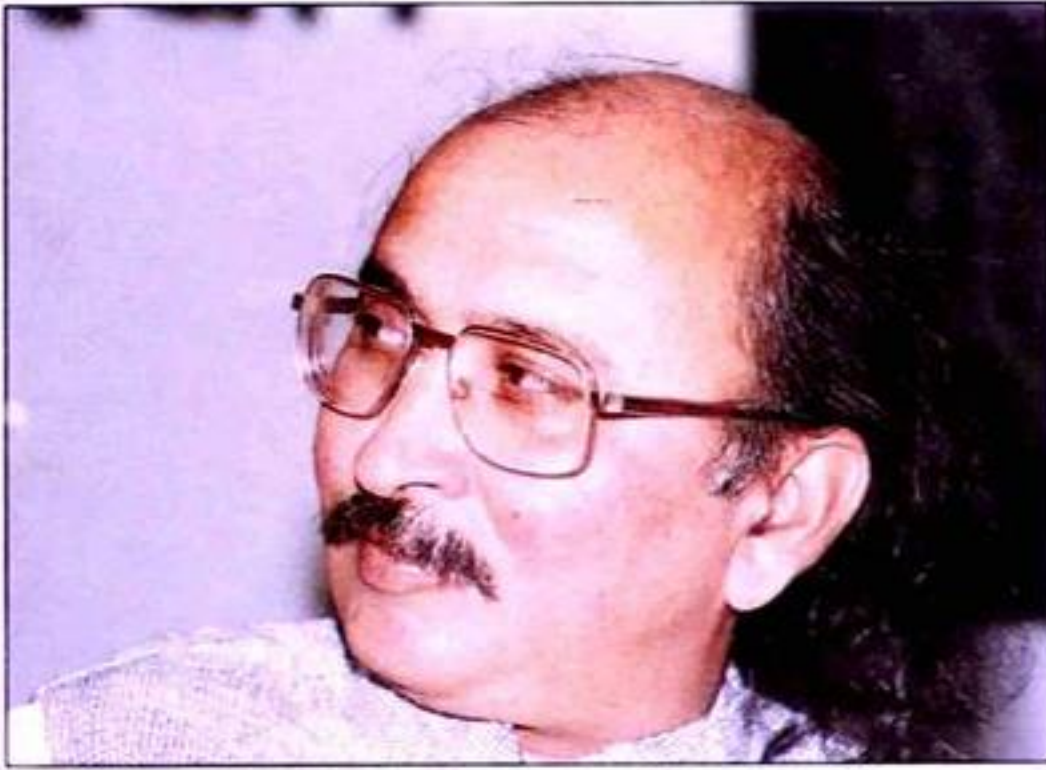
وزیراعظم کے مصنف اشرف شاد ادیب، شاعر، محقق اور پیشے کے اعتبار سے صحافی اور براڈ کاسٹر ہیں۔ "بے وطن" ان کا پہلا ناول تھا جسے اکادمی ادبیات پاکستان نے 1997ء کے بہترین ناول کے وزیراعظم ادبی ایوارڈ سے نوازا تھا۔ "وزیراعظم" ان کا دوسرا ناول ہے جس کے بعد وہ اب "صدر محترم" میں پاکستان کے مستقبل کا نقشہ کھینچنے میں مصروف ہیں۔ صحافی کی حیثیت سے وہ پاکستان میں حریت، مشرق، الفتح اور معیار سے، بحرین میں ویکلی گلف مرر سے اور کویت میں روزنامہ عرب ٹائمز سے وابستہ رہے ہیں۔ وہ گزشتہ دس سال سے آسٹریلیا میں مقیم ہیں اور ایس بی ایس ریڈیو سڈنی کی اردو سروس کے سربراہ ہیں۔ شاعر کی حیثیت سے ان کا مجموعہ کلام "نصاب" 1994ء میں شائع ہو چکا ہے جبکہ آسٹریلیا کے ایک ممتاز علمی ادارے یونیورسٹی آف نیو ساؤتھ ویلز نے ان کے تحقیقی مقالے Reporting the third world in the western media پر ایم اے آنرز کی ڈگری تفویض کی تھی۔

ISBN : 969-496-095-9